بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ

اور بے شک ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

معالم العرفان

فی

دروس القرآن

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

خطیب جامع مسجد نور

بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مرتب

الحاج لعل دین، ایم۔اے [علوم اسلامیہ]

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

فاروق گنج ○ گوجرانوالہ

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

١ سورۃ الرعد
٢ سورۃ ابراھیم
٣ سورۃ الحجر
٤ سورۃ النحل

جلد : ١١

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دام مجدہم
خطیب جامع مسجد نور، گوجرانوالہ، پاکستان

بیسواں ایڈیشن

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ رعد، ابراہیم، حجر، نحل) جلد ۱۱

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی رحمہ اللہ

مرتب .... الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمہ اللہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری، گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... -/۳۰۰ (تین سو روپے)

تاریخ طبع بیسواں ایڈیشن رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ جولائی 2013ء

ملنے کے پتے

(۱) کتب خانہ صفدریہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

(۲) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ (۳) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۴) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور (۵) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۶) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور (۷) مکتبہ علمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور (۹) اسلامیہ کتب خانہ اڈا کامی، ایبٹ آباد

(۱۰) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ (۱۱) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین معالم العرفان فی دروس القرآن جلد ۱۱

سُورَة الرَّعْد
مُكَمَّل

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا سِتُّ رُكُوْعَاتٍ
سورۃ رعد مدنی ہے یہ تنتالیس آیات اور اس میں چھ ۶ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ
رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①
اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

ترجمہ:۔ الٓمّٓرٰ یہ آیتیں ہیں کتاب کی، اور وہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے برحق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ① اللہ کی ذات وہ ہے جس نے بلند کیا ہے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو۔ پھر مستوی ہوا عرش پر اور اُس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو۔ یہ سب چلتے ہیں ایک مقررہ وقت تک۔ وہ تدبیر کرتا ہے معاملے کی اور تفصیل بیان کرتا ہے آیتوں کی، تاکہ تم

اپنے رب کی ملاقات کے ساتھ یقین رکھو (۲)

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ الرعد ہے۔ رعد بادل کی گرج کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس سورۃ میں بادلوں اور انکی گرج کا ذکر ہے، اس لیے اس سورۃ کو رعد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ گذشتہ سورۃ یوسف کی طرح یہ سورۃ بھی مکی ہے جو کہ مکی دور کے آخری حصے میں نازل ہوئی۔ یہ وہی دور ہے جب حضور علیہ السلام اور آپ کے پیروکار سخت مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔ اس سورۃ کی تینتالیس آیات، ۸۵۵ کلمات اور ۳۰۵۶ حروف ہیں۔ یہ زیادہ لمبی سورۃ نہیں بلکہ چھ رکوع کی درمیانی سورۃ ہے۔

مضامین سورۃ

سورۃ یوسف اور سورۃ رعد کے زمانہ نزول کی طرح ان کے مضامین بھی آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مکی سورتوں میں عام طور پر بنیادی عقائد توحید، رسالت، قیامت وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کو بھی مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ توحید کے ساتھ ساتھ شرک کی تمام اقسام کی تردید کی گئی ہے اور ایمان کی جزئیات کو بیان کیا گیا ہے۔ تو اس سورۃ رعد میں بھی بالعموم انہی چیزوں کا ذکر ہوگا۔ اور ساتھ ساتھ ضمنی باتیں بھی آئیں گی۔ مکی سورتوں میں اصلاح عقیدہ کے موضوع کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کی فکر پاک نہیں ہو سکتی اور نہ ہی عبادات، معاملات اور اخلاق درست ہو سکتے ہیں۔ اس سورۃ کا ایک خصوصی موضوع حق و باطل کی کشمکش ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے واضح فرمایا ہے۔

محکمات متشابہات اور مقطعات

قرآن پاک میں تین قسم کی آیات آتی ہیں۔ محکمات وہ آیات ہیں جن کا مطلب واضح اور حقیقت روشن ہو۔ ایسی آیات پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے دوسری قسم متشابہات کی ہے ان آیات کا معنی تو سمجھ میں آتا ہے مگر ان کی حقیقت انسانی سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ جیسے اگلی آیت ۲ میں ہے

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ پھر اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا۔ اس حصہ آیت کے معنیٰ تو معلوم ہے مگر یہ بات انسانی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیفیت کیا ہے۔ یہ متشابہات میں سے ہے۔ ایسی آیات کے متعلق سورۃ آل عمران میں حکم دیا گیا ہے کہ ان کو محکم آیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

آیات یا الفاظ کی تیسری قسم مقطعات کی ہے۔ ایسے الفاظ کا مطلب تو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ[1] یعنی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم عقیدہ رکھیں کہ ان الفاظ سے اللہ نے جو بھی مراد لی ہے وہ برحق ہے۔ اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہماری عقل ناقص اور ذہن کمزور ہے۔ اس لیے ہم ہر چیز کی حقیقت کو معلوم نہیں کر سکتے بعض چیزوں کا انکشاف اس دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کا علم آخرت میں حل کر ہوگا۔ اس کی مثال کے طور پر محدثین کرام فرماتے ہیں، کہ تقدیر کا مسئلہ ایسا ہے کہ اسکی حقیقت جنت میں جا کر کھلے گی، اسی طرح حروف مقطعات کے معانی ہیں، جنہیں ہم نہیں جانتے اور یہ اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔ ہمیں صرف ان پر ایمان رکھنا چاہیئے کہ یہ برحق ہیں۔ ایسی چیزوں کو زیادہ کریدنے کی اجازت نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے انسان گمراہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تفسیر میں یہ طریقہ بہتر سمجھا جاتا ہے کہ انسان ایسی چیزوں میں زیادہ کرید نہ کرے۔

بعض مفسرین اور متکلمین متشابہات اور مقطعات میں محض اس لیے بحث کرتے ہیں کہ انسانوں کے اذہان قرآن کریم سے قریب رہیں اور لوگ اللہ کی کتاب سے دور نہ ہو جائیں۔ وگرنہ حقیقت

بحث بھی ادا پیدا فہم

۱؎ جلالین ص۲

یہی ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے بھی حروف مقطعات کے متعلق کوئی بحث نہیں کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں ذکر کرتے ہیں کہ ان حروف میں نہ تو آنحضرت نے اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے کلام کیا ہے بلکہ آپ ان حروف کو اسی طرح پڑھتے رہے جس طرح یہ نازل ہوئے ہیں، البتہ حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان حروف کو من وعن تسلیم کر لو اور ان کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش نہ کرو۔ بعد صحابہ کرام کے آخری دور میں جب عجم کے اکثر لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان حروف کے متعلق کریدگی تو ان کے بعض معانی حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے منقول ہوئے مگر یہ محض تقریب فہم کے لیے ہے۔ الیقین سے پھر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا جب حضرت علیؓ سے تقدیر کے مسئلہ میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا سِرُّ اللّٰہِ فَلَا تَفْتَحُوْا یہ اللہ تعالیٰ کے راز ہیں، ان میں تحقیق نہ کرو، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ الٹا خرابی پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

الٓمٓ کی تفسیر: بعض مفسرین اور محدثین الٓمٓ کے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اجتماع کی مختلف صورتیں بیان ہوئی ہیں اور ان حروف مقطعات کا اشارہ رحمتِ خداوندی کے اکٹھا ہونے کے مقام کی طرف ہے۔ بعض ان حروف سے بلندی کا جھنڈا مراد لیتے ہیں اور یہ اُس شخص کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو قرآن کریم کی تعلیمات کو اپنائے گا۔ بعض فرماتے ہیں کہ علوم الہیہ یا معارف ربانی کی چمک ان حقائق سے ہے جو اس سورۃ میں بیان کیے گئے ہیں اور الٓمٓ سے وہ حقائق مراد ہیں۔ علی مہائمیؒ نے اپنی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ اس سورۃ میں اللہ نے ہدایت اور رشد کی پوشیدہ باتیں اور لطائف واسرار کو بیان کیا ہے اور ان حروف سے یہی چیز مراد ہے

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ الٓمّٓ میں ا سے مراد آلاءِ یعنی انعامات ل سے لطف اور م سے لازوال ملک مراد ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام نعمتیں، بے انتہا لطف اور لازوال بادشاہی صرف اللہ تعالےٰ ہی کو سزاوار ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ الٓمّٓ مخفف ہے اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ وَاَرٰی یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں میں جانتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ بعض یہ فرماتے ہیں کہ الٓمّٓ سے وہ اسرار لطیفہ مراد ہیں جو رُشد پہ مبنی ہیں اور شک کو زائل کرتے ہیں۔ امام رازیؒ نے بعض بزرگوں سے یہ بھی نقل کیا ہے اَنَا اللّٰہُ الْمَلِکُ الرَّحْمٰنُ یعنی اللہ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں جو بادشاہ اور رحمان ہوں۔ بہر حال مختلف مفسرین نے یہ مختلف معانی بیان کیے ہیں اور قرآن کریم انہی مطالب و معانی کا مظہر ہے

شاہ ولی اللہؒ کی توجیہ

امام شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تین کتابوں الفوز الکبیر، الخیر الکثیر اور ہوامع میں اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کشفی طریقے سے سمجھایا ہے کہ الٓمّٓ سے اُن عیوب کی طرف اشارہ ہے جو مقدس عالم یعنی عالمِ بالا سے عالم متدنس میں آکر بنی آدم میں، پائے جانے والے قبائح کے ساتھ آکر ٹکراتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس مقام سے قرآن پاک نازل ہوتا ہے وہ حظیرۃ القدس کا مقدس جہان ہے جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے اور عالم متدنس یہ مادی جہان ہے جہاں ہر قسم کی آلودگی، شرور فتن، بد عقیدگی، بد وضعی، بد اخلاقی، کفر، شرک، نفاق، الحاد اور گندگی پائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایمان، تقویٰ، نیکی اور طہارت بھی ملی جلی ہوتی ہے۔ تو عالم بالا سے آنے والے علوم و معارف کا تصادم اس مادی جہان کی برائیوں سے مسلسل ہوتا رہتا ہے، چونکہ اس سورۃ میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے تو الٓمّٓ سے اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حق و باطل ہمیشہ ٹکراتا رہتا

ہے جس سے حق واضح ہوتا ہے اور باطل مٹتا ہے۔

الکتاب

ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ یہ آیات ہیں الکتاب کی تفسیر میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ الکتاب سے عظیم کتاب مراد ہے قرآن کریم ہی وہ عظیم کتاب ہے جو صحیح معنوں میں کتاب کہلانے کی مستحق ہے اس کے علاوہ باقی تمام کتابیں مجازاً کتاب کہلاتی ہیں حقیقی کتاب یہی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کے علم اور صفت کا ظہور ہے۔

امام سیبویہؒ دوسری صدی ہجری کے امام ہیں۔ ایک موقع پر استاد کے سامنے عبارت پڑھتے ہوئے تلفظ کی غلطی کی تو استاد صاحب نے فرمایا کہ تم دین کی تعلیم حاصل کر رہے ہو مگر تمہارا تلفظ بھی درست نہیں امام صاحب یہ سن کر سخت افسردہ ہوئے اور اُٹھ کر چلے گئے۔ انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ عربی قواعد کی تعلیم حاصل کیے بغیر آگے نہیں پڑھوں گا چنانچہ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ علم نحو کی تحقیق و جستجو میں گزار دیا جب آپ نے اس علم میں کمال حاصل کر لیا تو استاد کے پاس آئے۔ بہرحال امام صاحب نے علم نحو کی تحقیق میں دو ضخیم جلدوں میں الکتاب نامی کتاب لکھی۔ اگرچہ یہ کتاب آجکل نہیں پڑھائی جاتی مگر اس سے اخذ ضرور کیا جاتا ہے اس کتاب کو بھی اس کی عظمت کی بنا پر "الکتاب" کہا جاتا ہے۔ تاہم سب سے عظیم الشان کتاب قرآن حکیم ہے اور اس کے متعلق یہاں ارشاد ہے کہ یہ الکتاب کی آئتیں ہیں۔

قرآن برحق

فرمایا یہ بڑی کتاب کی آئتیں ہیں، وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے، وہ برحق ہے۔ حق کا معنی ثابت چیز ہوتا ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ قرآن پاک کو حق کہا گیا ہے۔ جس کے تمام علوم و معارف واقع کے مطابق ثابت ہیں اور اس میں کوئی غلط یا مشکوک چیز

شامل نہیں ہے۔ پھر اسی کتاب کے ضمن میں دین کے جو اصول شریعت اور ملت ہیں، وہ بھی بلاشبہ حق ہیں۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ مگر اس کے باوجود اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر دور میں اکثریت غلط عقیدے پر ہی رہی ہے۔ لوگ صحیح عقیدے اور صحیح بات کو تسلیم کرنے کی بجائے خاندانی، قومی اور ملکی رسم و رواج کے پیچھے چلتے ہیں اور اللہ کی نازل کردہ سچی کتاب کے اصول و احکام کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ سابقہ سورۃ میں بھی یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ لوگوں کی اکثریت بے دین ہی رہی ہے بہرحال یہ قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا بیان بھی ہو گیا۔

آسمان کی حقیقت

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کو دلائل کے ذریعے سمجھایا ہے اور ساتھ ساتھ قیامت کو بھی برحق قرار دیا ہے۔ ہر دو مسائل کا ذکر اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ سے ہوتا ہے اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے پیدا کیا جن کو تم دیکھ رہے ہو۔ یعنی نیلگوں آسمان تمہیں صاف نظر آ رہا ہے۔ عربی میں اس کے لیے خضراء یعنی سبزی مائل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی تعریف میں فرمایا مَآ اَظَلَّتِ الْخَضْرَآءُ وَلَآ اَقَلَّتِ الْغَبْرَآءُ عَلٰى ذِىْ لَهْجَةٍ اَصْدَقَ مِنْ اَبِىْ ذَرٍّ یعنی سبزی مائل آسمان اور گرد و غبار والی زمین کے درمیان حضرت ابوذر غفاریؓ سے سچا آدمی کوئی نہیں ہے۔ یہ زہد و تقویٰ میں عیسیٰ ابن مریم کے مشابہ ہیں۔ بہرحال آسمان کے لیے خضراء کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ اس کی رنگت نیلگوں ہے۔

بعض لوگ آسمان کی حقیقت کے قائل نہیں بلکہ اسے محض

حدِ نگاہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ آسمانی کثافت کی وضع قطع بھی زمین جیسی ہی ہے۔ دیگر آسمانی کروں کی طرح زمین بھی ایک کرّہ ہے اور فضا میں معلّق ہے۔ تیز ترین راکٹ کے ذریعے جو لوگ زمین سے بہت دور فضا میں چلے جاتے ہیں انہیں زمین بھی چاند، سورج اور دیگر سیاروں کی طرح ایک گول مٹول سیارہ ہی نظر آتی ہے مگر انہیں چاند روشن اور زمین تاریک نظر آتی ہے کیونکہ چاند کے عناصر زمین کی نسبت لطیف ہیں۔ بہر حال شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آسمان محض ایک حدِ نگاہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ کا ارشاد موجود ہے۔ کہ اس نے تمہارے لیے زمین کو فرش "وَالسَّمَاءَ بِنَاءً" اور آسمان کو چھت بنایا۔ ظاہر ہے کہ چھت ایک ٹھوس چیز ہوتی ہے جو دیواروں اور ستونوں پر کھڑی کی جاتی ہے مگر آسمان کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ چھت ضرور ہے مگر بغیر دیواروں اور ستونوں کے ہے بلکہ اللہ نے اسے اپنی کمال قدرت کے سامنے کھڑا کیا ہے۔

سائنسدانوں کی تحقیق یہ ہے کہ تمام آسمانی کرّے قانونِ کشش کے ذریعے اپنے اپنے مدار میں محو گردش ہیں اور یہ آپس میں ٹکراتے نہیں آخر قانونِ کشش بھی تو خدا تعالیٰ ہی کا پیدا کردہ ہے جس نے تمام کروں کو مربوط بنا رکھا ہے جب تک یہ قانون موجود ہے۔ موجودہ نظامِ شمسی اسی طرح برقرار ہے۔ پھر جب اس قانون کو ختم کر دیا جائے گا تو سارا نظام درہم برہم ہو کر کرات آپس میں ٹکرا جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس دن آسمان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ مگر اس وقت تک یہ آسمان ایک حقیقت کے طور پر قائم ہے جس کے متعلق یہاں فرمایا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بغیر ستونوں کے

استویٰ علی العرش

بلند کیا ہے جیسے ہر شخص بچشم خود ملاحظہ کر رہا ہے۔
فرمایا اللہ نے بغیر ستونوں کے آسمانوں کو کھڑا کیا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ پھر وہ مستوی ہوا عرش پر۔ یہ آیت اس لحاظ سے متشابہات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیفیت کسی کو معلوم نہیں۔ چنانچہ متکلمین اس کی توجیہہ تین طریقوں سے کرتے ہیں بعض حضرات اس کو مجازی معنوں میں لیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا عرش پہ قائم ہونا اس طرح نہیں جس طرح ہم چارپائی یا کرسی پہ بیٹھتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات پہ خدا تعالیٰ کا کنٹرول ہے۔ عربی میں کہتے ہیں "اِسْتَوٰی بِشْرٌ عَلَی الْعِرَاقِ مِنْ غَیْرِ دَمٍ مُّھْرَاقٍ یعنی بشر عراق کا بادشاہ بن گیا بغیر خون کا قطرہ بہائے۔ تو یہاں پر استویٰ کا معنیٰ اقتدار حاصل ہونا ہے یعنی اسے پورے عراق پر کنٹرول حاصل ہو گیا۔

بعض آئمہ کرام اور سلف صالحین استویٰ کا حقیقی معنیٰ مراد لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پہ مستوی ہے مگر ہم اس کی کیفیت سے نابلد ہیں۔ ہم خدا کے بیٹھنے کو اس طرح محمول نہیں کر سکتے جس طرح ہم کسی چیز پہ بیٹھتے ہیں۔ ہم مادی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہم جہاں بھی مقیم ہوں ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے جہت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ مادی تصورات، محسوسات اور جہت سے پاک ہے۔ لہذا اس کے عرش پہ مستوی ہونے کی کیفیت ہمارے ذہن میں نہیں آسکتی۔ ہم اسی چیز پہ ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پہ مستوی ہے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ ہم اس کے عرش پہ بیٹھنے کی کیفیت کو متعین نہیں کر سکتے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس معاملہ کو آسان طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ارض و سما، ملائکہ، روح اور تمام

مخلوق اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اسی طرح عرش بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور عرش سے نیچے کی تمام اشیاء مخلوق میں داخل ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی تجلی جب عرش پر پڑتی ہے تو سارا عرش رنگین ہو جاتا ہے۔ پھر اس تجلی کے اثرات نیچے تمام کائنات پر پڑتے ہیں اور پھر عرش کی طرف لوٹتے ہیں۔ تو عرش پر پڑنے والی تجلی کو تجلی اعظم کہا جاتا ہے اور اسی تجلی کے لیے ہم اپنی زبان میں اللہ کا لفظ بولتے ہیں اسی کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ انسانی ذہن خدا تعالیٰ کی اس تجلی اعظم تک ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے جب کہ خدا تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند ہے جو انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حظیرۃ القدس میں پہنچ جائے تو وہ تجلی اعظم کو نمایاں طور پر محسوس کر سکے گا کیونکہ یہ وہاں پر براہ راست پڑ رہی ہے مگر اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے وہاں تک رسائی ممکن نہیں، البتہ مرنے کے بعد آخرت میں جا کر انسان تجلی اعظم تک ترقی کر سکتا ہے اور اس کو واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔

تسخیر شمس وقمر

فرمایا اللہ عرش پر مستوی ہوا وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر لیا ہے یعنی کام میں لگا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ان میں سے ہر ایک مقررہ وقت کے لیے چلتا ہے۔ سورج اور چاند اپنے اپنے راستے پر محو سفر ہیں سورج مکمل بارہ ماہ تک ایک ہی مدار میں چلتا ہے۔ جب کہ چاند ہر ماہ اپنا مدار تبدیل کرتا رہتا ہے۔ بہر حال اللہ نے ان کے چلنے اپنی اپنی منازل مقرر کر دی ہیں جس میں وہ چلتے رہتے ہیں اور انسان

کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ سورج انسانی ضروریات کے لیے روشنی اور حرارت بہم پہنچا رہا ہے اور اس کے اثرات سے اناج اور پھل پکتے ہیں۔ چاند کی دھیمی روشنی سے پھلوں میں رس پیدا ہوتا ہے۔ سمندر کے پانیوں میں مدوجزر کا عمل پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کا اثر ہواؤں پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پورے نظام شمسی کو ایک مقررہ مدت تک کے لیے جاری فرما دیا ہے۔ جب یہ نظام اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے گا تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر دوسرا نظام شروع ہو جائیگا۔

بعث بعد الموت

فرمایا یُدَبِّرُ الْاَمْرَ اللہ تعالیٰ ہر معاملے کی خود تدبیر کرتا ہے مگر اکثر لوگ صفت دوسروں میں تسلیم کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ غیر اللہ کو بھی تدبیر کنندہ مانتے ہیں حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے۔ پھر فرمایا یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ اللہ تعالیٰ آیتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے اور اسمیں کسی قسم کا اشتباہ نہیں رہنے دیتا۔ اور یہ اس لیے کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین رکھو۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت واقع ہو گی اور مرنے کے بعد اللہ کے ہاں حاضر ہونا ہے۔ وہاں حساب کتاب کی منزل آئیگی اور ہر ایک کو اپنے کیے کا بھگتان کرنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کا مسئلہ بھی سمجھا دیا ہے کہ جب خدا قادر مطلق ہے، اس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے کھڑا کیا ہے، تمام معاملات کی تدبیر کرتا ہے، تو کیا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات میں کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لاؤ اور بعث بعد الموت پر یقین رکھو۔

وَهُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ
وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِىْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③ وَفِى الْاَرْضِ
قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ
وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ وَّاحِدٍ ۣ قف
وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④

ترجمہ :- اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے پھیلایا ہے زمین کو اور رکھے ہیں اس میں بوجھل پہاڑ اور پانی کی نہریں اور ہر قسم کے پھلوں سے بنایا ہے اس (زمین) میں جوڑا جوڑا۔ وہ اوڑھاتا ہے رات کو دن پر۔ بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں ③ اور زمین میں مختلف خطے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے، اور باغات ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں ایک تنے سے نکلے ہوئے اور الگ الگ بھی۔ ان کو سیراب کیا جاتا ہے ایک ہی پانی سے، اور ہم فضیلت دیتے ہیں ان میں سے بعض کو بعض پر کھانے

ہیں ۔ بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے
جو عقل رکھتے ہیں ④

ربطِ آیات
سورۃ رعد میں اللہ تعالیٰ نے بنیادی عقائد توحید، رسالت اور قیامت کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ اس سورۃ کا ایک خصوصی موضوع حق و باطل کی کشمکش ہے۔ پہلی آیت میں قرآنِ پاک کی حقانیت اور صداقت کو بیان کیا گیا۔ اس کے بعد دلائلِ قدرت میں سے علویات کا ذکر ہوا اور اللہ نے آسمانوں کی تخلیق اور عرش کو بغیر ستونوں کے قائم کرنے کا ذکر کیا۔ سورج اور چاند کی تسخیر کا ذکر کر کے اللہ نے پوری کائنات پر اپنے کنٹرول اور تسلط کا اظہار فرمایا۔ ان بڑی بڑی چیزوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے وقوعِ قیامت پر دلیل قائم کی اور سمجھایا کہ ہر شخص کو اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔

اب آج کے درس میں آیات سفلیہ کو توحید کی دلیل بنایا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس پر پیدا کی جانے والی بڑی بڑی چیزوں کا تذکرہ کر کے ان میں غور و فکر کی دعوت دی ہے تاکہ انسان دلائل قدرت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لے آئے اللہ نے انسان کو اپنی عقل استعمال کرنے کی بھی ترغیب دی ہے۔ جو لوگ عقل کو صحیح طریقے سے استعمال نہیں کرتے یا غور و فکر نہیں کرتے اُن کے لیے دلائل قدرت کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔

زمین کا پھیلاؤ
ارشاد ہوتا ہے وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وہ وہی خدا تعالیٰ کی ذات ہے جس نے زمین کو پھیلایا ہے۔ مد کا معنیٰ پھیلانا یا ہموار کرنا ہوتا ہے۔ هُوَ الَّذِي کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ زمین کو بچھانے والا وہی ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو زمین کو معبود مانتے ہیں حالانکہ معبود تو وہ ذات ہے جس نے زمین کو انسانوں کی خدمت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی وضع ایسی بنائی ہے کہ انسان اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ زمین انسانوں کے پاؤں تلے روندی جاتی ہے، تو یہ عبادت کے لائق کیسے ہو سکتی ہے؟

ایسا عقیدہ رکھنا تو نہایت ہی جہالت اور بے وقوفی کی بات ہے۔
یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین اسی طرح پھیلی ہوئی ہے جس طرح زمین پر کوئی کپڑا یا چمڑا پھیلا دیا جاتا ہے؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ زمین کے پھیلاؤ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ چھٹی صدی کے عظیم مفسر قرآن امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ زمین گیند کی طرح گول ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کرّہ ہے جس کا قطر چوبیس ہزار میل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اتنی بڑی چیز کی گولائی تو نظر نہیں آسکتی بلکہ جہاں بھی دیکھیں گے یہ پھیلی ہوئی ہموار ہی نظر آئے گی۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ زمین سمیت تمام کرّے گول ہیں۔ البتہ ان کی جسامت میں بڑا فرق ہے۔ زمین اور سورج میں ایک اور تیرہ لاکھ کی نسبت ہے یعنی سورج زمین کی نسبت تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور دونوں کا درمیانی فاصلہ نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ جہاں تک چاند کا تعلق ہے، یہ زمین سے قدرے چھوٹا ہے۔ زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ پونے تین لاکھ میل سے سے پانچ لاکھ میل تک ہے۔ یہ تمام آسمانی کرّے ہماری زمین سے دوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ زمین سمیت تمام کرّوں کو اللہ نے فضا میں معلق کر رکھا ہے جو کہ اس کی قدرتِ تامہ کا شاہکار ہے۔

سلسلہ ہائے کوہ

فرمایا اللہ کی ذات وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا اور اس زمین میں بوجھل پہاڑ اور پانی کی نہریں رکھی ہیں۔ دنیا بھر میں اونچے اونچے پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی شمالی سرحد پہ سلسلہ کوہ ہمالیہ تین ہزار میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے جو سطح سمندر سے انتیس ۲۹ ہزار فٹ بلند ہے۔ پاکستانی سرحد کے ساتھ ملنے والا کوہ قراقرم

اور بعض دوسرے پہاڑ پچیس ۲۵۰۰۰ ہزار فٹ بلند ہیں۔ پہاڑوں کے چھوٹے بڑے سلسلے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پرانی ریاضی والے کہتے ہیں کہ سطح ارضی پر تیس ہزار فٹ بلند پہاڑ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک گز لمبی کسی چیز پر جَو کے سترھویں حصے کی کیا حیثیت ہے۔ اس طرح زمین کے پھیلاؤ اور وسعت کے مقابلہ میں بڑے سے بڑا پہاڑ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا پہاڑوں کی موجودگی زمین کے پھیلاؤ پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتی۔ البتہ پہاڑی حصے کچھ اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے جب کہ باقی زمین ہموار ہی نظر آئے گی۔ اسی لیے زمین کے لیے مِہاد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر حقیقت میں زمین گیند کی طرح گول شکل کی ہے۔

رواسی فائدے

سورۃ انبیاء میں زمین پر پہاڑ پیدا کرنے کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے اَنْ تَمِیْدَ بِھِمْ "تاکہ زمین حرکت نہ کر سکے یا زمین مضطرب نہ ہو" مفسرین نے تَمِیْدَ کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ پہلا معنیٰ تو عام فہم ہے کہ زمین پر بوجھل پہاڑ رکھ دیے ہیں تاکہ اس کا توازن قائم رہے اور یہ مضطرب نہ ہو یعنی ڈولنے نہ پائے مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[1] مضطرب کو اس معنیٰ میں لیتے ہیں کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو میدانی علاقوں کی انسانی زندگی مضطرب ہوتی کیونکہ وہ پہاڑوں سے پیدا ہونے والی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں میں انسانی زندگی کی بہت سی چیزیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً ندی، نالوں اور دریاؤں کے منبع حیات پہاڑ ہیں۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر سینکڑوں سالوں سے برف پڑی ہوئی ہے جو آہستہ آہستہ پگھل کر ندی نالوں کے لیے پانی مہیا کرتی ہے۔ یہ پانی دریاؤں کے ذریعے میدانوں میں پہنچتا ہے اور پھر دریاؤں سے نہریں نکال کر میدانی زمین کو سیراب کیا جاتا ہے

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ص۱۱ ج ۲

جس سے پھل سبزیاں اور اناج پیدا ہوتا ہے۔ یہی پانی پہاڑوں کے اندر ہی اندر چلتا رہتا ہے اور کسی جگہ چشموں کی شکل میں ابل پڑتا ہے جس سے خود پہاڑی علاقوں کے انسان، جانور اور زمین سیراب ہوتی ہے پہاڑوں کی بعض جڑی بوٹیاں ہیں جو انسانی صحت کے لیے بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ تمام معدنیات مثلاً سونا، چاندی، لوہا، سیسہ، ابرق، چونا اور پتھر پہاڑوں ہی کی پیداوار ہیں جو انسانی زندگی کے لیے نہایت مفید ہیں۔ پہاڑوں میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے درخت عمارتی اور دوسری کارآمد لکڑی مہیا کرتے ہیں، جو انسانی معاشرے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تَمِیْدَ کا معنیٰ یہ ہے پہاڑوں کی عدم موجودگی کی صورت میں انسانی زندگی مضطرب رہتی۔

مختلف الانواع پھل

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے پھل بھی پیدا کیے۔ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ زمین میں ان کا جوڑا جوڑا بنایا۔ زوجین کا ایک معنیٰ تو نر اور مادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھلوں میں نر اور مادہ پھل پیدا کیے ہیں۔ اور دو دو کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ایک پھل میٹھا ہے تو دوسرا پھیکا ہے ایک شیریں ہے تو دوسرا ترش ہے یا ایک اعلیٰ درجے کا ہے تو دوسرا ادنیٰ درجے کا۔ ہم روزمرہ زندگی میں ایسے پھلوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کے پھل ہیں جن کی شکلیں مختلف ہیں۔ رنگ اور ذائقے مختلف ہیں۔ کہیں پھیکا پھل کام دیتا ہے تو کہیں میٹھے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہیں ترش چیز درکار ہوتی ہے تو کہیں کسیلا کام دیتا ہے گویا انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف الانواع پھل پیدا فرمائے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔

شب و روز کا تغیر

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ڈھانک

دیتا ہے رات کو دن پر۔ شب و روز کا آگے پیچھے آنا خود بخود نہیں بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ دن کو ختم کر کے اس پر رات کو اوڑھا دیتا ہے۔ گویا دن پر رات کی چادر ڈال دیتا ہے۔ سورۃ نور میں ہے "یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ" اللہ تعالیٰ رات اور دن کو پلٹیاں دیتا ہے۔ کہیں رات بڑی ہوتی ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے اور کہیں دن بڑا ہوتا ہے اور رات چھوٹی ہوتی ہے۔ شب و روز کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کی حرکات سے پیدا کیا ہے۔ سبع کلیم یعنی متمدن دنیا میں دن اور رات کی طوالت قریب قریب ہوتی ہے البتہ زمین کے کناروں کی طرف انتہائی شمال اور انتہائی جنوب میں دن اور رات کی طوالت میں بڑا فرق ہوتا ہے کہیں دو ماہ کی رات اور دو ماہ کا دن ہوتا ہے اور کہیں دن اور رات کی طوالت چھ چھ ماہ تک ہوتی ہے مگر عام متمدن دنیا میں دن اور رات چوبیس گھنٹے میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ بیشک ان تمام چیزوں میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اگر انسان اس بات میں غور کرے کہ اللہ نے یہ چیزیں کیوں پیدا کی ہیں، ان میں اختلاف کیوں رکھا ہے۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی ہے جو یہ چیزیں پیدا کرنے پر قادر ہے تو انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان تمام دلائل کو پیدا کرنے والا صرف خدا تعالیٰ ہے اور یہی بات خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو یاد کراتی ہے۔

آگے فرمایا وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ اور زمین میں مختلف خطے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں ساری زمین ایک جیسی نہیں بلکہ متفاوت ہے مگر ہر خطہ ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ کسی علاقے کی زمین سیاہ ہے، کسی کی سرخ، کسی کی سفید ہے اور کسی خطے کی ٹیلہ، کوئی زمین سخت ہے اور کوئی نرم۔

کوئی ریتلی ہے اور کوئی پتھریلی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین کے مختلف خطوں سے مختلف الانواع مٹی لے کر اُس سے آدم علیہ السلام کا مجسمہ بناؤ، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح انسان کی تخلیق مختلف قسم کی مٹی سے ہوئی اُسی طرح اِن کے اخلاق بھی مختلف ہیں مٹی کی طرح کوئی سخت مزاج ہے اور کوئی نرم مزاج۔ بعض کلر والی زمین کی طرح نکمے ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے طبائع زرخیز زمین کی طرح بڑے باصلاحیت ہوتے ہیں گویا زمین کا اختلاف نوعِ انسانی کے اختلاف سے ملتا جلتا ہے۔ حضور کے فرمان کے مطابق تمام نسلِ انسانی میں مٹی کا اثر قیامت تک موجود رہے گا۔ بعض انسان پاکیزہ اخلاق ہوں گے اور بعض خبیث طینت، اسی طرح بعض لوگ خوش اخلاق ہوں گے اور بعض بداخلاق۔ یہ تو اس زمین کا اثر ہے اور اس دنیا کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ قیامت کے بعد جب نئی زمین پیدا ہو گی تو وہ میدے یا چاندی کی مانند سفید ہو گی اور اس کے کسی حصے میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا بلکہ ساری زمین یکساں نوعیت کی ہو گی۔

اِس زمین کے مختلف الانواع ہونے میں یہ حکمت بھی ہے کہ ہر حصے سے مختلف قسم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ کہیں سے پٹرول نکل رہا ہے تو کہیں سے کوئلہ اور لوہا برآمد ہو رہا ہے۔ کہیں مرمر کا پتھر پایا جاتا ہے تو کہیں سیمنٹ اور چونا ملتا ہے۔ کہیں سونا چاندی ہے اور کہیں جواہرات پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں انسانی ضروریات کی ہیں اور ایک حصے کی چیزیں دوسرے حصے کے بھی کام آتی ہیں اگر ساری زمین ایک سی ہوتی تو ایسی مختلف ضروریات زندگی کی تکمیل کیسے ممکن ہوتی؟

باغات اور کھیتیاں

فرمایا اللہ نے زمین میں مختلف خطے پیدا کیے ہیں وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ اور انگوروں کے باغات بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں، منجملہ کھجور، انار کے آم اور انگور بھی بہشتی پھل ہے۔ وَّزَرْعٌ اور اللہ نے کھیتیاں بھی پیدا کی ہیں، جن میں اناج، پھل اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں جو انسانی اور حیوانی زندگی کے لیے لازمی ہیں۔ وَّنَخِيْلٌ اور اللہ نے کھجوریں بھی پیدا فرمائی ہیں۔ کھجور کا درخت بھی اللہ کی عظیم نعمت ہے اس کی سینکڑوں قسمیں ہیں جن کے مختلف ذائقے ہیں۔ ان کی شکلیں اور حجامت بھی مختلف ہے۔ کوئی لمبی ہے اور چھوٹی، کوئی سیاہ ہے اور کوئی سرخ، کوئی گٹھلی والی اور کوئی بغیر گٹھلی کے، کوئی جلدی استعمال کرنے والی ہوتی ہے اور کوئی لمبے عرصہ تک کار آمد رہتی ہے۔ کھجور کے درخت بھی کوئی چھوٹے ہوتے ہیں اور کوئی بہت لمبے۔ بعض درخت صدیوں تک قائم رہتے ہیں اور پھل بھی دیتے رہتے ہیں۔ جب کہ اس کی بعض اقسام کم عمر بھی ہوتی ہیں۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ کھجور کے درخت کو مومن انسان کے ساتھ بہت حد تک مشابہت ہے۔ جس طرح مومن ہمیشہ سرسبز رہتا ہے اسی طرح کھجور کا درخت بھی سدا بہار ہے۔ جس طرح اس درخت سے لوگ ہر وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اسی طرح مومن کے اعمال و اخلاق بھی انسانوں کے کام آتے ہیں کیونکہ مومن کا دل نور ایمان سے منور اور اس کا عقیدہ پاک ہوتا ہے۔ جس طرح کھجور کا درخت اوپر کی طرف فضا میں پھیلتا ہے اسی طرح مومن کے اعمال و اخلاق بھی پھیلتے ہیں۔ جس طرح کھجور کے درخت کی چوٹی بہت بلند ہوتی ہے، اسی طرح مومن کے اخلاق بھی بہت بلند ہوتے ہیں۔

مختلف اللون درخت

اللہ نے کھجور کے درخت کے تذکرے میں فرمایا

صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ کہ بعض درخت ایک جڑ سے دو تنے والے ہوتے جب کہ بعض کا ایک جڑ پر ایک ہی تنا ہوتا ہے۔ اس قسم کے درخت کھجور کے بھی ہوتے ہیں اور بعض دوسرے بھی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کی حضرت عباسؓ سے کسی بات پر تلخ کلامی ہوگئی۔ حضور کو پتہ چلا تو فرمایا اے عمرؓ! کیا تم نہیں جانتے اِنَّمَا الْعَمُّ صِنْوُ اَبِیْہِ کہ چچا باپ کی شاخ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح کسی درخت کی ایک جڑ سے دو تنے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک دادا کی اولاد میں باپ اور چچا دو تنے یا دو شاخیں ہوتی ہیں۔ فرمایا عباسؓ میرے چچا اور واجب الاحترام ہیں۔ یاد رہے کہ حضور علیہ السلام کے چار چچا تھے۔ جنہوں نے حضور علیہ السلام کا زمانہ پایا۔ ان میں سے حضرت عباسؓ اور حضرت حمزہؓ نور ایمان سے مشرف ہوئے جب کہ ابولہب اور ابوطالب کفر پر ہی گئے۔ البتہ ابولہب حضور کا سخت دشمن جب کہ ابوطالب آپ کا ہمدرد تھا۔ اُس کے ایمان نہ لانے کا حضور کو بڑا افسوس تھا مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں بلکہ میرے اختیار میں ہے۔ میں بہتر جانتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں، ہدایت دیتا ہوں۔

فرمایا مختلف قسم کے درخت ہوتے ہیں يُسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ جنہیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ اور ہم فضیلت دیتے ہیں بعض کو بعض پر کھانے میں۔ بعض نہایت ہی خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض پھیکے، ترش یا بدذائقہ، حالانکہ پانی سب کو ایک ہی ملتا ہے۔ امام رازیؒ۔ امام ابوبکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں نیچریوں کا رد ہے جن کا دعوےٰ ہے کہ ہر کام نیچر کے تحت خودبخود ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک ہی کھیت میں ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والا کوئی خربوزہ میٹھا اور کوئی پھیکا نہ ہوتا بلکہ فطرت

کے قانون کے مطابق سب کا رنگ اور ذائقہ ایک ہی ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پھلوں کو پیدا کرنا نیچر کا کام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ کا شاہکار ہے جس نے بعض درختوں اور پھلوں کو بعض دوسروں پر فضیلت بخشی ہے۔

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ بلاشک ان تمام چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔ زمین کے مختلف خطے، باغات، کھیتیاں اور کھجوروں کے درخت نشاناتِ قدرت میں سے ہیں فَفِیْ كُلِّ شَیْءٍ دَلِیْلٌ اَنَّهٗ وَاحِدٌ ان میں سے ہر چیز میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحدہٗ لاشریک ہے۔ مگر یہ دلائل اُن لوگوں کو نظر آتے ہیں جو صاحبِ عقل ہیں۔ اور غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل کو استعمال نہیں کرتے "اَلصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ" (انفال) یہ بہرے، گونگے اور بے عقل ہیں۔ نیز فرمایا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" یہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ ان کو دلائلِ قدرت نظر آتے ہیں مگر یہ فلاح نہیں پائیں گے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا
لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۵﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ
الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ
وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ
وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ
اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ ع ۱/۷

ترجمہ :- اور اگر آپ تعجب کریں تو اِن کی بات زیادہ قابلِ تعجب ہے (جب کہ وہ کہتے ہیں) کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا نئی پیدائش میں پیدا کیے جائیں گے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اپنے رب کے ساتھ، اور یہی لوگ ہیں کہ طوق ہونگے انکی گردنوں میں، اور یہی لوگ ہیں دوزخ والے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۵﴾ اور آپ سے جلدی طلب کرتے ہیں یہ بُرائی کو بھلائی سے پہلے۔ اور تحقیق گزر چکی ہیں اس سے پہلے مثالیں (عذاب کی)۔ اور بیشک تیرا پروردگار

البتہ بخشش کرنیوالا ہے لوگوں کیلئے باوجود اُن کی زیادتی کے اور بیشک تیرا پروردگار البتہ سخت سزا دینے والا ہے ⑥ اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ کیوں نہیں اتاری جاتی اس پر کوئی نشانی اس کے پروردگار کی طرف سے ۔ بیشک آپ ڈر سنانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ہادی ہوا کرتا ہے ⑦

رابطِ آیات

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ پر مشتمل بعض دلائلِ توحید بیان فرمائے ہیں۔ زمین اور اس میں پیدا ہونے والے مختلف قسم کے درختوں اور پھلوں کا ذکر فرمایا۔ سارے ایک پانی سے سیراب ہونے والے پھلوں کے ذائقے اور رنگ مختلف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا کام ہے۔ فرمایا کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانیاں ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور غور و فکر کرتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو یہ واضح دلائل بھی کچھ مفید نہیں ہوتے، وہ اپنی جہالت اور نادانی میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر فرمایا ہے اور ساتھ ساتھ کافروں کی ضد اور ہٹ دھرمی پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی بھی دی ہے۔

قیامت کا انکار

ارشاد ہوتا ہے وَاِنْ تَعْجَبْ اگر آپ تعجب کریں اس بات پر کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید، بعث بعد الموت اور محاسبہ اعمال پر ایمان کیوں نہیں لاتے فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ تو ان کی یہ بات زیادہ تعجب انگیز ہے ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے ہمارے اجسام ذرات بن کر خاک میں مل جائیں گے ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا ہوں گے؟ کفار کی یہ منطق سورۃ الٓمٓ سجدۃ میں اس طرح بیان ہوئی ہے "ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ" جب ہمارے اجزا زمین میں رل مل جائیں گے تو کیا ہم پھر سے دوبارہ پیدا ہو جائیں گے ۔ سورۃ

النّٰزِعٰتِ میں کفار کا یہ بیان بھی مذکور ہے "ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً" کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے تو پھر زندہ ہو جائیں گے؟ گویا ان لوگوں کا بعث بعد الموت پر یقین نہیں تھا۔ اللہ نے فرمایا ان کا انکار نہایت ہی تعجب انگیز اور افسوسناک ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کائنات کو بغیر مادے، سابقہ نمونے اور آلے کے پیدا فرمایا تو انسان جیسی چھوٹی سی چیز کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کون سی مشکل بات ہے وہ تو پہلے بھی انسان کو پیدا کر چکا ہے، تو اب اس کو دوبارہ کیوں نہیں کھڑا کر سکے گا؟ بہر حال وہ لوگ قیامت کے وقوع اور دوبارہ زندگی پر تعجب کرتے تھے

کفار کی دوسری تعجب انگیز بات یہ تھی کہ وہ کہتے تھے "اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا ج اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ" (ص ۵) کیا تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک معبود کی پوجا کی جائے، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ معبود بنا رکھے ہیں جو اپنے اپنے دائرہ اختیار میں لوگوں کی بگڑی بناتے ہیں، ان کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں، بھلا اتنے سارے کام صرف ایک معبود کیسے انجام دے سکتا ہے۔ یہ تو ناممکن بات نظر آتی ہے۔ اللہ نے ان کی دونوں باتوں کی نفی فرمائی ہے اس کی قدرت میں وقوع قیامت اور محاسبۂ اعمال بھی ہے اور کائنات کے تمام امور اللہ وحدہٗ لاشریک ہی انجام دینے پر قادر ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

منکرین کے لیے سزا

فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، اس کی قدرت کا یقین نہ کیا اور اس کی صفت ہی کو نہ پہچانا۔ وہ کہتے تھے کہ مرنے کے بعد کون زندہ ہوگا

مگر اللہ نے فرمایا "بَلٰی وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا" (النحل) ہمارا وعدہ بالکل سچا ہے اور ہم الیا ضرور کریں گے مگر افسوس کہ آخر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کی سزا بھی سن لیں وَاُولٰٓئِکَ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِھِمْ قیامت والے دن ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے جو کہ ذلّت کی نشانی ہے۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں باطل کو سینے سے لگائے رکھا۔ قیامت والے دن یہی چیز ان کے گلے کا طوق بن جائے گی۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے "اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِھِمْ اَغْلٰلًا فَھِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَھُمْ مُّقْمَحُوْنَ" ان کے گلے میں طوق ہوں گے جن کی وجہ سے ان کی گردنیں اُوپر کو اٹھی ہوں گی۔ اور پھر مجرموں کو کھینچنے کے لیے بڑی بڑی زنجیریں ہوں گی سورۃ الحاقّۃ میں ہے "فِیْ سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا" ستر ستر گز زنجیریں ہونگی جن سے باندھ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں بیڑی یا ہتھکڑی لگی دیکھے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ شخص دین میں ثابت قدم ہے اور یہ اس کے حق میں اچھی علامت ہے۔ اور اگر کوئی گردن میں طوق پڑا ہوا دیکھے تو یہ ذلّت کی نشانی ہے۔ غرضیکہ مشرکین کی شرکیہ باتیں۔ باطل رسم ورواج اور کفریہ کلمات ہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائیں گے۔ بخیل کے متعلق بھی سورۃ آل عمران میں آتا ہے "سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ" بخل کی وجہ سے ان کے گلے میں طوق ڈال دیا جائے گا، وہ سانپ بن کر بخیل کو ڈسے گا۔ کیونکہ اس نے دنیا میں مال کا حق ادا نہیں کیا۔ زکوٰۃ نہیں دی یا معاشرے کے کمزور لوگوں کا خیال نہیں رکھا۔ فرمایا

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے خلاصی کی کوئی صورت نہیں ہوگی کیونکہ کفر اور شرک کی سزا دائمی ہے۔ البتہ اعمال کی خرابی کی سزا وقتی ہوگی۔ جو کہ تطہیر قلب کے لیے دی جائے گی۔

بھلائی سے پہلے برائی

آگے اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور منکرین کی ایک اور خرابی کا ذکر فرمایا ہے وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ یہ لوگ آپ سے بھلائی سے پہلے برائی کو چاہتے ہیں۔ بھلائی تو ایمان قبول کرنے اور نیکی اختیار کرنے سے آتی ہے مگر یہ تو انہوں نے کیا نہیں وہ اپنے کفر اور شرک پر اڑے ہوئے ہیں اور خود اپنی زبان سے عذاب طلب کرتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ان کا یہ بیان موجود ہے "اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ" اے اللہ! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سچی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے یا کوئی اور دردناک عذاب نازل کر دے سورۃ بنی اسرائیل میں ہے "اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا" یا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرا دے ہم تو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ دیکھو یہ کتنے بے وقوف لوگ ہیں جو اپنے مونہوں سے سزا کے طالب ہیں اور جب یہ سزا آجاتی ہے تو پھر ٹالی نہیں جاتی۔ فرمایا وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ اور اس سے پہلے اس قسم کی سزاؤں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اللہ نے نافرمانوں کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا مگر یہ لوگ اُن مثالوں کو دیکھ کر بھی عبرت حاصل نہیں

کرتے بلکہ کفر و شرک پر اصرار کر کے ویسی ہی سزاؤں کا دوبارہ مطالبہ کر رہے ہیں جو کہ سخت نادانی کی بات ہے۔

معافی اور سزا

فرمایا وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ بیشک تیرا پروردگار البتہ بخشش کرنے والا ہے لوگوں کے لیے باوجود اُن کے ظلم اور زیادتی کے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نافرمانی پر فوری گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے اور دوسری یہ کہ جو شخص اپنے عقیدے اور فکر کو پاک کر لیتا ہے اُس کے لیے بخشش کا ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ" (الحجر) میرے بندوں کو مطلع کر دو کہ میں بخشش کرنے والا اور مہربان ہوں، اور میری سزا بھی بڑی سخت ہے۔ یہاں بھی فرمایا کہ ایک طرف تو تیرا رب زیادتی کرنے کے باوجود لوگوں کو معاف کرنے والا ہے اور دوسری طرف وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ خدا تعالیٰ سخت سزا دینے والا بھی ہے۔ انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات کی طرف ہونی چاہیئے۔ اگر کسی کو مہلت ملے تو اُسے مغرور نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ خدا تعالیٰ کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔ حضرت سعید ابن مسیبؒ کی روایت میں آتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی معافی اور درگذر نہ ہوتا تو انسانوں کے لیے زندگی قطعی خوشگوار نہ ہوتی بلکہ نہایت تلخ ہوتی۔ فرمایا اگر خدا کی گرفت نہ ہوتی تو لوگ بھروسہ کر کے ہی بیٹھ جاتے، گویا معافی اور سزا کا قانون ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اسی لیے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ یعنی انسان کا ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ انسان کو اللہ کی پکڑ کا ڈر بھی ہو اور اس

کی بخشش کی امید تھی۔

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حافظ ابن عساکرؒ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ ایک بزرگ ابوحسان حسن ابن عثمانؒ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جلوہ فرما ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ایک آدمی کی سفارش فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا اَلَمْ یَکْفِکَ کیا آپ کے لیے سورۃ رعد کی یہ آیت کافی نہیں ہے "وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ" یعنی تیرا پروردگار لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود بخشنے والا ہے۔ بشرطیکہ فکر پاک ہو۔

معجزے کی فرمائش

کفار کی ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

کافر لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتاری جاتی اس پیغمبر پہ کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے۔ اس نشانی سے وہ نشانی مراد ہے جو کافر خود اپنے منہ سے طلب کرتے تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ہاتھ پہ بے شمار نشانیاں ظاہر فرمائی ہیں مگر ضدی لوگ محض اپنی من مانی نشانی پہ اڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بنجر میں باغ لگ جائیں، ان میں نہریں جاری ہوں آپ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں اور وہاں سے ہمارے سامنے کتاب لائیں فرشتے آکر آپ کی رسالت کی گواہی دیں یا خدا خود سامنے آکر کھڑا ہو جائے (العیاذ باللہ) کوئی منصف مزاج آدمی ایسی بات نہیں کہہ سکتا مگر یہ ایسی جاہل قوم تھی کہ من مرضی کی نشانی پانے کے باوجود انکار کر دیتے تھے۔ انہوں نے شق القمر کا معجزہ خود طلب کیا، مگر جب ظاہر ہو گیا تو کہنے لگے "سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ" یہ تو چلتا ہوا جادو ہے یعنی محمدؐ نے جادو کر دیا ہے۔ تو فرمایا کافر کہتے ہیں کہ نبی پر کوئی نشانی کیوں نہیں نازل ہوتی۔ اس کے جواب میں

اللہ نے فرمایا کہ نشانیوں کا ظاہر کرنا نبی کا کام نہیں بلکہ یہ تو اللہ کا کام ہے، وہ جب چاہے اپنی مصلحت کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر کر دے کوئی نبی اپنی مرضی سے معجزہ ظاہر نہیں کر سکتا۔

ہر قوم کے لیے ہادی

اللہ نے فرمایا، اے نبی علیہ السلام! اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ آپ تو ڈرسنانے والے ہیں۔ آپ لوگوں کو شدید محاسبے اور عذاب سے ڈرائیں کہ آگے ایک منزل آنے والی ہے، اس کے لیے تیاری کریں ہر نبی کو اللہ نے مبشر اور منذر بنا کر بھیجا ہے "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" (النساء) انبیاء کے علاوہ ان کے پیروکار بھی منذر ہوتے ہیں۔ جو لوگ بھی اہل حق ہوتے ہیں، وہ لوگوں کو کفر، شرک، اور معاصی کے انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا آپ تو ڈرسنانے والے ہیں وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ اور ہر قوم کا ہادی ہوتا ہے۔ یہ سنت اللہ ہمیشہ جاری رہی ہے کہ اللہ نے ہر قوم میں ہادی بھیجے ہیں اللہ نے اپنے آخری نبی کو بھی ہادی بنا کر بھیجا ہے آپ کا کام ہدایت کا راستہ دکھانا اور ڈرسنانا ہے۔ لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنا آپ کے فرائض میں شامل نہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سابقہ انبیاء خاص خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا "وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ" (آل عمران) یعنی آپ کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تمام اقوام عالم کی طرف نبوت عامہ عطا کی گئی۔ آپ ہر قوم کے ہادی اور راہنما ہیں سورۃ اعراف میں بھی موجود ہے "قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" اے نبی علیہ السلام! آپ کہہ دیں کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں آپ کے علاوہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی نبوت عامہ سے سرفراز فرمایا

"اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" (البقرہ) حضور علیہ السلام تمام قوموں کی طرف رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا "بُعِثْتُ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ" یا مجھے تمام کالے اور سُرخ لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ اس میں ہر قوم اور ہر ملک چین، جاپان، روس، امریکہ، افریقہ اور ایشائی ممالک شامل ہیں۔ سورۃ انعام میں ہے کہ آپ کو اس لیے مبعوث کیا گیا ہے "لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا" تاکہ آپ اہل مکہ اور گرد و پیش کے لوگوں کو ڈرائیں۔ اور فرمایا یہ قرآن آپ کی طرف اس لیے نازل کیا گیا ہے "لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ" تاکہ آپ ان کو بھی ڈرائیں اور ان کو بھی جہاں تک یہ قرآن پہنچے۔ تمام جہان والے آپ کے مخاطب ہیں۔ آپ کو تسلیم کیے بغیر کسی کے لیے ہدایت کا دروازہ نہیں کھلے گا۔ بہرحال اللہ نے ہر قوم کے لیے ہادی بھیجے۔

اَللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِیْضُ
الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۞ ۸
عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ۞ ۹ سَوَآءٌ
مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ
هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۞ ۱۰ لَهٗ
مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ
یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ
حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ
سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ
مِنْ وَّالٍ ۞ ۱۱

ترجمہ:۔ اللہ تعالےٰ وہ ہے جو جانتا ہے وہ جو اٹھاتی ہے ہر مادہ اور جو سکڑتے ہیں رحم اور جو بڑھتے ہیں۔ اور ہر چیز اُس کے نزدیک ایک خاص اندازے کے مطابق ہے (۸) وہ جاننے والا ہے پوشیدہ باتوں کا اور ظاہری باتوں کا۔ وہ بڑا ہے اور سب سے برتر ہے (۹) برابر ہے تم میں سے جو پوشیدہ بات کرتا ہے اور جو پکار کر کرتا ہے وہ بات۔ اور وہ جو چھپنے والا ہے رات

کے وقت اور جو چلنے والا ہے دن کے وقت (۱۰) اُس کیلیے آگے پیچھے آنیوالے ہیں اس آدمی کے آگے بھی اور پیچھے بھی جو اُسکی حفاظت کرتے ہیں اللہ کے حکم سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں تبدیل کرتا کسی قوم کی حالت یہاں تک کہ وہ تبدیل کریں جو کچھ اُنکے نفسوں میں ہے۔ اور جب ارادہ کرے اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ برائی کا، پس نہیں کوئی اُس کو پھیرنے والا، اور نہیں ہے اُن کے لیے اُس کے سوا کوئی کارساز (۱۱)

ربطِ آیات

جیسا کہ سورۃ ہٰذا کے تعارف میں بیان ہو چکا ہے، اس میں بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ اللہ نے ابتداء میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کو بیان کرنے کے بعد توحید کے دلائل ذکر کیے۔ اِن دلائل میں سے بعض کا تعلق عالمِ بالا سے اور بعض کا عالمِ زیریں سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قیامت کا مسئلہ بھی سمجھایا گیا ہے اور درمیان میں حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی حقانیت کا ذکر بھی آگیا ہے اب آج کے درس میں بھی توحید ہی کے دلائل بیان کیے گئے ہیں جن پر غور کر کے انسان مسئلہ توحید کو پہچان سکتا ہے اور اپنے ایمان کو درست کر سکتا ہے۔

شکمِ مادر میں بچے کی کیفیت

ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ اٹھاتی ہے ہر مادہ۔ مادہ سے مراد عورت بھی ہو سکتی ہے اور ہر جانور کی مادہ بھی جس کے رحم میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ سورۃ لقمان کی آخری آیت میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے" وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ" وہی جانتا ہے اکہ شکمِ مادر میں کیا ہے۔ مطلب یہ کہ پیدا ہونے والے بچے کی تفصیلات سے نہ تو بچے کی ماں واقف ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص جانتا ہے بلکہ اس کی اصل کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ موجودہ میڈیکل سائنس اس حد تک تو ترقی کر چکی ہے کہ یہ بتا سکے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی مگر یہ کوئی نہیں بتائیگا کہ پیدا

ہونے والا بچہ تام الخلقت ہوگا یا ناقص الخلقت اس کا رنگ کالا ہوگا یا گورا ــــــــــ یہ بڑا ہو کر سعادت مند ہوگا یا شقی یہ کس وقت پیدا ہوگا، اس کی عمر کتنی ہوگی، دولت مند ہوگا یا مفلس تعلیم یافتہ ہوگا یا نہیں۔ فرمایا ان تمام چیزوں کو اللہ ہی جانتا ہے جو خالق اور مالک ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

فرمایا وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ رحم مادر کے سکڑنے اور پھیلنے کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ رحم میں موجود مادے کی مقدار کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی زیادہ۔ اس کی مصلحت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے کیونکہ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ بعض اوقات رحم میں صرف ایک بچہ ہوتا ہے جب کہ بعض اوقات دو یا زیادہ بھی ہوتے ہیں، اور بعض اوقات رحم بالکل خالی ہوتا ہے۔ عام طور پر صحت مند بچے کے لیے مدت حمل نو ماہ ہوتی ہے مگر بعض اوقات بچہ چھ ماہ پر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض حمل قبل از وقت بھی گر جاتے ہیں۔ یہ بھی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بچہ رحم مادر میں مدت حمل نہیں پوری کر سکا۔ بعض اوقات مدت حمل نو ماہ سے زیادہ بھی ہو جاتی ہے۔

امام ابو حنیفہ تجربات کی بناء پر فرماتے ہیں کہ مدت حمل کے چار سال تک طویل ہونے کے شواہد بھی ملے ہیں

امام شافعی بھی زیادہ سے زیادہ مدت حمل چار سال تک بتاتے ہیں جب کہ امام مالک پانچ سال تک کے قائل ہیں۔ امام ضحاک تین یا چار سال تک شکم مادر میں رہے اور پیدائش کے وقت ان کے دانت بھی نکلے ہوئے تھے۔ بہرحال مدت حمل کے کم و بیش ہونے کی حکمت کو بھی اللہ ہی

بہتر جانتا ہے۔
رہی یہ بات کہ ایک عورت کے ہاں بیک حمل کتنے بچے پیدا ہو سکتے ہیں تو اس کی کوئی انتہا نہیں بعض فرماتے ہیں کہ بیک وقت چار بچے ہو سکتے ہیں اور بعض چھ یا زیادہ کی تعداد بھی متعین کرتے ہیں، تاہم تجربات اس سے زیادہ کے بھی ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں ہندوستان میں قاضی قدوہ گزرے ہیں۔ ان کے متعلق قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں انکشاف کرتے ہیں کہ ان کی بیوی کے ہاں ایک حمل میں سو بچے پیدا ہوئے اللہ کی قدرت وہ سارے کے سارے اپنی طبعی عمر تک زندہ رہے اور حسب معمول مختلف کام کاج کرتے رہے۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اور اس کی مصلحت کے مطابق ہوتا ہے غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ شکم مادر کی کیفیت کو اللہ ہی جانتا ہے، اور اس کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ ہے۔

عالم الغیب والشہادۃ

آگے ارشاد ہے عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وہی اللہ پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کو جاننے والا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں کیونکہ اس کا ارشاد ہے۔ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ (یونس) کائنات میں ذرے کے برابر بھی کوئی چیز تیرے رب سے غائب یا نہیں ہے۔ اس کی نظر تو چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر چیز پہ ہے۔ مگر یہاں پر غائب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کی نسبت سے غائب ہیں اور لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ بعض چیزیں ملائکہ کی نسبت سے بھی غائب ہیں اور بعض ان کے سامنے ہیں۔ بعض چیزوں کا احساس انسان کو حواس کے ذریعے ہوتا ہے اور اور بعض چیزیں۔ وراء المحسوسات ہیں یعنی وہ عقل و حواس سے باہر ہیں۔

تو بہرحال وہ تمام چیزیں جو انسانوں کی نسبت سے غائب ہیں اور جو
چیزیں سامنے ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ عالم الغیب و
الشہادۃ کا یہی معنی ہے

فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات اَلْکَبِیْرُ ہے یعنی وہ بہت
بڑی ہستی ہے۔ اس کی وسعت کو کوئی نہیں جان سکتا اور نہ کوئی
اس کے علم اور قدرت کا احاطہ کر سکتا ہے۔ خداوند تعالیٰ اَلْمُتَعَالِ
یعنی بہت بلند و برتر ہے۔ اُس کو ہر قسم کا تصرف حاصل ہے۔ وہ
ہمہ دان، ہمہ بین اور ہمہ توان ہے، وہ قدرت تامہ اور حکمت بالغہ
کا مالک ہے، لہٰذا جو چاہے سو کرے، اُس کے راستے میں کوئی
رکاوٹ نہیں۔

فرمایا سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ
جو کوئی تم میں سے پوشیدہ طور پر کوئی بات کرتا ہے یا ظاہراً کرتا ہے
اللہ تعالیٰ کے لیے سب برابر ہے۔ وہ ظاہر اور باطن سب کو جانتا ہے
وہ تو عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے جو سینوں کے رازوں سے
بھی واقف ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے وہ بھی برابر ہے وَمَنْ
هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ جو رات کے وقت چھپنے والا ہے۔
بعض لوگوں کا کاروبار رات کے وقت شروع ہوتا ہے چور اور بدکار لوگ اپنا
کام رات کے وقت انجام دیتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل
رہ سکیں۔ یہ رات کے وقت چھپنے والے لوگ ہیں وَسَارِبٌۢ
بِالنَّهَارِ اور دن کے وقت چلنے والے بھی اللہ کے ہاں برابر ہیں۔ جو
لوگ دن کے وقت کاروبار کرتے ہیں۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے
پھرتے ہیں، وہ بھی اللہ کے علم میں ہیں۔ گویا اس کی نظروں سے رات
اور دن میں کوئی بھی غائب نہیں، وہ سب کو جانتا ہے۔ انسان کسی بھی

حالت میں ہوں، اللہ کے نزدیک برابر ہیں۔ وہ ان پر نظر رکھتا ہے اور اُن کا ضرور محاسبہ کریگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور خصوصیت ہے

اللہ کا حفاظتی نظام

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ ہر شخص کے لیے آگے پیچھے آنے والے مقرر ہیں، اس کے آگے بھی اور پیچھے بھی۔ اس سے مراد اللہ کے فرشتے ہیں جو اس نے ہر آدمی کے لیے بطور نگران مقرر کر رکھے ہیں۔ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ؕ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اس شخص کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو طرح کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے۔ ایک تو ہر شخص کے اعمال کی حفاظت کا کام ہے اور اس کے لیے اللہ نے کراماً کاتبین دو فرشتے لگا رکھے ہیں۔ دائیں طرف والا نیک اعمال لکھتا ہے اور بائیں طرف والا بُرے اعمال محفوظ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ سورۃ قٓ میں موجود ہے "مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ" جو بھی کلمہ انسان کی زبان سے اچھا یا بُرا نکلتا ہے، فرشتے فوراً لکھ لیتے ہیں۔ یہ فرشتے دن اور رات کے لیے الگ ہوتے ہیں۔ دن کے فرشتے عصر کے وقت تبدیل ہو جاتے ہیں اور رات کے فرشتے صبح کی نماز کے وقت چلے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ دن کے فرشتے ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں۔ اسی لیے عصر اور فجر کی دو نمازیں بڑی اہم ہیں کہ ان اوقات میں فرشتے ہر انسان کے متعلق رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ بہر حال یہ سلسلہ انسان کے ساتھ عمر بھر قائم رہتا ہے، پھر جب وہ فوت ہو جاتا ہے، تو اس کا مکمل نامہ اعمال اس کے گلے میں لٹکا دیا جاتا ہے جو قیامت کے دن کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اسی طرح گویا ہر انسان کی پوری زندگی کا ریکارڈ محفوظ ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر عمل کو احاطہ تحریر میں لانے کے

علاوہ ان کی شکل وصورت بھی بنائی جاتی ہے۔ جب فرشتے بعض اعمال کی شکل بنانے سے عاجز آجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس عمل کو اسی طرح لکھ دو، اس کی شکل وصورت میں خود بنالوں گا۔

انسان کے اعمال کے حفاظتی فرشتوں کے علاوہ ہر انسان کے ساتھ بعض ایسے فرشتے بھی مقرر ہیں جو اسے موذی جانوروں، اجنات اور شیاطین کے شر اور ہر قسم کے حادثات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ حفاظت اس وقت تک ہوتی رہتی ہے۔ جب تک اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ پھر جب اللہ کی مشیت ہوتی ہے تو حفاظت اٹھالی جاتی ہے اور فوراً کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل حفاظتی نظام قائم کر رکھا ہے جس کے ذریعے ہر شخص کی جان اور اس کے اعمال کی حفاظت کی جاتی ہے اور یہ فریضہ آگے پیچھے یعنی یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے انجام دیتے ہیں۔

امام ابن جریرؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اور امام شاہ ولی اللہؒ نے کنانہ عدویؒ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ ہر انسان کی حفاظت کے لیے کتنے فرشتے مقرر ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ دو فرشتے تو دائیں بائیں اعمال کی نگرانی کے لیے مقرر ہیں اور دو آگے پیچھے حفاظت کے لیے ہیں۔ دو فرشتے ہر انسان کی آنکھوں پر مقرر ہیں اور دو ہونٹوں پر۔ ایک فرشتہ منہ پر مقرر ہے کہ کوئی خطرناک چیز منہ میں نہ چلی جائے اور ایک فرشتہ پیشانی پر مقرر ہے اس طرح ہر انسان کے ساتھ کل دس فرشتے بنتے ہیں۔ لیکن امام ابن جریرؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ جو فرشتے اس کے اعمال اور اس کے جسم کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں، ان کی کل تعداد تین سو ساٹھ ہے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ بہ روایت ابو یعلیٰؒ کے

حوالے سے بیان کی جاتی ہے جس کے ذریعے کا کچھ علم نہیں۔ بہر حال فرشتوں کی تعداد جو بھی ہو، اعمال کے حفاظت کنندگان تو نص قرآنی سے ثابت ہیں اور انسان کے جسم کی حفاظت کرنے والوں سے متعلق ان احادیث سے پتہ چلتا ہے۔ یہ سارا حفاظتی نظام اس لیے ہے تاکہ انسانی ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔ اور پھر جب محاسبے کی منزل آئے گی تو انسان کا ہر قول، فعل اور عمل بالکل محفوظ حالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ اور کسی قسم کا اشتباہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔

اجتماعی حالت کی تبدیلی

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں تبدیل کرتا کسی قوم کی حالت کو حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ یہاں تک کہ وہ تبدیل کریں اس چیز کو جو ان کے نفسوں میں ہے۔ یہ سنت اللہ ہے کہ جب تک کوئی قوم خود اسباب مہیا نہیں کرتی، اس کی حالت تبدیل نہیں کی جاتی۔ اگر کسی قوم کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت عطا کی ہے تو وہ اس وقت تک نہیں چھنتی جب تک قوم اپنے عمل کے ذریعے اس کے چھن جانے کے حالات پیدا نہیں کر دیتی۔ اسی طرح جب کوئی قوم تکلیف میں ہوتی ہے اور وہ اچھائی چاہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس قوم کو بہتری کی طرف نہیں لاتے جب تک قوم اپنے اعمال و کردار کے ذریعے ثابت نہیں کر دیتی کہ وہ مطلوبہ بھلائی کی اہل بن چکی ہے۔ گویا ہر قوم اور فرد کے نتائج اس کے مہیا کردہ اسباب پر مرتب ہوتے ہیں جو قوم خود تو بہتری کی کوشش نہیں کرتی۔ ایسے اقدام نہیں کرتی جو اسے ترقی کی طرف لے جائیں تو پھر خالی دعاؤں سے تو اللہ تعالیٰ ان کی مراد پوری نہیں کرتا۔ جب تک وہ خود اس کے لیے تگ و دو نہ کریں۔

مسلمانوں کی اجتماعی حالت تاتاریوں کے زمانہ سے زوال پذیر

۱

ہے اور آٹھ صدیاں گزرنے کے باوجود یہ قوم کسی ٹھکانے پر لگتی نظر نہیں آتی اس وقت مسلمانوں کا پورا نظام بگڑ چکا ہے۔ فواحش، خواہشات اور خود غرضی کا دور دورہ ہے جیسے مسلمان ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر شخص آرام طلب ہو چکا ہے۔ محنت سے جی چراتا ہے عباسیوں کو اسی آرام طلبی اور حب مال وجاہ نے تباہ کیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں انفرادی طور پر تو بڑے اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور ہمیشہ رہیں گے مگر ان کی اجتماعی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ صفین کے واقعہ تک اور پھر کچھ عرصہ بعد تک بھی مسلمان اجتماعی حیثیت سے قابل رشک تھے مگر بعد میں خود غرضی کی وجہ سے ان کی حالت کافروں سے بھی بدتر ہو گئی ہے پورے یورپ اور امریکہ میں کوئی بھکاری نظر نہیں آتا۔ مگر ہمارے ایشیائی ممالک میں ہر گلی کوچے اور بازار میں بھکاری آپ کا پیچھا کرتے ہیں۔ انگریزوں میں فحاشی اور عیاشی ضرور ہے، مگر بھکاری کوئی نہیں، کیونکہ وہ ہر بیکار آدمی کو گزارہ الاؤنس دیتے ہیں مادی ترقی کا جذبہ بھی مسلمانوں کی نسبت کافروں میں بہت زیادہ ہے جاپانی اپنے ملک کی خاطر بم لے کر چمنیوں میں کود گئے وہ لوگ محنت کے عادی ہیں۔ وقت کو ضائع نہیں کرتے جب کہ ان کے مقابلے میں مسلمان کھیل کود کے دلدادہ ہیں۔ فضول رسومات، لڑائی جھگڑا، بد اخلاقی مسلمانوں کے مشاغل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ذلت میں مبتلا اور اغیار کے دست نگر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ جب تک مسلمان خود اس حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس قبیح حالت کو تبدیل نہیں کرے گا۔

فرمایا وَإِذَآ أَرَادَ ٱللَّهُ بِقَوْمٍ سُوٓءًا اور جب اللہ تعالیٰ کسی

قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے خود قوم ایسے اسباب پیدا کر لیتی ہے تو فرمایا فَلَا مَرَدَّ لَهُ تو اس برائی کو پھر کوئی ٹال نہیں سکتا۔ پھر وہ ذلت کے گڑھے میں ہی گرتے ہیں۔ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَّالٍ پھر ان کے لیے خدا تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار اور کارساز بھی نہیں ہوتا۔ وہ لاکھ شرکیہ عقائد کو اپنائیں، غیر اللہ سے مدد مانگیں، مگر ان کی کہیں شنوائی نہیں ہو گی اور کوئی بھی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔

هُوَ الَّذِىۡ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنۡشِئُ
السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ
وَالۡمَلٰۤـئِكَةُ مِنۡ خِيۡفَتِهٖ‌ ۚ وَيُرۡسِلُ
الصَّوَاعِقَ فَيُصِيۡبُ بِهَا مَنۡ يَّشَآءُ وَهُمۡ
يُجَادِلُوۡنَ فِى اللّٰهِ‌ ۚ وَهُوَ شَدِيۡدُ الۡمِحَالِ ﴿۱۳﴾
لَهٗ دَعۡوَةُ الۡحَـقِّ‌ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ
دُوۡنِهٖ لَا يَسۡتَجِيۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَىۡءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ
كَفَّيۡهِ اِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ‌ ؕ
وَمَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

ترجمہ:- وہی اللہ تعالیٰ ہے جو دکھاتا ہے تمہیں بجلی
خوف اور طمع کے لیے اور وہ اٹھاتا ہے بادل بوجھل (۱۲)
اور تسبیح پڑھتا ہے رعد اُس کی تعریف کے ساتھ اور
فرشتے بھی اُس کے خوف سے۔ اور چھوڑتا ہے کڑک کو،
پس پہنچاتا ہے اس کے ساتھ جس کو چاہے۔ اور یہ لوگ
جھگڑا کرتے ہیں اللہ کے معاملے میں حالانکہ وہ بہت
سخت طاقت والا ہے (۱۳) اُسی کی دعوت برحق ہے
اور وہ جو لوگ پکارتے ہیں اُس کے سوا، نہیں جواب دیے

سکتے، مگر جس طرح کوئی پھیلانے والا ہو اپنے ہاتھ کو پانی کی
طرف تاکہ پہنچ جائے پانی اس کے منہ تک۔ اور نہیں ہے
وہ پہنچنے والا اُس تک۔ اور نہیں ہے پکار کافروں کی
مگر گمراہی میں (۱۴)

ربطِ آیات

یہ آیات بھی پہلی آیات کے ساتھ ہی مربوط ہیں۔ ان میں بھی اللہ تعالےٰ نے توحید کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ گذشتہ درس میں انسان کی پیدائش کے ضمن میں رحموں کا گھٹنا بڑھنا اور مدتِ حمل کے متعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا بیان تھا۔ اللہ کے ہاں ہر چیز کا اندازہ مقرر ہے جس کے مطابق وہ تمام امور کے فیصلے کرتا ہے۔ کوئی شخص کسی چیز کو چھپائے یا ظاہر کرے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ وہ رات کی تاریکی میں چھپنے والے اور دن کے وقت چلنے پھرنے والے ہر نفس سے واقف ہے۔ اُس نے انسان کی جان اور اعمال کی حفاظت کے لیے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو یکے بعد دیگرے آکر اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ پھر جب تک اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ انسان کی حفاظت ہوتی رہتی ہے۔

گذشتہ درس میں ایک دستورِ الٰہی کا ذکر بھی کیا گیا فرمایا کہ اللہ کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلنے کے لیے تگ و دو نہ کرے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب وہ کسی کو اسکی شامتِ اعمال کی وجہ سے ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور خدا کے سوا کسی کا کوئی کارساز اور مددگار نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ کا ارشاد ہے کہ گرفت آئیگی جس میں سارے کے سارے مبتلا ہوں گے، اَنُهْلِكُ فِيْنَا صٰلِحُوْنَ تو کیا ہم ہلاک کر دیے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان نیک لوگ بھی موجود ہوں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا جب بُرائی زیادہ ہو جائیگی تو نیک و بد سب ہلاکت کا شکار ہوں گے

حضور نے یہ بھی فرمایا اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَا یَاْخُذُوْا یَدَیْہِ جب لوگ دیکھ رہے ہوں کہ ظالم ظلم کر رہا ہے اور پھر اُس کے ہاتھ پکڑ کر ظلم کو نہ روکیں، تو قریب ہے کہ اللہ ان سب کو سزا میں مبتلا کر دے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایسے لوگ دعائیں کریں گے مگر وہ مستجاب نہیں ہوں گی۔ گویا عام برائی کے دور میں نیک و بد سب کے سب گرفتارِ بلا ہوں گے، یہ الگ بات ہے کہ نیک لوگوں کو آخرت میں اُن کی نیت کے مطابق نجات حاصل ہو جائے گی۔

خوف اور امید کا اتصال

اب آج کے درس میں بھی دلائل توحید ہی کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ھُوَالَّذِیْ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خدا کی ذات وہ ہے جو تم کو برق یعنی بجلی دکھلاتا ہے۔ برق کا معنی چمکنا ہوتا ہے اور اسے بجلی پر محمول کیا جاتا ہے کیونکہ وہ چمکتی ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں بجلی دکھاتا ہے خَوْفًا وَّطَمَعًا خوف اور امید دلانے کے لیے۔ جب بادل گرجتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو اس سے نقصان کا خوف بھی آتا ہے، اور اس سے خوشحالی کی امید بھی ہوتی ہے کہ بارش برسے گی، سبزیاں اناج اور پھل پیدا ہوں گے۔ جن سے انسان اور جانور مستفید ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ ایمان کا صحیح مقام خوف اور امید کے درمیان ہی ہے۔ انسان نہ تو اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو جائے اور نہ ہی اس کی رحمت سے مایوس ہو، ان دونوں کے اتصال میں ہی کامیابی ہے۔

گرج اور چمک

فرمایا وہی اللہ ہے جو تمہیں خوف اور طمع کے لیے بجلی دکھاتا ہے وَیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ اور اٹھاتا ہے بادل جو بڑے بوجھل ہوتے ہیں۔ یہ بادل پانی سے بھرپور ہوتے ہیں اور ہوائیں انہیں اُس طرف

لے جاتی ہیں جہاں بارش برسانا مقصود ہوتا ہے۔ بارش کی کمی یا زیادتی، مفید یا مضر اللہ تعالیٰ کے ارادے، مشیت اور تصرف کے ساتھ ہوتی ہے۔ گویا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل ہیں۔ نیز فرمایا وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ اور رعد فرشتہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے اس کی تعریف کے ساتھ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ اور دوسرے فرشتے بھی خدا تعالیٰ کے خوف سے اس کی تسبیح اور حمد بیان کرتے ہیں۔ رعد لغوی طور پر گرج کو بھی کہا جاتا ہے مگر اس مقام پر حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلرَّعْدُ مَلَكٌ مُّوَكَّلٌ رعد ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ بادلوں کو ہانکتا ہے۔ کوڑا مارنے سے چمک پیدا ہوتی ہے اور پھر بادلوں کے آپس میں ٹکرانے سے بڑی خوفناک گرج پیدا ہوتی ہے سائنسدان بھی یہی کہتے ہیں کہ بادلوں میں مثبت (POSITIVE) پازیٹو۔ اور منفی (NEGATIVE) نیگیٹیو، عناصر ہوتے ہیں جن کے ٹکرانے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

جب بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں تو اس موقع کے لیے حضور علیہ السلام نے یہ دعا بھی سکھلائی ہے[1]۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ سُبْحٰنَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ اے اللہ! اپنے غضب سے ہمیں قتل نہ کر اور اپنے عذاب سے ہمیں ہلاک نہ کر اور اس سے پہلے ہمیں عافیت عطا فرما۔ پاک ہے وہ ذات کہ رعد اس کی تسبیح بیان کرتا ہے اس کی تعریف کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔

فرمایا اللہ کی ذات وہ ہے وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ جو

---

[1] ابن کثیر ص۵۰۵ ج۲ و ترمذی ص۴۹۸ و ادب المفرد للبخاری ص۱۰۵ و عمل الیوم واللیلۃ ص۱۲۱۔

کرکڑک کو بھیجتا ہے۔ جب کسی کو نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا ہے تو اس پر بجلی بھیجی جاتی ہے جو اللہ کی منشاء کے مطابق تھوڑا یا زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ بعض اوقات یہ بجلی پہاڑوں، درختوں یا جانوروں پر گرتی ہے تو اس کے حسب حال نقصان ہوتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ بعض اوقات بجلی اس طرح پڑتی ہے کہ آدمی کے کپڑے اتار کر درخت کی شاخ پر رکھ دیتی ہے اور اس آدمی کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

خدائی طاقت

بجلی تو بڑی طاقت والی چیز ہے اور ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی ہے اگر کوئی چیز اس کی زد میں آنے کے بعد بھی بچ جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کسی طاقت کے مشیت، ارادے اور حکم سے ہوتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ جہاں کسی کو ہلاک کرنا ہوتا ہے بجلی ہلاک کر دیتی ہے۔ اور بچانا مقصود ہو تو بال بیکا نہیں ہوتا۔ فرمایا فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ پس پہنچاتا ہے اسکے ساتھ جس کو چاہتا ہے۔ نقصان اسی کا ہوتا ہے جس کے متعلق اللہ چاہتا ہے۔ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ اور وہ لوگ اللہ کے معاملے میں جھگڑا کرتے ہیں اطرح طرح کی بیہودہ باتیں کرتے ہیں۔ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ حالانکہ وہ بڑی سخت قوت والا ہے لفظ محال کے کئی معنی آتے ہیں مثلاً عذاب دینا، گرفت کرنا اور قوت۔ یہاں پر قوت اور طاقت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا ہے، اس کے سامنے تمام طاقتیں ہیچ ہیں۔ یہ لفظ م کی زبر کے ساتھ مَحال بھی آتا ہے، جس کا معنی ناممکن ہے۔ اگر یہ میم کی پیش کے ساتھ مُحال ہو تو معنی ہوگا باطل، جھوٹ یا خلاف واقعہ۔ تاہم اس مقام پر محال ہے جس سے قوت اور طاقت مراد ہے

بجلیاں، گرج اور چمک اللہ تعالیٰ کی طاقت کے مظاہر ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قیامِ مدینہ کے دوران قبیلہ عامر کے دو بڑے آدمی عامر ابن طفیل اور اربد ابن ربیعہ حضور علیہ السلام کے قتل کے ارادۂ بد سے آئے۔ عامر نے اربد سے کہا کہ تم میرے ساتھ رہنا، میں محمد سے بات چیت کروں گا، جب میں اُن کو اس بات چیت میں الجھا دوں تو تم اُن پر تلوار سے حملہ کر دینا۔ چنانچہ دونوں ساتھی حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔ عامر حضور علیہ السلام سے مخاطب ہوا کہ اے محمد! اگر میں آپ کا اتباع کر لوں تو آپ میرے لیے کیا حصہ رکھیں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم ایمان لے آؤ، تو تمہیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں اور تم پر بھی وہی ذمہ داریاں عاید ہوں گی۔ جو دوسرے مسلمانوں پر عاید ہوتی ہیں۔ عامر کہنے لگا۔ کیا ایسا نہ کریں کہ دیہات میں میری حکومت ہو اور شہروں پر آپ حکومت کریں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے نیابت اور حکومت عطا کرتا ہے پھر عامر کہنے لگا کہ میں آپ سے کچھ اور ضروری بات کرنا چاہتا ہوں آپ ذرا اٹھ کر اِدھر آئیں۔ حضور اٹھ کر ایک طرف آ گئے۔ عامر کا دوسرا ساتھی اربد موقع کی تلاش میں تھا اس نے میان سے تلوار نکالنا چاہی۔ مگر اس کا ہاتھ وہیں جام ہو کر رہ گیا اور وہ تلوار نکال ہی نہ سکا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (المائدہ) اللہ تعالیٰ ہی آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ پھر یہ دونوں ساتھی واپس جا رہے تھے کہ اربد پر بغیر بادل کے بجلی گری اور وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔ عامر کو راستہ چلتے طاعون کی گلٹی نکلی۔ راستے میں قبیلہ سلول کی عورت کا خیمہ تھا، وہاں پناہ حاصل کی

اپنی جہالت کی بنا پر گلٹی کو ٹٹول کر کہا غدة غدة البعیر یہ تو اونٹ کی گلٹی جیسی گلٹی ہے اور میں سلولیہ کے خیمے میں مر رہا ہوں، مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور تلوار سونت لی۔ گھوڑے کو دوڑانا شروع کیا اور ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام اور ملک الموت کو گالیاں دینے لگا۔ ملک الموت کو کہتا ہے کہ اگر میرے سامنے آجاؤ تو فوراً تمہارا کام کر دوں۔ پھر وہ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے ہی ہلاک ہو گیا۔ بہر حال یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت بہت شدید ہے۔ لوگ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اس کی طاقت کو تسلیم نہیں کرتے جس کی وجہ سے کفر اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر ہلاک ہوتے ہیں لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی صفات کو تسلیم کریں، اسی کی عبادت کریں اور اُسی کو کارساز اور متصرف سمجھیں۔

ارشاد ہوتا ہے لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ اس کی دعوت برحق ہے دعوتِ حق سے مراد وہ دعوت ہے جو ایمان اور توحید کی طرف دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے یہ دعوت حضور علیہ السلام نے اہل مکہ کو دی اور فرمایا قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لوگو! کہو: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اگر تم نے یہ بات تسلیم کر لی تُفْلِحُوْا تو فلاح پا جاؤ گے۔ صرف اللہ کی عبادت ہی حق کی دعوت ہے اور اس کے برخلاف اغیار کی عبادت سراسر باطل، کفر، شرک، تباہی اور بربادی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اپنی تمام حوائج و ضروریات میں اُسی ایک اللہ کو پکارنا برحق ہے کیونکہ اس کے سوا نہ کوئی مشکل کشا ہے اور نہ حاجت روا نہ کسی کے ہاتھ میں شفا ہے اور نہ موت و حیات، ترقی و تنزل، خیر اور شر سب اُسی کے ہاتھ میں ہے، لہذا پکارنا بھی صرف اسی کو روا ہے فرمایا وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ جو لوگ اُس کے

علاوہ دوسروں کو پکارتے ہیں اغیار کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہیں
فرمایا لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُم بِشَيْءٍ وہ پکارنے والوں کو
کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اللہ کے سوا مافوق الاسباب کوئی کسی
کے کام نہیں آسکتا، نہ کسی کی کوئی مشکل حل کر سکتا ہے۔ جس طرح
پکارنے والا مخلوق ہے۔ اسی طرح جنات، فرشتے، پیغمبر، اولیاء
سب مخلوق ہیں۔ قادرِ مطلق، علیم کل اور مختارِ کل صرف اللہ کی ذات
ہے۔ وہی پکارنے کے لائق ذات ہے اس کے علاوہ دوسروں
کو پکارنے والے کی مثال ایسی ہے اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى
الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ جیسے کوئی شخص اپنے ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے
تاکہ وہ اس کے منہ میں چلا جائے وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ مگر وہ اس
تک پہنچنے والا نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص لاکھ آوازیں دے
پانی کی طرف ہاتھ بھی بڑھائے اور چاہے کہ پانی خود بخود اس کے منہ
میں چلا جائے، فرمایا ایسا نہیں ہوگا جس طرح یہ ناممکن ہے اسی طرح
غیر اللہ کو پکارنا بھی بے سود ہے۔ اس کی حاجت کبھی پوری نہیں ہوگی
بعض فرماتے ہیں کہ پانی کی طرف ہاتھ بڑھانے کا مطلب یہ
ہے کہ آدمی پانی کو مٹھی میں پکڑنے کی کوشش کرے۔ جس طرح
پانی مٹھی میں بند نہیں ہوسکتا اسی طرح غیر اللہ سے حاجت روائی کا
منتظر رہنا امر محال ہے۔ تاہم پہلا معنیٰ زیادہ راجح ہے۔ بہر حال
حاجت روائی اور مشکل کشائی صرف ذات خداوندی سے ممکن ہے
جو اس کی مستحق اور متصرف ہے۔ فرمایا وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِيْنَ
اِلَّا فِي ضَلٰلٍ اور کافروں کی پکار گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے
مطلب یہ کہ غیر اللہ کو مافوق الاسباب پکارنا بڑی گمراہی ہے۔ جن کو

کچھ اختیار ہی نہیں، اُن کو پکارنا حماقت محض ہے۔ قرآن کریم میں
اس مضمون کو مختلف انداز سے بالوضاحت بیان کیا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩ ⑮ السجدة
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ
قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ
لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ
وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ
فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑯

ترجمہ :- اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سجدہ ریز ہوتا ہے
جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے ، خوشی سے
یا ناخوشی سے ، اور ان کے سائے بھی صبح اور پچھلے پہر ⑮
(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے ، کون ہے جو رب ہے آسمانوں
کا اور زمین کا ۔ آپ کہہ دیجئے ، وہ اللہ ہی ہے ۔ آپ کہہ
دیجئے (ان سے) کیا تم نے بنایا ہے ۔ اس کے سوا دوسروں
کو کارساز ، جو نہیں مالک اپنے نفسوں کے لیے نفع کے اور
نہ نقصان کے ۔ آپ کہہ دیجئے ، کیا برابر ہے اندھا اور دیکھنے

والا ۔ یا کیا برابر ہیں اندھیرے اور روشنی ۔ کیا ٹھہرائے ہیں
ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے شریک ۔ کہ انہوں نے
پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق کی طرح پس
مشابہ ہو گئی ہے ان پر مخلوق ۔ آپ کہہ دیجئے ، اللہ ہی ہے
پیدا کرنے والا ہر ایک چیز کا ، اور وہ اکیلا ہے اور سب
کو دبا کر رکھنے والا ہے ۔ (۱۶)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے شرک اور مشرک کی تردید اور توحید کے دلائل بیان کئے تھے ۔ آج کی آیات بھی سابقہ مضمون کے تسلسل میں ہی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں قرآن کی حقانیت و صداقت ، نبوت و رسالت اور قیامت کا ذکر ہی زیادہ تر فرمایا ہے ۔ توحید کے علوی اور سفلی دلائل بیان کیے ہیں توحید کے بیان میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا پکارنا ہی برحق ہے ۔ جو لوگ دوسروں کو بھی پکارتے ہیں ، وہ اُن کا کوئی جواب نہیں دے سکتے ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص دریا یا کنویں پر کھڑا ہو کر پکارے کہ پانی اس کے منہ میں خود بخود چلا جائے یا وہ پانی کو اپنی مٹھی میں بند کرنا چاہے ، فرمایا جس طرح یہ دونوں چیزیں ممکن نہیں ، اسی طرح غیر اللہ کو مافوق الاسباب پکارنا بھی بے سود ہے ۔ وہ اُن کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے ۔

ہر چیز سجدہ کرتی ہے

سورۃ حج اور بعض دیگر سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ انسانوں میں دو گروہ پائے جاتے ہیں ۔ ایک وہ جو اپنے اختیار اور ارادے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اُس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں ۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے اختیار اور ارادے سے توحید الٰہی کو نہیں مانتے اور ان پر عذاب الٰہی ثابت ہو چکا ہے ۔ اب اِن آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسانوں کے علاوہ باقی تمام چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے

سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ـــــ اور اللہ ہی کے لیے سجدہ ریز ہوتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ آسمانی مخلوق اللہ کے فرشتے ہیں اور فضا میں دوسری چیزیں بھی ہیں۔ اسی طرح زمین پر مختلف قسم کی چیزیں ہیں جن میں انسان، جانور، درخت، پہاڑ وغیرہ ہیں، یہ سب اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں طَوْعًا وَّكَرْهًا خوشی سے یا ناخوشی سے۔ خوشی سے مراد یہ ہے کہ اپنے اختیار اور ارادے سے سجدہ کرتے ہیں جو ایماندار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچان کر بخوشی اسکے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور جو نافرمان مشرک اور کافر ہیں وہ اپنی خوشی سے نہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے ہیں اور نہ اسکے سامنے سجدہ کرتے ہیں ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے تکوینی اصول کے مطابق سجدہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ خود نہیں جھکتے تو ان کا سایہ تو بہر حال صبح و شام اپنے خالق کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ یہ ناخوشی کا سجدہ ہے۔ اسی طرح انسان موت کے قانون میں بھی جکڑا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ اس پر ناخوش ہے مگر موت ہر صورت میں آکر رہے گی۔ تو فرمایا اللہ کے لیے ہر چیز سجدہ ریز ہوتی ہے خوشی سے یا مجبوری سے۔

سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور نیازمندی کا نام ہے اور یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت ابن آدم خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے، تو شیطان الگ ہو کر واویلا کرتا ہے سر پر مٹی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ ابن آدم کو سجدے کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کیا فَلَهُ الْجَنَّةُ پس اس کے بدلے میں اسے جنت ملے گی مگر افسوس ہے میری حالت پر کہ مجھے سجدے کا حکم دیا گیا، تو میں نے سجدہ نہ کیا فَلِيَ النَّارُ پس میرے لیے دوزخ ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ شیطان کا واویلا کرنا بربنائے حسد ہے، وگرنہ وہ اس طرح نادم نہیں

ہونا جس طرح کوئی شخص اپنی غلطی کا اعتراف کرکے تائب ہو جاتا ہے۔
بہر حال انسان کے لیے وہی سجدہ کارگر ہوگا جو اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے کیا ہوگا۔ اور جو کوئی مجبوراً سجدہ ریز ہوگا۔ جیسے سایہ کا سجدہ یا اللہ کے تکوینی اصولوں کے مطابق غیر ارادی سجدہ ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

فرمایا وَظِلٰلُهُم بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ اور ان کے سائے بھی سجدہ ریز ہوتے ہیں صبح بھی اور پچھلے پہر کو بھی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اگر انسان اللہ کو سجدہ نہ بھی کرے اور اکڑ جائے تو اس کا سایہ تو بہر حال زمین پر ہی سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اس مضمون کو سورۂ نحل میں بھی بیان کیا گیا ہے۔
"اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ" کیا ان لوگوں نے مخلوقِ خدا میں ایسی چیزیں نہیں دیکھیں۔ جن کے سائے دائیں اور بائیں سے لوٹتے رہتے ہیں اور خدا کے آگے عاجز ہو کر سجدے میں پڑے رہتے ہیں۔ اگلی آیت میں یہ بھی فرمایا کہ تمام جاندار جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب خدا کے آگے سجدہ کرتے ہیں، اور فرشتے بھی، اور وہ ذرا غرور نہیں کرتے۔

یہاں پر صبح کے وقت کو مفرد استعمال کیا گیا ہے اور پچھلے پہر کو جمع اگلی آیت میں بھی نور کو واحد اور ظلمت کو جمع کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے گویا صبح کو روشنی سے اور پچھلے پہر کو اندھیرے سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ روشنی ایک ہی ہے اور اندھیرے بہت سے ہیں۔ نورِ ایمان ایک روشنی ہے جب کہ اندھیرے مختلف ہیں جیسے روحانی اندھیرے اور مادی اندھیرے۔ اندھیرا کفر کا بھی ہوتا ہے۔ اور شرک کا بھی۔ نفاق کا اندھیرا بھی ہے اور ریاکاری کا بھی۔ اندھیرا قبر کا بھی ہوگا اور پلصراط کا بھی اور پھر انسان کے دل و دماغ میں بھی اندھیرے ہوتے

ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَلظُّلْمُ ظُلُمٰتٌ یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ قیامت والے دن اندھیرا کئی قسم کی شکلوں میں نظر آئے گا۔

سجدہ تلاوت

قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ ان مقامات میں سے ہے جن کو پڑھنے سے سجدہ لازم آتا ہے۔ اسے سجدہ تلاوت کہتے ہیں اور یہ قرآن کریم کے چودہ مقامات پر آتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سجدہ واجب ہے جب کہ امام مالکؒ کے نزدیک گیارہ سجدے واجب ہیں جب کہ باقی تین غیر مؤکدہ ہیں۔ البتہ باقی ائمہ اور محدثین سجدہ تلاوت کو سنت کا درجہ دیتے ہیں، واجب نہیں سمجھتے۔ آیت سجدہ کو پڑھنے اور سننے والے سب پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ ان آیات میں یا تو سجدہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے یا سجدے کا حکم دیا گیا ہے اور یا سجدہ نہ کرنے والوں کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کا مسلک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ ہر سجدہ واجب ہے۔

جس وقت آیت سجدہ تلاوت کی جائے تو وہ پڑھنے والا ہے یا سننے والا اگر سجدہ کی شرائط پوری کرتا ہے تو فوراً سجدہ کرلے اور اگر اس کے لیے تیار نہیں تو بعد میں جب بھی موقع ملے، سجدہ کرلے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک مجلس میں سورۃ نجم کی آخری آیت تلاوت فرمائی اور اسی مجلس میں سجدہ کیا۔ آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں نے بھی سجدہ ادا کیا۔ اس کے علاوہ کچھ کافر اور مشرک بھی مجلس میں موجود تھے وہ بھی سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے، صرف ایک بوڑھا کافر ایسا تھا جس نے سجدہ تو نہ کیا، البتہ تھوڑی سی مٹی لے کر اپنی پیشانی پر لگالی۔ یہ شخص ابی ابن خلف یا امیہ ابن خلف تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو بدر کی جنگ میں بحالت کفر مرتے ہوئے دیکھا[1]۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یہ نکتہ اٹھایا ہے[2] کہ حضور علیہ السلام نے

[1] بخاری ص۱۳۲ ج ۱ ، [2] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۴ ج ۲

تو حکم الٰہی کے مطابق سجدہ کیا اور مسلمانوں نے آپ کے اتباع میں ایسا کیا، مگر مشرکوں نے کیسے سجدہ کر دیا؟۔ اس کے جواب میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضور علیہ السلام تلاوت فرما رہے تھے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی قہری تجلی نازل ہو رہی تھی جس کی وجہ سے کافر اور مشرک بھی سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مسائل سجدہ تلاوت

سجدہ تلاوت کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو نماز کے سجدہ کے کے لیے ہیں یعنی انسان باطہارت ہو، اس کے کپڑے اور جسم پاک ہو اور وہ قبلہ رو ہو کر سجدہ کرے۔ اس سجدے کی دو تکبیریں ہوتی ہیں۔ اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدہ میں جائے، تسبیح پڑھے اور پھر اللہ اکبر کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہو۔ اس میں رفع یدین کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کوئی آدمی کسی ایک مجلس میں متعدد بار بھی آیت سجدہ پڑھے گا۔ یا سنے گا تو سجدہ ایک ہی واجب ہو گا البتہ اگر مقام تبدیل ہو جائے تو ہر مقام پر پڑھنے یا سننے پر ایک سجدہ لازم آئے گا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا نماز کی طرح سجدہ تلاوت کے لیے بھی باوضو ہونا ضروری ہے مگر مولانا مودودی کا یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ سجدہ تلاوت بغیر وضوء کے بھی ہو سکتا ہے

ایک ضروری مسئلہ یہ بھی ہے کہ سجدہ تلاوت صرف اس وقت لازم آئے گا۔ جب قرآن پاک کے اصل الفاظ پڑھے یا سنے گا۔ اگر کوئی شخص آیت سجدہ کا محض ترجمہ پڑھے یا سنے گا تو اس پر سجدہ واجب نہیں ہو گا۔ سورۃ مزمل میں " فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ " سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن کو اس کے الفاظ میں پڑھنا ضروری ہے اسی لیے نماز میں بھی اصل قرآن پڑھنا ضروری ہے۔ کسی دوسری زبان میں محض ترجمہ پڑھنے سے نماز ادا نہیں ہو گی۔ البتہ بعض مفتیان کرام فرماتے ہیں کہ سجدہ تلاوت کے لیے مجلس میں موجود آدمی کا آیت سجدہ

پڑھنا ضروری ہے۔ اگر کسی نے گراموفون، ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو یا ٹیلیویژن پر سجدہ کی آیت سنی ہے تو اس پر سجدہ نہیں آئے گا مگر صحیح بات یہی ہے کہ اگر الفاظ قرآن کسی انسان نے پڑھے ہیں اور وہی سننے میں بھی آئے تو ذریعہ سماعت کوئی بھی ہو، اس پر سجدہ کر لینا ہی بہتر ہے۔

آسمان و زمین کا رب

ارشاد ہوتا ہے قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ کون ہے رب آسمان کا اور زمین کا۔ رب کا معنی پرورش کرنے والا ہے۔ عربی میں اس کو کہتے ہیں تَرْبِیَۃُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا یعنی کسی چیز کو بتدریج حدِ کمال تک پہنچایا۔ انسان حیوان یا پودا کوئی بھی ہو اُسے حدِ کمال تک پہنچنے کے لیے ایک زمانہ صرف ہوتا ہے۔ اور یہ کام آہستہ آہستہ کون کرتا ہے۔

فرمایا قُلِ اللّٰہُ اے پیغمبر! آپ اس کا جواب یہ دیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کی تربیت کر کے اُسے حدِ کمال تک پہنچاتا ہے۔ اور اگر حقیقت یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں تو قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖۤ اَوْلِیَآءَ آپ کہہ دیجئے، کیا تم نے اُس کے سوا دوسروں کو کارساز بنا لیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جب پرورش کرنے والا اور حدِ کمال تک پہنچانے والا فقط اللہ ہے تو تم مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لیے دوسروں کے آگے دستِ سوال کیوں دراز کرتے ہو؟ آگے خلق کی دلیل بھی آ رہی ہے۔ کہ اللہ کے سوا خالق بھی کوئی نہیں اور کارساز بھی کوئی نہیں تو پھر اس کے سوا معبود بھی کوئی نہیں۔ مافوق الاسباب اُسی کو پکارو اور اُسی سے حاجت روائی کے لیے درخواست کرو۔ یہ شرک کی تردید ہو رہی ہے فرمایا اگر تم اللہ کے سوا دوسروں کو پکارو گے، ان کی حد درجہ تعظیم کرو گے، ان کے نام کی نذر و نیاز دو گے تو یاد رکھو کہ وہ تمہاری حاجت براری

کیا کہیں گے لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ وہ تو اپنی جان کے نفع ونقصان کے مالک بھی نہیں ہیں۔ یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے جیسے قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا" (الجن) آپ کہہ دیں کہ میں تمہارے کسی نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ اللہ نے سورۃ یونس میں اپنے نبی علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا ہے" قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ" آپ کہہ دیں کہ میں تو اپنی جان کے لیے بھی کسی نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے۔ النافع اور الضّار اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور وہی اس کا مالک ہے اس کے سوا کسی کے نفع نقصان پر کوئی قادر نہیں۔

مشرک اور موحد کا تقابل

ارشاد ہوتا ہے قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کیا برابر ہے اندھا اور دیکھنے والا؟ اَمْ ھَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ یا کیا برابر ہیں اندھیرے اور روشنی۔ کوئی عقلمند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بینا اور نابینا برابر ہیں یا روشنی اور اندھیرا برابر ہیں۔ یہ دراصل مشرک اور موحد کی مثال ہے۔ مشرک دل کا اندھا ہے جسے توحید کی روشنی نظر نہیں آتی اور وہ شرک کی نجاست میں ہی پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ" (التوبہ) بیشک مشرک ناپاک ہیں۔ سورۃ حج میں ہے" فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" بت پرستی کی گندگی اور نجاست سے بچو۔ قلبی طہارت تو نور ایمان سے حاصل ہوتی ہے اور دین کی سمجھ آتی ہے اور مستقبل کے بارے میں بھی عقیدہ پاک ہو جاتا ہے۔ تو فرمایا نہ تو اندھا اور بینا برابر ہیں اور نہ ہی اندھیرے اور روشنی۔ لہٰذا مشرک اور موحد کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ مشرک کی بخشش

کا کوئی چانس نہیں جبکہ موحد اللہ کی ابدی رحمت میں ہوگا۔

شرک کی تردید

آگے اللہ نے شرک کی تردید ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔
اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ کیا انہوں نے اللہ کے لیے شریک ٹھہرا لیے ہیں خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ اور ان شرکاء نے بھی اسی طرح مخلوق پیدا کی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ اور اس پیدائش کا ان پر شبہ پڑ گیا۔ یعنی پتہ ہی نہیں چلتا کہ خدا کی مخلوق کون سی ہے اور شرکاء کی کون سی ہے۔ فرمایا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان شرکاء نے کسی مخلوق کو پیدا نہیں کیا۔ بلکہ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ آپ کہہ دیں کہ ہر چیز کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے اور باقی سب مخلوق ہے۔ مخلوق میں نہ تو ربوبیت کا کرشمہ مانا جا سکتا ہے اور نہ وہ کارساز بن سکتی ہے۔ مشرکین کا دوسروں کو کارساز بنانا تو خلاف واقعہ اور صریح شرک ہے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ موجود ہے "اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ" (فاطر) مجھے دکھاؤ تو سہی تمہارے شرکاء نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے، کوئی انسان، جانور، پہاڑ، درخت، اناج کیڑے مکوڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور ان میں کسی شریک کا کوئی حصہ نہیں۔

بعض مشرکین ایک کے بجائے کئی خدا تسلیم کرتے ہیں مثلاً ہندوؤں کے نزدیک پیدا کرنے والا برہما جی مہاراج ہے، جب کہ قائم کرنیوالا وشنو جی مہاراج اور فنا کرنے والا شیو جی مہاراج ہے۔ اُدھر عیسائیوں نے بھی باپ، بیٹا اور روح القدس تین خدا تسلیم کر لیے ہیں۔ مجوسیوں نے اہرمن اور یزدان دو خداؤں کو مانا مگر اللہ نے فرمایا کہ خدا نہ دو ہیں نہ تین اور نہ زیادہ بلکہ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ وہ اکیلا

ہے اور ہر چیز کو دبا کر رکھنے والا ہے۔ "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" یعنی زندہ اور تھامنے والا بھی وہی ہے "یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ" یعنی زندہ کرنیوالا اور مارنے والا بھی وہی ہے "اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" تمام پیدائش بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اُسی کا چلتا ہے۔ اور جو خالق ہے الٰہ بھی وہی ہے۔ وہ قادرِ مطلق اور علیمِ کل ہے، وہ ہمہ بین، ہمہ دان اور ہمہ توان ہے، حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ جو کوئی یہ صفات غیر اللہ میں مانے گا وہ مشرک ٹھہرے گا۔ غرضیکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی جڑ کاٹ دی ہے۔

فرمایا وہ اکیلا بھی ہے اور قہار بھی ہے۔ اُس کی یگانگت میں اس کا کوئی شریک نہیں، اُس کا وجود ذاتی ہے اور کسی کا عطا کردہ نہیں جب باقی تمام اشیاء اُس کی عطا کردہ ہیں۔ جب ہر چیز اُسی کی عطا کردہ ہے تو ہر چیز پر کنٹرول بھی اُسی کا ہے "هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ" (الانعام) قہر کا معنیٰ ہوتا ہے کسی چیز کو دبا کر رکھنا۔ اُس کے دباؤ سے کوئی چیز باہر نہیں۔ وہ مہلت بھی دیتا ہے مگر جب چاہتا ہے رسی کھینچ لیتا ہے۔ اس کے تسلط سے کوئی چیز باہر نہیں۔ لہٰذا انسانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کریں اور اسی کے سامنے سجدہ ریز ہوں، اُسی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھیں اور اپنی حاجات میں اُسی کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا
فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ
عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَٰعٍ زَبَدٌ
مِّثْلُهُۥ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَٰطِلَ ۚ
فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ
النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ
يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا
لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۗ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا
لَهُۥ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُۥ
مَعَهُۥ لَافْتَدَوْا بِهِۦٓ ۚ أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ سُوٓءُ الْحِسَابِ
وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾ ع

وقف النبی علیہ السلام

النصف ۲ ع ۷

ترجمہ:۔ اتارا اُس نے آسمان کی طرف سے پانی۔ پس
بہہ پڑیں وادیاں اپنے اندازے کے مطابق۔ پس اٹھایا
سیلاب نے جھاگ پھولا ہوا اور اس میں سے جس کو وہ گرم کرتے
ہیں آگ میں واسطے تلاش کرنے زیور کے یا سامان کے جس
کے اُوپر بھی جھاگ ہوتا اسی طرح۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ
بیان کرتا ہے حق اور باطل کو۔ بہرحال وہ جھاگ پس

وہ چلا جاتا ہے خشک ہو کر ۔ اور جو چیز فائدہ پہنچاتی ہے
لوگوں کو وہ ٹھہر جاتی ہے زمین میں ۔ اسی طریقے سے اللہ
بیان کرتا ہے مثالیں (۱۷) اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے
قبول کیا اپنے رب کی بات کو ، اُن کے لیے بھلائی ہے ۔
اور وہ لوگ جو نہیں قبول کرتے اس کو ، اگر اُن کے لیے ہو
جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اس جیسا اور بھی
اس کے ساتھ اور (پھر وہ فدیہ دیں اس کے ساتھ) پھر بھی
قبول نہ کیا جائے گا ۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ہے بُرا حساب
اور ٹھکانا اُن کا جہنم ہے ، اور بہت بُرا ٹھکانا ہے (۱۸)

آیات

اس سُورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت بیان کرنے کے بعد معاد کا ذکر فرمایا ۔ پھر رسالت کا بیان ہوا ۔ اللہ نے توحید کا مسئلہ سمجھایا اور شرک کا ردّ فرمایا ۔ توحید کے عقلی اور نقلی دلائل بیان کیے اور شرک کی مختلف صورتوں کو واضح کیا ۔ اللہ تعالیٰ نے ربوبیت اور خالقیت کی دلیل پیش کر کے الوہیت کا استدلال پیش کیا کہ الٰہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو رب اور خالق ہے ۔ چونکہ یہ صفات اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی میں نہیں پائی جاتیں لہٰذا مستحقِ عبادت بھی صرف اللہ ہی ہے ۔ پھر اللہ نے مشرکوں اور مومنوں کی مثال اندھے اور بینا کی بیان فرمائی ۔ شرک کو ظلمات سے تعبیر کیا اور ایمان اور توحید کو نور فرمایا اور یہ بھی کہ یہ دونوں چیزیں برابر نہیں ہو سکتیں ۔ چونکہ مکی سورتوں میں زیادہ تر عقائد ہی کا بیان ہے ، لہٰذا اس سورۃ میں بھی توحید کا مسئلہ اللہ نے پورے طریقے سے واضح کر دیا ہے ۔

اور
لے

اب آج کے درس میں اِس سورۃ کا مرکزی مضمون حق و باطل کی کشمکش بیان ہو رہا ہے ۔ اللہ نے یہ مسئلہ ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے کہ باطل کسی چیز پہ آنے والی جھاگ کی مانند ہے جو وقتی طور پہ تو بہت ابھری ہوئی نظر آتی ہے ۔ مگر

جلد ہی مٹ جاتی ہے۔ اور حق کو اُس اصل چیز سے تشبیہ دی ہے جو جھاگ سے نیچے ہوتی ہے اور جس سے لوگ مستفید ہوتے ہیں ارشاد ہوتا ہے اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا۔ آسمان سے نہیں بلکہ آسمان کی طرف سے کہنا زیادہ مناسب ہے۔ بارش برسنے کی ظاہری وجوہات تو یہ ہیں کہ سورج کی گرمی سے سمندروں کی سطح سے پانی بخارات بن کر بادلوں کی صورت میں اٹھتا ہے۔ پھر ہوائیں اُن بادلوں کو اُس خطے کی طرف اڑا لے جاتی ہیں جہاں بارش برسانا مقصود ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ بارش کا ذریعہ صرف بادل ہی نہیں بلکہ اس کے لیے عالم بالا کا حکم بھی ضروری ہے اسی لیے یہاں پر مِنَ السَّمَآءِ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے آسمان و زمین کی درمیانی فضا بھی مراد ہے۔ اور عالم بالا کا حکم الٰہی بھی اس میں شامل ہے۔ اسی لیے فرمایا وہ آسمان کی طرف سے پانی اتارتا ہے۔

فرمایا جب بارش ہوتی ہے فَسَالَتۡ اَوۡدِیَۃٌ تو وادیاں بہ نکلتی ہیں۔ اودیہ وادی کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب پہاڑوں پر یا سطح مرتفع پر بارش ہوتی ہے تو اُس کا پانی ندی نالوں کی صورت میں بہ کر وادیوں میں پہنچ جاتا ہے بِقَدَرِهَا اُن کے اندازے کے مطابق۔ جس قدر ندی نالہ بڑا ہوگا اُسی قدر پانی بھی اس کے ذریعے زیادہ آئے گا۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ندی نالوں کا پانی پاک ہوتا ہے ایسے پانی کی رنگت خواہ تبدیل ہو چکی ہو مگر یہ غسل اور کپڑے دھونے کے لیے بالکل درست ہوتا ہے۔ اس پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے پرانے زمانے میں پانی کے ذرائع ندی نالے یا کنوئیں تھے مگر

جدید دور میں اِن کی جگہ ٹیوب ویلوں، ہینڈ پمپوں اور واٹر سپلائی نے لے لی ہے، تاہم پہاڑی علاقوں میں آجکل بھی ندی نالوں اور چشموں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ پانی دریا کے پانی کی طرح بالکل پاک ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ ہم لوگ سمندر میں سفر کے دوران میٹھا پانی زیادہ ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اور اگر ہم اس محدود مقدار کے پانی سے وضو بھی کریں تو پینے کے لیے پانی نہیں بچتا۔ تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو اور غسل وغیرہ کر سکتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا هُوَ الطَّهُوْرُ مَآءُهٗ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهٗ[1] سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا شکار یعنی مچھلی وغیرہ حلال ہے۔ سمندر کا پانی اگرچہ سخت کڑوا ہے اور پینے کے قابل نہیں ہوتا اور پینے سے بیماری لاحق ہونے کا بھی خطرہ ہوتا مگر یہ پانی بہر حال پاک ہے۔

بلاب کا جھاگ

فرمایا جب بالائی علاقوں میں زیادہ بارش ہوتی ہے تو ندی نالے سیلاب کی صورت میں بہ نکلتے ہیں فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا۔ پس وہ سیلاب اٹھا لاتا ہے جھاگ پھولی ہوئی۔ سیلاب کا پانی جن وادیوں سے گزرتا ہے۔ وہاں کی مٹی، تنکے اور کوڑا کرکٹ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ مٹی کی وجہ سے پانی گدلا ہو جاتا ہے اور اس پر جھاگ بھی آجاتی ہے زمین کا کوڑا کرکٹ بھی جھاگ کے ساتھ مل کر پانی کی اوپر والی سطح پر نظر آتا ہے۔ اور اس طرح پانی کی سطح ابھری ہوئی نظر آتی ہے۔ رَابِيًا ربٰو سے ہے۔ ربو سانس کی بیماری کو کہتے ہیں جس سے سانس پھول جاتا ہے اور ربٰوا زاید مال یعنی سود کو کہتے ہیں جو بغیر استحقاق کے حاصل کیا جاتا ہے زَبَدًا جھاگ کو کہتے ہیں زبد عطیے کو بھی کہتے ہیں حدیث شریف

---

[1] ترمذی ص۱۷ ج ۱

ہیں آتا ہے کہ ایک مشرک نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا نُهِيْنَا عَنْ زَبَدِ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی ہمیں مشرکین کا ہدیہ قبول کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ البتہ جہاں دین کا فائدہ ہو وہاں ایسا ہدیہ قبول کر لینا چاہیئے۔ اقامتِ دین وملت اور مسلمانوں کے غلبے کی خاطر ایسا ہدیہ قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اگر ایسے ہدیہ کی وجہ سے دین وملت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو یا مشرکین کی تعظیم ہوتی ہو یا اُن کے غلبے کو تقویت حاصل ہو تو پھر اُن کا ہدیہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح زبد مکھن کو کہا جاتا ہے اور زبد اس جھاگ کو بھی کہتے ہیں جو سونا چاندی یا کوئی دوسری دھات پگھلانے سے اُس پگھلے ہوئے پانی پر آجاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد ختم ہو جاتا ہے۔

دھات کی جھاگ

سونا اور چاندی عموماً زیورات بنانے کے لیے پگھلایا جاتا ہے چاندی تو جلدی پگھل جاتی ہے مگر سونے اور تانبے وغیرہ کے لیے بہت زیادہ ٹمپریچر کی ضرورت ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اور اس میں بھی جھاگ آتی ہے جس کو وہ آگ میں گرم کرتے ہیں زیور بنانے کے لیے۔ حلیہ اُس زیور کو کہا جاتا ہے جسے مرد وزن زینت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عورتوں کے لیے تو سونے چاندی کا زیور پہننا جائز ہے بشرطیکہ اُس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو۔ البتہ مردوں کے لیے صرف چاندی کی محدود اجازت ہے اور سونا بالکل ممنوع ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک خاتون اور اُس کی بیٹی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انہوں نے سونے کے موٹے موٹے کنگن پہن رکھے تھے حضور نے دریافت کیا، کیا ان کی زکوٰۃ ادا کرتی

ہو؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا، کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ یہی کنگن آگ کے بن کر تمہارے ہاتھوں میں پڑے ہوں ؟ اس خاتون نے وہ کنگن فوراً اتارے اور صدقہ کر دیئے۔ بہرحال اگر زیور نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے زیور کا زیرِ استعمال آنا ضروری نہیں ہے۔ زیور خواہ پہنا جائے، صندوق میں پڑا رہے یا کسی بنک کے لاکر میں محفوظ ہو، زکوٰۃ بہرحال ادا کرنا ہوگی، جب کہ وہ نصاب کو پہنچ جائے۔

فرمایا اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لیے کسی دھات کو پگھلایا جائے تو اس پر بھی جھاگ آجاتی ہے پلاٹینیم سونے سے بھی قیمتی دھات ہے اور اس سے بھی زیورات بنتے ہیں۔ باقی دھاتوں میں لوہا سرِ فہرست ہے جس سے ہر قسم کی مشینری اور اس کے پرزہ جات بنتے ہیں۔ موجودہ دور میں لوہا اور پٹرول بنیادی ضروریات میں شامل ہیں اور ان کے بغیر پوری دنیا کا نظامِ رسل و رسائل ٹھپ ہو سکتا ہے۔ تمام گاڑیاں لوہے سے بنتی ہیں اور پٹرول سے چلتی ہیں۔ عام شہری ضروریات کے لیے استعمال ہونے والی کاروں اور بسوں سے لے کر بحری اور ہوائی جہاز تک لوہے کے مرہونِ منت ہیں۔ جنگی ساز و سامان میں رائفل، توپ، ٹینک ہوائی جہاز، میزائل اور راکٹ وغیرہ سب لوہے سے بنتے ہیں جسے پگھلانا پڑتا ہے۔ دنیا میں لوہے اور پٹرول کے ذخائر کم ہو رہے ہیں تو قدرت ان کا متبادل بھی پیدا کر رہی ہے۔ لوہے، پیتل، تانبے اور سلور وغیرہ کی بجائے اب پلاسٹک کے برتن اور دوسری ضروریاتِ زندگی تیار ہو رہی ہیں۔ تیل کا متبادل اللہ نے گیس پیدا کر دی ہے جسے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اب سورج کی شعاعوں سے

اینڈھن کا کام لینے کے تجربات ہو رہے ہیں۔

حق و باطل میں کشمکش

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے دو قسم کی جھاگ کا ذکر فرمایا ہے، ایک جو سیلاب کی وجہ سے پانی کے اُوپر آتی ہے اور دوسری جو دھات پگھلانے سے دھات کے پانی پہ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی دھات سے بات سمجھانا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ حق اور باطل کو بیان فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی اور جھاگ کو حق اور باطل کے ساتھ تشبیہ دی ہے فرمایا فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً جھاگ تو خشک ہو کر چلا جاتا ہے۔ جب سیلاب آتا ہے یا دھات کو گرم کیا جاتا ہے تو کچھ وقت کے لیے اُوپر جھاگ آتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ خشک ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ نیچے زمین میں رہ جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ جب سیلاب کا پانی مع اپنی جھاگ کے گزر جاتا ہے تو وہ اپنے پیچھے زمین میں زرخیز مٹی (بھَل) چھوڑ جاتا ہے جس سے زمین زرخیز ہو جاتی ہے اور خوب اناج اور پھل اُگاتی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح سونا چاندی یا لوہا تانبہ وغیرہ پگھلانے سے جو اُوپر جھاگ آتی ہے، وہ تو کچھ لمحوں کے بعد خشک ہو جاتی ہے اور اصل جوہر نیچے رہ جاتا ہے جس سے زیورات اور روزمرہ زندگی کی ہزاروں ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ فرمایا کَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ اسی طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کے سمجھانے کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے۔ آسمان سے بارش برسی جس کا پانی ندی نالوں میں بہہ نکلا۔ اس کے اُوپر جھاگ، کوڑا کچرا، میل کچیل وغیرہ آئی جو کچھ دیر بعد ختم ہو گئی

اسی طرح دھاتوں کے پگھلاتے وقت دھات کے پانی پر آنے والی جھاگ بھی تھوڑی دیر بعد ختم ہوجاتی ہے، اور دونوں صورتوں میں کار آمد اشیاء یعنی پانی، زرخیز مٹی اور دھات وغیرہ نیچے رہ جاتی ہے، اور یہی وہ اصل ہے۔ جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اگر حق و باطل کی مثال سمجھنی ہو تو یوں سمجھو کہ انسانوں کے دلوں پر وحی الٰہی کا اثر اُن کی دلی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ جہاں صلاحیت زیادہ ہوگی وہاں وحی الٰہی کا اثر بھی زیادہ ہوگا اور جہاں استعداد کم ہوگی وہاں اثر بھی کم ہی ہوگا۔ حضور علیہ السلام نے اس بات کو اس طرح سمجھایا کہ عام طور پر زمین کے خطے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض خطے نہایت اچھے ہوتے ہیں۔ جب آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے تو ایسے خطے پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس زمین سے پھل، اناج، چارہ اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں جس سے مخلوقِ خدا استفید ہوتی ہے۔ فرمایا زمین کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے کہ اس میں روئیدگی کی صلاحیت تو نہیں ہوتی البتہ وہ اپنے اندر پانی کو جمع کر لینے کی استعداد رکھتی ہے۔ ایسی زمین میں تالابوں، حوضوں اور جھیلوں کی صورت میں پانی جمع ہو جاتا ہے جس سے انسان اور جانور سیراب ہوتے ہیں۔ فرمایا زمین کی تیسری قسم ایسی ہے جو نہ تو خود پیداوار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ وہ پانی کو سٹور کر سکتی ہے کہ اس سے دوسرے لوگ ہی فائدہ اٹھا سکیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آسمان سے جو وحی، ہدایت اور شریعت نازل ہوتی ہے اس سے بھی تین قسم کے اثرات قبول کیے جاتے ہیں اچھی صلاحیت والے لوگ وحی الٰہی کی تعلیمات کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں اور اس سے

خوب مستفید ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ خود تو اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے مگر وہ اس علم کو اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں جس سے دوسرے لوگ مستفید ہوتے ہیں اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو بالکل نکمے ہوتے ہیں جو وحی الٰہی سے نہ تو خود فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کے لیے وجہ استفادہ بنتے ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی کشمکش کی یہ مثال بیان فرمائی ہے۔ جب یہ آپس میں ٹکراتے ہیں تو باطل جھاگ کی مانند اوپر آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے مگر وہ آخر کار دب جاتا ہے اور کار آمد حق نیچے رہ جاتا ہے جس سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ وحی الٰہی کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ جب انسان کے دل میں حق اترتا ہے تو بعض اوقات وہم اور شکوک و شبہات بھی جوش مارتے ہیں مگر جھاگ کی طرح یہ بھی کچھ وقت کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور انسان کے دل میں حق بات ٹھہر جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باطل کے وقتی جوش و خروش کو دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے۔ "اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" (بنی اسرائیل) باطل تو مٹ جانے والی چیز ہے۔ کفر، شرک، نفاق، بدعات، معاصی کتنا بھی زور ماریں وہ بالآخر ختم ہوں گے اور ایمان ہی باقی رہے گا۔ باطل کی عمر زیادہ سے زیادہ اس عارضی دنیا کی زندگی تک ہو سکتی ہے۔ مگر ایمان نیکی، توحید اپنی جگہ پر قائم رہینگی۔ اور یہی چیزیں لوگوں کے لیے مفید ہوں گی۔

شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عالم مقدس سے انبیاء پر نازل ہونے والا حق اس متدنس جہان کے شر اور قبائح سے ٹکراتا

رہتا ہے۔ اس سورۃ کی ابتدا میں الٓمّٓرٰ کی تشریح میں میں نے شاہ صاحبؒ کی حکمت کے مطابق عرض کیا تھا کہ انبیاء کی تعلیمات جو عالمِ بالا سے نازل ہوتی ہیں۔ وہ اس دنیا میں آکر انسانوں کے برے اخلاق، شرک، کفر، معصیت وغیرہ سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں باطل مٹتا رہتا ہے اور حق ظاہر ہوتا رہتا ہے باطل میں کتنا ہی جوش و خروش کیوں نہ ہو، وہ حق کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔ حق و باطل کی کشمکش کا یہی مطلب ہے

مسلمین اور مکذبین

فرمایا لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى جنہوں نے اپنے رب کی بات کو قبول کیا ان کے لیے بھلائی ہے، اچھا بدلہ ہے۔ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ اور جنہوں نے اسے قبول نہیں کیا، ان کی حالت یہ ہوگی کہ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا اگر اس زمین کی ہر چیز ان کی ملکیت ہو وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ اور اس کے ساتھ اس جیسی اور بھی ہو۔ دوسری جگہ ہے کہ سونے چاندی اور روپے پیسے سے پوری زمین بھری ہوئی ہو اور اس سے ڈبل بھی ہو، اور اگر وہ شخص جان خلاصی کے کے لیے پوری کی پوری زمین فدیہ دینا چاہے لَافْتَدَوْا بِهٖ تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن فرمائے گا، اے ابن آدم! اگر یہ ساری زمین سونے سے بھری ہوئی ہو، تو کیا تم فدیہ دینے کے لیے تیار ہو؟ وہ آدمی عرض کرے گا، پروردگار! ہاں میں تیار ہوں۔ اللہ فرمائے گا، تم جھوٹے ہو، تم ابھی باپ کی پشت میں تھے جب میں نے تم سے مطالبہ کیا تھا "اَلَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا" میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، مگر تم نے میرا حکم نہ مانا۔ اب یہ ساری زمین اور اس

سے کوئی بھی تمہارے لیے فدیہ نہیں بن سکتی۔
ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ سوء الحساب
یہ لوگ بڑے حساب والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑے حساب کی وجہ سے تو گرفت ہی آئیگی، بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان[1] ہے مَنْ نُوقِشَ فِي الْحِسَابِ هَلَكَ جس شخص کے ساتھ حساب کتاب کے موقع پر جھگڑا ہو گا، اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا، فرمایا وہ شخص ہلاک ہوگیا، وہ عذاب الٰہی سے نہیں بچ سکتا۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے فلاں! تو نے یہ یہ کام کیے اور وہ اقرار کرتا گیا تو اُس کا حساب آسان ہوگا۔ اُمید ہے کہ اُسے معافی مل جائے گی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے دُعا سکھائی ہے اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِي حِسَابًا يَسِيرًا اے اللہ مجھ سے آسان حساب لینا۔ کہیں فرمائے گا۔ اُدْخُلِ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ بغیر حساب کتاب کے جنت میں چلا جا، اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی فرمائے گا۔ البتہ ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوں گے جو ایک ہی قطار میں جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور جو لوگ باطل کے ساتھ ہی منسلک رہے، حق بات کو تسلیم ہی نہ کیا۔ فرمایا وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ اُن کا ٹھکانا دوزخ ہوگا وَبِئْسَ الْمِهَادُ جو آرام پکڑنے کی بہت بری جگہ ہے۔ وہاں آرام نہیں بلکہ دکھ ہی دکھ ہوگا۔

---

[1] بخاری ص۲۱ ج ا

درس ہشتم ٨ — آیت ١٩ تا ٢٤

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ
كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾
الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ
الْمِيثَاقَ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ
أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ
سُوءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا
مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى
الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ
صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ
وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ
بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ
عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾

ترجمہ :۔ بھلا وہ شخص جو جانتا ہے کہ بیشک جو چیز
اتاری گئی ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب

سے وہ حق ہے ، کیا وہ اس کی طرح ہو گا جو اندھا ہے ؟
بیشک نصیحت پکڑتے ہیں عقل مند لوگ (۱۹) وہ لوگ جو پورا
کرتے ہیں اللہ کے عہد کو ، اور نہیں توڑتے پختہ عہد و پیمان
کو (۲۰) اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں اُس چیز کو جس کو اللہ
نے ملانے کا حکم دیا ہے ، اور ڈرتے ہیں اپنے پروردگار
سے اور خوف کھاتے ہیں بُرے حساب سے (۲۱) اور وہ
لوگ کہ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی خوشنودی تلاش
کرتے ہوئے اور انہوں نے قائم رکھی نماز ، اور خرچ کیا انہوں
نے اس میں سے جو ہم نے اُن کو روزی دی ہے ، پوشیدہ
بھی اور ظاہر بھی ، اور مٹاتے ہیں وہ بھلائی کے ساتھ برائی
کو ، یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا گھر ہے (۲۲)
وہ باغات ہیں رہنے کے ، داخل ہوں گے اِن میں ، اور
جو بھی نیک ہو گا اُن کے آباواجداد ، ان کی بیویوں اور
اُن کی اولادوں میں ۔ اور فرشتے داخل ہوں گے اُن پہ ہر
دروازے سے (۲۳) اور کہیں گے وہ سلامتی ہو تم پر اس
وجہ سے کہ تم نے صبر کیا ، پس اچھا ہے آخرت کا گھر (۲۴)

ربط آیات — شرک کی تردید اور توحید کے بیان کے بعد اس کے ماننے اور نہ ماننے والے ہر دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا ۔ حق و باطل کی کشمکش کا ذکر فرمایا کہ اِن دونوں میں ہمیشہ ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے ۔ باطل کی مثال سیلاب کے پانی پہ آنے والی جھاگ یا کسی دھات کو پگھلانے پہ دھات کے پانی پہ آنے والی جھاگ کی ہے ۔ ہر دو قسم کی جھاگ تھوڑی دیر کے لیے جوش مارتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے اور جو چیز کارآمد اور مفید ہوتی ہے ، وہ اس جھاگ کے نیچے تہ نشین ہو جاتی ہے ۔ دھات کی صورت

ہیں اصل دھات کے زیورات یا برتن یا دیگر سامان تیار کر لیا جاتا ہے۔ فرمایا نیکی اور بدی کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ اِن کا بھی آپس میں ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات بُرائی جوش بھی مارتی ہے مگر بالآخر وہ مٹ جاتی ہے اور باقی حق ہی رہتا ہے۔

آپ آج کے درس میں قرآن پاک، دین اور شریعت کو ماننے والوں اور اس کا انکار کرنے والوں کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ نیز قرآن پاک کی تعلیمات سے مستفید ہونے والوں کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

عالم اور نابینا کی مثال

ارشاد ہوتا ہے اَفَمَنۡ يَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَـقُّ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ آپ کے رب کی طرف سے نازل کردہ چیز برحق ہے كَمَنۡ هُوَ اَعۡمٰى اُس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے کسی چیز کو جان لینا ہی کافی نہیں بلکہ اُس پہ ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ علم رکھتا ہے کہ قرآن پاک برحق ہے مگر خود اس پہ ایمان نہیں لاتا تو اُس کا محض علم کچھ مفید نہیں ہوگا۔ اس مقام پہ علم سے مراد اعتقاد بھی ہے یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ برحق کتاب ہے، وہ قرآن پاک کے منکر کی طرح تو نہیں ہو سکتا جس کو اندھے سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً "فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک ہونے کا محض علم ہونا مفید نہیں کیونکہ یہ علم تو یہود و نصاریٰ کو بھی تھا مگر وہ اس کو مانتے نہیں تھے، لہٰذا ان کا صرف جاننا مفید نہیں ہے۔ اور جس شخص کے پاس نہ تو علم ہے کہ قرآن پاک برحق ہے اور نہ وہ

اس کی حقانیت پہ اعتقاد رکھتا ہے اُسے قرآنِ پاک کی غرض وغایت کا ہی علم و یقین نہیں، وہ نابینا آدمی کی طرح ہے جسے کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا آدمی تو حق و باطل، نور اور ظلمت، صحیح اور غلط میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا۔ گویا ایماندار آدمی بینا کی طرح ہے اور مشرک، کافر اور منافق نابینا کی طرح اور ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فرمایا اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ بیشک صاحب عقل لوگ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ بے عقل اور نادان لوگ نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے متعلق تو سورۃ انفال میں موجود ہے۔ "الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ" وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل کو صحیح طور پہ استعمال ہی نہیں کرتے۔

عقلمندوں کے اوصاف

آگے اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کے اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ اور پختہ عہد و پیمان کو نہیں توڑتے۔

(۱) ایفائے عہد

جب کوئی شخص کلمہ توحید زبان سے ادا کرتا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو وہ دو چیزوں کا عہد کرتا ہے۔ ایک یہ کہ میں اللہ کی وحدانیت پہ ہمیشہ قائم رہوں گا اور دوسری یہ کہ میں اُس دین اور شریعت کا پابند رہوں گا جو اللہ نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل فرمائی ہے۔ یہ تو توحید و رسالت کا عہد ہو گیا۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اس عہد میں تمام قسم کے عہد آجاتے ہیں جو ایک انسان اپنے خالق کے ساتھ کرتا ہے یا ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے ایک جماعت کا دوسری جماعت سے اور ایک سلطنت کا دوسری سلطنت سے عہد بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہو، پورا کرنا لازمی ہوگا

سورۃ مائدہ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اے ایمان والو! "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" عہد و پیمان کو پورا کرو۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ لوگو! عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ "اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" اس کے متعلق قیامت والے دن سوال کیا جائے گا۔

میثاق کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایک تو میثاقِ الست ہے جو اس جہان میں آنے سے پہلے اللہ نے تمام انسانوں کی روحوں سے لیا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ذریتِ آدم کو ان کی پشت سے نکالا اور فرمایا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" بتلاؤ میں تمہارا رب ہوں یا نہیں۔ "قَالُوْا بَلٰى" تو سب نے کہا کہ پروردگار! کیوں نہیں؟ تو ہی ہمارا رب ہے پھر اس پختہ عہد کی یاد دہانی کے لیے اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور کتابیں نازل فرمائیں تاکہ کل قیامت کو یہ بہانہ نہ کر سکو کہ ہمیں یاد دلانے والا کوئی نہیں آیا تھا، حالانکہ ہر نبی نے اپنی اپنی امت کو یہ عہد یاد دلایا ہے۔ غرضیکہ میثاق الست اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے کیونکہ ہر شخص کی روح اس کا اقرار کر چکی ہے۔ اور یہی وہ عہد ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ توڑنے کا حکم دیا ہے اگرچہ اس دنیا میں آکر عام آدمی اس عہد کو بھول جاتے ہیں تاہم ایسے سلیم الفطرت لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو روحانیت کے اعتبار سے بیدار ہوتے ہیں۔ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کے بعض حضرات کا بیان ملتا ہے جنہوں نے کہا کہ ہمیں تو وہ عہد بالکل تازہ بتازہ محسوس ہوتا ہے اور ہمیں یاد ہے کہ عالمِ ارواح میں ہم نے یہ عہد کیا تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ عقلمند آدمی وہ ہیں جو عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو توڑتے نہیں خواہ وہ عہدِ الست ہو یا کوئی اور عہد۔

آج کی دنیا میں بدعہدی عام ہو چکی ہے، افراد ہوں یا جماعتیں یا حکومتیں وعدے کی پابندی نہ صرف ختم ہو چکی ہے بلکہ اس کے اعلانیہ اظہار کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ انگریزوں کے وزیر جنگ نے جنگ عظیم کے موقع پر برملا کہا تھا کہ ترکوں کے ساتھ عہد محض وقت گزارنے کے لیے کیا گیا تھا، اس کو پورا کرنا مقصود نہ تھا۔ آج بھی امریکہ ہو یا روس، فرانس ہو یا جرمنی وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے عہد کو ٹالتے رہتے ہیں۔ ہمارا پڑوسی ملک بھارت کشمیریوں سے کیے گئے عہد استصواب رائے کو نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ٹالتا جا رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی عہد کو پورا نہیں کیا۔ البتہ مسلمان جب تک ایک زندہ قوم تھی، ان کو عروج حاصل تھا تو یہ عہد پر بھی قائم ہوتے تھے۔ مگر جب سے انحطاط پذیر ہوئے ہیں۔ ان کی حالت بھی دیگر اقوام کی طرح ہی ہو گئی ہے۔ بہرحال عہد کی پاسداری کرنا سچے مسلمانوں اور عقلمندوں کا کام ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے کہ ایک عقل معاد ہوتی ہے اور دوسری عقل معاش۔ معاش کی عقل تو اس دنیا تک محدود ہے۔ یہاں پر بڑے بڑے اہل عقل و ہنر، دانش ور، بیرسٹر اور پی ایچ ڈی حضرات موجود ہیں۔ مگر عقل معاد سے خالی ہیں "يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ" (الروم) ان کا علم دنیا تک محدود ہے اور یہ آخرت سے غافل ہیں۔ مگر یہاں پر تو آخرت کو سمجھنے والی عقل کی ضرورت ہے اور صحیح عقلمند وہی ہے جو آخرت کی منزل کو سمجھتا ہے اور جسے آخرت کا احساس ہو گا وہ عہد کی پابندی

کرے گا اور اسے قطع نہیں کریگا۔

(۲) ہی ملاپ

اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی ہے وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں اُس چیز کو جسے اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے۔ سب سے پہلے اللہ نے ایمان اور نیکی کو ملانے کا حکم دیا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے گویا نیکی ایمان کے ساتھ بالکل جڑی ہوئی ہے۔ نہ تو نیکی کے بغیر ایمان کا کچھ فائدہ ہے اور نہ صرف نیکی کسی کام کی ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نیکی کرے۔ باہمی ملاپ میں قرابتداری اور صلہ رحمی بھی آتی ہے۔ اللہ نے قرابتداروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور قطع رحمی سے منع فرمایا ہے۔ اس کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں کیونکہ صالح انسان وہی ہوگا جو اللہ کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے۔ جس طرح ایمان کے ساتھ نیکی کو ملانا ضروری ہے اسی طرح حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا ملانا بھی لازمی ہے۔

قرابت داروں کے حقوق کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے کا حق ہے۔ اپنے پڑوسی کا حق ہے، دو ہم سفروں کا آپس میں حق قائم ہوتا ہے، اس کی رعایت ضروری ہے۔ اپنے پیر کا حق ہے، استاد کا حق ہے۔ افسر اور ماتحت کا حق ہے۔ مالک اور مزدور کے درمیان حقوق کی تقسیم ہے اور امام اور مقتدی کا بھی آپس میں حق ہے۔ تو عقلمند وہ لوگ ہیں جو ان تمام حقوق کو ملاتے ہیں۔ اور ان میں اختلاف نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" (الحجرات)
تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا وہ اخوت اور بھائی چارے
کے جذبے کے ساتھ ہی رہیں۔ مسلمان خواہ کسی ملک میں رہتا ہو اور
کوئی زبان بولتا ہو، وہ ہمارا بھائی ہے۔ ہم سب ایمان کے رشتے
میں پروئے ہیں، کلمہ طیبہ ہی جامع ایمان ہے۔

(۳) خشیتِ الٰہی
عقلمندوں کی تیسری صفت اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ وَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ خشیت وہ چیز ہے جو علم کے ساتھ حاصل ہوتی ہے
جب کوئی شخص اچھائی اور برائی میں امتیاز کر لیتا ہے اور پھر وہ برائی
کے کام سے ڈر جاتا ہے تو یہی خشیت الٰہی ہے۔ سورۃ فاطر میں اس
مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ
عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" علم والے لوگ ہی اللہ کا خوف رکھتے ہیں
فرمایا وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ یہ وہی لوگ ہیں جو حساب کی
خرابی سے ڈرتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال سے خوف
کھاتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کا حساب آسان ہو جائے۔ یہی سیدھے
راستے پر چلنے والے لوگ ہیں۔

(۴) صبر
اہلِ عقل و خرد کی چوتھی صفت اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ اور
وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی خوشنودی کی تلاش کے لیے
جنہوں نے دنیا کے مصائب و آلام جھیلے اور ناگوار باتوں پر صبر کیا۔
صبر اطاعت پر بھی ہوتا ہے معصیت سے بچنے کے لیے بھی
اور تکلیف کو برداشت کرنے پر بھی۔ صبر ملتِ ابراہیمی کے اہم
اصولوں میں سے ایک ہے۔ قرآن پاک میں اس کی بہت سی تفصیلات

موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ" (الزمر) صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر ملیگا۔ گرمی کے دنوں میں روزہ رکھنا صبر کی بات ہے۔ صبر کے بغیر انسان گرمی اور سردی میں وضو نہیں کر سکتا، نماز نہیں پڑھ سکتا، حج و عمرہ ادا نہیں کر سکتا۔ صبر نفس کو برائی سے روکتا ہے اور اطاعت پہ آمادہ کرتا ہے۔ تو فرمایا عقلمند لوگوں کی چوتھی صفت صبر ہے۔

ایک مومن کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی حاصل ہو جائے۔ ہمارے تمام نیک کاموں اور تمام عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" (التوبۃ) اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سی رضا بھی حاصل ہو جائے تو وہ ہر چیز سے بڑی ہوگی۔ ہمارے بزرگ حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی فرماتے[1] ہیں کہ لوگ لمبی چوڑی دعائیں مانگتے ہیں۔ مگر میری دعا بالکل مختصر ہوتی ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُخْطِكَ وَالنَّارِ اے اللہ میں تجھ سے تیری رضا کا طالب ہوں اور جنت کا سوال کرتا ہوں جب کہ تیرے غضب اور دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں۔ غرضیکہ جس کو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگئی۔ اس کو سب کچھ مل گیا اور جو کوئی خدا کے غضب سے بچ گیا، وہ تمام برائیوں سے بچ گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ عقلمند وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صبر کیا۔ صبر بہت بڑی حقیقت اور ملتِ ابراہیمی کا اہم اصول ہے۔

(۵) اقامت صلوٰۃ

فرمایا عقلمندوں کی پانچویں صفت یہ ہے وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

---

[1] شمائم امدادیہ صہ ۲۷

کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ نماز بھی بہت بڑی حقیقت ہے۔ حساب کتاب کے موقع پر سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا۔ نماز ہی کے ذریعے انسان کا تعلق باللہ قائم رہتا ہے۔ نماز مومن کی پہچان ہے۔ مومن اور کافر کے درمیان نماز ہی خطِ امتیاز ہے۔ نمازی ہونا بھی مومن اور اہلِ عقل کی صفت ہے۔

(۶) انفاق فی سبیل اللہ

فرمایا، اُن کی چھٹی صفت یہ ہے وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ اہلِ عقل وہ ہیں جنہوں نے خرچ کیا اُس چیز میں سے جو ہم نے انہیں روزی دی ہے۔ انسان جو بھی خرچ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز سے ہی کرتا ہے کسی کی کوئی ذاتی ملکیت نہیں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی محنت، ہنر اور عقل سے کوئی چیز کمائی ہے تو وہ نادان ہے یہ تو سب حیلے ہیں، یہ تو انسان کو اللہ کے حکم سے تصرف حاصل ہوا ہے۔ تو عقلمند وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں مگر نیکی کے کاموں پر، نہ کہ شیطانی راستوں پر۔ انفاق فی سبیل اللہ میں کھیل تماشہ، گانا بجانا، شراب نوشی، جوا بازی، شرکیہ امور اور رسومات باطلہ نہیں آتیں۔ یہ تو سب ناجائز مدات ہیں۔ ہاں قابلِ قبول خرچ وہ ہے جو خدا کی رضا کے لیے ہو اور اس میں تمام انفرادی اور اجتماعی حقوق بھی شامل ہوں جن پر خرچ کرنا عقلمندوں کی صفت ہے۔

اور اُن کے خرچ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خرچ کرتے ہیں سِرًّا وَّعَلَانِيَةً پوشیدہ طور پر بھی اور علی الاعلان بھی۔ اگر پوشیدہ طور پر کوئی چیز مستحقین تک پہنچا دی جائے تو یہ بہت اچھی بات ہے کیونکہ اس میں ریاکاری نہیں ہوگی۔ اور اگر کھلے طور پر خرچ کرنے سے دوسروں کو ترغیب دینا مقصود ہو تو ایسا کرنا بھی درست ہے تاہم زیادہ اجر پوشیدہ طور پر خرچ کرنے کا ہے۔

برائی کا
ازالہ نیکی
سے

فرمایا اُن کی ساتویں صفت یہ ہے وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کہ وہ برائی کو نیکی کے ذریعے دور کرتے ہیں۔ اگر کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو اس کے جواب میں کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں تاکہ برائی کا ازالہ ہو جائے حضور علیہ السلام نے حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے فرمایا تھا کہ غلطی کو نیکی کے ساتھ مٹاؤ۔ جب نیکی کرو گے تو برائی خود بخود مٹ جائے گی۔ اگر کوئی آدمی تمہارے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آتا ہے، گالی دیتا ہے یا کوئی اذیت پہنچاتا ہے تو اس کے جواب میں تم بھی غلط کام نہ کرو بلکہ تم برائی کا جواب نیکی سے دو گے تو برائی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر ایک گولی کے جواب میں دو گولیاں چلیں، ایک گالی کا جواب دو گالیوں سے ملے اور ایک گھونسے کی بجائے دو برسیں تو پھر برائی مٹے گی نہیں بلکہ مزید پھیلے گی۔ ہاں البتہ بعض مواقع پر برائی اور ظلم کا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور بعض اوقات معاف کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کے محلات بیان کر دیے ہیں۔ تو فرمایا اہل عقل وہ ہیں جو برائی کا ازالہ نیکی سے کرتے ہیں۔

جنت
کے گھر

فرمایا جن لوگوں میں مذکورہ سات اوصاف پائے جائیں گے أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا گھر ہے اور وہ گھر کیا ہے جَنَّاتُ عَدْنٍ وہ رہائش کے قابل باغات ہیں۔ جنت کے کئی طبقات ہیں جیسے جنت الفردوس جنت النعیم اور جنت عدن وغیرہ۔ تو جنت عدن وہ باغات ہیں۔ جو صرف درختوں اور پودوں کے باغات ہی نہ ہوں بلکہ رہنے کے لیے ان میں محلات بھی موجود ہوں۔ فرمایا يَدْخُلُونَهَا مذکورہ صفات کے حاملین ان باغوں میں داخل ہوں گے، اور وہ

وہاں اکیلے نہیں ہوں گے بلکہ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِہِمْ وَاَزْوَاجِہِمْ وَ ذُرِّیّٰتِہِمْ اُن کے آباؤ اجداد اور اولادوں میں سے نیک لوگ بھی ان کے ساتھ جنت عدن میں داخل ہوں گے۔ ایک مومن کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ ان کے متعلقین اگرچہ عمل میں ان سے کم تر ہوں گے مگر ان کی وجہ سے وہ بھی ان کے ساتھ جنت کے اعلیٰ مقام میں ہوں گے۔ جنت عدن کا مقیم جب اپنے اعزہ و اقارب کے متعلق اللہ کے حضور تشویش ظاہر کرے گا اور پوچھے گا کہ وہ کس درجے میں ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی اُسی کے ساتھ ملا دے گا۔ تاکہ اُس جنتی کو کوئی ذہنی کوفت بھی نہ ہو دوسری جگہ پر ہے "وَاتَّبَعَتْہُمْ ذُرِّیَّتُہُمْ بِاِیْمَانٍ" (الطور) اگر ایمان اور نیکی ہے تو اللہ تعالیٰ اُن کی اولادوں کو بھی ان کے ساتھ ملا دیگا۔

فرشتوں کا سلام

فرمایا وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْہِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ اور ان پر ہر دروازے سے فرشتے داخل ہونگے مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر داخلہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی شخص اپنے اہل و عیال میں مشغول ہوتا ہے تو ایسے میں مخل ہونا درست نہیں ہوتا۔ فرشتے داخل ہو کر کہیں گے سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ تم پہ سلامتی ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بِمَا صَبَرْتُمْ اس وجہ سے کہ تم نے اس دنیا میں صبر کیا۔ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ آخرت کا گھر کیا ہی اچھا ہے جو صبر کی بدولت حاصل ہوا۔ فرشتے مبارکباد دیں گے جس سے اہل ایمان کی خوشی میں اضافہ ہوگا۔ یہ نیک لوگوں کا انجام بیان ہوا۔ اب اگلی آیت میں برے لوگوں کا حال بیان ہوگا۔

درس نہم ٩ — آیت ٢٥ تا ٢٦

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ
وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ
وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ
اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۲۵ اَللّٰهُ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا
بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي
الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۲۶ ع ٣/٨/٩

ترجمہ :- اور جو لوگ توڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عہد کو بعد اس کے مضبوط کرنے کے ، اور قطع کرتے ہیں اُس چیز کو کہ اللہ نے حکم دیا ہے ۔ اُس کو جوڑنے کا ، اور فساد کرتے ہیں زمین میں ۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور اُن کے لیے بُرا گھر ہے ۲۵ اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور تنگ کرتا ہے (جس کے لیے چاہے) اور خوش ہو گئے ہیں یہ لوگ دنیا کی زندگی پر ، حالانکہ نہیں ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر ایک حقیر سامان ۲۶

ربط آیات

مسئلہ توحید اور شرک کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے ۔ ایک وہ جو قرآنی تعلیمات سے مستفید ہوتے ہیں ، یہ عقلِ معادِ

رکھنے والے لوگ ہیں۔ گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف بیان فرمائے تھے کہ یہ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُن کو توڑتے نہیں۔ یہ لوگ بُرے حساب سے اپنے پروردگار سے خوف کھاتے ہیں اور اپنے رب کی خوشنودی کے لیے صبر کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، اللہ کے دیے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں اور برائی کا ازالہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ پھر اللہ نے ان کا انجام بھی بیان فرمایا کہ ان کے لیے قابلِ رہائش باغات ہوں گے اور اگر ان کے آباؤ و اجداد، بیویاں اور اولادیں بھی صاحبِ صلاحیت ہوں گی، تو وہ ان کے ساتھ ہی رہیں گے۔ ایسے لوگوں کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ فرشتے ہر دروازے سے داخل ہو کر ان کو سلام کریں گے اور پھر انہیں صبر کرنے کی وجہ سے اچھے انجام کی خوشخبری دیں گے۔

اب آج کے درس میں اُن لوگوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جو قرآنی تعلیمات سے مستفید نہیں ہوتے درحقیقت یہ لوگ عقلمند نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے اوصاف بیان کیے ہیں اور ان کے انجام کا ذکر بھی کیا ہے قرآن پاک کا یہ اسلوبِ بیان ہے کہ جہاں ایمانداروں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نافرمانوں کا حال بھی بیان ہوتا ہے جہاں محسنین کی بات ہوتی ہے وہاں فساق و فجار کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، اس طرح گویا ترغیب و ترہیب ساتھ ساتھ چلتی ہیں گذشتہ درس میں قرآن سے مستفید ہونے والوں کا ذکر تھا، اب نافرمانوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔

عہد شکنی

ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ اور جو لوگ اللہ کے عہد کو توڑتے

ہیں اس کو پختہ کرنے کے بعد۔ اس میں عہدِ ازل سے لے کر سارے عہد آجاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور بنی نوع انسان کے درمیان عہد یہ ہے کہ بندے اُس کی توحید کو مانیں، اوامر کی پابندی کریں، نواہی سے باز رہیں، اطاعت کرتے رہیں اور برائیوں سے بچتے رہیں۔ مومن کبھی عہد کو نہیں توڑتا۔ البتہ منافق کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ جب وہ عہد کرتا ہے تو اسکو پورا نہیں کرتا۔ عہد کو توڑنے والے لوگ عقلمند نہیں ہوتے۔

آگے فرمایا وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ اور جو قطع کرتے ہیں اُس چیز کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ نیکی کو جوڑو مگر وہ نہیں جوڑتے۔ اللہ تعالیٰ تمام نبیوں پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے مگر یہ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ یہود و نصاریٰ اسی بیماری کے مریض ہیں جو بعض انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ بیان قرآن پاک میں موجود ہے "نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ" (النساء) یہ تو کفر ہے اور بے عقلی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرابتداروں کو باہمی جوڑنے کا حکم دیا ہے مگر یہ لوگ قطع رحمی کرتے ہیں۔ یہ دوسری صفت ہو گئی۔

فی الارض

فرمایا ایسے بے عقل لوگوں کی تیسری صفت یہ ہے وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ یہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ کے پیروکار امام بیضاویؒ پانچویں صدی کے بڑے امام گزرے ہیں۔ اُن کی تفسیر مختصر تفاسیر میں سب سے اہم تفسیر ہے۔ بعد والے ان کی تفسیر سے استفادہ کرتے ہیں۔ تو امام بیضاوی فساد فی الارض کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ عربی زبان

میں فساد کی ضد اصلاح ہے۔ جب کوئی چیز اعتدال پر ہوتی ہے تو وہ درست حالت پر ہوتی ہے مگر جب وہ اعتدال سے باہر نکل جاتی ہے تو اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔

فساد فی الارض کا مفہوم بڑا وسیع ہے مثلاً کفر، شرک اور نفاق فساد فی الارض ہے۔ اس کے برعکس ایمان اور توحید درستگی اور اصلاح ہے۔ یہ فطرت کے عین مطابق ہے اور اس سے تمام چیزیں اعتدال پر آتی ہیں، کافروں کے ساتھ دوستانہ کرنا، اُن کو مسلمانوں کے راز پہنچانا، فتنہ برپا کرنا، غلط رسومات کو رواج دینا، دین کے خلاف بات کرنا، شرعی قوانین کو توڑنا، قتل و غارت گری کرنا، معصیت کے حق میں پراپیگنڈا کرنا، فحاشی پھیلانا، اخلاق سوز باتیں کرنا، بدعقیدہ ہونا، خلاف سنت کام کرنا۔ بدعت جاری کرنا، زنا، بدکاری، چوری، ڈاکہ، خیانت، آبرو ریزی کرنا سب فساد فی الارض میں شامل ہے۔ "وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

یہ سب کچھ وہ لوگ کرتے ہیں جو عقل سے محروم ہیں۔ ان کے برعکس جو لوگ اہل عقل اور اہل ایمان ہیں وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، زکوٰۃ اور صدقات ادا کرتے ہیں۔ ان میں غریب پروری اور بنی نوع انسان سے ہمدردی کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ تعلق باللہ قائم کرتے ہیں اور عہد کے پابند ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے اور فساد فی الارض کرنے والے ناپسندیدہ لوگ ہیں۔

لعنت کا طوق

فرمایا أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے۔ لعنت کا لغوی معنی ہے بُعد عن الرحمۃ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری۔ جس طرح شیطان مردود اور خدا کی رحمت سے محروم ہے اسی طرح تمام کافر بھی اللہ کی

رحمت سے دور ہیں۔ فساد فی الارض کرنے والا ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہے گا۔ وہ اللہ کی رحمت سے کچھ حصہ نہیں پاسکتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس دُنیا میں بھی خدا تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہیں گے۔ اور قیامت کے دِن بھی ان کے گلے میں طوق پڑا ہوگا۔ سورۃ ہود میں اللہ نے نافرمان قوموں کا حال بیان کر کے فرمایا " وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اُس دنیا میں بھی ان پر لعنت بھیجی جاتی ہے اور آخرت میں بھی وہ اسی میں پھنسے رہیں گے۔ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ اور ان کے لیے بہت بُرا گھر ہے۔ بُرے گھر کا ذِکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے کہ ایسے لوگ جہنم کا شکار بنیں گے۔ بہرحال قرآن پاک سے مستفید ہونے والے اور اس سے نصیحت حاصل نہ کرنے والے دونوں گروہوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی صفات بیان ہوئی ہیں اور ان کا انجام بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

رزق کی کشادگی اور تنگی

نافرمان لوگوں کی دُنیوی خوشحالی اور آرام و آسائش دیکھ کر بعض اذہان میں شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ اگر یہ واقعی خدا تعالیٰ کے باغی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں عیش و آرام کیسے عطا کر رکھا ہے۔ ایسے ہی شبہات کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی آیات میں رفع فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اللہ تعالیٰ ہی جس کی روزی چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ آسودگی اور تنگ دستی انسانوں کے فہم، عقل اور پلان کے مطابق نہیں ہوتی۔ یہ کسی انسان کا اپنا کمال نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور مصلحت کے تابع ہوتی ہیں۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق کشادگی یا تنگی کا فیصلہ

کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ" (الشوریٰ) اگر اللہ تعالیٰ رزق کے دروازے سب کے لیے یکساں کشادہ کر دیتا تو سب کے سب نافرمان ہوتے، لہٰذا وہ اپنے اندازے کے مطابق جو کچھ چاہتا ہے نازل فرماتا ہے۔ کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم۔ بعض اوقات نافرمانوں کو بھی رزق میں بڑی وسعت عطا کرتا ہے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام بُرے لوگ آسائش میں ہوں۔ بہت سے کافر بھی تنگی میں وقت گزارتے ہیں۔ کفر اور افلاس اگر دونوں چیزیں یکجا ہو جائیں تو بہت ہی بُری بات ہو گی مگر بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں۔ لیکن بہت سے نافرمان، بد اخلاق اور بد عقیدہ لوگ آرام و آسائش میں بھی ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت پر موقوف ہے فضیلت کا معیار دنیا کا مال و دولت نہیں بلکہ نیکی، تقویٰ اور ایمان ہے، لہٰذا کسی منکر کی خوشحالی دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ یہ شخص خدا تعالیٰ کا پسندیدہ بندہ ہے۔

دنیا کا حقیر سامان

فرمایا وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یہ لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہیں، فریفتہ ہو گئے ہیں، حالانکہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہے وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ نہیں ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر حقیر سامان۔ اس دنیا کا سارا ساز و سامان ایک بالکل معمولی سی چیز ہے۔ ترمذی شریف کی روایت[1] میں آتا ہے لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَّا سَقٰى كَافِرًا مِّنْهَا شَرْبَةً "اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی

[1] ترمذی ص ۳۳۷

قدر و قیمت مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر اور منکر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا مگر اللہ کے نزدیک دنیا ایک حقیر چیز ہے مسلم شریف کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حیثیت ایسی ہے كَمَا جَعَلَ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهٗ فِي الْيَمِّ جیسے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈبو کر نکال لے فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ پھر دیکھ لے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى" (الاعلیٰ) آخرت ہی پائیدار اور بہتر ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گی، ترمذی شریف ہی کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مَرَّ بِجَدْيٍ اَسَكَّ مَيِّتٍ چھوٹے کانوں والے بکری کے مردہ بچے پاس سے گزرے۔ آپ علیہ السلام نے صحابہ سے فرمایا، تم میں سے کون ہے جو اس مردہ بچے کو ایک درہم میں خریدتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا حضور! یہ تو حقیر سا مرا ہوا بچہ ہے۔ لَا نُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَيْءٍ ہم تو اسے کسی قیمت پر بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا بخدا! اللہ کے نزدیک پوری دنیا کی قیمت اس مردہ بچے سے بھی زیادہ حقیر ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اس دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اس کے حقیر سامان کو سمیٹ سمیٹ کر رکھ رہا ہے اسی کو پائیدار سمجھ لیا ہے اور اپنے فرائض منصبی سے غافل ہو گیا ہے۔ دنیا کے آرام و آسائش، محلات، کاروں اور دیگر لوازمات میں ہی الجھ کر رہ گیا ہے۔ مگر اصل منزل تو آخرت کی منزل ہے جو پائیدار بھی ہے اور جس کو دوام بھی حاصل ہے۔ اس آیت

ہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کا تقابل بھی کر دیا ہے اور دونوں
کی حیثیت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ اب یہ بندوں کا کام ہے کہ وہ
ان میں سے کس چیز کو پسند کرتے ہیں۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ
مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ
وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾ الَّذِينَ آمَنُوا
وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ
اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ
مَآبٍ ﴿٢٩﴾ كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ
خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ
عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ
يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ
إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿٣٠﴾

ترجمہ :- اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ کیوں نہیں اتاری جاتی اس پر کوئی نشانی اُس کے رب کی طرف سے۔ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف اُس کو جو رجوع رکھتا ہے ﴿٢٧﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے اور مطمئن ہوتے ہیں اُن کے دل اللہ کے ذکر سے

آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی دل مطمئن ہوتے
ہیں (۲۸) وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے
کام کیے خوشخبری ہے اُن کے لیے اور اچھا ٹھکانا (۲۹)
اسی طریقے سے ہم نے بھیجا ہے آپ کو رسول بنا
کر ایک امت میں ۔ تحقیق گذر چکی ہیں اس سے پہلے بہت
سی امتیں ، تاکہ آپ تلاوت کریں اُن پر وہ چیز جو ہم
نے وحی کی ہے آپ کی طرف ۔ اور یہ لوگ انکار کرتے
ہیں رحمان کا ۔ آپ کہہ دیجئے وہ میرا رب ہے نہیں کوئی
معبود اُس کے سوا ، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور
اسی کی طرف رجوع ہے (۳۰)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں قرآن کریم کی نصیحت سے مستفید ہونے والوں کے اوصاف اور اُن کا انجام بیان ہوا ۔ پھر اس نصیحت سے مستفید نہ ہونے والوں کے اوصاف بیان ہوئے کہ یہ لوگ عہد کو توڑتے ہیں ، جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُس کو کاٹتے ہیں اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ فرمایا ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی لعنت اور آخرت میں بُرا ٹھکانا ہوگا ۔ اگر ایسے نافرمان لوگوں کو دنیا میں وافر روزی نصیب ہو تو اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے کیونکہ رزق کی وسعت اللہ تعالیٰ کی حکمت پر منحصر ہوتی ہے ۔ دنیا کا مال و اسباب خدا کی جانب سے آزمائش ہوتی ہے ، یہ کسی شخص کے پسندیدہ ہونے کی علامت نہیں ہوتی ۔ اللہ تعالےٰ جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے ، تنگ کر دیتا ہے ۔ تاہم وہ ہر شخص کی صلاحیت کے مطابق ہی کوئی فیصلہ کرتا ہے ۔ اس کی حکمت کو کوئی مخلوق نہیں جان سکتی ۔

نشانی کا مطالبہ

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کرنے والوں کا شکوہ بیان کیا ہے

کہ یہ لوگ محض ضد اور عناد کی بناء پر فضول مطالبات کرتے تھے حالانکہ ان پر حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا۔ کفر کا لغوی معنیٰ انکار ہی ہے۔ اور اصطلاحاً توحید، ایمانیات، کتاب، انبیاء، کتب سماویہ، قیامت اور ملائکہ کا انکار مراد ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ کیوں نہیں اتاری جاتی اس (پیغمبر) پر نشانی اس کے رب کی طرف سے۔ اس نشانی سے وہ نشانی مراد ہے جو کافر لوگ خود اپنے موہنوں سے طلب کرتے تھے نشانیاں تو ہزاروں اللہ نے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمائیں اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیغمبر! قُلْ آپ کہہ دیجئے إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ بیشک اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع رکھتا ہے، ہدایت اور گمراہی دونوں چیزوں کے اسباب ہیں۔ جو شخص ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو گمراہ کرتا ہے، وہ راہِ راست سے محروم رہتا ہے۔ سورۃ نساء میں ہے "بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ" اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جس کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے اور کفر پر جمے ہوئے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بھی ہے "خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ" اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے ہدایت کے لیے طلب کا ہونا ضروری ہے، جو شخص ہدایت کی خواہش رکھے گا، اُسے حاصل ہو گی اور جو عناد اور ضد رکھے گا، اسے ہدایت نصیب نہیں ہو گی بلکہ وہ گمراہی میں ہی بھٹکتا رہیگا

مکے کے مشرکین حضور علیہ السلام سے من مانی نشانیاں طلب کرتے رہتے تھے۔ کہتے تھے مکے کے اِن پہاڑوں کو یہاں سے چلا دے تاکہ ہم یہاں پر کھیتی باڑی کر سکیں۔ کبھی کہتے اِن پہاڑوں کو سونے کا بنا دے اس قسم کی بیہودہ فرمائشیں کرتے مگر تسلیم نہیں کرتے تھے شق القمر کا معجزہ انہوں نے خود طلب کیا، پھر جب اللہ نے اسے ظاہر کر دیا۔ تو کہنے لگے "سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ" (القمر) یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ پہلے بھی ہوتا تھا، اب بھی ہوتا ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے منکرین کی ذہنیت کا ذکر کیا ہے کہ یہ ہٹ دھرم لوگ، اللہ کی طرف رجوع نہیں رکھتے لہٰذا انہیں ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ ہدایت اُس شخص کو حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے اِس کا طلبگار ہوگا۔

اطمینانِ قلب

کفار کے تذکرے کے بعد اب اہل ایمان کا ذکر آرہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وہ لوگ جو ایمان لائے۔ وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ اور مطمئن ہوتے ہیں۔ ان کے دِل اللہ کے ذکر سے۔ ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ جو بھی ایماندار آدمی اللہ کا ذکر کریگا اُس کے دل میں سکون پیدا ہوگا۔ ساتھ یہ بھی فرمایا اَلَا آگاہ رہو اور سن لو، بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی دلوں کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اطمینانِ قلب کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب اللہ کا نام لیا جائے یا اس کا کلام پڑھا جائے یا کوئی شخص منقول ذکر کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اُس کے دِل میں خاص قسم کا اُنس پیدا ہوتا ہے اور وحشت دور ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دِل میں سکون پیدا ہوتا ہے جس سے وہ خاص قسم کا لطف محسوس کرتا ہے۔ برخلاف اس کے دنیا کے

آرام و آسائش کے تمام لوازمات بھی اکٹھے کر لیے جائیں تو جسم کو آرام تو مل سکتا ہے مگر سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کا عیش و آرام تو ایسی چیز ہے کہ اس سے کوئی انسان کبھی بھی سیر نہیں ہوتا بلکہ اس کا معاملہ "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" والا ہو جاتا ہے، کہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری سہولت کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے۔ اس کی حرص بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور وہ اطمینانِ قلب سے محروم رہتا ہے۔ بڑے بڑے دولت مند حتیٰ کہ سلطنتوں کے مالک بھی ذکرِ الٰہی سے دوری کی وجہ سے بے چین ہی رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اپنے دلوں کو ذکرِ الٰہی سے منور کرنے والے مزدور پیشہ لوگوں کو بھی سکونِ قلب حاصل ہو جاتا ہے ان کی ساری وحشت دور ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ اطمینانِ قلب کا واحد ذریعہ ذکرِ الٰہی ہے۔

ذکرِ الٰہی کے طریقے

ذکر کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام طور پر ذکر زبانی ہوتا ہے۔ انسان نماز پڑھتا ہے، قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے یا دیگر ذکر و اذکار کرتا ہے۔ جنہیں زبان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نشانیوں اور نعمتوں میں غور و فکر کرتا ہے کہ اللہ نے انہیں کیسی حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، تو یہ بھی اللہ کے ذکر کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ ایک ذکر ذکرِ قلبی بھی ہے۔ بزرگانِ دین اس کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں کہ انسان دِل کے ساتھ کس طرح اللہ کا ذکر کرے۔ متاخرین بزرگانِ دین جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ یا بعض دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر بہت سے لطائف رکھے ہوئے ہیں، جب وہ لطائف

کثرتِ ریاضت سے بیدار ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ہر وقت اللہ کا
ذکر کرتے رہتے ہیں اور یہ ملکہ مرشدِ برحق سے سیکھنے پر حاصل ہوتا ہے
اس کے علاوہ نفس کے ساتھ بھی ذکر ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین ایسا
طریقہ بھی سکھاتے ہیں کہ انسان کے جسم کے اندر جانے والی اور باہر
آنے والی ہر سانس اللہ کا ذکر کرتی ہے۔ تاہم آسان ترین ذکر لسانی ہے
امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ہر دن کے لیے کسی مومن کا ذکر
الٰہی میں حصہ اس سے کم نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ سُبْحَانَ اللّٰہِ ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۔ سو سو مرتبہ
کہے۔ بعض بزرگانِ دین اس کے ساتھ ساتھ ایک سو مرتبہ
استغفار اور ایک سو مرتبہ درود شریف پڑھنے کی تلقین بھی کرتے
ہیں۔ مشائخ چشت کے طریقے پر بیعت ہونے والے عوام کو
یہ عمل ہر روز صبح و شام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اذکار کے
تمام کلمات جو حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں یا
جو سلف صالحین سے منقول ہیں، وہ سب اطمینانِ قلب کا باعث ہیں
حصن حصین کی روایت میں آتا ہے کُلُّ مُطِیْعٍ ذَاکِرُ اللّٰہِ
یعنی اللہ کا ہر اطاعت گزار اس کا ذاکر ہے۔ یعنی اگر وہ زبان سے
ذکر نہیں بھی کرتا مگر اس کی طرف سے خدا کی اطاعت کا ہر کام
اس کی طرف سے ذکر ہی سمجھا جائے گا۔ تاہم زبانی ذکر ملتِ ابراہیمی
کا بہت بڑا اصول ہے" وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ اللہ کا ذکر ہر چیز
سے بڑا ہے۔ جب انسان اللہ کا اسم پاک اپنی زبان سے ادا
کرتا ہے تو اس پر خدا تعالیٰ کی تجلی نازل ہوتی ہے جس سے اسے
سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ آپ بزرگوں کی سوانح حیات پڑھ
کر دیکھ لیں، یہ اللہ والے دنیا کے ساز و سامان سے بے نیاز مگر سکونِ

قلب کی دولت سے مالا مال رہے ہیں۔ انہیں کوئی پریشانی اور بے چینی نہیں ہوئی کیونکہ اللہ کے ذکر سے بڑھ کر سکون والی اور کوئی چیز نہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ بعض بزرگ زیادہ تر ذکر الٰہی میں ہی منہمک رہتے ہیں۔ وہ دنیا کے لوازمات کی طرف محض اس لیے راغب نہیں ہوتے کہ اس دوران خدا تعالیٰ کی تجلی کا نزول نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔ لہٰذا وہ خدا کی تجلی کے حصول کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تاکہ ان کے سکونِ قلب کی دولت میں کسی وقت بھی کمی نہ آنے پائے۔ بہر حال سکونِ قلب کے لیے ذکر کا طریقہ بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی بدعتی یا غیر مشروع طریقہ اختیار کیا گیا۔ تو اس سے چین نصیب نہیں ہوگا کیونکہ بہتر نتیجہ صحیح راستہ اختیار کرنے سے ہی حاصل ہوگا۔

ایک اشکال

اس مقام پر بعض مفسرین نے اس اشکال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس آیت کی رو سے تو ذکرِ الٰہی اطمینانِ قلب کا باعث ہوتا ہے جب کہ سورۃ انفال کی آیت "اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکرِ الٰہی سے دل ڈر جاتے ہیں یعنی خوف طاری ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں آیات متعارض معلوم ہوتی ہیں مگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ دونوں کیفیتوں کے مراجع مختلف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن آیات میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے ان کی تلاوت سے مومنوں کے دلوں میں اطمینان پیدا ہوتا ہے اور جن آیات میں اللہ کی وعید اور اس کے عذاب کا ذکر ہے ان کی تلاوت سے اہلِ ایمان کے دل ڈر جاتے ہیں۔ گویا جس وقت خدا تعالیٰ کے عدل کا تذکرہ ہوتا ہے تو مومنوں کے دل خوف سے کانپ اٹھتے ہیں اور جب

خدا تعالیٰ کی رحمت بے پایان کا ذکر ہوتا ہے تو اہل ایمان کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان آیات میں درحقیقت کوئی تعارض نہیں ہے۔

صاحب تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ خوف اور امید اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ انسان کے دل میں یاد الٰہی سے جو انس پیدا ہوتا ہے اس میں خوف اور رجا دونوں چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ دونوں کی یکجائی کے متعلق حدیث میں مثال موجود ہے ایک نوجوان زندگی کے آخری لمحات پر تھا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے پاس تشریف لے گئے اور دریافت کیا کہ تم اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو؟ اُس نوجوان نے عرض کیا حضور! اَخَافُ ذُنُوْبِیْ میں اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور گناہوں کی وجہ سے خوفزدہ ہوں وَ اَرْجُو اللّٰہَ اور میں خدا تعالیٰ سے اس کی رحمت کی امید بھی رکھتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس شخص میں خوف اور رجا اکھٹے ہو گئے وہ یقیناً کامیاب ہو گا۔ فرمایا ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اُسے وہ چیز عطا کرے گا جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اس چیز سے بچا لے گا جس سے وہ ڈرتا ہے۔ گویا ایک کامل الایمان آدمی میں یہ دونوں چیزیں اکھٹی ہوتی ہیں۔ خدا کے عدل سے ڈر بھی ہوتا ہے اور اس کی رحمت سے اُمید بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں انبیاء علیہم السلام کی یہ صفت بیان کی گئی ہے "یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا" (انبیاء) وہ ہمیں پکارتے ہیں ہماری نعمتوں میں رغبت رکھتے ہوئے اور ہمارے جلال سے ڈرتے ہوئے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے۔ امام مجدد فرماتے

ہیں کہ ایمان کے بعد اچھے کاموں میں بنیادی طور پر عباداتِ اربعہ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے جو آدمی ایمان لانے کے بعد اِن عبادات کو انجام دے گا۔ اللہ اس کو جنت میں پہنچا دیگا۔ اگرچہ وہ گھر میں ہی بیٹھا رہے بشرطیکہ اُس کا خاتمہ انہی اعمال پر ہو۔ اس کے علاوہ صالحات ہیں ہر قسم کی بدنی، مالی، قولی اور فعلی نیکیاں شامل ہیں۔ تو فرمایا ایمان لانے کے بعد جن لوگوں نے اچھے اعمال انجام دیے طُوبیٰ لَهُمْ ان کے لیے خوشخبری ہے وَحُسْنُ مَاٰبٍ اور اچھا ٹھکانہ ہے۔ طوبیٰ کا معنی خوشخبری کے علاوہ پاکیزگی بھی آتا ہے بعض فرماتے ہیں کہ طوبیٰ جنت کے ایک درخت کا نام ہے جو اتنا لمبا چوڑا ہو گا کہ تمام جنتیوں پر چھایا ہوا ہو گا۔ بعض تفسیری روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت کا تنا حضور علیہ السلام کے گھر میں ہو گا اور اس کی شاخیں تمام بہشتوں میں سارے اہل ایمان پر سایہ فگن ہوں گی۔ بہر حال طوبیٰ کا عام فہم معنیٰ بشارت ہے۔ درخت ہونا بھی کوئی اجنبی بات نہیں کیونکہ قرآن پاک میں سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ بھی عجیب وغریب قسم کا درخت ہے جسے انسانی زندگی کے ساتھ خاص لگاؤ ہے۔ اِن چیزوں کا راز اس دنیا میں تو نہیں کھل سکتا۔ جب انسان اگلے جہان میں پہنچیں گے تو سب پردے اٹھ جائیں گے اور یہ ساری چیزیں واضح ہو جائیں گی۔

آگے کفار کی من مانی نشانیوں کے مطالبہ کے تسلسل میں ہی ذکر ہو رہا ہے کہ نہ تو نبوت اور رسالت دنیا میں کوئی نئی چیز ہے اور نہ ہی منکرین کا انکار عجیب چیز ہے۔ بلکہ یہ سلسلہ تو ابتداء سے ایسے ہی چلا آرہا ہے۔ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ اسی طرح ہم نے آپکو بھیجا ہے۔ اس آخری امت میں پہلی امتوں کی طرف

بت
ت پاک

بھی انسانوں میں سے ہی رسول بنا کر بھیجے گئے۔ انہوں نے بھی خدا کا پیغام، اس کا حکم اور شریعت لوگوں کے سامنے پیش کی مگر منکرین اسی طرح ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے رہے، یہ کوئی نیا سلسلہ نہیں بلکہ آپ کی بعثت اور لوگوں کا انکار پرانے سلسلے کی ہی آخری کڑی ہے۔ فرمایا قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ اس سے پہلے بھی بہت سی امتیں گزر چکی ہیں۔ اور سابقہ انبیاء کی طرح ہم نے آپ کو اس لیے رسول بنا کر بھیجا ہے لِتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ تاکہ آپ پڑھ کر سنا دیں ان کو وہ چیز جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے۔ کتاب الٰہی کی تلاوت انبیاء کا پہلا کام ہوتا ہے۔ سورۃ العنکبوت میں بھی موجود ہے "اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ" جو کچھ ہم نے کتاب میں سے آپ کی طرف وحی کی ہے، آپ اسے پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں۔ یہ پہلا کام ہے۔ اس کے بعد باقاعدہ تعلیم دینا، حکمت سمجھانا، لوگوں کا تزکیہ کرنا، یہ سب فرائض انبیاء اور کتاب الٰہی کے موضوعات ہیں۔ چنانچہ جب کوئی وحی نازل ہوتی تو حضور علیہ السلام تو مشہور کاتبان وحی میں سے کسی شخص کو بلا کر آیات الٰہی لکھوا دیتے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ نزول وحی کے بعد آپ گھر سے باہر تشریف لاتے اور جو آدمی ملتا اسے اللہ کا کلام سنا دیتے۔ کلام الٰہی کو پڑھ کر سنانے میں دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو مطلوبہ بات دوسروں تک پہنچ جاتی ہے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اطمینان قلب حاصل ہو اور اجر و ثواب بھی ملے۔ قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت میں یہی راز پنہاں ہے کہ ہمارا تعلق قرآن پاک سے قائم رہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے حکم کے مطابق آپ تو ان کو قرآن

پڑھ کر سناتے ہیں مگر کفار و مشرکین کی حالت یہ ہے وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ کہ وہ رحمان کا انکار کر دیتے ہیں۔

سمائےپاک

مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان کو تسلیم نہیں کرتے تھے ان کے نزدیک تو رحمان اہل یمامہ مسیلمہ کذاب تھا مگر قرآن پاک نے صاف صاف بتلایا ہے کہ رحمان اللہ تعالیٰ کی اسی طرح صفت ہے جس طرح اس کا اسم پاک اللہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں اسم ذات اللہ کے ساتھ اس کی صفات رحمان اور رحیم دونوں کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے "قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ" آپ کہہ دیں کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمان کے نام سے پکارو ایسے جس نام سے بھی پکارو "فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" اس کے سارے کے سارے نام بھلے ہیں۔ یہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ جو شخص ان کو یاد کرے گا اور ان کو پڑھتا رہے گا۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ غرضیکہ مشرکین رحمان کے نام سے بدکتے تھے اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی بجائے بِسْمِكَ اللّٰهُمَّ کہتے تھے۔ بعض مشرکین کہتے کہ یہ نبی ہمیں تو ایک اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے اور خود ساتھ رحمان کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ سب جہالت کی باتیں تھیں، مشرکین کے لغو اعتراضات تھے حالانکہ رحمان اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے اور یہ اس کا صفاتی نام ہے۔

فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے هُوَ رَبِّیْ وہ میرا پروردگار ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کو جس نام سے بھی پکارا جائے وہ راضی ہوتا ہے، اور پھر قرآن نے

یہ مسئلہ بھی بیان کر دیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا" (حٰمٓ سجدہ) اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک میں جو شخص الحاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کو بھی پہچانتا ہے۔ الحاد کا مطلب یہ ہے کہ اسمائے پاک کا غلط مطلب لیا جائے، جیسے پرویز کہتا ہے کہ اللہ سے مراد ذات اللہ نہیں بلکہ قانون مراد ہے حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے، اس کے پیچھے ایک حقیقت پوشیدہ ہے اور اس لفظ کا ذکر کرنے سے وہ حقیقت ذہن میں آتی ہے۔ اسی طرح لفظ رحمان بھی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت کو ظاہر کرتا ہے مگر مشرک لوگ اس نام کو تسلیم نہیں کرتے غرضیکہ اللہ کا معنیٰ قانون نہیں بلکہ اس نام سے اللہ کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی ذات کا تشخص نام کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔ انسان بھی ناموں سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا ذاتی نام ہے اگر لفظ اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس سے ذات مراد ہو گی اور لفظ رحمان سے یاد کیا جائے۔ تو اس سے اللہ کی صفت رحمت مراد ہوتی ہے فرمایا وہ میرا رب ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ میں اُسی پر بھروسہ کرتا ہوں وَاِلَیْهِ مَتَابِ اور ہر وقت میرا اسی کی طرف رجوع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، تمہارا رجوع خود بخود اُس کی طرف ہو جائیگا خدا کی رحمت ہر وقت متوجہ رہتی ہے لہذا اُس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسری جگہ فرمایا "اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ" (الزمر) رجوع کے لیے انصاف شرط ہے۔ ضد، ہٹ دھرمی اور عناد مشرکوں کا شیوہ اور محرومی کی علامت ہے۔

درس یازدہم ۱۱ — آیت ۳۱

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ
بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ
جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ
لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا
قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى
يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ
الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ ع ۵ ۱۰

ترجمہ :- اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے ساتھ پہاڑوں کو چلایا جاتا یا اس کے ساتھ زمین کے ٹکڑے کیے جاتے یا اس کے ساتھ مُردوں سے کلام کیا جاتا (تو پھر بھی یہ لوگ نہ مانتے)، بلکہ معاملہ سب کا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کیا مایوس نہیں ہوئے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہدایت دے دے سب لوگوں کو۔ اور برابر رہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پہنچتی رہے گی اُن کو اس وجہ سے جو انہوں نے کیا، کھٹکھٹانے والی چیز۔ یا اترے گی وہ ان کے گھروں سے قریب یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے۔ بیشک اللہ تعالےٰ

نہیں خلاف کرتا وعدے کا (۳۱)

ربط آیات
یہ آیت بھی گذشتہ آیات کے ساتھ ہی مربوط ہے۔ کافر اور مشرک لوگ من مانی نشانیاں طلب کرتے تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ ضدی اور عنادی لوگ ہیں، انہیں حقیقت کی طلب نہیں ہے، اس لیے انہیں راہِ راست نصیب نہیں ہو سکتا۔ صراطِ مستقیم کے حقدار وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی طرف رجوع رکھتے ہیں اور ہدایت کے طالب ہوتے ہیں۔ گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اطمینانِ قلب کا نسخہ بھی بتلا دیا کہ یہ ذکرِ الٰہی ہی ہے جو دلوں کے سکون کا باعث بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے انجام کا ذکر بھی فرمایا۔ حضور علیہ السلام کے لیے تسلی کا مضمون بھی نازل فرمایا کہ کفار و مشرکین کی طرف سے مخالفت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو آخری نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے، اسی طرح آپ سے پہلے بھی بہت سی امتیں گزر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بھی ہادی بھیجے مگر وہ لوگ اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے مخالفت پر اڑے رہے۔ اللہ نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کی طرف سے مخالفت کی پروا کیے بغیر اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں اور اپنا تبلیغی مشن جاری رکھیں اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔

شانِ نزول
آج کا درس مشرکین کے اعتراضات کے جواب میں ہی ہے وہ لوگ طرح طرح کے مطالبات کرتے تھے، مثلاً یہ کہ آپ اس قرآن کے ذریعے مکے کے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دیں، یہاں پر زمین ہموار ہو جائے اور ہم یہاں کھیتی باڑی کر سکیں، وہ یہاں پر نہریں جاری کرنے کا مطالبہ بھی کرتے تھے نیز یہ بھی مطالبہ کرتے کہ آپ اس قرآن کے ذریعے زمین کے ٹکڑے کر دیں یا ہمارے

فوت شدہ آباؤ اجداد کو زندہ کر دیں تاکہ ہم ان کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ مشرکین ایمان لانے کے لیے اس قسم کی شرائط اور بیہودہ اعتراضات پیش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آج کے درس میں مشرکین کی غلط فرمائشوں کا رد فرمایا ہے اور اُن کو جواب دیا ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب قرآن کریم اس قسم کی فرمائشوں کی تکمیل کے لیے نازل نہیں کی بلکہ اس کتاب کو اللہ نے ذریعہ ہدایت بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر کامیابی کی منزل حاصل کر سکیں۔

قرآن ذریعہ ہدایت

ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اس کے ذریعے پہاڑوں کو چلایا جاتا اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ یا اس کے ذریعے زمین کے ٹکڑے کر دیے جاتے اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى یا مُردوں سے باتیں کی جائیں مگر اللہ نے اپنی کتابیں اس مقصد کے لیے نازل نہیں فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام کتب سماویہ اور صحائف کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ یہ قرآن پاک بھی اللہ کی آخری کتاب ہے اور دیگر کتب کی طرح منبع رشد و ہدایت ہے، مگر اس سے جھاڑ پھونک کا کام نہیں لیا جا سکتا کہ اس کو دم کر کے لوگوں کی فرمائشیں پوری کی جائیں۔ یہ کتاب تو گمراہی کو دور کر کے نیکی اور ہدایت کی طرف بلانے والی چیز ہے۔ اس کے ذریعے کفر و شرک مٹتا اور ایمان آتا ہے۔ ظلم و جور کی جگہ عدل و انصاف لیتا ہے، نجاست کی بجائے پاکیزگی، اور بداخلاقی کی جگہ اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں۔ نزول قرآن کا مقصد خود قرآن کی زبان سے یہ ہے "كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ" (ص)

ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں، اس پر عمل پیرا ہوں اور دانا لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ سورۃ ابراہیم کی ابتداء میں ہی قرآن کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے "لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" تاکہ اس کے ذریعے آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ کفر، شرک، بدعات، معاصی وغیرہ سب ظلمات ہیں، ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قرآن پاک کو اپنانا ہوگا۔ اس کے بغیر ایمان اور توحید کی روشنی نصیب نہیں ہو سکتی۔

قرآن کا مفہوم

اس مقام پر قرآن سے مراد قرآن پاک بھی ہے اور مطلق کتاب بھی۔ قرآن کے لغوی معنی پڑھی جانے والی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ چاروں کتب اور صحائف پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا میں بھی قرآن کے متعلق یہی لکھا ہے کہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے، اور یہی اس کے برحق ہونے کی علامت ہے۔ حدیث شریف میں قرآن کا اطلاق زبور پر بھی کیا گیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر قرآن کا پڑھنا آسان کر دیا تھا۔ آپ علیہ السلام اپنے خادم کو حکم دیتے کہ گھوڑے کو اصطبل سے نکال کر اس پر زین ڈالو، یہ حکم دے کر آپ زبور کی تلاوت شروع کر دیتے اور جب تک خادم گھوڑے کو سواری کے لیے تیار کرتا۔ آپ پوری زبور کی تلاوت کر لیتے۔ قرآن کریم کے متعلق بھی آتا ہے کہ بعض حضرات پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہوتی ہے جو تھوڑے وقت میں بہت زیادہ تلاوت کر لیتے ہیں۔ بعض بیچارے

زیادہ وقت میں بھی تھوڑی سی تلاوت کر پاتے ہیں۔ بہر حال یہ اللہ کی دین اور اس کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے کلام کی تلاوت میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

الغرض! اس مقام پر اگر قرآن سے مراد مطلق کتاب لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی کتاب سے پہاڑوں کو چلانے، زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے یا مردوں سے ہم کلام ہونے کا کام لیا جا سکتا تو قرآن پاک سے تو بطریق اولیٰ ایسا ہو سکتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے کوئی بھی کتاب یا صحیفہ اس مقصد کے لیے نازل نہیں فرمایا کہ اس سے لوگوں کی فرمائشیں پوری کی جائیں بلکہ اللہ کی کتابیں تو منبع رشد و ہدایت ہیں، جو ان کی طرف رجوع کرے گا اُسے راہِ راست میسر آجائے گا جس پر چل کر اللہ کی رحمت کے مقام میں پہنچ جائے گا۔

فرمایا، یہ قرآن اللہ نے تمہاری خواہشات کی تکمیل کے لیے نازل نہیں فرمایا بَل لِّلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا بلکہ معاملہ سارے کا سارا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ چاہے تو پہاڑوں کو چلا سکتا ہے مگر اُس مالک الملک نے یہ کتاب نازل فرما کر پہاڑوں کی طرح کفر و شرک پر جمے ہوئے لوگوں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر انوار و تجلیات کی وادیوں میں پہنچا دیا ہے اور اُن کے دلوں میں جمی ہوئی برائیوں کو اکھاڑ کر رکھ دیا ہے اور وہاں پر نورِ ایمان اور معرفت کے چشمے جاری کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرح منجمد رسومات باطلہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور مردہ قوموں اور مردہ دلوں کو ابدی زندگی عطا کر دی ہے قرآن تو اس مقصد کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اللہ نے سورۃ یونس میں قرآن پاک کا ایک

مقصد یہ بھی بتایا ہے "قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ" یہ تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور تمام روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے انسان کی تمام عقلی اور روحانی ضروریات اسی قرآنِ پاک کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔

اجتماعی ہدایت

شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جب کافر و مشرک طرح طرح کی فرمائشیں پیش کرتے تو بعض مسلمانوں کے دلوں میں بھی خیال پیدا ہوتا کہ اگر ان کی خواہش پوری کر دی جائے تو شاید یہ ایمان لے آئیں مگر اللہ نے اہلِ ایمان کو تنبیہ فرمائی کہ دل میں ایسا خیال نہ لائیں، یہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں، اگر ان کی فرمائش پوری کر بھی دی جائے تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ سورۃ انعام میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ تمام نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں، وہ جسے چاہے ظاہر کر دے۔ مگر تمہیں کیا معلوم ایمان والو! اگر ان کے پاس نشانیاں بھی آجائیں تو یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ ضدی اور عنادی لوگ ہیں اور اپنی ہٹ دھرمی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔

فرمایا اَفَلَمْ يَا۟يْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کیا اہلِ ایمان اس بات سے مایوس نہیں ہوئے اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا تو سب کے سب لوگوں کو ہدایت دے دے۔ خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ چاہے تو تمام انسانوں کو جبراً ہدایت کے راستے پر ڈال دے مگر

یہ چیز اسکی حکمت اور مصلحت کے خلاف ہے اللہ تعالےٰ نے ایمان کا معاملہ خود انسان کی صوابدید پر چھوڑ رکھا ہے اس نے حق و باطل میں امتیاز بتلا کر فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا ہے " فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف) چاہے تو ایمان قبول کرے اور چاہے تو کفر پہ اڑا رہے۔ وہ جو بھی راستہ اختیار کریگا۔ اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ البتہ کسی سے زبردستی کوئی چیز منوانا اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف ہے وہ تو انسان کو ہر طریقے سے آزماتا ہے " وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً " (الانبیاء) وہ برائی کے ساتھ بھی آزماتا ہے اور نیکی کے ساتھ بھی۔ پھر جو اس کے معیار پہ پورا اترتا ہے۔ کامیابی کا حقدار وہی ہوتا ہے۔ الغرض! اجتماعی ہدایت اللہ تعالےٰ کی مشیت کے خلاف ہے۔ ہدایت کا حصول ہر شخص کی اپنی صلاحیت اور طلب پر منحصر ہے۔

ییٔس کے معانی

یایئس کا عام فہم معنیٰ تو مایوسی ہے، تاہم شاہ عبدالقادرؒ اس لفظ کا ترجمہ "خاطر جمع کرانا" کرتے ہیں مطلب یہ کہ کیا ان اہل ایمان کے لیے خاطر جمع نہیں ہوئی۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو سب کو ہدایت دے دے یعنی ہدایت پہ مجبور کر دے بعض مفسرین فرماتے ہیں یایئس کا معنیٰ الیقینی بات ہے اور اس طرح جملے کا مفہوم یہ ہو گا کہ کیا اہل ایمان کے لیے یہ یقینی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ چاہے تو سب کو ہدایت دے دے مگر وہ ایسا نہیں کرے گا، اہل ایمان کو مشرکین سے ایمان کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

اہل لغت کہتے ہیں کہ قبیلہ نخع کی زبان میں یایئس کا معنیٰ جاننا بھی ہوتا ہے اور جملے کا مفہوم یہ ہے کہ کیا اہل ایمان

نے اس بات کو نہیں جانا کہ اگر اللہ چاہے تو سب کو راہ راست پر لے آئے مگر یہ اس کی حکمت کے منافی بات ہے۔ اس لفظ کو اُردو زبان میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور یاس کو نا امیدی کے معنوں پر محمول کیا جاتا ہے۔
اصغر شاعر کہتا ہے ؎

یاس اک جنوں ہوشیاری   امید فریب زندگی کا

جنوں ہوشیاری یہ ہے کہ انسان کو قطعی طور پر یقین ہو جائے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ یاس زندگی کا ایک جنون ہے اور امید محض دھوکہ ہے انسان ساری زندگی امید کے دھوکے میں مبتلا رہتا ہے مگر بسا اوقات اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بہر حال ہدایت کا فائدہ اُسی کو حاصل ہوگا جو اپنی مرضی سے اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت پر مجبور نہیں کرتا۔

کفار کے لیے دائمی مشکلات

فرمائشیں کرنے والے ازلی منکرین کے متعلق اللہ نے فرمایا وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا اور ہمیشہ رہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا۔ تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ پہنچے گی اُن کو اُن کے کیے کی وجہ سے کھٹکھٹانے والی چیز۔ گویا ایسے لوگوں کو امن و سکون نصیب نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمیشہ مشکلات میں گھرے رہیں گے۔ یا تو جنگ و جدل میں مصروف رہیں گے۔ یا بیرونی حوادثات کا شکار ہوں گے۔ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ یا وہ کھٹکھٹانے والی چیز ان کے گھروں کے قریب اترے گی یا اُن پر پڑے گی جس کی وجہ سے وہ ہر وقت خوف میں مبتلا رہیں گے، گویا اُن کو ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت کا کھٹکا لگا رہے گا۔ چنانچہ مشرکین عرب ہمیشہ لڑائی کے خوف میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا۔ اُن کے گھروں کے قریب مصیبت اُترنے کی مثال ۶ھ کا واقعہ حدیبیہ ہے حضور علیہ السلام پندرہ سو جانبازوں کے ساتھ حدیبیہ کے

مقام پہ اترے جسکی وجہ سے مکے والوں میں ہلچل مچ گئی اور آخر کار یہ معاملہ ایک معاہدے کے تحت طے ہوا۔ الغرض! تحلّ اگر مخاطب کا صیغہ ہو تو معنیٰ ہوگا کہ آپ اتریں اور اگر غائب کا صیغہ تسلیم کیا جائے تو اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ ان کے گھروں کے قریب کوئی آفت یا مصیبت اترے۔

جب کسی علاقے میں آفت نازل ہوتی ہے تو یہ قریبی علاقے والوں کے لیے باعثِ عبرت ہوتی ہے۔ آج ہمارے قریب مشرقی پنجاب میں سکھوں پر مصیبت پڑی ہوئی ہے تو اس سے ہمیں بھی عبرت پکڑنی چاہیئے۔ ذرا ۳۵ سال پہلے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں، ان ظالم سکھوں نے مسلمانوں پر کتنے ظلم کیے۔ اللہ کے گھروں کی بے حرمتی کی، مسجدوں کو اصطبل اور بیت الخلا بنایا، مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی، مگر آج ان کے گوردوارے کا حال بھی ملاحظہ کر لیں۔ ان کے مقدس مقام کی بے حرمتی ہوئی، گولی چلی اور سینکڑوں سکھ مارے گئے۔ تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی ہے، اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ ادھر گذشتہ پانچ سال سے روس ہماری سرحدوں پر دستک دے رہا ہے۔ افغانوں پر مظالم ڈھا رہا ہے مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہمیں اس بات کی فکر ہونی چاہیئے کہ ہمارے قریب نازل ہونے والی آفت کہیں ہم پر بھی نہ آپڑے۔ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں جو انقلاب آیا تھا اس میں دو کروڑ انسان ہلاک ہوئے۔ بڑے بڑے باعزت آدمیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر تین تین میل تک گھسیٹا گیا۔ اپنے قریب مصیبت دیکھ کر انسان کو تنبیہ ہونی چاہیئے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنا چاہیئے ظلم و زیادتی سے تائب ہو جانا چاہیئے۔ ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جو

دشمن کو حملہ کرنے کی دعوت دے۔ اندرونی طور پر طوفان اور زلزلے بھی آسکتے ہیں۔ یہ بھی انسانوں کو جھنجوڑتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے، اللہ سے معافی مانگ لیں۔

مسلمانوں کے لیے عبرت

بنیادی طور پر تو یہ کافروں کا حال بیان کیا گیا ہے مگر یہ مسلمانوں کے لیے بھی مقامِ عبرت ہے۔ ابتدائی دور میں مصیبت کفار کے گھروں کے قریب اترتی رہی جس میں ان کے لیے تنبیہ تھی مگر آخر کار یہ مصیبت خود اُن پر بھی آن پڑی۔ اسی لیے فرمایا کہ انسان کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ آجائے۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ساتھ اللہ کا وعدہ یہ تھا کہ وہ اسلام کو غالب کرے گا، چنانچہ اللہ نے وہ وعدہ پورا کر دیا۔ خلافتِ راشدہ قائم ہوئی اور آدھی دنیا پر مسلمانوں کو کنٹرول حاصل ہوگیا، اور باقی آدھی دنیا ساڑھے چھ سو سال تک مغلوب رہی، کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر جب مسلمانوں میں انحطاط پیدا ہوا، کافروں نے سر اٹھایا اور مسلمان مغلوب ہوتے چلے گئے۔

وعدے کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جب یہ دنیا ختم ہوگی تو دوسری دنیا قائم ہوگی۔ اللہ نے یہ بھی وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا، پھر جزائے عمل کی منزل آئیگی اور ہر ایک کے متعلق فیصلہ کر دیا جائے گا۔ موت کا وعدہ انسان کے لیے انفرادی طور پر آتا ہے اور پھر اجتماعی طور پر فنا کا وعدہ اُس وقت پورا ہوگا۔ جب قیامت برپا ہو جائیگی کائنات کی تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی اور پھر نئی دنیا اور نیا نظام قائم ہوگا۔ ایسے ہی وعدے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَعْدًا

عَلَيْنَا (انبیاء) ہمارا وعدہ برحق ہے "اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝" ہم اس نظام کو تبدیل کر کے دوسرا نظام ضرور لائیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ بیشک اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتا اُس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾
اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ
وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ
بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ
الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ
وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ
فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ وَمَا لَهُمْ
مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ
وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ
اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق ٹھٹھا کیا گیا رسولوں کے ساتھ آپ سے پہلے۔ پس میں نے مہلت دی اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا۔ پھر میں نے پکڑا اُن کو، پس کیسی تھی سزا ﴿۳۲﴾ بھلا وہ ذات جو قائم ہے ہر ایک نفس

اللہ کے لیے شریک - آپ کہہ دیجئے ، اُن کے نام لو ۔ کیا تم بتلاتے ہو اُس کو وہ جو نہیں جانتا وہ زمین میں، یا سرسری بات ۔ بلکہ مزیّن کیا گیا ہے اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا اُن کا مکر - اور روکے گئے ہیں وہ راستے سے ۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے پس نہیں ہے اُس کو کوئی ہدایت دینے والا ۳۳ اُن لوگوں کے لیے عذاب ہے دنیا کی زندگی میں ، اور آخرت کا عذاب بہت سخت ہے ۔ اور نہیں ہوگا اُن کے لیے اللہ سے کوئی بھی بچانے والا ۳۴ مثال (اور حال) اُس جنت کا جس کا وعدہ کیا گیا ہے متقیوں کے ساتھ ، جاری ہیں اُس کے سامنے نہریں - اور پھل اُس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں اور اُس کا سایہ بھی - یہ ہے انجام اُن لوگوں کا جو ڈرتے رہے ۔ اور انجام کفر کرنے والوں کا جہنم کی آگ ہے ۳۵

ربط آیات

گذشتہ آیات میں مشرکین کی تردید کے متعلق دو باتیں بیان ہو چکی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ کفار و مشرکین اللہ کے نبی سے من مانی نشانیاں طلب کرتے تھے اور یہ مطالبہ کسی اشتباہ کی وجہ سے نہیں بلکہ محض ضد اور عناد کی وجہ سے ہوتا تھا ۔ اُن کا منصوبہ یہ ہوتا تھا کہ اپنی خواہش کی نشانیاں طلب کی جائیں اور جب آپ پیش نہ کر سکیں تو آپ کا تمسخر اڑایا جائے ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ٹھٹھا کیا گیا ، اور آپ کے ساتھ یہ سلوک کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ اللہ نے فرمایا کہ میں نے ایسے لوگوں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دی اور پھر بالآخر انہیں سخت عذاب میں مبتلا کیا ۔ فرمایا آپ کے مخالفین کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اللہ کی ڈھی

ہوئی مہلت سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں، ورنہ سابقہ اقوام کی طرح وہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

اب اللہ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ ان لوگوں کی بے عقلی کا حال ملاحظہ کریں کہ خدا تعالیٰ کی ہستی ایسی ہے جو ہر چیز پہ قائم اور نگران ہے، وہ قادرِ مطلق ہے، ہر قسم کا تصرف اسی کو حاصل ہے مگر یہ لوگ اس ذات کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو شریک بناتے ہیں، حالانکہ ان شرکاء کا نہ کوئی اختیار ہے اور نہ وہ کسی چیز پہ تصرف رکھتے ہیں، نہ وہ کسی کی حاجت کو جانتے ہیں، نہ ان کے پاس علم ہے۔ بلکہ وہ تو عاجز مخلوق ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو خدا کا شریک بنانا کتنی بیوقوفی اور حماقت ہے۔

استہزائے رسل

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ البتہ تحقیق ٹھٹھا کیا گیا بہت سے رسولوں کے ساتھ آپ سے پہلے۔ فرمایا یہ تو پرانے جاہلوں اور کافروں کا دستور ہے کہ وہ اپنے انبیاء کو تمسخر کا نشانہ بناتے رہے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مگر آپ تسلی رکھیں کہ یہ لوگ اپنا کام کرتے رہیں گے، مگر ان کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ٹھٹھے کا مسئلہ تو یہ ہے کہ کسی مسلمان کا تمسخر اڑانا کبیرہ گناہ اور حرام ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ وَلَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْ اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑا نہ کرو اور نہ اس کے ساتھ استہزا کرو۔ فرمایا ایسا وعدہ بھی نہ کرو جسے پورا نہ کر سکو مگر یہ خرابیاں معاشرہ میں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ تو وہ کہنے لگے، کیا تو ہمارے ساتھ ٹھٹھا کرتا ہے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا " اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ

الجٰھلین (البقرہ) خدا کی پناہ! کہ میں جاہلوں میں سے بن جاؤں
کیونکہ ٹھٹھا کرنا تو جاہلوں کا کام ہے۔ میں تو اللہ کا نبی ہوں اور اُس
کا حکم پہنچا رہا ہوں۔ غرضیکہ عام مسلمانوں کے ساتھ ٹھٹھا کرنا جس سے اُس
کی تحقیر مقصود ہو، حرام ہے اور اللہ کے نبی کے ساتھ یہ سلوک کرنا تو کفر
ہے۔ نبی کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے
اللہ نے آپ علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ سے پہلے بھی
رسولوں کا مذاق اڑایا گیا فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا پھر میں نے
کفر کرنے والوں کو مہلت دی ثُمَّ اَخَذْتُھُمْ پھر میں نے
اُن کو پکڑ لیا، مہلت مل جانے سے انسان کو مغرور نہیں ہو جانا چاہئے
کہ وہ دندناتا پھرے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ مجرمین کو پہلے مہلت
دیتا ہے، پھر جب وہ اپنی نافرمانیوں سے باز نہیں آتے تو ان کو
پکڑ لیتا ہے۔ فرمایا، میں نے استہزاء کرنے والوں کو پکڑ لیا
فَکَیْفَ کَانَ عِقَابِ، پھر دیکھو! میری گرفت کیسی تھی۔ میں
نے اُن کو کیسی سزا دی۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے لوگوں کو تنبیہہ
کی جا رہی ہے کہ تم بھی اللہ تعالیٰ کے قانونِ امہال میں ہو۔ وہ جب
چاہے گا پکڑ لیگا اور پھر عبرت ناک سزا دیگا۔

ارشاد ہوتا ہے اَفَمَنْ ھُوَ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ
بھلا وہ ذات جو قائم یعنی نگران ہے ہر نفس پر بِمَا کَسَبَتْ
جو اُس نے کمایا ہے۔ قائم کا معنی خود قائم اور دوسروں کو قائم رکھنے
والا ہے اور نگران کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں
حفیظ اور وکیل کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کائنات کی تمام
چیزوں کی حفاظت کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ ہر چیز کی نگرانی
کر رہا ہے۔ اس کی نظروں سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہے سورۃ فجر

میں ہے " اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ " بے شک تیرا پروردگار گھات میں ہے۔ جس طرح شکاری اپنے شکار کی گھات میں رہتا ہے اور جب اُسے غافل پاتا ہے تو پکڑ لیتا ہے، اسی طرح خدا تعالیٰ کی گھات اور نگرانی بھی باریک، قائم اور دائم ہے۔ بہر حال فرمایا کہ ہر نفس جو بھی کام کرتا ہے اُس پر خدا کی نگرانی اور حفاظت قائم ہے۔ وہ علیم کل، قادر مطلق اور مختار کل ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ فرمایا ایسی ہستی کو چھوڑ کر جَعَلُوا لِلّٰہِ شُرَكَاءَ اُن کفار و مشرکین نے اللہ کے شریک بنا لیے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں کی حماقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نیز فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں سَمُّوْهُمْ ان شریکوں کے نام تو لو۔ بھلا بتلاؤ تو سہی کہ وہ کون ہیں جنہیں تم نے خدا کی صفت میں شریک کر رکھا ہے۔ پھر یہ بھی بتاؤ کہ ان شریکوں کو کیا اختیار حاصل ہے اور وہ لوگوں کے نفع نقصان کے کہاں تک مالک ہیں۔ یہ کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ لوگوں نے ایسی ہستیوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جو نہ قائم ہیں نہ دائم ہیں۔ نہ علیم کل ہیں، نہ قادر مطلق اور نہ حاضر و ناظر وہ تو عاجز مخلوق اور محتاج ہیں، وہ خدا کے شریک کیسے ہو سکتے ہیں؟

فرمایا اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ کیا تم اس اللہ تعالیٰ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو تم نے اللہ کے شریک بنا رکھا ہے اُن کی شراکت تو ثابت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا کے علم میں ہوتا۔ تو گویا تم ایسی چیز کے متعلق بتلانا چاہتے ہو جو خدا کے علم میں نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک سرے سے موجود ہی نہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسی

ہستی کو خدا کا شریک بناتے ہو جس کو زمین میں موجود ہر چیز کا علم ہی نہیں۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ کون کس حال میں ہے، اس کی کیا حاجت ہے اور وہ کس طرح پوری کرنی ہے۔ تو کیا تم ایسی ہستیوں کو خدا کے شریک بناتے ہو جن کا علم ہی محدود اور قلیل ہے۔ بھلا ایسی ہستی خدا کا شریک ہو سکتی ہے؟ یہ تو نہایت ہی حماقت کی بات ہے۔

حقیقت نہیں

فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کو وہ چیز بتلاتے ہو جس کو وہ زمین میں نہیں جانتا اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ یا سرسری سی بات بنا رہے ہو۔ شاہ عبدالقادرؒ اپنے ترجمے میں ظاہر کا معنیٰ ایسی بات کرتے ہیں جس کے تحت کوئی حقیقت نہ ہو۔ یہ شریک بنانے والی بات محض اوپری سی ہے جس میں کوئی صداقت نہیں۔ کسی کو اللہ تعالےٰ کی عبادت میں شریک بنایا جائے یا تدبیر میں، یہ ایک لغو بات ہے اور اسی کو بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ سے تعبیر کیا گیا ہے عربی زبان میں ظاہر کا لفظ زائل یا باطل ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ یا تم ایسی بات کرتے ہو جو باطل محض ہے۔ عربی ادب میں یہ لفظ مختلف اشعار میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

اَعَیَّرْتَنَا اَلْبَانَهَا وَلُحُوْمَهَا
وَ ذٰلِكَ عَارٌ یَا ابْنَ رَیْطَةَ ظَاهِرٌ

تم نے ہمیں طعن دیا ہے کہ ہم اونٹوں کی دیکھ بھال میں ہی لگے رہتے ہیں اور لڑائی لڑنا نہیں جانتے۔ یہ عار باطل ہے، جب ہم اس کی حقیقت بیان کریں گے تو تمہارا طعن باطل ہوگا ؎

وَعَیَّرَهَا الْوَاشُوْنَ اِنِّیْ اُحِبُّهَا
وَتِلْكَ شَکَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا

لوگوں نے اس کو بھڑکایا کہ میرا اُس کے ساتھ تعلق ہے۔ یہ ایسی شکایت ہے جس کا عار دلانا باطل ہے۔

بہر حال ظاہر کا معنیٰ اوپری بات ہو یا باطل چیز ہو، دونوں معانی درست ہیں۔ آپ دیکھ لیں شرکیہ رسم و رواج میں پھنسے ہوئے لوگ محض سرسری اور اوپری باتیں کہتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ بعض لوگ برادری یا ملکی رواج میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی نے کوئی بات پکڑ لی اور کسی نے کوئی۔ ان میں بنیادی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ محض ایک دوسرے سے سنی سنائی بات پر عمل کرنے لگتے ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ میں نے درخت کے ساتھ دھاگا باندھا تھا تو میری مراد پوری ہو گئی، کسی نے کہا کہ فلاں قبر پر چادر چڑھانے سے بچہ پیدا ہو گیا اور کسی نے کہا کہ فلاں پیر کی نذر ماننے سے بیماری دُور ہو گئی۔ ایسی باتوں کی بنیاد نہ عقل پر ہوتی ہے اور نہ فطرت پر۔ لوگ محض بے بنیاد باتوں کے پیچھے چل نکلتے ہیں۔

حدیث شریف میں زید ابن عمرو ابن نفیل کا واقعہ ملتا ہے کہ وہ کعبے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور لوگوں کو شرک میں مبتلا دیکھ کر کہتے، خدا کے بندو! تم جو کچھ کر رہے ہو، غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ کفر کرنے والے بے عقل ہیں۔ ان کے شرکیہ افعال عقل اور فطرت کے خلاف ہیں۔ اس کے برخلاف ایمان اور توحید کی بنیاد پختہ دلائل پر ہے جو کہ عقل اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہیں۔ رسم و رواج اور بدعات علاقائی چیزیں ہیں۔ ہر ملک، ہر خطے اور ہر علاقے کے اپنے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں اسی طرح میدانی علاقوں کی ______ بدعات اور پہاڑی علاقوں کی بدعات میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کتاب و سنت کے خلاف اور محض شیطان کا جھانسہ ہوتی ہیں مگر افسوس کا مقام

ہے کہ لوگ انہی امور کو عبادت اور کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔
ایسے ہی اعمال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ بلکہ کفار کے مکر و فریب اُن کے لیے مزین کیے گئے ہیں۔ دوسرے مقام پر کفار کے اعمال کا ذکر بھی ہے کہ اُن کے لیے مزین کیے گئے ہیں۔ اُن کے تمام قبیح اعمال کو شیطان مزین کر کے دکھاتا ہے کہ تم بہت اچھے کام کر رہے ہو۔ قبروں پر انجام دیے جانے والے تمام شرکیہ اعمال کو کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ عرس، میلاد، قوالی وغیرہ نہایت عقیدت و احترام سے منائے جاتے ہیں، گویا کہ آخرت کا دارومدار انہی چیزوں پر ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ شیطان کافروں کو ان کے قبیح کام مزین کر کے دکھاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ انہیں انجام دیتا رہتا ہے حتیٰ کہ اُس کا آخری وقت آجاتا ہے اور وہ اِن کفریہ اور شرکیہ امور پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔
وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ اور ایسے لوگ راہِ راست سے روک دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو غلط کام کو اچھا سمجھ کر کرنے لگے، اُس کے نزدیک حق و باطل کا امتیاز اٹھ جائے تو وہ سیدھے راستے پر کیسے آسکتا ہے؟ گویا اُس کے قبیح اعمال اُسے صراطِ مستقیم سے روک رہے ہیں۔ اگر خدا تک پہنچنا ہے تو پھر تمام باطل عقائد، بدعات اور باطل رسم و رواج کو ترک کر کے حقیقت، ایمان اور توحید کو اپنانا ہوگا، اگر اس میں کامیاب ہوگیا۔ تو راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی اور حقیقی منزل قریب آجائے گی۔ برخلاف اس کے جو شخص غلط رسم و رواج اور بدعات پر کھڑا رہے گا، وہ گمراہی میں پڑا رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص اپنی بداعمالی کی وجہ سے

گمراہ ہوجاتا ہے اس کے راہِ راست پر آنے کی امید ختم ہوجاتی ہے اسی لیے فرمایا وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے، اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں اللہ تعالیٰ انسان کو قوت، توانائی، عقل، فہم اور ادراک عطا کر کے اختیار دے دیتا ہے کہ وہ حق اور باطل میں سے جونسا راستہ چاہے اختیار کر لے۔ اس کے بعد جو شخص راہ راست کی بجائے غلط راستے پر چل نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى" (النساء) ہم اس کو اسی طرف پھیر دیتے ہیں۔ جس طرف وہ جانا چاہتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ہم اسے جہنم میں داخل کر دیتے ہیں "وَسَآءَتْ مَصِيْرًا" جو کہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ غرضیکہ جو کوئی شخص رسول کی مخالفت کرتا ہے اور ایمان والوں کے راستے سے علیحدہ ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہو، چلے جاؤ۔ ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ ایسا شخص غلط راستے پر چل کر بالآخر جہنم کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔

فرمایا لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ان لوگوں کے لیے دنیا میں بھی سخت عذاب ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے مشرکین عرب کو اسی دنیا میں سزا دی۔ آٹھ نو سال تک اہلِ ایمان سے برسرپیکار رہے۔ لڑتے مرتے رہے شکست کھاتے رہے، تباہ و برباد ہوئے اور آخر کار سارا ملک کفر و شرک سے پاک ہوگیا۔ جب مکہ فتح ہوگیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اب یہ دار السلام بن گیا ہے۔ جنگ کے علاوہ بھی یہ لوگ کبھی وبائی امراض میں مبتلا ہوتے کبھی قحط پڑ گیا۔ طوفان آگیا۔ زلزلے

آئے اور نہایت خوف کی زندگی گذارتے رہے۔ فرمایا یہ تو ان کی زندگی کا حال ہے وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی شدید ہے۔ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ اور پھر انہیں اللہ کے سامنے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں تو ناجائز ذرائع اختیار کر کے بچتے رہے۔ کبھی قانون کی نظروں سے غائب ہو گئے، کبھی وکیل نے کوئی اہم نکتہ پیش کر کے بچا لیا، کبھی جج نے رعایت دے دی اور کبھی سفارش اور رشوت چل گئی، مگر اللہ کی عدالت میں ایسا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوگا۔ اور وہ سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

قرآن پاک کے اسلوب بیان کے مطابق کفار کی سزا کے بعد اب متقین کے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اس جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔ مثال سے مراد بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے۔ یعنی وہ جنت جو ڈرنے اور بچنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے اس کی تعریف یہ ہے، اور متقین وہ ہیں جو پہلے نمبر پر کفر، شرک اور نفاق سے بچتے ہیں۔ پھر کبائر سے اور درجہ بدرجہ صغائر سے بھی بچتے ہیں۔ اور جیسا کہ امام شاہ ولی اللہ رح فرماتے ہیں کہ تقوٰی کی انتہا یہ ہے "محافظت برحدود شرع" یعنی شریعت کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرنا کسی بھی معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرنا۔ سورۃ توبہ میں مومنوں کی ساتویں صفت بھی بیان کی گئی ہے "وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ" کہ وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان سے تجاوز نہیں کرتے اور ان کے خلاف نہیں چلتے۔ فرمایا جس جنت کا متقیوں کے لیے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کے

سامنے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ایسے باغات ہوں گے اُكُلُهَا دَآئِمٌ کہ ان کے پھل دائمی ہوں گے، جو کبھی ختم نہیں ہوں گے، جونہی جنتی کے دل میں کوئی پھل کھانے کی خواہش پیدا ہوگی، پھل فوراً اس کے قریب آجائے گا۔ سورۃ واقعہ میں موجود ہے کہ وہاں پر کثیر تعداد میں پھل ہوں گے۔ "لَا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ" نہ ان کو ختم کیا جائے گا اور نہ روکا جائیگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مومن کسی درخت سے پھل حاصل کرے گا۔ تو اُس درخت پر اسی وقت پہلے کی جگہ دوسرا پھل پیدا ہوجائے گا۔ غرضیکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا انعام ہوگا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

فرمایا ایک تو پھل دائمی ہوں گے وَظِلُّهَا اور اُس جنت کا سایہ بھی دائمی ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جنت کی کیفیت یہ ہوگی۔ کہ وہاں پر نہ تو دھوپ ہوگی اور نہ ابر، وہاں کا موسم نہایت خوشگوار ہوگا۔ جس میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ سورۃ دہر میں اللہ نے جنتیوں کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ وہ تکیوں پر ٹیک لگائے ہوں گے "لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا" وہ وہاں پر نہ دھوپ دیکھیں گے اور نہ سردی بلکہ نہایت ہی معتدل موسم ہوگا، گرمی اور سردی کا کوئی احساس نہیں ہوگا، لہذا کہہ سکتے ہیں کہ وہ سائے میں ہمیشہ رہیں گے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سائے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اہل ایمان جن پر تجلیاتِ الٰہی کا نزول، اسمائے مبارکہ اور صفاتِ الٰہی کا ظہور ہو رہا ہوگا۔ بعض اوقات ان کا سائے میں رہنے کو جی چاہے گا، تو ان کو وہاں سایہ محسوس ہوگا۔ حالانکہ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ فرمایا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا یہ ان لوگوں کا انجام ہوگا جو ڈرتے رہے اور منکرات سے

بچتے رہے، فرمایا، یاد رکھو! وَعُقْبَی الْکٰفِرِیْنَ النَّارُ اور کافروں کا انجام جہنم کی آگ ہوگا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ
قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ
اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ
حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ
وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع ۵

ترجمہ :- اور وہ لوگ جن کو دی ہے ہم نے کتاب خوش ہوتے ہیں اُس چیز پر جو اتاری گئی ہے آپ کی طرف ۔ اور بعض فرقوں میں سے وہ ہیں جو اس کی بعض باتوں سے انکار کرتے ہیں ۔ آپ کہہ دیجئے ، بیشک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں ۔ اسی کی طرف میں دعوت دیتا ہوں اور اس کی طرف میرا لوٹ کر جانا ہے ﴿۳۶﴾ اور اسی طرح اتارا ہے ہم نے اس کو ایک فیصلہ عربی زبان میں اور اگر آپ پیروی کریں گے ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے ، تو نہیں ہو گا آپ کے لیے اللہ کے سامنے کوئی حمایت کرنیوالا

اور نہ کوئی بچانے والا (۳۷)

آیات
مکی سورتوں میں زیادہ تر بنیادی حقائق کا ذکر ہے اور جزئیات کم ہیں۔ اس سورۃ میں عقیدے کی اصلاح کا پہلو نمایاں ہے۔ ابتدائی آیات میں قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت کا ذکر ہوا۔ درمیان میں کافروں اور مشرکوں کی مذمت بیان ہوئی، اُن کے اوصاف اور اُن کا انجام ذکر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل ایمان اور نیکی والے لوگوں کا تذکرہ ہوا، اُن کے اوصاف اور اُن کا انجام بھی بیان ہوا۔ تیسرے رکوع میں یہ آیت کریمہ گزر چکی ہے "اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی" بھلا وہ شخص جو جانتا ہے کہ آپ کی طرف آپ کے رب سے حق نازل کیا گیا ہے وہ اندھے آدمی کی طرح ہو سکتا ہے؟ بیشک عقلمند لوگ ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بیان فرمائی۔ گویا قرآن کریم کو منزل من اللہ تسلیم کرنے والا شخص نور ہدایت پر ہو گا اور اسے نہ تسلیم کرنے والا اندھے کے موافق ہو گا جو نور ایمان اور نور ہدایت سے خالی ہے۔

اہل کتاب
خوشی
اب آج کی آیت میں قرآن پاک سے متعلق ہی ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے۔ یہاں پہ کتاب سے مراد خود قرآن حکیم بھی ہو سکتا ہے اور پہلی کتب سماویہ تورات، انجیل وغیرہ بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر اس کا اطلاق قرآن مجید پہ کیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ تنزیل کتاب پہ حاملین قرآن خوش ہوتے ہیں اور یہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگ ہیں۔

اِن لوگوں کا خوش ہونا فطری امر ہے کہ انہیں قرآن پاک کی صورت میں دین و دنیا کی فلاح کی چابی حاصل ہو گئی ہے۔ سورۃ یونس میں موجود ہے اللہ نے فرمایا اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے موعظت "وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ" اور وہ چیز آگئی ہے جو دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے آگے فرمایا ہے اے پیغمبر! آپ اِن سے کہہ دیں کہ تمہیں یہ چیز اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے حاصل ہوئی ہے "فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا" پس اس کے ساتھ خوش ہو جاؤ۔ "هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ" یہ بہتر ہے اُس چیز سے جو یہ دنیا کا مال اکٹھا کرتے ہیں۔ مال و دولت تو فانی چیز ہے جب کہ قرآن حکیم باقی رہنے والی چیز ہے، لہذا اس پر خوشی منانا اہل ایمان کے لیے قدرتی بات ہے۔

اہل کتاب کا کردار

اور اگر کتاب سے تورات اور انجیل مراد ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کو اللہ نے پہلی کتابوں کا علم عطا فرمایا ہے۔ وہ بھی خوش ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں جتنی بھی سابقہ کتب موجود تھیں وہ سب کی سب بگڑ چکی تھیں، خود اِن کتابوں کے ماننے والوں نے اپنی خواہشات کی خاطر کتابوں میں ردّ و بدل کر دیا تھا۔ زرتشتیوں کی کتاب کا حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا تھا، باقی صحائف کا بھی بہت برا حال ہو چکا تھا۔ البتہ تورات اور انجیل ایسی کتابیں تھیں جن کا بیشتر حصہ اگرچہ تحریف ہو چکا تھا، تاہم کچھ نہ کچھ اصلیت بھی باقی تھی، اور ان کے ماننے والے یہود و نصاریٰ بھی موجود تھے۔ خود عیسائی علماء کا بیان ہے کہ گزشتہ صدی تک انجیل میں تین ہزار کے قریب تبدیلیاں آچکی تھیں۔ بائبل کے ہر نئے ایڈیشن میں کوئی نہ کوئی نئی تبدیلی آتی ہے۔ ابھی پچھلی صدی تک اس میں لفظ فارقلیط

موجود تھا۔ سریانی زبان کے اس لفظ کا عربی معنی احمد بنتا ہے، جس کا مطلب ستودہ جہان ہے۔ مگر موجودہ انجیل سے یہ لفظ حذف کر کے شفیع اور مددگار کا لفظ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق قرآن پاک نے بھی کی ہے۔ سورۃ صف میں موجود ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اپنے سے پہلی کتاب تورات کا مصدق ہوں "وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" اور میں خوشخبری دینے والا ہوں ایک عظیم الشان رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے میرے ذمے دو فرائض لگائے ہیں، ایک یہ ہے کہ میں تمام بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہوں اور دوسرا یہ کہ میں اپنے بعد والے نبی کی بشارت سنانے کے لیے آیا ہوں۔

جس طرح تورات و انجیل کا کچھ نہ کچھ حصہ خود اس کے اپنے پیروکاروں کی دست برد سے ابھی تک محفوظ ہے، اسی طرح اہلِ کتاب میں سے کچھ نہ کچھ حق پرست بھی ہر زمانے میں موجود رہے ہیں اگرچہ ان کی غالب اکثریت ہمیشہ ضد اور عناد پر ہی اڑی رہی ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانہ میں مدینہ کے گرد و نواح میں یہودیوں کے دس بڑے بڑے عالم تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ دس آدمی اسلام قبول کر لیں تو آئندہ کوئی یہودی نظر نہیں آئے گا۔ مگر ہوا یہ کہ ان دس میں سے صرف ایک شخص عبداللہ بن سلامؓ کو اللہ نے ایمان کی توفیق بخشی، باقی سب جانتے بوجھتے ضد پر اڑے رہے اور اسلام کی مخالفت ہی کرتے رہے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ نے ان کو خبردار کیا "وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ"

کہ قرآن کے ساتھ سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بن جانا۔ اگر تم نے قرآن کے ساتھ کفر کیا۔ تو تمہارے بعد آنے والی نسلیں بھی تمہارے نقش قدم پر چلتے ہوئے انکار ہی کرتی چلی جائیں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا، اگرچہ اہل کتاب نے انکار کیا تو آج منکرین کی تعداد اربوں میں ہے۔ آج دنیا میں اڑھائی ارب عیسائی موجود ہیں جو چودہ سو سال سے قرآن پاک کی متواتر مخالفت کرتے آ رہے ہیں۔ یہودی اگرچہ تعداد میں بہت کم یعنی دو کروڑ کے قریب ہوں گے۔ مگر اسلام کو نقصان پہنچانے میں انہوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے بڑوں نے قرآن کا انکار کیا، اسلام کو قبول نہ کیا، تو آج ان کی اولادیں بھی اسی روش پر چل رہی ہیں۔ مگر جیسا کہ سورۃ آل عمران میں موجود ہے لَيْسُوا سَوَاءً "سب کے سب برابر نہیں" مشہور مقولہ ہے کہ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ یہود و نصاریٰ میں سے بھی بعض حق پرست ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں بھی بعض سعادت مند اہل کتاب موجود تھے جنہوں نے بالآخر ایمان قبول کر لیا۔ عالموں میں سے عبداللہ بن سلام اور بعض دوسرے منصف مزاج لوگ ہیں۔ بادشاہوں میں نجاشی والیِ حبشہ کا نام آتا ہے، اس کے علاوہ ۳۲ دیگر حق طلب عیسائی بھی موجود تھے۔ اللہ نے ان کی تعریف بیان کی ہے۔ نجران کے چالیس آدمیوں نے بھی ایمان قبول کیا۔ تمیم داریؓ کا مذہب بھی عیسائیت تھا، بعد میں ایمان قبول کر لیا۔ سلمان فارسیؓ کا نام بھی اسی فہرست میں آتا ہے۔ ایسے لوگ پہلی کتاب کا علم رکھتے تھے اور حق کے طالب تھے، تو اللہ نے ان کو ہدایت نصیب فرمائی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہے کہ وہ نزولِ قرآن پر خوش ہوتے ہیں، ان کی خوشی کی وجہ یہ ہے کہ

جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن کریم پہلی کتابوں کا مصدق ہے۔ ان میں پیدا کی گئی خرابیوں کی نشاندہی کرتا ہے، بنیادی حقائق کی تصدیق کرتا ہے اور سارے نبیوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

اس زمانے میں بھی کہیں نہ کہیں حق پرست نکل آتے ہیں، فرانس کے ایک بڑے سائنسدان نے اسلام قبول کیا، یہ شخص الجزائر یوں سے میل جول کے نتیجے میں مسلمان ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں مسٹر کولیم بہت بڑا بیرسٹر تھا۔ وہ اپنے خاندان کے اسی افراد سمیت مسلمان ہوا۔ اس وقت دنیا میں انگریز انتہائی عروج پر تھے، انہوں نے اس کے ساتھ بڑے جھگڑے کئے مگر وہ تنہا مقابلہ کرتا رہا۔ اور ایمان پر قائم رہا۔ یہودیوں میں سے جرمنی کے رہنے والے محمد اسد کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ محمد پکھتال مترجم قرآن ہے۔ یہ شخص ترکوں کے آخری شیخ الاسلام کی مجلس میں سات سال تک بیٹھا رہا، آخر اللہ نے کایا پلٹ دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ ان کا ترجمہ ہم پڑھتے ہیں۔ اس نے ترجمہ مکمل کر کے مصری علماء کے سامنے پیش کیا تاکہ اگر کوئی غلطی ہو تو دور ہو سکے، اور اب یہ انگریزی ترجمہ ساری دنیا میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ شخص کچھ عرصہ تک ہندوستان کے صوبہ مدراس میں بھی رہا۔ نواب حیدر آباد کے ہاں بھی رہا۔ انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کیا، اب فوت ہو چکا ہے۔ اہل کتاب کے علاوہ ہندوؤں، سکھوں، بدھوں اور جینیوں میں سے بھی بعض حق پرست ہوئے مگر کوئی اکا دکا۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر فرمایا ہے کہ ان میں سے کچھ مومن ہیں " وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ " (آل عمران)

مگر اُن کی اکثریت فاسق ہے۔

قرآن کا عملی انکا

فرمایا، جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ خوش ہوتے ہیں اُس چیز پہ جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے۔ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ اور فرقوں میں سے بعض وہ ہیں جو اس کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن پاک کے موافقین اور مخالفین عربوں میں بھی تھے اور یہود و نصاریٰ میں بھی۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ قرآن پاک کی بہت سی باتوں کا عملی طور پہ انکار کر رہے ہیں۔ جب انگریز نے برصغیر میں عنانِ حکومت سنبھالی تو اس نے لوگوں سے دریافت کیا تھا کہ تم شریعت کا قانون چاہتے ہو یا رسم و رواج پہ عمل پیرا ہونا چاہتے ہو۔ اس طرح بعض اضلاع کے لوگوں نے رسم و رواج کو شریعت پہ ترجیح دی اور ان کے معاملات شریعت کی بجائے رسم و رواج کی بنیاد پہ فیصلہ ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اُن کو شرعی قانون اس لیے ناپسند تھا کہ وہ اُن کی ذاتی خواہشات کے راستے میں حائل تھا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو قرآن کے بعض حصے کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ دنیا میں اُن کو ذلت ہوگی اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ جب تک قرآن پاک پہ مکمل طور پر عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک مسلمانوں کو اس دنیا میں عزت نصیب نہیں ہو سکتی۔

شرک سے برأت

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خطاب کیا ہے قُلْ آپ کہہ دیں إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں وَلَا أُشْرِكَ بِهِ اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ

تم ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرو، ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں کرنے دیں۔ سابقہ مشرکوں کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پڑھ لیں۔ وہ لوگ بھی کہتے تھے کہ ابراہیم ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، اللہ نے فرمایا کہ آپ صاف کہہ دیں کہ یہ بے جان بت بے معنی ہیں میں تو صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں، کسی دوسرے کو الٰہ تسلیم نہیں کر سکتا۔

عبادت انتہائی درجے کی تعظیم کو کہا جاتا ہے جو اس عقیدے سے اٹھے کہ جس ہستی کی عبادت کر رہا ہوں اُس کو مافوق الاسباب تمام اشیاء پر کنٹرول حاصل ہے۔ وہ علیم کل، خالق اور مدبر ہے۔ اُس ذات کی تعظیم قول سے بھی ہوتی ہے، فعل سے بھی اور عمل سے بھی۔ چنانچہ سورۃ انعام میں اللہ نے شرک کی تمام اقسام کی مذمت بیان کی ہے۔ سورۃ کی ابتداء ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ تمام تعریفیں اُس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے "وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ" نیز اندھیروں اور روشنی کو بھی پیدا فرمایا۔ یہ اُن ثنوی فرقہ والوں کی تردید ہے۔ جو اندھیروں اور روشنی کا علیحدہ علیحدہ خالق تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نیکی اور بدی کے خدا جُدا جُدا ہیں۔ یزدان اور اہرمن دو خدا تسلیم کرنا خدا کی ذات میں شرک کرنا ہے۔ اسی طرح خدا کی صفات میں شرک کرنے والے بھی بہت لوگ ہیں، جو خدا تعالیٰ کی صفات مختصہ میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ ایسے لوگ علیم کل، قادر مطلق حاضر ناظر اور مختارِ مطلق غیر اللہ کو بھی مانتے ہیں، وہ خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی مدبر مانتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ فلاں بھی ہماری حاجت روائی اور مشکل کشائی کر سکتا ہے یا کم از کم ہماری سفارش ہی کر سکتا ہے۔

نذر و نیاز میں شرک، قبر پرستی، چڑھاوے چڑھانا اور روشنی کرنا سب
اسی قبیل سے ہیں۔ کبھی گنڈے تعویذ کے ذریعے غیر اللہ سے مدد مانگی
جاتی ہے، کبھی مکان کی بنیادوں میں خون کرایا جاتا ہے تاکہ جنات
سے پناہ حاصل کی جائے۔ لبوں پر "یا علی مدد" اور "یا غوث الاعظم" کے
کتبے لکھے جاتے ہیں، کبھی جبرائیل اور میکائیل کو مدد کے لیے پکارا
جاتا ہے اور کبھی اولیاء اللہ سے حاجت روائی کی اُمید رکھی جاتی ہے
یہ سب شرک کی مختلف صورتیں ہیں جو آج بھی مسلمانوں میں رائج ہیں
اللہ کے سارے نبی اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے آئے ہیں -
"یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" (ہود)
اے میری قوم کے لوگو! صرف اللہ کی عبادت کرو کہ اُس کے سوا
کوئی معبود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے
بھی یہی کہلوایا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت
کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔

دعوت الی اللہ

فرمایا، اے پیغمبر! آپ یہ بھی کہہ دیں اِلَيْهِ اَدْعُوْا میں
اُسی ایک اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں جس کا کوئی شریک
نہیں، نہ عبادت میں، نہ صفت میں اور نہ حقوق میں۔ سورۃ یوسف
میں بھی گزر چکا ہے اللہ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا کہ یہ میرا
راستہ ہے "اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ" میں اللہ کی طرف دعوت دیتا
ہوں "عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" میں بھی بصیرت
پر ہوں اور میرے پیروکار بھی۔ ایمان اور توحید کی دعوت بصیرت
کی دعوت ہے، کفر، شرک اور برائی کی دعوت ظلمت ہے۔ ایمان
کی دعوت نور ہے جس سے انسان کے قلب میں بصیرت پیدا ہوتی
ہے۔ مجھے اور میرے پیروکاروں کو دین کی کسی بات میں شبہ نہیں ہے

تمام انبیاء کی بات ہمیشہ واضح ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا۔ اگر امیری دعوت کو خوب اچھی طرح سمجھ لو میرا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔ تمام شرکاء کو بھی جمع کر لو۔ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً پھر تمہیں کسی بات میں شبہ نہیں رہنا چاہیئے، میں واضح طریقے پر بات کہہ رہا ہوں، میں خدا تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہوں وَاِلَيْهِ مَاٰبِ اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے، مجھے بہر حال اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

قرآن در عربی زبان

ارشاد ہوا ہے وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا اور اسی طریقے سے ہم نے اس قرآن کو ایک فیصلے کے طور پر اتارا ہے عربی زبان میں۔ كَذٰلِكَ کی تشبیہ سابقہ کتب سماویہ کی طرف ہے کہ جس طرح ہم سابقہ ادوار میں انبیاء علیہم السلام پر وحی بھیجتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا ہے، اور یہ عربی زبان میں ہے قرآن پاک میں یہ اصول بیان کر دیا گیا ہے" وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" (ابراہیم) ہم نے ہر رسول اس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سریانی یا عبرانی زبان بولتے تھے تو انجیل بھی اسی زبان میں نازل ہوئی۔ یہودی عبرانی زبان بولتے تھے تو تورات عبرانی میں نازل ہوئی۔ دیگر صحائف بھی ہر نبی کی قومی زبان میں نازل ہوئے۔ پھر سب سے آخر میں اللہ نے اپنے آخری نبی کو عرب میں میں پیدا کیا۔ تو قرآن پاک بھی عربی زبان میں نازل ہوا۔

عربی زبان کی ترقی نزولِ قرآن سے سولہ سترہ سو سال پہلے شروع ہوئی اور حضور کے زمانہ تک یہ زبان انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ برصغیر میں اردو زبان کی ترویج خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے زمانے سے شروع

ہوئی اور اب تک یہ ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکی ہے سائنس فلسفہ، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ اس زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ انگریزی زبان کی ترقی انگریزوں کے دو سو سالہ عروج کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح حضور کے زمانہ مبارک تک عربی زبان کو بڑی ترقی حاصل ہو چکی تھی۔ عربوں میں بڑے بڑے شعراء اور خطیب تھے۔ بڑے بڑے نقیس اور باریک بین متکلم موجود تھے، مگر عربوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ مسیلمہ کذاب نے قرآن کے مقابلے میں اُول فُول کلام پیش کرنے کی کوشش کی تھی مگر حضرت عمرو ابن العاص کا اگرچہ اس کے ساتھ دوستانہ تھا اور وہ ابھی اسلام بھی نہیں لائے تھے، مگر کہنے لگے، یہ تیرے بس کا روگ نہیں۔ آپ نے اس کے منہ پہ تھوک دیا تھا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ قرآن کا مقابلہ صرف زبان کے لحاظ سے نہیں بلکہ نظام کے لحاظ سے بھی ہے اگر قرآن کا چیلنج صرف زبان کے لحاظ سے ہوتا تو صرف عربوں کو خطاب ہوتا، مگر اس کے مخاطب تو تمام بنی نوع انسان ہیں۔ سورۃ اعراف میں اللہ کا ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ تمام لوگوں سے کہہ دیں "اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا" میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میں کسی خاص قوم، یا خطے یا خاص زمانے کے لیے نہیں آیا بلکہ روئے زمین کے تمام بنی نوع انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں اسی قرآن کے ذریعے "لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ" تمہیں بھی خبردار کر دوں اور اُن سب لوگوں کو متنبہ کر دوں جہاں تک یہ قرآن پہنچے۔ بہرحال اس کے اولین مخاطبین اہلِ عرب ہیں اور پھر

وہ تمام لوگ جہاں تک یہ پیغام الٰہی پہنچے۔

وعیدِ عام

فرمایا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو یاد رکھیں مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ آپ کے لیے اللہ کے سامنے نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔ اس آیت کریمہ میں مخاطب اگرچہ حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ ہے مگر اس سے مراد آپ کی قوم کو بات سمجھانا ہے کہ لوگو! اچھی طرح سن لو کہ قانون اور ضابطہ آجانے کے بعد اس کی پیروی کی بجائے اگر خواہشات نفسانیہ پر چلو گے، رسم و رواج کو اپناؤ گے یا برادری اور قبیلے کی بات پر عمل کرو گے تو پھر خدا کی گرفت میں آؤ گے اور اس سے نہ بچ نہیں سکو گے۔ علم کی عدم موجودگی میں تو انسان ایک حد تک مجبور ہوتا ہے مگر قرآن کے ذریعے علم آگیا تو اب کوئی حیلہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ اب صرف اور صرف قرآن کے پروگرام پر عمل کرنا ہوگا اسلام کی جگہ اب کوئی ازم قابل قبول نہیں ہوگا۔ اگر اب بھی اسلام کے نظام کو نہیں اپناؤ گے تو پکڑے جاؤ گے۔

درس چہاردہم ۱۴ آیت ۳۸ تا ۴۰

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا
لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ
اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ
كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖۚ
وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ
بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

ترجمہ :- البتہ تحقیق بھیجے ہم نے رسول آپ سے پہلے اور ہم نے بنائیں ان کے لیے بیویاں اور اولاد - اور نہیں تھا کسی رسول کے لیے کہ وہ لائے کوئی نشانی مگر اللہ کے حکم سے - ہر ایک وعدے کے لیے ایک لکھا ہوا نوشتہ ہے ﴿۳۸﴾ اللہ مٹاتا ہے جو چاہے اور ثابت رکھتا ہے (جس کو چاہے) اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب ﴿۳۹﴾ اور اگر دکھلا دیں ہم آپ کو وہ چیز جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں - یا ہم آپ کو وفات دے دیں گے - پس بیشک آپ کے اوپر ہے پہنچا دینا ، اور ہمارے ذمے ہے حساب لینا ﴿۴۰﴾

ربط آیات

پہلے شرک کا رد اور مشرکین کا انجام بیان ہوا ۔ قرآن کریم کی حقانیت کا ذکر

کر کے اُس کی پیروی کا حکم دیا گیا۔ اللہ نے خبردار کیا کہ وحی الٰہی کے آجانے کے بعد اگر کوئی شخص اپنی خواہشات کی پیروی کرے گا۔ تو وہ گرفت سے نہیں بچ سکے گا اور نہ ہی اس کا کوئی حامی ہوگا۔ قطعی علم آجانے کے بعد رسم و رواج پر چلنا روا نہیں ہے بلکہ قطعی علم کا اتباع ضروری ہو جاتا ہے

اس کے بعد اب رسالت کا بیان آرہا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مشرکین کے اعتراضات کا ضمناً جواب ہے۔ قرآن کا یہ اسلوب بیان ہے کہ جہاں توحید کا ذکر آتا ہے، اس کے ساتھ شرک کی تردید بھی ہوتی ہے، اور جہاں وحی الٰہی کی بات ہوتی ہے، ساتھ نبوت و رسالت کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی عقائد مکی سورتوں میں بکثرت موجود ہیں اور مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر ان عقاید میں سے کسی عقیدے میں بھی شک و شبہ یا تردد پیدا ہو جائے تو ایمان کی بنیاد ہی خراب ہو جاتی ہے اور انسان کے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ ان بنیادی عقائد میں سے آج رسالت کا بیان آرہا ہے۔

انبیاء کی ازدواجی حیثیت

بعض کافر اور مشرک کہتے تھے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں تو پھر انہیں ہر وقت عبادت اور زہد میں مشغول رہنا چاہیئے اور ازدواجی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیئے۔ برصغیر کے آریہ سماجی اور ہندو بھی معاذ اللہ نبی پر شہوت رانی کا الزام لگاتے ہیں کہ آپ کی متعدد بیویاں تھیں۔ اسی قسم کا اعتراض یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے بھی ہوتا رہتا ہے۔ آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی قسم کے بیہودہ اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ البتہ تحقیق ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے۔ احادیث سے

کل تین سو پندرہ ۳۱۵ رسولوں کا ذکر ملتا ہے، اور انبیاء کی تعداد تو ایک لاکھ بیس ہزار یا سوا لاکھ کے قریب آتی ہے۔ رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ مستقل شریعت یا کتاب عطا کرتا ہے۔ رسولوں کو اپنی اپنی شریعت اور کتاب کی تبلیغ کا حکم تھا۔ البتہ انبیاء علیہم السلام سابقہ شرائع اور کتب ہی کی تعلیم و تبلیغ پر مامور ہوتے تھے، تاہم اگر کوئی خاص بات ہوتی بھی تو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی آگاہ کر دیتے تھے۔ بنی اسرائیل کے اکثر انبیاء کا فریضہ تورات کی تبلیغ تھا۔

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا اور بنائیں ہم نے ان کے لیے بیویاں۔ نکاح کرنا اور بیوی سے اشتغال رکھنا کمال کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو لوازمات بشریت میں سے ہے۔ فرمایا بیویوں کے علاوہ وَذُرِّيَّةً اللہ نے نبیوں کی اولاد بھی بنائی، بیوی بچوں کا ہونا کوئی عیب والی بات نہیں ہے نبیوں نے نکاح بھی کیے اور ان کی اولادیں بھی ہوئیں۔ اگر یہود و نصاریٰ کو نبی آخر الزمان کی بیویوں اور بچوں پر اعتراض ہے تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیسے گوارا کرتے ہیں۔ جو اہل کتاب کے بھی جد الانبیاء ہیں۔ آپ کی پانچ یا سات بیویاں تھیں اور ان سے اولاد بھی تھی۔ بلکہ خلاف توقع اللہ نے آپ کو بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی۔ آپ کا پہلا بچہ چوراسی ۸۴ سال کی عمر میں پیدا ہوا جب کہ دوسرا سو سال کے قریب عمر میں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق تو مشہور ہے کہ ان کی تین سو منکوحہ بیویاں اور سات سو لونڈیاں تھیں، آپ کی سلطنت بھی بے مثال تھی اور اس کے باوجود آپ صاحب کمال نبی تھے حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں

تھیں۔ بعض دوسرے انبیاء کی بھی کئی کئی بیویاں تھیں، لہذا معترضین کا یہ اعتراض لغو اور بے بنیاد ہے کہ بیوی اور اولاد کا ہونا کمال کے منافی ہے، بلکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک تو یہ ہے کہ مجرد آدمی کو وہ کمال حاصل نہیں ہو سکتا جو متاہل (شادی شدہ) آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے اکثر صالحین صاحب اہل رہے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ کے نکاح میں نو بیویاں موجود تھیں جب کہ دو بیویاں حضرت خدیجہؓ اور زینبؓ وفات پا چکی تھیں۔ حضور علیہ السلام کی ازدواجی زندگی کا آغاز حضرت خدیجہؓ کے نکاح سے ہوا، جو کہ اس سے پہلے دو خاوندوں سے بیوہ تھیں اور ان کی عمر چالیس ۴۰ سال تھی جب کہ آپ کی عمر اس وقت پچیس ۲۵ سال تھی چنانچہ آپ نے جوانی کا بہترین زمانہ (تقریباً پچیس سال) اسی بیوہ کے ساتھ گزارا، اور سوائے حضرت ابراہیمؓ کے، ساری اولاد اسی سے پیدا ہوئی پھر اس بیوی کی وفات کے بعد جب آپ کی عمر مبارک باون ۵۲ یا ترپن ۵۳ سال ہوئی تو آپ نے دوسرا نکاح کیا۔ ان حالات میں اللہ کے نبی پر شہوت رانی کا الزام لگانا نہایت ہی لغو ہے۔ دیگر بیویوں سے نکاح اللہ تعالےٰ کے حکم سے کیا تھا اور اس سے اسلام کی تعلیم کو گھر گھر پہنچانا مقصود تھا۔ آپ علیہ السلام نے مختلف خاندانوں میں نکاح کئے اور ازواج کے ذریعے تعلیم پھیلائی۔ سورۃ احزاب میں موجود ہے "وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ" اے ازواج مطہرات! اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اور حکمت جو تمہارے گھروں میں نازل کی ہے اس کا چرچا کرو۔ آیات سے مراد قرآن پاک اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ گویا کہ قرآن وسنت کی تشہیر کا ایک

ذریعہ حضور علیہ السلام کی بیویاں بھی تھیں اور آپ کے متعدد نکاحوں کا یہی مقصد تھا۔ اگر بیویاں زیادہ ہوں گی تو ذمہ داریاں بھی بڑھیں گی، محنت و مشقت زیادہ کرنی پڑے گی اور صبر بھی کرنا ہوگا، لہٰذا اس میں اجر بھی زیادہ ہوگا۔ غرضیکہ متعدد نکاح کمال کے منافی نہیں

معجزات کا اظہار

منکرین اپنی من مانی نشانیاں بھی بار بار طلب کرتے تھے، اُس کے جواب میں اللہ نے فرمایا وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اور نہیں ہے کسی رسول کے اختیار میں یہ بات، أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ کہ وہ کوئی نشانی یا معجزہ لائے مگر اللہ کے حکم سے۔ معجزے کا اظہار اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے اور نبی اپنی مرضی سے جب چاہے کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کرامت کا اظہار بھی کسی ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ولی کا درجہ تو نبی سے بہت کم ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے جو اختیار نبی کو نہیں وہ ولی اللہ کو حاصل ہو۔ بعض لوگ کرامت کو اولیاء اللہ کا فعل مان کر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ معجزے کا اظہار اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ہر وعدے کے لیے ایک لکھا ہوا نوشتہ ہوتا ہے یعنی ہر چیز کے ظہور کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقت مقرر ہوتا ہے، اسی طرح معجزے کے اظہار کا بھی خاص وقت ہوتا ہے اور یہ ہر شخص کی خواہش پر ظاہر نہیں ہوتا۔

نسخ شرائع اور احکام

آگے ارشاد ہوتا ہے۔ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے وَيُثْبِتُ اور باقی رکھتا ہے جس کو چاہے وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب، کائنات کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی

تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں اور اس کے باوجود تقدیر کی الٹ پلٹ اللہ تعالےٰ کے اختیار میں ہے، وہ کسی چیز کو مٹانا چاہے یا کسی چیز کو باقی رکھنا چاہے تو اس کی مشیت میں کسی کو مجاز دخل نہیں ۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے بعض گناہوں کی وجہ سے انسان اپنی روزی سے محروم ہو جاتا ہے اور تقدیر کو دُعا کے سوا کوئی چیز نہیں بدل سکتی، اور عمر میں زیادتی کرنے والی بجز نیکی کے کوئی چیز نہیں ۔ نسائی اور ابن ماجہ شریف میں یہ حدیث بھی آتی ہے کہ صلہ رحمی عمر بڑھاتی ہے ۔ عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس لوح محفوظ ہے اللہ تعالیٰ اس پر تین سو ساٹھ بار توجہ فرماتا ہے ۔ پھر جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے، ام الکتاب اسی کے پاس ہے ۔

مشرکین یہ بھی اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر سچا ہے اور اس کی کتاب سچی ہے تو پھر پہلے احکام منسوخ کیوں ہو جاتے ہیں، کیا خدا کو علم نہیں ہوتا کہ کونسا حکم بہتر ہے ۔ پہلے وہ ایک شریعت نازل کرتا ہے ۔ پھر اس کی جگہ دوسری لے آتا ہے ۔ یہ آیت اس اعتراض کا جواب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، وہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور احکام و شرائع کا نسخ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مصلحت پر ہوتا ہے ۔ ہر چیز کو ایک خاص وقت تک مناسبت ہوتی ہے ۔ اس وقت تک وہ چیز قائم رہتی ہے، پھر اس کو تبدیل کر دیا جاتا ہے مختلف شرائع میں حلت و حرمت کے احکام بدلتے رہتے ہیں اور ایسا زمان و مکان کی مناسبت سے ہوتا تھا ۔ اس کی مثال سورۃ آل عمران میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا قول ہے کہ اے لوگو! میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ

عَلَیۡکُمۡ" اور اللہ کے حکم سے تم سے بعض حرام قرار دی گئی چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں۔ گویا نسخ احکام کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو ایک وقت میں کوئی دوائی دیتا ہے جب کہ دوسرے وقت میں وہ دوائی تبدیل کر کے اس کی جگہ کوئی اور تجویز کر دیتا ہے۔ ایسا کرنا مریض کے مزاج اور بیماری کی کیفیت پر موقوف ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ ڈاکٹر نے پہلی دوائی تبدیل کیوں کی ہے تو اس کی نادانی ہوگی۔ اسی طرح نسخ شرائع کا معاملہ بھی انسانی سوسائٹی کے احوال کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس میں تغیر و تبدل کرتا رہتا ہے۔ ہر چیز کی حکمت اور مصلحت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہی مختلف شرائع اور احکام جاری فرماتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں مذکور محو اور اثبات سے مراد تقدیر کی تمام چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس تقدیر کو چاہے مٹا دے اور جس کو چاہے باقی رکھے۔ البتہ فرماتے ہیں کہ تقدیر کی چار چیزوں کے مٹنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور وہ ہیں۔ عمر، روزی، سعادت اور شقاوت۔ حدیث میں آتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے اور استقرار حمل سے چار ماہ کے بعد ایک خاص منزل آتی ہے جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ پیدا ہونے والے انسان کے متعلق لکھ لو کہ اس کی عمر یہ ہوگی، اس کو روزی اس قدر نصیب ہوگی۔ اور یہ سعادت مند ہوگا یا شقی۔ تو گویا ان چار چیزوں میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے، یعنی معلق اور مبرم۔ تقدیر معلق میں تغیر و تبدل ہو جاتا ہے جب کہ مبرم یعنی قطعی تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ تقدیر کے پانچ درجے ہوتے ہیں۔ پہلا درجہ ازلی ہوتا

ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا ۔ دوسرا درجہ فرشتوں یعنی جبرائیل میکائیل وغیرہ کی پیدائش کا دور ہے جو انسان کی پیدائش سے اربوں سال پہلے پیش آیا ۔ نوعِ انسانی کی مصلحت ان فرشتوں پر موقوف ہے ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تقدیر کا تیسرا درجہ وہ ہے جب احکام و شرائع میں تغیر و تبدل ہوتا ہے ۔ یہ تغیرات ہزاروں سال کے بعد آتے ہیں ۔ چوتھا درجہ وہ ہے جب انسان کے اس مادی جہان میں آنے سے پہلے اس کی تقدیر لکھ دی جاتی ہے اور پانچواں درجہ وہ ہے جب انسان اس مادی جہان میں آجاتا ہے اور اپنی طبعی عمر گذارتا ہے ۔ بہرحال یہ پانچ درجات ہیں اور ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے بعض تقدیریں بدل جاتی ہیں اور بعض قائم رہتی ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہوتا ہے ۔ انسان کی دعا کی وجہ سے اس کی مصیبتیں مٹ جاتی ہیں ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان کی دعا اور مصیبت آپس میں الجھتی ہیں اور انسان کی دعا مصیبت کو انسان کی طرف آنے سے روکتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا ۔ بعض تغیرات نیکیوں کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں اور گناہ مٹتے رہتے ہیں ۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ گناہ کی وجہ سے بندہ روزی سے محروم کر دیا جاتا ہے ۔ کوئی ایسا گناہ کرتا ہے جس سے ملنے والی روزی موقوف ہو جاتی ہے ۔ یہ سارے تغیرات ازلی درجہ کے بعد والے درجات میں واقع ہوتے ہیں ۔ ازلی درجہ اللہ کے علم والا درجہ ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ اسی کو مبرم سمجھ لیں ۔

علیہ السلام پیشن گوئی

آگے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی دی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اور اگر ہم دکھا دیں آپ کو وہ چیزیں جن کا ہم

ان سے وعدہ کرتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وعدہ آپ کی زندگی میں ہی پورا ہو جائے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مکے کے مشرکین کو آپ کی زندگی میں ہی مغلوب کر دیا ۔ سورۃ قمر میں ہے " سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ " آج یہ مشرکین بڑے جتھے اور طاقت کے مالک ہیں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے ، اللہ کے نبی اور اس کے پیروکاروں کے جانی دشمن ہیں مگر ایک وقت عنقریب آنے والا ہے جب یہ پشت پھیر کر بھاگیں گے ۔ یہ وعدہ اللہ نے حضور کی زندگی میں بدر کے موقع پر ہی پورا کر دیا مشرکین کی جمعیت تتر بتر ہو گئی اور وہ مغلوب ہو گئے ۔

فرمایا أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ یا ہم آپ کو وفات دے دیں گے اگر اسلام کا مجموعی غلبہ آپ کی زندگی میں نہ ہوا تو آپ کے بعد یہ وعدہ پورا ہو جائے گا ۔ چنانچہ اسلام کا مجموعی غلبہ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا ۔ صفین کے واقعہ تک مسلمان نصف دنیا پر غالب آ چکے تھے اور ان کے سامنے سر اٹھانے والی کوئی طاقت نہیں تھی ۔ یہ کیفیت تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک قائم رہی ۔ پھر مسلمانوں کا تنزل شروع ہو گیا ۔ تاتاریوں کے حملے نے مسلمانوں کو من حیث القوم درہم برہم کر دیا ۔ اس وقت کا پھسلا ہوا قدم آج تک نہیں سنبھل سکا ، ہو سکتا ہے کہ نزول مسیح کے وقت سابقہ پوزیشن پھر بحال ہو جائے ، ورنہ اس وقت تو حالات سخت مخدوش ہیں اور بہتری کی کوئی رمق نظر نہیں آتی خلافت راشدہ کے زمانے میں اللہ نے مسلمانوں کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی " وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا " (النور) اللہ تعالیٰ اُن کے پسندیدہ دین کو پختہ اور مضبوط کر دے گا

اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ اللہ نے فرمایا میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور جس نے کفرانِ نعمت کیا وہ گرفت میں آئے گا یہ ساری باتیں حضور کے بعد واقع ہوئیں۔ خلفائے راشدین کے زمانہ کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے نبوت کے کام کو مکمل کیا۔ اس میں چاروں خلفاء کا زمانہ شامل ہے۔ البتہ چوتھے خلیفہ کے زمانے میں آپس کے اختلاف کی وجہ سے اجتماعی حرکت میں فرق پڑ گیا۔ تاہم اسلام کا غلبہ صدیوں تک قائم رہا۔

حضور علیہ السلام کی زندگی میں جب بدر کا معرکہ ہوا تو بڑے بڑے ائمہ کفر جہنم واصل ہوئے۔ ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر قریبی کنوئیں میں پھینک دیا گیا اور حضور علیہ السلام نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ نے ہم سے جو فتح و نصرت کا وعدہ کیا تھا، اس کو ہم نے سچا پا لیا۔ اے مشرکین کے گروہ! تم سے اللہ نے جو مغلوب کرنے کا وعدہ کیا تھا کیا تم نے بھی اس کو سچ پایا ہے یا نہیں؟ کسی کہنے والے نے کہا، حضور! آپ ان مردار لاشوں سے خطاب فرما رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ مردار اس وقت تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے۔

تو فرمایا ہم آپ کو دکھا دیں گے وہ چیزیں جن کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا آپ کو وفات دے دیں گے۔ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ پس آپ کے ذمے پہنچا دینا ہے۔ آپ ان لوگوں کو دین اور شریعت کے احکام پہنچا دیں، آپ کا فریضہ یہی ہے وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ اور حساب لینا ہمارے ذمے ہے۔ ہم ایک ایک عمل کا حساب لیں گے، گرفت کریں گے اور پھر ان کے اعمال کی ان کو سزا بھی دیں گے۔ آپ اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہیں اور نتیجہ ہم پر چھوڑ دیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ
أَطْرَافِهَا ۚ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ
سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ
كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾
وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ
كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ
عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾ ع

ترجمہ :- کیا نہیں دیکھا ان لوگوں نے کہ بیشک
ہم آتے ہیں زمین پر ، ہٹاتے ہیں اِس کو اس کے اطراف
سے - اور اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے ، کوئی نہیں ہے پیچھے ہٹانے
والا اُس کے حکم کو ، اور وہ جلد حساب لینے والا ہے (۴۱)
اور تحقیق مخفی چالیں چلیں اُن لوگوں نے جو اِن سے پہلے
تھے - پس تمام تدبیر اللہ کے قبضے میں ہے - وہ جانتا ہے
جو کچھ کماتا ہے ہر نفس ، اور عنقریب جان لیں گے کفر کرنے
والے کہ کس کے لیے ہے آخرت کا گھر (۴۲) اور کہتے ہیں
وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے تو بھیجا ہوا رسول
آپ کہہ دیجئے کہ کافی ہے اللہ تعالیٰ میرے درمیان

اور تمہارے درمیان گواہ، اور وہ جس کے پاس کتاب
کا علم ہے (۴۳)

ربط آیات

سورۃ ہذا کی ابتداء میں قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت کا ذکر تھا، پھر مسئلہ توحید اور قیامت کا ذکر آیا اور اب آخر میں اس سورۃ کا اختتام رسالت کے بیان پر ہو رہا ہے۔ مشرکین مکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر جو مختلف قسم کے اعتراضات کرتے تھے، اُن کا جواب دیا گیا ہے اور پیغمبر خدا کی رسالت اور نبوت کی تصدیق کی گئی ہے۔ درمیان میں محو اور اثبات کا ذکر بھی ہوا۔ شرائع کی منسوخی اور نئے احکام کا اجرا، قضا و قدر میں تغیر و تبدل، کسی چیز کو مٹا دینا اور کسی کو باقی رکھنا، یہ سب اللہ کی قدرت تامہ کے تحت بیان ہو چکا ہے اس کے بعد اللہ نے اپنے نبی اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی بھی دی۔ فرمایا، ہم نے جن چیزوں کا آپ سے وعدہ کر رکھا ہے وہ یا تو آپ کی عین حیات میں ہی آپ کو دکھا دیں گے، یا اُن کا ظہور آپ کی اس دنیا سے رخصتی کے بعد ہوگا، بہرحال اللہ کا وعدہ حرف بحرف پورا ہوا

کفار کی پے در پے ناکامی

آج کی آیات مسلمانوں اور اُن کے پیغمبر سے کئے گئے اُس وعدے ہی سے متعلق ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے پے در پے شکست اور اہل ایمان کی کامیابی کا ذکر کیا ہے۔ مشرکین سمجھتے تھے کہ یہ نیا دین ہے، تھوڑے عرصہ میں ہی ہم اسے ختم کر کے اس کے ماننے والوں کو مغلوب کر لیں گے مگر اللہ تعالیٰ کا پروگرام اس دین کو غالب کرنے کا تھا۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کیا اِن لوگوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے

گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں مشرکین کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ...
سمجھ رہے ہیں کہ ہم مٹھی بھر اہلِ ایمان کو ختم کر دیں گے اور خود غالب آجائیں
گے، مگر یہ لوگ اپنے گرد و پیش کے حالات کی طرف نہیں دیکھ رہے
ہیں کہ کس طرح ہم ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کو نکال رہے
ہیں یعنی اِن کے قبضے سے عرب کے مختلف خطے نکلتے جا رہے ہیں
اور وہاں پر اہلِ اسلام غالب آرہے ہیں۔ چنانچہ ۸ھ میں جب
مکہ فتح ہو گیا تو وہ سر زمین بھی مشرکین کے قبضہ سے نکل گئی اور دارالکفر
دارالاسلام میں تبدیل ہو گیا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو مدینہ پر غلبہ حاصل
ہوا اور یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا گیا، پھر وہ خیبر کے مقام پر جمع ہو
گئے اور بالآخر انہیں وہاں سے بھی نکلنا پڑا اور وہ سارا علاقہ اہلِ ایمان
کے تسلط میں آگیا۔ مدینہ کے گرد و پیش کی صفائی کے ساتھ ساتھ نجران
اور یمن والے لوگ خود بخود ایمان لے آئے۔ کفار و مشرکین کی شکست
اور اسلام کا غلبہ حضور علیہ السلام کی وفات تک مسلسل جاری رہا اور پھر
آپ کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی دین پھیلتا چلا
گیا حتیٰ کہ پورے ملکِ عرب پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ دوسرے مقام
پر اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا کہ ہم کافروں کے پاؤں کے نیچے
سے زمین نکالتے چلے جا رہے ہیں أَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ کیا اب بھی انہیں
اُمید ہے کہ وہ ایمان والوں پر غالب آجائیں گے؟ بہر حال اکثر مفسرین
کرام نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے اور یہ اہلِ ایمان کے لیے
تسلی کا مضمون ہے۔

عبداللہ ابن عباسؓ کی توجیہہ

حضرت ابن عباسؓ مختلف تفسیر بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں
کہ اس مقام پر اطراف طرف یعنی کنارے کی جمع نہیں بلکہ طَرَف کی جمع
ہے اور اس کا معنی عمدہ گھوڑا یا کوئی دوسری نفیس چیز ہوتا ہے۔ آپ

کی توجیہہ کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین سے اچھے لوگوں کو اٹھا رہے ہیں یعنی باکمال اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تغیرات اللہ تعالیٰ کے حکم سے واقع ہو رہے ہیں۔ جب اللہ کے پسندیدہ بندے اس دنیا میں باقی نہیں رہتے تو یہ کفار و مشرکین کس خیال میں پڑے ہوئے ہیں، کیا یہ لوگ حق و صداقت کی مخالفت کر کے کفر کے پروگرام کو غالب کر سکیں گے؟ ہرگز نہیں ان کو غور کرنا چاہیئے کہ جب اچھے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ اس دنیا سے اٹھا لیتا ہے تو پھر یہ کفار و مشرکین کس گنتی میں ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں کیسے باقی رہ سکتے ہیں، اور کفر کا پروگرام کیسے مسلط کر سکتے ہیں؟ حدیث شریف میں آتا ہے کہ زمانے میں ایسا تغیر آئے گا کہ اچھے لوگ ختم ہو جائیں گے اور ردی لوگ باقی رہ جائیں گے۔ وہ لوگ نفسانی خواہشات کی پیروی کریں گے جس کی وجہ سے تمام نظام مختل ہو جائیں گے اور نتیجتاً تباہی و بربادی آئے گی۔ بہرحال فرمایا کہ جب علماء، حکماء، عارف، سالک، عابد اور زاہد لوگ باقی نہیں رہیں گے تو کافر و مشرک بھی نہیں رہیں گے، لہٰذا انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ وہ ایمان والوں پر غالب آجائیں گے۔

بہرحال اس آیت کریمہ سے مراد کفار و مشرکین کے لیے زمین کی تنگی ہو یا صاحب فضیلت لوگوں کا دنیا سے اٹھ جانا، یہ سارا تغیر و تبدل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وَاللّٰهُ يَحْكُمُ اللہ تعالیٰ ہی ہر معاملے کا حکم اور فیصلہ کرتا ہے لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ اس کے حکم کو پیچھے ہٹانے والا کوئی نہیں۔ اس کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ جب اس نے غلبۂ اسلام کا فیصلہ کر رکھا ہے تو اب منکرین اس فیصلے میں کیسے حائل ہو سکتے ہیں۔ انہیں یہ فیصلہ طوعاً و کرہاً قبول کرنا ہوگا۔

مسلمانوں کا تنزل

کبھی وہ وقت تھا کہ کافروں کے قدموں تلے سے زمین کو نکال کر اللہ نے مسلمانوں کو عروج عطا کیا، اور آج کے دور میں اس کا الٹ ہو رہا ہے۔ اللہ کی زمین مسلمانوں کے تسلط سے نکل کر دہریوں، کافروں، مشرکوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تسلط میں جا رہی ہے۔ یہ برصغیر پورے کا پورا دارالاسلام تھا۔ کابل سے لے کر یہاں تک اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی۔ لاہور کی شاہی مسجد اور حیدرآباد دکن کی مکہ مسجد اُسی کے کارنامے ہیں۔ مگر اُس کے بعد اُس کے جانشین سخت نالائق ثابت ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا برصغیر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا، اور دو سو سال کی جدوجہد کے بعد جب برطانیہ کی غلامی کا جوا اُترا تو اس سرزمین کا بیشتر حصہ ہندوؤں کے تسلط میں چلا گیا اور ایک تھوڑے سے حصے کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ مگر اس قوم کی نفس پرستی اور حبِ مال و جاہ کی وجہ سے پاکستان بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کی تاریخ ایسے ہی سانحات سے بھری پڑی ہے۔ بلخ، بخارا، ختن، تاشقند وغیرہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئے۔ سنکیانگ صوبے میں سات کروڑ مسلمان آباد تھے مگر آج وہاں ایک کروڑ بھی نظر نہیں آتے۔ بخارا میں چالیس ہزار مساجد اور چار ہزار سے زیادہ مدرسے تھے مگر آج وہاں دو ہزار مسجدیں بھی موجود نہیں۔ البانیہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا ملک تھا جو اشتراکیوں کے قبضہ میں چلا گیا، چیکوسلاواکیہ کے مسلمان بھی نہایت تنگی میں گزر اوقات کر رہے ہیں، اُن کے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی ہے اور وہ بے یار و مددگار مظلومانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فلسطین کا سانحہ آپ کے سامنے ہے۔ مسلمانوں کا تاریخی خطہ اور انبیاء کی سرزمین یہودیوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔ شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ ہم سال ہا سال تک مسلمان حکمرانوں سے اپیل کرتے رہے کہ اس مقدس سرزمین کی طرف

توجہ دو۔ یہودی اس خطے میں دھڑا دھڑ غیر منقولہ جائیدادیں خرید رہے ہیں اور اُن کی یہ سکیم خطرناک ثابت ہو سکتی ہے مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ یہودیوں نے مسلمانوں سے سستے داموں زمینیں اور مکانات خرید لیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین پر مسلمانوں کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور یہودیوں کے پاؤں جمتے گئے اور بالآخر وہ یہاں پر ایک خالص یہودی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آج فلسطینی مہاجر دنیا میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ بیت المقدس ان کے قبضے سے نکل چکا ہے۔ بچے بوڑھے اور عورتیں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ اس شیطانی منصوبے میں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس چاروں طاقتیں شامل ہیں جنہوں نے فلسطین کے اصل باشندوں کو بے وطن کر کے طاغوتی طاقت کو وہاں مسلط کر دیا ہے بہر حال اب مسلمانوں کا معاملہ الٹا ہو گیا ہے۔ کبھی اِن کا تسلطِ اغیار پر قائم ہوتا تھا مگر اب اغیار ان پر مسلط ہو رہے ہیں۔

حبِ مال و جاہ

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو حبِ مال و جاہ، ذاتی اقتدار اور چوہدراہٹ نے تباہ کیا ہے۔ ملوکیت کی ساری لعنت مال کی محبت کا نتیجہ ہے۔ جب تک لوگ ذاتی خواہشات کی تکمیل کرتے رہیں گے۔ ملی مفاد پسِ پشت ڈالا جاتا رہیگا، مسلمان من حیث القوم تنزل میں رہیں گے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ مفاد پرست لوگ قومی دولت کو باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر استعمال کرتے ہیں مگر کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ایوب کے زمانے میں ناچنے اور گانے والوں، فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا گیا۔ بنگال کی بلبل چوہدری کو پچاس ہزار روپے کا انعام ملا۔ نام نہاد ملکہ ترنم کو مربعے الاٹ ہوئے۔ یہ کونسا کارنامہ ہے جس کی

پذیرائی ہوتی ہے۔ قوم کا سرمایہ کھیل کود اور لہو ولعب میں صرف کیا جاتا ہے۔ کبھی فلک بوس عمارتوں پر کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا جاتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ لاہور میں تعمیر ہونے والا مینار پاکستان ستر لاکھ روپے میں بنا، مسٹر جناح کے مقبرے پر سات کروڑ روپیہ خرچ ہوا ان عمارات سے قوم کی کون سی ضرورت پوری ہوئی ہے۔ اس میں فضول خرچی، نمود و نمائش اور ذہنی عیاشی کے سوا کیا رکھا ہے۔

دوسری تباہ کن چیز ذاتی چوہدراہٹ ہے۔ عراق اور ایران کے درمیان یہی وجہ تنازعہ ہے۔ تین چار سال کی جنگ میں دو مسلمان ملکوں کے دو لاکھ آدمی لقمہ اجل بن چکے ہیں، جب کہ مالی نقصان کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ دونوں فریق مسلمان کہلاتے ہیں۔ شیعہ ہوں یا سنی نام تو اسلام ہی کا لیتے ہیں مگر باہم برسر پیکار ہیں۔ یہی ہماری نالائقی کی علامت ہے ہم میں اسلام کی انقلابی روح باقی نہیں رہی۔ ہم ذاتی خواہشات کے غلام بن چکے ہیں، اور معمولی ذاتی مفاد کی خاطر بڑے بڑے ملی مفاد قربان کر دیتے ہیں۔ بہرحال اس آیت میں حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کے لیے تسلی کا مضمون بھی ہے اور تغیر و تبدل سے کافروں پر دلیل بھی قائم کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے زعم میں مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ عبث ہے کیونکہ اللہ کے فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اور وہ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ جب وہ پکڑے گا تو پھر اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکے گا۔

خدائی تدبیر کی کامیابی

آگے ارشاد فرمایا وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور تحقیق مخفی تدبیر کی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے۔ عربی میں مکر مخفی چال کو کہا جاتا ہے، اس کے برخلاف اُردو اور پنجابی میں

یہ لفظ دھوکہ اور فریب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے فرمایا، حق کو مٹانے کے لیے پہلے لوگوں نے بھی مخفی چال چلی اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ساری کی ساری مخفی تدبیر اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دشمن کی کسی تدبیر کو کامیاب نہیں ہونے دیگا۔ وجہ یہ ہے يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وہ جانتا ہے ہر اُس چیز کو جو کوئی نفس کماتا ہے، گویا ہر شخص کا ہر کام اس کی نگاہوں میں ہے۔ جب خدا تعالیٰ ہر ایک کے ہر کام سے واقف ہے، تو اس کی مخفی تدبیروں سے بھی واقف ہے، مخفی تدبیر جبھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب کوئی دوسرا اس کے لیے لاعلم ہو مگر اللہ تعالیٰ تو ذرے ذرے سے واقف ہے لہٰذا اس کے سامنے کسی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور سزا دے گا۔ فرمایا وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ اور کافر لوگ عنقریب جان لیں گے کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے۔ جلدی ہی انہیں پتہ چل جائے گا کہ آخرت کا آرام و آسائش کافروں کے حصے میں آتا ہے یا ایمان والوں کے حصے میں۔ یہ معاملہ تو گذشتہ آیات میں ہی حل ہو چکا ہے، اللہ نے فرمایا کہ جنہوں نے خدا کی رضا کے لیے صبر کیا، نماز قائم کی اور خفیہ اور اعلانیہ مال خرچ کیا اور برائی کو نیکی کے ذریعے دور کرتے رہے لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ آخرت کا گھر تو ایسے لوگوں کے لیے ہوگا۔ یہ تو ایمانداروں کی صفات ہیں اور وہی آخرت کے حقدار ہیں۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا" آخرت کا گھر ان کے لیے ہے۔ جنہوں نے تقوے کا راستہ اختیار کیا" وَعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ" اور کافروں کا انجام دوزخ کی آگ ہوگا۔

رسالت کا انکار

فرمایا وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا لَسْتَ مُرْسَلًا آپ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول نہیں ہیں۔ اِن لوگوں نے حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا انکار کیا۔ کہنے لگے یہ شخص رسول کیسے ہوسکتا ہے جو" يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ" (الفرقان) جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چل پھر کر سودا سلف خریدتا اور کاروبار کرتا ہے۔ کبھی کہتے کہ ہم اس کو رسول تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یہ ہماری مطلوبہ نشانیاں پیش نہیں کرتا۔ کوئی کہتا، یہ خزانوں کا مالک نہیں ہے۔ اس کے پاس نوکر چاکر، باڈی گارڈ اور فوج نہیں ہے۔ مکے والے کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بناتا تو مکے اور طائف کے کسی آسودہ حال شخص کو یہ منصب عطا کرتا وہاں بڑے بڑے سردار موجود ہیں، اُن کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے دنیاوی لحاظ سے کمزور آدمی کو اپنا رسول کیسے منتخب کرلیا۔ کوئی آپ کو شاعر کہتا، کوئی کاہن اور جادوگر، اور اس طرح آپ کی رسالت کا انکار کردیا۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا قُلْ آپ کہہ دیجئے كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ میرے اور تمہارے درمیان خدا تعالیٰ ہی گواہ کافی ہے۔ اگر تم انکار کرتے ہو تو کرتے رہو ــــــ خود اللہ تعالیٰ جو مجھے مبعوث کرنے والا ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اگر گواہی چاہتے ہو تو وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ میرا گواہ وہ بھی ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے کتاب سے مراد سابقہ کتب تورات، انجیل وغیرہ مراد ہیں، اور جو شخص ان کتابوں کا صحیح علم رکھتا ہے، وہ بھی گواہی دیگا کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں کیونکہ سابقہ کتب میں میری تمام نشانیاں موجود ہیں۔ جنہیں دیکھ کر صاحب علم لوگ میری

صداقت کی گواہی دیں گے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ جو یہودی عالم تھے، انہوں نے پہلی ہی نشست میں حضور علیہ السلام کو اہی کتاب کے علم سے پہچان لیا اور آپ پر ایمان لے آئے۔ آپ کہتے تھے کہ مجھے اپنے بیٹے کے حق میں اتنا یقین نہیں ہے۔ جتنا حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت پر یقین ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ یہاں پر کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اے کفار و مشرکین تم بے شک انکار کرتے رہو مگر کائنات کا خالق تو گواہ ہے جس کے پاس لوحِ محفوظ کا علم ہے۔ لوحِ محفوظ میں درج ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں میرے لیے وہی گواہی کافی ہے، لہٰذا تمہاری گواہی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری جگہ بھی موجود ہے "قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً" (الانعام) آپ کہہ دیں، اللہ سے بڑھ کر کس کی گواہی ہو سکتی ہے۔ اللہ نے اپنے نبی سے یہ بھی کہلوایا "قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ" (الانعام) آپ کہہ دیں کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ ہے۔ اس سب سے بڑی گواہی کے بعد اگر تم پھر بھی انکار کرتے ہو تو اس سے میری رسالت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس انکار کا مواخذہ تم سے آخرت میں ہوگا۔

سُورة
إبراهيم
مكية

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا سَبْعُ رُكُوْعَاتٍ
سورۃ ابراہیم مکی ہے یہ باون (۵۲) آیات اور اس میں سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى
صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ① اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ
لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ ② الَّذِيْنَ
يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا
عِوَجًا ۭ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ③

ترجمہ :- الٓرٰ قف یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا ہے آپ کی طرف تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اُن کے رب کے حکم سے، عزیز اور حمید کے راستے کی طرف ① وہ اللہ جس کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ

زمین میں ہے۔ اور ہلاکت ہے کفر کرنے والوں کے لیے
سخت عذاب سے ② وہ لوگ جو پسند کرتے ہیں،
دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں، اور وہ روکتے
ہیں اللہ کے راستے سے اور تلاش کرتے ہیں (اس راستے
میں) کجی۔ یہی لوگ ہیں جو گمراہی میں دور پڑے ہوئے ہیں ③

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ ابراہیم ہے۔ سورۃ کے چھٹے رکوع میں خانہ کعبہ کی تعمیر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور ملتِ ابراہیمیہ کا ذکر ہے، اسی مناسبت سے سورۃ کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ سابقہ سورۃ کی طرح یہ سورۃ بھی مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ اس کی باون آیات اور سات رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۸۲۱ الفاظ اور ۳۴۳۴ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامینِ سورۃ

جس طرح اس سورۃ کا سابقہ سورۃ سے زمانہ نزول ملتا ہے اسی طرح ان دونوں سورتوں کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں۔ اس سورۃ میں بھی دین کے بنیادی عقائد، توحید، تردیدِ شرک، رسالت، معاد اور قرآن کی حقانیت و صداقت کا ذکر ہے۔ نبوت و رسالت کے متعلق معترضین کے جوابات دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کلمۂ حق و باطل کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا ہے۔ تذکرہ انبیاء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خصوصی ذکر ہے۔ جب کہ باقی انبیاء کا ذکر اجمالی طور پر آیا ہے، اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کا ایک خاص موضوع مقصدِ بعثتِ انبیاء بھی ہے۔ چنانچہ اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنی بنیادی عقائد کی تعلیم و تبلیغ کے لیے انبیاء کو مبعوث فرمایا، خصوصاً اللہ کی وحدانیت کا مسئلہ اور ایمانیات کی تلقین ہمیشہ سے ملتِ ابراہیمیہ کا مقصد اور دینِ اسلام کی غرض و غایت اور منتہائے مقصود رہا ہے۔ اس کے علاوہ انفاق فی سبیل اللہ، نماز اور بعض دوسری چیزوں کا ذکر ضمناً اس سورۃ میں آئے گا۔

اِس سورۃ مبارکہ میں انبیاء کی تاریخ کا ایک حصہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اگلے درس میں آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں " وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ " اور انہیں تاریخی واقعات یاد دلائیں۔ ایام اللہ سے وہ دن مراد ہیں جب اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام پہ نعمتیں نازل فرمائیں اور بعض کو سزا میں مبتلا کیا۔ ان کو اصطلاحاً ایام تنعیم اور ایام تعذیب بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے واقعات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور اسکی ناشکری کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انبیاء علیہم السلام کے طریقہ تعلیم و تربیت اور اُن کی تبلیغ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ کافروں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتے وقت انہیں کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

حروف مقطعات

سابقہ سورۃ کی طرح اس سورۃ کی ابتدا بھی حروف مقطعات سے ہوتی ہے الٓرٰ۔ مفسرین نے تقریب فہم کے لیے حروف مقطعات کے بہت سے ممکنہ معانی بیان کیے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ الٓرٰ سے خود قرآن مراد ہے اور پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے۔ بعض مفسرین تینوں حروف کے مختلف معانی بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ا سے آنا، ل سے اللہ اور ر سے رویت مراد ہے، اور پورا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں اور تمہاری تمام حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہوں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ الٓمٓرٰ سورۃ کے موضوع کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ غیبی حقائق جو انبیاء کے ذریعے عالم بالا سے اِس جہان میں متعین ہوتے ہیں، اُن کا تصادم انسانوں سے سرزد ہونے والے شرور رذیلہ (گندے شرور) سے ہوتا رہتا ہے

جس کے نتیجے میں حق بات واضح ہوتی رہتی ہے۔ تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ الٓمٓ دراصل مقامات انبیاء کی طرف اشارہ ہے اور یہ بات مجھے ذوقی یعنی الہامی طریقے سے معلوم ہوئی ہے کیونکہ اسے عقلی دلیل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

حروف مقطعات قرآن پاک کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں بعض فرماتے ہیں کہ ہر حرف مفرد اللہ تعالیٰ کے کسی اسم کی طرف اشارہ کرتا ہے ا سے اللہ کا اسم ذات اللہ ہو سکتا ہے ل سے لطیف اور ر سے رحمان یا رحیم مراد لیا جاسکتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ الٓمٓ اس سورۃ کا نام ہے، گویا اس سورۃ کے دو نام ہیں ابراہیم اور الٓمٓ۔ قرآن پاک کی بعض سورتوں کے متعدد نام بھی آتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کے پندرہ نام عرض کیے تھے۔ دسویں صدی کے حافظ الحدیث امام جلال الدین سیوطیؒ حروف مقطعات کی تفسیر میں فرماتے ہیں اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ[1] یعنی ان حروف کی مراد کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ تاہم جو کچھ اس نے مراد لی ہے، وہ برحق ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حروف ابتلائے عباد یعنی بندوں کے امتحان کی خاطر نازل فرمائے ہیں۔ اسی لیے جب حضور علیہ السلام یہ حروف صحابہ کے سامنے پڑھتے پڑھاتے تھے تو کسی نے بھی ان کے معانی میں کرید کرنے کی کوشش نہیں کی، یعنی کسی نے ان کا مطلب یا مراد دریافت نہیں کی، بلکہ جس طرح حضور نے پڑھایا، صحابہ نے پڑھ لیا اور خاموش ہو گئے حضرت علیؓ کے زمانے میں جب عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان حروف کے معانی دریافت کیے، چنانچہ ان کے متعلق بعض باتیں حضرت علیؓ نے اور بعض حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی بیان کیں تاکہ لوگوں کے اذہان قرآن کریم کے ساتھ مانوس رہیں۔ حافظ

---

[1] جلالین ص۴

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جب حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ نے ان حروف کے متعلق کرید نہیں کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ایمان لانا ہی ضروری ہے، اگر کوئی کرید کرے گا تو کسی غلطی میں مبتلا ہو سکتا ہے امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام شعبیؒ جنہیں پانچ سو صحابہؓ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ان سے حروفِ مقطعات کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا، یہ اللہ کا راز ہے، اس کے پیچھے نہ پڑو، کیونکہ ایسا کرنے سے گمراہی میں پڑنے کا خطرہ ہے صرف اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف سے جو بھی مراد لی ہے، وہ برحق ہے۔

حروفِ مقطعات کے بعد سورۃ کی ابتداء قرآن کریم کی صداقت و حقانیت اور اس کی غرض و غایت سے ہوتی ہے کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے آپ کی طرف۔ لفظ کتاب کو نکرہ لایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔ اور حقیقت میں کتاب کہلانے کی مستحق یہی کتاب ہے، اس کے مقابلے میں کوئی دوسری کتاب کتاب کہلانے کی حقدار نہیں ہے سورۃ القصص میں قرآن اور تورات دونوں کے متعلق فرمایا "قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا" اگر تم اس قرآن کا انکار کرتے ہو تو پھر کوئی ایسی کتاب لے آؤ۔ جو ان دونوں سے بڑھ کر ہدایت دہندہ ہو۔ اپنے زمانے میں تورات بھی عظیم کتاب تھی اور اس میں قانون، شریعت اور عقائد کے تمام احکام تھے۔ مگر اس کی جامعیت قرآن سے کم تھی۔ بہر حال قرآن پاک ایک ایسی عظیم کتاب ہے کہ تمام مخلوق مل کر بھی اس کی کسی ایک آیت پر بھی حاوی نہیں ہو سکتی۔ امام شاہ ولی اللہؒ

محدث دہلوی اپنی کتاب فیوض الحرمین[1] میں فرماتے ہیں کہ جب میں قرآن پاک کی کسی آیت کے متعلق مراقبہ کرتا ہوں تو مجھے اس کے نیچے حقائق و معارف کے لاانتہا سمندر نظر آتے ہیں، اور پاک نفوس کو ایسی باتیں نظر آنا بعید از قیاس نہیں۔ قرآن پاک اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے اور خدا تعالیٰ کی یہ صفت لامحدود ہے لہٰذا لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبَاتُہٗ قرآن پاک کے عجائبات لامتناہی ہیں ان میں جتنا بھی غور کریں۔ یہ عجائبات ختم ہونے کی بجائے بڑھتے ہی چلے جائیں گے۔

فرمایا، یہ ایک عظیم کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے اور اس کی غرض و غایت یہ ہے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں، یہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہو رہا ہے۔ اس میں رسالت کا بیان آگیا۔ کہ جس طرح یہ کتاب عظیم الشان ہے، اسی طرح جس رسول پر نازل کی گئی ہے، وہ بھی عظیم الشان رسول ہے۔ یہاں پر ظلمات سے مراد کفر، بدعت، شرک، نفاق اور جملہ معاصی اور برائیاں ہیں۔ گناہوں کی وجہ سے انسان کے دل اور روح پر تاریکی چھا جاتی ہے اور انسان کی انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں سنت ایک روشنی ہے، جس سے روح و قلب اور دل و دماغ روشن ہوتے ہیں۔ قرآن پاک کو بصائر بھی کہا گیا ہے۔ ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ (اعراف) یہ تمہارے رب کی طرف سے بصیرت ہے۔ بصیرت ایسی چیز ہے جو دل کو روشن کرتی ہے۔ دل میں اطمینان اور یقین پیدا ہوتا ہے۔ تو قرآن کی آیات بصیرت کی باتیں ہیں جو انسان کو ہر قسم کے اندھیروں سے نکال کر ایمان، اخلاص، نیکی اور اطاعت کی روشنی کی طرف لاتی ہیں۔

---

[1] فیوض الحرمین مترجم ص۴۲

یہ قرآن لوگوں کو رسومات باطلہ اور بدعات سے موڑ کر سنت کی طرف لاتا ہے۔ دل کی تاریکیاں اگرچہ ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتیں مگر ان کی وجہ سے انسان کا فہم اور شعور ختم ہو جاتا ہے اور انسان نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ برخلاف اس کے ایمان والے قرآن کو برحق سمجھتا ہے اور اللہ کا وعدہ یہ ہے "اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا" (الانفال) اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ ہر جگہ تمہارے لیے فیصلہ کن بات بناتا رہے گا۔ تمہیں صحیح اور غلط کی تمیز آجائے گی اور تم تاریکی میں نہیں رہو گے۔ فرقان قرآن پاک کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے جس کا معنیٰ حق و باطل میں فیصلہ کرنے والا ہے۔ قرآن کے ذریعے انسان ظلمت اور نور میں امتیاز پیدا کرتا ہے، اسی لیے فرمایا کہ اس کی غرض و غایت ہے کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں۔

فرمایا، روشنی کی طرف لانا کسی انسان کا ذاتی فعل نہیں بلکہ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اُن کے پروردگار کے حکم سے ہے۔ جس انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی، وہ حق کو پالے گا اور آپ سے روشنی کی طرف لے آئیں گے۔ اور جو ضدی اور عنادی آدمی ہوگا، وہ اس نور سے استفادہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ اور یہ نور کیا ہے، اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ کمال قدرت کے مالک اور تعریفوں والے پروردگار کی طرف جانے والا راستہ ہے وہ ایسی کمال تعریفوں کا مالک ہے کہ اگر کوئی اس کی تعریف نہ بھی کرے تو اس کی خوبیوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ بہر حال اپنی جگہ موجود ہیں۔ غرضیکہ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ آپ اُن کے پروردگار کے حکم سے لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ آگے اللہ تعالیٰ کی،

تعریف بھی بیان کی گئی ہے اَللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اُسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ ہر چیز کا خالق اور مالک وہی ہے حقیقت میں کوئی دوسری ہستی کسی چیز کی مالک نہیں۔ جو کوئی عارضی طور پر کسی چیز کا مالک بنتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے بنانے سے بنتا ہے۔ انسان تو اپنے وجود اور دیگر لوازمات کا بھی خود مالک نہیں ہے۔ ہر چیز کا مالک و متصرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہ اُس کی تعریف بھی ہوگئی۔

کافروں کا انجام

ان تمام حقائق کے باوجود جو لوگ کفر کرتے ہیں، اللہ نے ان کا انجام بھی بیان فرمایا ہے وَوَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِۣ تباہی و بربادی ہے کفر کرنے والوں کے لیے سخت عذاب سے۔ قرآن پاک کے پروگرام کو تسلیم نہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی سخت سزا کا مزا چکھیں گے۔

فرمایا اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ جو لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں یعنی ان کی تمام تگ و دو اسی زندگی کے لیے ہے جیسے فرمایا "یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚۖ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ" (الروم) وہ لوگ دنیا کی باریک ترین باتیں بھی جانتے ہیں مگر آخرت سے کُلی طور پر غافل ہیں۔ دنیا کے اعتبار سے بڑے عقل مند ہیں مگر آخرت کے لحاظ سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے، اسی دنیا میں ہے آگے کچھ نہیں۔ اسی لیے وہ اپنے پروردگار سے عرض کرتے ہیں۔ "رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡحِسَابِ" (صٓ) ہمیں جو کچھ دینا ہے قیامت سے پہلے پہلے اسی دنیا میں عطا کردے

اللہ تعالیٰ نے عاد اور ثمود کے متعلق فرمایا ہے کہ بڑے بڑے کاریگر، انجینئر، صناع اور ماہرین تھے، دنیا کے اعتبار سے بڑی بصیرت رکھتے تھے، عقل معاش کے لحاظ سے بڑے ترقی یافتہ تھے مگر عقل معاد کی نسبت سے بالکل کورے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کی تحقیر میں یہ دعا بھی سکھلائی ہے[1] اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا اے اللہ! صرف دنیا کو ہی ہمارا منتہائے مقصود نہ بنا۔ اہل ایمان تو ہمیشہ یہ دعا کرتے ہیں "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مطلقاً دنیا کی پسندیدگی بری نہیں ہے مال، دولت، اولاد، آسائش زندگی وغیرہ ایک فطری چیز ہے مگر اس کی طلب اور اس سے محبت اگر آخرت پر غالب آجائے تو پھر تباہ کن ثابت ہوگی۔ سورۃ العادیات میں موجود ہے "وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ" انسان میں مال کی محبت ضرور ہے مگر جب وہ آخرت کو فراموش کر کے حقوق و فرائض کو فراموش کر دے گا تو پھر یہی مال اس کے لیے وبال جان بن جائیگا۔ کافروں کا یہی وطیرہ ہے، خاص طور پر مغربی تمدن میں تو اس کی انتہا ہو چکی ہے۔ شیطان نے دنیا کے لوازمات کو اس قدر مزین کر کے دکھایا ہے کہ اکثر لوگ اسی میں منہمک ہو کر رہ گئے ہیں اور آخرت کو بالکل بھول چکے ہیں، دنیا کی زندگی سے محبت کا یہی مطلب ہے اور اسی کی مذمت کی گئی ہے۔

فرمایا کافروں کی ایک صفت تو یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وہ خدا کے

---

[1] ترمذی ص۵۰۳

راستے سے روکتے ہیں، دوسری جگہ فرمایا کہ خود تو دین سے دور ہوتے ہیں، دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے روک دیا جائے، اس مقصد کے لیے انھوں نے ہمیشہ بڑے بڑے جال بچھائے ہیں، کبھی طاقت استعمال کر کے، کبھی سازش کر کے اور کبھی مکر و فریب کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ عیسائی مشنریاں سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں اور رفاہی اداروں کا جال پھیلاتی ہیں اور اس قسم کا پراپیگنڈا کرتی ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں دین سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں تاکہ نوجوان نسل دین سے بیزار ہو جائے یہ لوگ مال و دولت اور عورت کے لالچ میں دین سے بیگانہ کرتے ہیں اور کبھی وسیع لٹریچر کے ذریعے مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ یورپی ممالک میں اسلام کے خلاف چھ لاکھ کتابیں شائع ہو کر تقسیم ہو چکی ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ کام مکے والے کرتے تھے کبھی رعب کے ذریعے اور کبھی لالچ کے ذریعے لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے، آج کی دنیا میں روس، امریکہ اور انگریز اس کام کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ تمام کافروں کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کو اسلام کے راستے سے روک دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تیسری صفت یہ بیان کی ہے وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا یہ لوگ اللہ کے راستے میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اسلام کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے لوگوں کو اسلام کا راستہ ٹیڑھا نظر آئے اور وہ اسے چھوڑ دیں۔ کافر، مشرک، منافق، یہود، ہنود اور عیسائی سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے فرمایا أُولَٰٓئِكَ

فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ یہ لوگ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں
ایمان والوں کے لیے تسلی کا پہلو بھی ہے کہ یہ لوگ شب و روز انہی سازشوں
میں لگے رہتے ہیں، لہٰذا اِن سے قبولِ حق کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔
یہ اسی طرح گمراہی میں پڑے رہیں گے حتیٰ کہ اس دُنیا کا دور ختم ہو جائے
گا، اور پھر انہیں اس گمراہی کا بدلہ مِل کر رہے گا۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ
لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ
مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۴ وَلَقَدۡ
اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰٮمِ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُوۡرٍ ۝۵ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهِ
اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ اَنۡجٰٮكُمۡ
مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ
وَيُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ
وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَاۤءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ۝۶ ع ۱ ۶ ۱۳

ترجمہ :- اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اُس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ بیان کرے اُن کے لیے۔ پھر گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اور راستہ دکھاتا ہے جس کو چاہے ، اور وہ غالب اور حکمت والا ہے ۴ ۔ البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ۔ (پھر اُن سے کہا) کہ نکالو اپنی

قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف۔ اور یاد دلاؤ اُن کو اللہ کے دِن۔ بیشک اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو صبر کرنے والا اور شکر گزار ہے ⑤ اور (وہ بات قابلِ ذکر ہے) جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہ یاد کرو اللہ کی نعمت کو تم پر، جب کہ اُس نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے۔ وہ پہنچاتے تھے تم کو بُرا عذاب، اور ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو، اور اسمیں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی ⑥

بلاآیات
سورۃ ہٰذا کی ابتدائی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی صداقت اور اس کے نزول کی حکمت بیان فرمائی۔ اس کتاب کے نزول کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعے پیغمبرِ خدا لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی، بداخلاقی اور بداعمالی اندھیرے ہیں، اس کے مقابلے میں توحید، اخلاق، نیکی اور اطاعت بمنزلہ روشنی کے ہیں۔ پھر اللہ نے قرآن کے پروگرام کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی اور اُن کے لیے عذاب کی وعید سنائی۔ فرمایا یہ لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور دین میں کجی تلاش کرتے ہیں، بیہودہ اعتراضات کرتے ہیں، لہٰذا گمراہی میں دور پڑے ہوئے ہیں۔

ل در
ا قوم
آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے رسالت کا مسئلہ بیان فرمایا ہے مکی سورتوں میں یہی بنیادی مسائل توحید، رسالت، معاد، کفر، شرک کی تردید وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔ جس طرح قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تمام انبیاء اور رُسل کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ وحی الٰہی، ملائکہ، تقدیر بھی ایمانیات

میں داخل ہیں۔ تاہم ان آیات میں رسالت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرنے والا۔ اللہ نے اسی کی زبان میں اُسے تعلیم دی لِیُبَیِّنَ لَهُمْ تاکہ اُن لوگوں کے لیے وہ تمام چیزیں بیان کرے جو ان کے لیے ضروری ہیں۔ اگر وحی کسی غیر زبان میں ہوتی تو لوگوں کا اس سے استفادہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا اللہ نے ہر نبی کی قومی زبان میں وحی نازل کی، احکام و شرائع دیے اور اسی زبان میں آگے تبلیغ کی تلقین کی۔ موسیٰ علیہ السلام عبرانی زبان بولتے تھے، لہٰذا تورات عبرانی زبان میں نازل ہوئی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی قومی زبان سریانی تھی تو انجیل بھی اسی زبان میں آئی۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے عربوں اور خاص طور پر قوم قریش میں مبعوث فرمایا، آپ اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور قرآن کریم قریش کی عربی زبان میں نازل ہوا۔ دوسرے مقام پر اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر یہ غیر زبان میں نازل ہوتا تو لوگ اعتراض کرتے کہ ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں، مگر اللہ نے اس اعتراض کی گنجائش نہیں رکھی۔ چنانچہ ہر نبی نے اپنی قومی زبان میں تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا۔ دوسرے مقام پر یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک اُن تمام باتوں کو واضح نہیں کر دیا جاتا جن سے بچنا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور رسول کو اُس کی قومی زبان میں مبعوث فرمایا۔ جزائے عمل کے واقع ہونے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو شرائع اور احکام ٹھیک طریقے سے پہنچائے جائیں اور ان کی اچھی طرح وضاحت کر دی جائے تاکہ کسی کے پاس عدم تبلیغ کا کوئی بہانہ نہ رہے۔

ائے عمل
ے اسباب

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے اعمال کی جزا چار اسباب کی بنا پر ہوتی ہے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے جزائے عمل ضرور واقع ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فطرتی طور پر اللہ تعالیٰ نے انسان میں ملکیت اور بہیمیت کے دو مادے رکھے ہیں جو ہمیشہ اس میں موجود رہیں گے، حتیٰ کہ جنت میں پہنچ کر بھی یہ مادے انسان سے علیحدہ نہیں ہوں گے ان کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی نفس یا نسمہ کا جو رُخ عالمِ بالا کی طرف ہے وہ ملکیت کہلاتا ہے اور جو رخ مادی جہان کی طرف ہے، اسے بہیمیت کہا جاتا ہے۔ ملکیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان میں کمال والی باتیں پیدا ہوں جب کہ بہیمیت چاہتی ہے کہ انسان من مرضی کرتا ہے۔ اِن دونوں مادوں کی آپس میں کشمکش ہوتی رہتی ہے انسان کا فرض ہے کہ وہ بہیمیت پر اس حد تک کنٹرول کرے کہ اُسے ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دے اگر بہیمیت نے اس حد کو پار کر لیا تو پھر خرابی پیدا ہو جائیگی ملکیت کمزور ہو جائیگی اور انسان حظیرۃ القدس، جنت یا بلند مقام تک نہیں پہنچ سکے گا۔ غرضیکہ ملکیت چاہتی ہے کہ اُسے تقویت حاصل ہو اور بہیمیت کی اصلاح ہوتی رہے۔ اس کشمکش کے نتیجہ میں جو بھی قوت غالب آتی ہے، اس کے مطابق جزا کا عمل ضروری ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں جزائے عمل کے اسباب میں سے دوسرا سبب یہ ہے کہ اگر انسان اچھے اعمال انجام دیتا ہے تو فرشتے اُس کے حق میں دُعا کرتے ہیں اور اگر برے اعمال کرتا ہے تو فرشتے بد دعا کرتے ہیں اور اُس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ تو فرشتوں کی دعا یا بد دعا ضرور نتیجہ خیز ہوگی اور جزائے عمل بھی ضرور واقع ہو گا۔

جزائے عمل کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ نے ہر دور میں اپنے

پیغمبر بھیجے ہیں، اور شریعت نازل فرمائی ہے جس کی پابندی ضروری ہے۔ اس شریعت یا قانون کی پابندی یا عدم پابندی کا نتیجہ برآمد ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ نزول شریعت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے تو اس سبب سے بھی جزائے عمل کا واقع ہونا ضروری ہے۔

انبیاء کی بعثت جزائے عمل کا چوتھا سبب ہے، ہر نبی اللہ کے احکام امت تک پہنچا دیتا ہے اور ان کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے اور دین و شریعت میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں رہنے دیتا۔ اس کے بعد اللہ کا واضح فرمان ہے "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ" (انفال) اب جس شخص کو زندہ رہنا ہے وہ کھلی دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور جسے ہلاک ہونا ہے وہ کھلی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو۔ تو گویا انبیاء کی بعثت اور احکام و شرائع کی وضاحت کا تقاضا بھی ہے کہ انسان کے لیے جزائے عمل واقع ہو۔

قومی و بین الاقوامی نبی

ایک بات تو واضح ہو گئی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی زبان عربی میں تکلم فرماتے ہیں۔ اور قرآن پاک بھی عربی زبان میں نازل ہوا تاکہ آپ کے اولین مخاطبین دین متین کو اچھی طرح سمجھ سکیں مگر دوسری طرف اللہ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے "قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا" (الاعراف) اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ دنیا جہان کے لوگوں کو خطاب ہے۔ اس سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عربوں کی طرف مبعوث ہوئے اور وہی زبان بولتے تھے، تو آپ کی رسالت تمام انسانوں کی طرف کیسے ثابت ہوئی۔ اس اشکال کو امام شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ

میں رفع کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت دو حیثیت سے ہے۔ اولاً آپ کو قریش کی طرف بھیجا گیا ہے۔ اور آپ کے ساتھ انہی کی سعادت وابستہ کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے آپ قومی نبی ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے قریش کو آلہ اور جارحہ بنا کر اپنا پیغام تمام اقوامِ عالم کو پہنچایا ہے، تو اس لحاظ سے آپ بین الاقوامی نبی ہیں۔ سورۃ بقرہ میں موجود ہے " وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا " مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر شہید کا معنیٰ معلم اور استاد ہے اور مطلب یہ ہے کہ نبی تمہارا معلم ہے اور تم باقی اہلِ جہان کے لیے بمنزلہ استاد اور معلم ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام عربوں ہی کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیلایا، تاہم اولاً حضور علیہ السلام کو عربوں کی طرف ہی مبعوث کیا گیا تھا۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِّقُرَيْشٍ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ نیکی اور بدی میں سارے لوگ قریش ہی کے تابع ہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں بھی قریش کو باقی عربوں پر فوقیت حاصل تھی اور اسلام آنے کے بعد بھی تمام اقوام کے مقابلے میں قریش ہی کو برتری حاصل ہوئی۔ بہرحال قریش کے واسطے سے آپ بین الاقوامی نبی ہیں۔

لمانوں کا
نج زوال

امت مسلمہ کی خلافت کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب تک قریش میں دو باصلاحیت آدمی بھی موجود ہیں، خلافت کا سلسلہ انہی میں رہیگا، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ابتدائی زمانہ سے لے کر ساڑھے چھ سو سال تک خلافت قریش میں ہی رہی۔ پھر جب مسلمانوں میں کمزوری آگئی تو خلافت سلجوقیوں کو منتقل ہوگئی، پھر ترکوں کے پاس چلی گئی اور پھر آخر میں یہ سلسلہ ہی ختم ہوگیا۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی

باون ریاستیں ہیں مگر سب اغیار کی دست نگر ہیں۔ غیر مسلم اقوام نے مسلمانوں کی اجتماعیت سے خائف ہو کر خلافت کا ہمہ گیر تصور ہی ختم کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ اب ان کی اپنی کوئی سیاست نہیں۔ ہم غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پوری دنیا میں کفار کو غلبہ حاصل ہے ان میں یا تو مذہبی کافر عیسائی ہیں یا پھر دہریئے کافر اشتراکی ہیں۔ آدھی دنیا پر ایک طاقت چھائی ہوئی ہے جب کہ باقی نصف دنیا دوسری طاقت کے تسلط میں ہے۔

فرمایا، ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ ان کو ہر چیز کی وضاحت کر دے پیغمبر کی طرف سے حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے۔ جو کفر، شرک اور نفاق پر اصرار کرتا ہے اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ وہ گمراہی میں پڑا رہتا ہے۔ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اور ہدایت دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے۔ جو ایمان کو قبول کر لیتا ہے، اسے ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور خدا تعالیٰ کمال قدرت کا مالک بھی ہے اور کمالِ حکمت کا مالک بھی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رسالت کے متعلق بنیادی اصول بیان کر دیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی بعثت

رسالت کا بحیثیت مجموعی ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بطور مثال بیان فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اور البتہ تحقیق ہم نے بھیجا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ۔ نشانیوں سے مراد معجزات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عصا اور ید بیضا وغیرہ نو معجزات عطا فرمائے تھے جن کا ذکر مختلف مقامات

پر آیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور قبطی دو قوموں کیطرف
مبعوث فرمایا تھا۔ قبطیوں نے تو آپ کی رسالت کو تسلیم نہ کیا جس کی
پاداش میں وہ تباہ و برباد ہوئے۔ بنی اسرائیل آپ پر ایمان لائے تو اللہ
نے انہیں فرعونیوں کے ظلم و ستم سے نجات دے کر ان پر طرح طرح
کے انعام بھی فرمائے، اور یہ سلسلہ ہزاروں سال تک چلتا رہا۔ بہر حال
موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث فرما کر حکم دیا۔ اَنۡ
اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ کہ
آپ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ ہر نبی
کا یہی کام ہوتا ہے۔ سورۃ کی ابتدائی آیت میں خود حضور خاتم النبیین
علیہ السلام کو بھی یہی حکم ہوا کہ ہم نے یہ کتاب آپ پر اس لیے اتاری
ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں
موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ نے یہی حکم دیا کہ قوم کو کفر، شرک اور معاصی کے
اندھیروں سے نکال کر ایمان اور توحید کی روشنی میں لے آئیں۔

تذکیر بایام اللہ

اور ساتھ یہ بھی حکم دیا وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ آپ
ان کو اللہ کے دن یاد دلائیں۔ ایام اللہ سے وہ تاریخی واقعات
مراد ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں پر انعام فرمائے اور بعض کو سزائیں
دیں۔ بعض قومیں اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کر کے اور ان پر عمل پیرا
ہو کر کامیاب ہوئیں اور بعض انکار کر کے طرح طرح کے عذاب میں
مبتلا ہوئیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ علوم قرآن
پانچ اقسام سے ہیں۔ پہلی قسم علم احکام ہے جس کے ذریعے فرائض،
سنت، واجبات، حلال، حرام، اور مباح وغیرہ کا پتہ چلتا ہے دوسری
قسم علم مناظرہ ہے جس کے ذریعہ چار فرقوں یعنی کافر و مشرک، یہود،
نصاریٰ اور منافقین سے بحث مباحثہ کیا جاتا ہے۔ اس علم کے ذریعہ

ان فرقوں کا ردّ مطلوب ہوتا ہے۔ علوم قرآن کی تیسری قسم علم تذکیر بما بعد الموت ہے۔ موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ اس حصۂ علوم میں کیا گیا ہے تاکہ لوگ ان واقعات سے عبرت حاصل کریں اور محاسبہ اعمال کے لیے تیاری کریں۔ علوم قرآن کی چوتھی قسم تذکیر بآلاء اللہ ہے۔ اس حصہ میں اللہ نے اپنی نشانیوں کا تذکرہ کر کے انسان کو یاد دہانی کرائی ہے کہ وہ ان میں غور و فکر کرے، عجائبات قدرت کا مشاہدہ کرے اور پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے۔ قرآن کے علوم کی پانچویں قسم تذکیر بایام اللہ ہے جس کا ذکر اس آیت مبارکہ میں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام پر گزرنے والے واقعات بیان کر کے انسان کو عبرت دلائی ہے تاکہ وہ اپنی کمزوریوں پر نظر رکھے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اللہ نے قوم عاد، ثمود، قوم لوط، قوم نوح وغیرہ کے حالات مختلف مقامات پر ذکر کیے ہیں۔ صرف قوم فرعون کا واقعہ قرآن پاک میں چھیالیس مرتبہ سے زیادہ ذکر ہوا ہے کیونکہ محض علم کے لیے کسی واقعہ کو ایک ہی دفعہ بیان کر دینا کافی نہیں بلکہ بار بار یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ متعلقہ بات لوگوں کے اذہان میں اچھی طرح جم جائے اور وہ نصیحت حاصل کر سکیں۔

فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ بیشک ان تاریخی واقعات میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو صبر کرتے ہیں۔ مصائب میں صبر اور برداشت سے کام لیتے ہیں۔ اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہیں اور جب کوئی نعمت میسر آتی ہے۔ تو اس کی قدر کرتے ہیں، اس کو برمحل صرف کرتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

فرعونیوں سے نجات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں ہی فرمایا۔ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی

لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہ اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کی ۔ اللہ کا احسان یہ تھا اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ کہ اُس نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے ۔ اور فرعونیوں کی کارگزاری یہ تھی يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وہ تم کو پہنچاتے تھے بُرا عذاب ۔ تمہیں غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا جو کہ بدترین عذاب ہے ۔ غلامی ایک غیر فطری چیز ہے غلام بے ضمیر ہوتا ہے اور اس کی کوئی رائے نہیں ہوتی ۔ غلامی اور آزادی کا مسئلہ اللہ تعالیٰ نے آمدہ سورۃ النحل میں بیان فرمایا ہے ۔

فرعونیوں کے عذاب کی تفصیل یہ ہے وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے ۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ فرعون نے نوّے ہزار بنی اسرائیلی بچے قتل کروائے ، مگر اللہ کی حکمت میں جو بات ہونے والی تھی وہ ہو کر رہی اور اتنا عظیم ظلم بھی اُسے روک نہ سکا ۔ فرمایا لڑکوں کو قتل کرتے تھے وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے تاکہ لونڈیاں بن کر ان کی خدمت کریں انہیں خطرہ صرف مردوں سے تھا کہ اُن کی سلطنت نہ چھین لیں ۔ چنانچہ فرعون کی پولیس تعاقب میں رہتی تھی اور بچہ پیدا ہوتے ہی والدین کے سامنے ذبح کر دیا جاتا تھا ۔

فرمایا وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ اس میں تمہارے لیے بہت بڑی آزمائش تھی ۔ سورۃ اعراف میں ہے بنی اسرائیل نے بڑا صبر کیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس ظالم دشمن کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا اور زمین میں اقتدار بھی بنی اسرائیل کو عطا فرمایا ۔ یہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا ۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ بات قوم کو یاد دلائیں تاکہ وہ اس نعمت کی قدر کریں ۔

آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ جب یہ نعمت حاصل ہو جائے تو پھر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہی کام کرنے چاہئیں جو آزاد لوگوں کے شایانِ شان ہیں۔ جھگڑا، فساد، لڑائی، فرقہ واریت غلامی کے اثرات ہیں جب کہ آزاد قوموں کا اخلاق و کردار بہت بلند ہوتا ہے آزاد لوگوں میں مساوات اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہونا چاہیئے۔ نیکی اور طہارت ہونی چاہیئے، رسوماتِ باطلہ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ہم میں انگریز کی غلامی کے اثرات ابھی تک موجود ہیں، نامعلوم یہ کب ختم ہوں گے۔ جب تک غلامی کے اثرات ختم نہیں ہوتے، قوم عزت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آزادی کی قدر ہی نہیں کی، ورنہ ہمیں اقوامِ عالم میں بلند مقام حاصل ہوتا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ
وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۷
وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۸
اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ
وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ڔ لَا يَعْلَمُهُمْ
اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا
اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ
اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ
اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۹

مع عند المتقدمین
الثلثۃ

ترجمہ:۔ اور جب خبردار کیا تمہارے پروردگار نے کہ
اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور زیادہ دوں گا تمہیں، اور اگر
تم ناشکری کرو گے تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے ۷
اور کہا موسیٰ علیہ السلام نے، اگر تم کفر کرو گے، تم اور جو بھی
زمین میں ہیں سب کے سب، تو بیشک اللہ تعالیٰ غنی ہے
اور تعریفوں والا ہے ۸ کیا نہیں آئی خبر تمہارے پاس
ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ قومِ نوح، عاد

اور ثمود۔ اور وہ لوگ جو اُن کے بعد آئے ۔ نہیں جانتا
اُن کو کوئی بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ آئے اُن کے پاس
اُن کے رسُول کھُلی نشانیاں لے کر، پس لوٹائے انہوں نے
اُن کے ہاتھ اُن کے مونہوں میں ، اور کہنے لگے بیشک
ہم انکار کرتے ہیں اُس چیز کا جس کو تم لے کر آئے
ہو ۔ اور بیشک البتہ ہم شک میں ہیں اُس چیز سے
جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ، تردد انگیز شک میں (۹)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے اس سُورۃ مبارکہ میں قرآنِ کریم کی حقانیت کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد رسالت کا مسئلہ بیان فرمایا۔ پہلے فرمایا کہ ہر نبی اور رسول اپنی قوم کی زبان میں مبعوث ہوتا ہے اور اُسی زبان میں قوم کو خطاب کرتا ہے تاکہ کسی کا کوئی اشتباہ باقی نہ رہے ۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بطورِ خاص ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو رسُول بنا کر بھیجا اور انہوں نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤں اور وہ تاریخی واقعات یاد دلاؤں جو باعثِ عبرت و نصیحت ہیں ۔ اللہ نے صبر اور شکر کرنے والوں کا ذکر کیا ۔ پھر بنی اسرائیل پر کیے گئے انعامات کا تذکرہ کیا کہ انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دے کر صاحبِ اقتدار بنایا اور شریعت عطا فرمائی ۔

مقامِ شکر

آج کی آیات بھی سابقہ آیات سے بسلسلہ شکر ہی مربوط ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ اور جب تمہارے پروردگار نے خبردار کیا لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ اگر تم میرے انعامات کا شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید عطا کروں گا ۔ گذشتہ آیت میں تھا کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کیں اور اب فرمایا کہ انعام پا کر اگر شکر گزاری کرو گے تو میں اس انعام میں مزید اضافہ کر دوں گا ۔ یہاں پر لام تاکیدی ہے اور نّ ثقیلہ ہے

یہ دونوں حروف عربی زبان میں تاکید کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یقین دلایا کہ شکر ادا کرنے کی صورت میں تمہیں ضرور بر ضرور زیادہ دونگا۔ اس میں کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں جسمانی روحانی، دنیوی، اخروی، اندرونی اور بیرونی ہر قسم کی نعمتیں شامل ہیں۔ انسان کا ایک ایک بال خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں گھرا ہوا ہے مگر ان میں سے کسی نعمت کا کما حقہٗ شکریہ ادا کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ مزید انعام ہے کہ وہ انسان کے تھوڑے سے شکریہ پر راضی ہو جاتا ہے، وگرنہ اُس کے انعامات کے متعلق تو خود اُس کا اپنا ارشاد ہے کہ "وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا" (ابراھیم) اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار ہی نہیں کر سکتے چہ جائیکہ ان سب کا شکر ادا کر سکو۔ بہر حال اللہ تعالیٰ تھوڑی سی شکر گزاری پر بھی خوش ہو جاتا ہے اور انسان کو مزید انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔

انسان پر انعاماتِ الٰہیہ

سعدی صاحبؒ نے اپنی کتاب گلستان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ہر ایک سانس کے ذریعے انسان کو اللہ کی دو نعمتیں میسّر آتی ہیں۔ جب انسان سانس کو باہر نکالتا ہے تو اس کے ذریعے جسم کے غلیظ بخارات خارج ہو کر انسان کے لیے آرام و راحت کا سبب بنتے ہیں اور جب سانس انسانی جسم کے اندر جاتا ہے تو باہر کی نسیم طیب (آکسیجن) اسکے جسم میں داخل ہو کر ممدِ حیات بنتی ہے۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسان چوبیس گھنٹے میں کم و بیش چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ انسان تو ایک سانس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ باقی لاکھوں اور کروڑوں انعاماتِ الٰہیہ کی شکر گزاری کرے۔ انسان کے ایک ایک بال میں بے شمار انعامات ہیں۔ ایک گلاس پانی جو انسان پیتا ہے۔ اس میں اللہ کی کروڑوں نعمتیں شامل ہیں جس کے نتیجے میں یہ پانی انسان کے

لبوں تک پہنچتا ہے مگر اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، وہ تھوڑے سے شکر یہ پر بھی راضی ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے ان العبد اذا یاکل الاکل او یشرب شیء یا جب کوئی بندہ کھانا کھاتا[1] ہے یا پانی پیتا ہے اور پھر الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہو جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرا بندہ میری نعمت کا شکر ادا کر رہا ہے۔ مگر کروڑوں انسان ہیں جو ہر وقت اللہ کی نعمتوں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں مگر اُس ذات کا شکر ادا نہیں کرتے۔ انسان کی صحت کو ہی دیکھ لیں، عافیت اور سلامتی کو دیکھیں یہ عظیم نعمتیں ہیں جن کی انسان قدر نہیں کرتا۔ ان کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ان میں سے کوئی چیز زائل ہو جائے۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے جس شخص کی آنکھیں ضائع ہو جائیں اور وہ اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اس کی دو عزت والی چیزیں اٹھالیں، اِس نے صبر کیا، اب میں اُسے جنت میں پہنچائے بغیر کسی چیز پہ راضی نہ ہوں گا۔ شرط یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر ادا کرتا رہے اور ناشکری کا کوئی کلمہ اپنی زبان پہ نہ لائے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دُعا[2] سکھلائی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَّاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ حَالِ اَھْلِ نَارٍ ہر حالت میں اللہ رب العزت کا شکر ہے اور میں اہل دوزخ کے حال سے پناہ چاہتا ہوں غرضیکہ انسان کی سلامتی، سماعت اور قوت شامہ وغیرہ ایسی نعمتیں ہیں کہ انسان کسی ایک کا بھی شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ انسان کی عافیت کے متعلق مسند احمد کی روایت میں آتا ہے مَآ اُوْتِیَ نِعْمَۃً بَعْدَ الْاِیْمَانِ مِثْلَ الْعَافِیَۃِ ایمان کے بعد کسی کو عافیت جیسی عظیم نعمت میسر نہیں، مگر کوئی شخص اس کی قدر نہیں کرتا جسمانی

ا۔ ترمذی صـ ۳۴۶ ، ۲۔ ترمذی صـ ۵۱۷ و ابن ماجہ صـ ۲۷۲ و ابن کثیر صـ ۱۶۷ ج ۳

اور مادی نعمتوں کے علاوہ اللہ نے انسان کو علم جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے
حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص کو سورۃ اخلاص یاد تھی حضور علیہ السلام
نے اُس سے فرمایا، تم اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو۔ اگر تمہارے پاس مال و دولت
نہیں تو کوئی بات نہیں تمہیں تو سورۃ اخلاص جیسی عظیم نعمت حاصل ہے۔
ایک دوسری حدیث میں آتا ہے۔ نِعَمُ اللہِ علی العِبادِ
کَثِیْرٌ وَّ اَجَلُّھُمْ نَجَابَۃُ الاَوْلَادِ یعنی لوگوں کو اللہ
کی بہت سی نعمتیں میسر ہیں اور ان میں سے بڑی نعمت یہ ہے کہ کسی کو فرمانبردار
اولاد نصیب ہو جائے۔ غرضیکہ ہر غریب و امیر کو لاتعداد نعمتیں حاصل ہیں۔
اور ہر شخص پر ان کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔

غرضیکہ علم، دولت، صحت، اولاد اور پھر قدرتی انعام میں ہوا، روشنی
پانی، گرمی اور سردی، بارش ایسی نعمتیں ہیں جو اللہ نے بالکل فری عطا
کر رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انتظام یہ ہے کہ جن چیزوں کی بہت زیادہ ضرورت
ہے اُن کو فری رکھا گیا ہے۔ کھانے کے لیے تو تگ و دو کرنا پڑتی
ہے مگر یہ چیزیں ایسی ہیں جو مفت حاصل ہو جاتی ہیں مگر پھر بھی انسان
شکر ادا نہیں کرتے۔ انسان اپنے اعمال سے پانی کے ایک قطرے کی
قیمت ادا نہیں کر سکتا۔

نعمت کا صحیح استعمال

بہر حال انسان کا فرض ہے کہ اُسے نعمت میسر آئے تو زبان سے
اللہ کا شکریہ ادا کرے اور شکریے کی ایک دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ
نے جو نعمت جس مقصد کے لیے عطا کی ہے اُسے اسی مقصد کے لیے
استعمال کیا جائے۔ اگر کوئی شخص نعمت کو برمحل استعمال نہیں کرتا
تو یہ ناشکری کے مترادف ہوگا۔ اللہ نے کانوں جیسی نعمت دی ہے
تو ان سے اچھی باتیں سنو، مواعظ حسنہ کی سماعت کرو، تلاوت قرآن پاک
سنو۔ اگر ان کانوں سے بیہودہ گانے اور لچر باتیں سنو گے تو یہ ناشکری

ہوگی۔ ظاہری قوا، اور جوارح ہاتھ، پاؤں، آنکھیں اور دماغ ہیں۔ ان کا صحیح استعمال کرو گے تو شکر ادا ہوگا اور غلط استعمال کرو گے تو ناشکری ہوگی، خدا نے قوت دی ہے حکومت دی ہے تو مخلوقِ خدا کی خدمت بجالاؤ نہ کہ لوگوں پر ظلم کرو، ناتوانوں کو تنگ کرو اور ضعیفوں کے مال غصب کرو۔ اللہ نے مال دیا ہے تو بخل نہ کرو، اس کی زکوٰۃ ادا کرو، مستحقین کی اعانت کرو۔ عدل وانصاف کو قائم کرو۔ اللہ نے علم دیا ہے تو اس کو دوسروں تک پھیلاؤ۔ یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں اور ان کا صحیح استعمال کرنے سے ان میں اضافہ ہوگا اور غلط استعمال آخرت میں وبالِ جان بن جائے گا۔

شکر بمقابلہ ناشکری

اللہ نے فرمایا کہ اگر میرا شکر ادا کرو گے تو مزید دوں گا وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اور اگر ناشکر گزاری کرو گے اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ تو میری گرفت بھی بہت سخت ہے۔ یہاں پر کفر سے مراد کفرانِ نعمت ہے کیونکہ یہ شکر کے مقابلے میں آیا ہے۔ عام طور پر کفر ایمان کے مقابلے میں آتا ہے جس کا مطلب اللہ کی وحدانیت رسولوں کی رسالت، معاد، اور تقدیر وغیرہ کا انکار ہوتا ہے، تاہم یہاں پر کفرانِ نعمت مراد ہے۔

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر ناقابلِ اعتبار نہیں کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا۔ اس وقت حضور کے پاس کھجور کا ایک دانہ تھا آپ نے وہی عطا فرما دیا۔ اُس شخص نے اُسے قبول نہ کیا کہ ایسی معمولی چیز سے اس کی ضرورت پوری نہیں ہوگی۔ اُس شخص نے گویا کفرانِ نعمت کیا۔ اتنے میں ایک دوسرا سائل حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اسے بھی کھجور کا ایک دانہ عطا فرمایا، اُس نے الحمد للہ کہہ کر وہ دانہ حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک سے لے لیا۔ آپ بڑے خوش ہوئے اور اپنے ایک آدمی کو بھیجا

کہ ام سلمہؓ کے پاس جو چالیس درہم رکھے ہیں وہ اس سائل کو دے دیں۔ کیونکہ یہ شخص شکر گزار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے شکر ادا کیا اس کو مزید مل گیا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا۔ اس وقت آپ کے پاس اور تو کچھ نہیں تھا، آپ نے پانی دم کر کے دیدیا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم اس پانی سے کون سی ضرورت پوری کریں گے، کوئی روپیہ پیسہ، غلہ وغیرہ مل جاتا تو ہمارا کچھ وقت گزر جاتا۔ اتنے میں حضرت ابوموسیٰ اور آپ کے خاندان کے کچھ لوگ حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے بھی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں لوگوں نے تو یہ پانی قبول نہ کیا، تم ہی لے لو۔ انہوں نے بصد شکر یہ وہ پانی قبول کیا، اس کو پیا اور جسم پر چھڑکا کہ یہ حضور کے دست مبارک سے عطا کردہ متبرک پانی ہے۔ پیچھے خیمے میں حضرت ام سلمہؓ تشریف فرما تھیں، انہوں نے کہا کہ اس باقی میں سے کچھ حصہ میرے لیے بھی رہنے دیا جائے۔ بہرحال حضور علیہ السلام نے یہ پانی قبول کرنے والوں کو خیر و برکت کی خوشخبری بھی سنائی۔ روزہ مرہ مشاہدہ میں آتا ہے۔ ہم ہزاروں نعمتیں ہر وقت استعمال کرتے ہیں مگر الحمد للہ کہنے والے کتنے لوگ ہیں؟ سورۃ سبا میں، اللہ نے فرمایا ہے "وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ" (سبا) میرے شکر گزار بندے بہت تھوڑے ہیں اور اکثر لوگ ناشکر گزار ہی ہیں۔ نہ تو زبان سے شکر ادا کرتے ہیں اور نہ عملی طور پر حق شکر ادا کرتے ہیں۔ آگے اسی سورۃ میں آرہا ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ" بے شک اکثر انسان بہت ظالم اور ناشکر گزار ہیں۔

ناشکری کی سزا

اللہ نے فرمایا اگر شکر ادا کرو گے تو میں مزید دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میری سزا بھی بڑی سخت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سزا کی مختلف

صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لوگوں پر سخت حاکم مقرر کر دیتا ہے، جو انہیں ہر وقت سزا میں مبتلا رکھتے ہیں۔ آج مسلمان ساری دنیا میں ناشکر گزاری کی سزا بھگت رہے ہیں۔ روس جیسی ظالم طاقت کا مسلمانوں کے علاقوں پر قابض ہونا سزا ہی تو ہے۔ بلخ، بخارا، تاشقند اور کابل وغیرہ اسلامی ریاستیں تھیں جنہیں روس پامال کر رہا ہے[1] یہ مسلمانوں نے نہ تو مال و دولت کی قدر کی اور نہ ہی سلطنت کی، یہ صرف چودھراہٹ کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ افغانستان میں ظاہر شاہ نے کیا کیا۔ تیس پینتیس سال برباد کر دیے، اس کے بعد آنے والے بھی ایک دوسرے کی ٹانگیں ہی کھینچتے رہے۔ نہ خدا کا قانون جاری کیا اور نہ ہی مخلوقِ خدا کی خدمت کی۔ اس کے نتیجے میں روس مسلط ہو گیا اور لاکھوں افغانی خانہ جنگی میں شہید ہو چکے ہیں۔ یہ اللہ کی نعمتوں کی ناقدری نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمیں پاکستان پر بڑا فخر تھا کہ ۱۳ کروڑ مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اغیار سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی جمعیت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، لہٰذا انہوں نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اب اس کا نام بھی ہندوانہ ہے، بنگلہ دیش۔ اسلامی جمہوریہ کا نام ہی ختم ہو چکا ہے ناشکری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اللہ نے دستور کے طور پر بتلا دیا کہ اگر شکر گزاری کرو گے تو مزید دوں گا اور اگر ناقدری کرو گے تو سخت عذاب میں مبتلا کروں گا، نہ دین رہیگا اور نہ دنیا، بے آبرو ہو کر رہ جاؤ گے۔

خدا تعالیٰ کی بے نیازی

فرمایا وَقَالَ مُوْسٰی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا اگر تم اور سارے اہلِ زمین مل کر بھی کفر کرو گے تو خدا تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِيْدٌ پس بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور تعریفوں والا ہے۔ حدیث شریف میں

---

[1] اب ۱۹۹۱ء سے روسی ریاستیں آزاد ہیں۔

آتا ہے کہ اللہ نے فرمایا، اے روئے زمین کے رہنے والے انسانو! اگر تم میں سے اول آخر، جن، انسان سب مل کر ایک متقی آدمی کے دل کی طرح بن جائیں، تو میری سلطنت میں ایک تنکا برابر بھی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر سب کے سب ایک بدترین آدمی کے دل کی طرح بن جاؤ، تو میری سلطنت میں ایک تنکا بھر بھی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتے۔ خدا تعالیٰ تو ہر حالت میں بے نیاز اور تعریفوں والا ہے۔ اگر ناشکری کرو گے تو خود ہی تباہی کے مستحق بنو گے۔ تمہاری سلطنت، سوسائٹی، اجتماعیت، تجارت، سیاست، معیشت، غرضیکہ ہر چیز میں تباہی آئے گی اور اس کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔

سابقہ اقوام کا حشر

اگلی آیت بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کے کلام پر مشتمل سمجھنی چاہیئے۔ آپ نے یاد دہانی کے لیے قوم سے فرمایا اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ کیا تمہارے پاس نہیں آئی خبر اُن لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی تو ان کا کیا حشر ہوا فرمایا وہ لوگ کون ہیں قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ وہ قوم نوح، عاد اور ثمود کے لوگ تھے۔ قوم نوح کا حال سورۃ ہود میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے اللہ نے اپنے نبی کے ذریعے ایمان اور توحید کا پیغام بھیجا، یہ اللہ کا بہت بڑا احسان تھا مگر قوم نے اس کی ناقدری کی تو اس کے نتیجے میں غرق ہو گئے۔ قوم عاد کے لوگوں کو اللہ نے بڑی جسمانی طاقت عطا کر رکھی تھی مگر یہ قوم کفر، شرک، سرکشی اور تکبر میں مبتلا تھی۔ قوم ثمود کے سترہ سو شہر اور بستیاں تھیں۔ یہ بڑے صناع اور کاریگر تھے۔ ان کے باغات تھے، انڈسٹری تھی۔ ان کے پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے مکانات لوگ آج بھی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ ان اقوام کی تباہی کے حالات بھی سورۃ اعراف، سورۃ یونس اور سورۃ ہود میں

گزر چکے ہیں۔ اللہ نے قوم عاد کو نرم ترین چیز ہوا کے ذریعہ تباہ کیا اور قوم ثمود کو چیخ اور زلزلے سے دلوچ لیا۔ ان لوگوں نے بھی اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی اور برے انجام کو پہنچے۔

فرمایا ان کے علاوہ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ اور وہ لوگ اور اقوام بھی جو مذکورہ بالا قوم نوح، عاد اور ثمود کے بعد آئے لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ تھے، ان کی شخصیت کیسی تھی اور ان کے مراتب کیسے تھے۔ یہ پوری تفصیل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا بعض اقوام کے اجمالی حالات کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے مگر تفصیلی حالات اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ یہ آیت پڑھ کر فرماتے تھے کَذَبَ النَّسَّابُوْنَ نسب نامے بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ بعض لوگ اپنا نسب نامہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ تواتر کے ساتھ ملاتے ہیں مگر ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ درمیان میں بعض اقوام ایسی گزر چکی ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حضور علیہ السلام بھی اپنا نسب نامہ عدنان سے آگے نہیں لے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ عدنان سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کم از کم تیس قرن یا تیس نسلوں کا فاصلہ ہے جن کے تفصیلی حالات کوئی نہیں جانتا، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنا نسب نامہ ٹھیک ٹھیک آدم علیہ السلام تک پہنچانے کا دعوےٰ کرتا ہے تو اس کی بات میں صداقت نہیں ہوگی۔ امام مالکؒ اس بات کو مکروہ خیال کرتے تھے کہ کوئی شخص اپنا نسب نامہ حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچائے، کیونکہ اللہ نے پوری تفصیلات کسی کو نہیں بتائیں اور نہ ہی تاریخ نے ان واقعات کو پوری طرح محفوظ کیا ہے۔ بہر حال فرمایا، کیا ان اقوام کے حالات آپ تک نہیں پہنچے کہ ان کا

کیا حشر ہوا؟

فرمایا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ پس آئے ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ پس لوٹائے انہوں نے اُن کے ہاتھ اُن کے موہنوں میں اس فعل کو کئی صورتوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس کا معنیٰ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نافرمان لوگوں نے اپنے نبیوں کے ہاتھ انہی کے منہ میں ٹھونس دیئے تاکہ وہ خاموش رہیں اور فریضہ تبلیغ ادا نہ کرسکیں۔ جب کسی کی زیادہ تحقیر مقصود ہوتی ہے تو پھر اسی قسم کا عمل کیا جاتا ہے کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے منہ پر رکھ دیا جائے کہ خاموش رہو۔ ہم تمہاری بات نہیں سننا چاہتے۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان لوگوں نے خود اپنے ہاتھ انبیا کے منہ پر رکھ کر اُن کو خاموش کرانے کی کوشش کی ہو۔ ایک تیسرا معنیٰ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن لوگوں نے خود اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈال لیے۔ اور ایسا کرنا دو وجہ سے ہوسکتا ہے۔ بعض اوقات نہایت غصے کی حالت میں کوئی شخص اپنے ہاتھ اپنے ہی منہ میں ڈال کر چباتا ہے۔ منافقوں اور کافروں کے متعلق آتا ہے وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ" (آل عمران) وہ اپنی انگلیاں غصے کی وجہ سے چباتے تھے کہ مسلمان کیوں کامیاب ہو رہے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان افسوس اور حسرت کی بنا پر اپنے منہ میں انگلی ڈال لیتا ہے۔ یہ بھی درست ہے اور امام شاہ ولی اللہ اسی معنیٰ کو ترجیح دیتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر مذکورہ سارے معنے ہی درست ہیں

بالآخر ان نافرمان قوموں نے خدائی پروگرام کا صریحاً انکار کردیا۔ وَقَالُوْٓا اور کہنے لگے اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ ہم اُس چیز کا انکار کرتے ہیں جو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے۔ تمہارا عقیدہ، شریعت

اور لائحہ عمل ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ ہم نہ تمہاری توحید کو مانتے ہیں، نہ رسالت کو اور نہ معاد کو، وَاِنَّا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَیْہِ مُرِیْبٍ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، ہمیں اس میں تردد انگیز شک ہے۔ ہمیں تمہاری باتوں پہ یقین ہی نہیں آتا۔ جن پرانی اقوام کا ذکر اللہ نے اس آیت میں کیا ہے انہوں نے اپنے اپنے انبیا کو اس قسم کا جواب دیا۔ کہ اُن کے پورے پروگرام کا ہی انکار کر دیا۔ تاکہ اللہ کے نبی انہیں اس پروگرام کی طرف بار بار دعوت دینا بند کر دیں۔ یہ اُن اقوام کے لوگوں کی بات بیان ہوئی ہے، اب اگلی آیات میں اللہ کے نبیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

درس چہارم ٤ آیت ١٠ تا ١٢

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ
اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ
مُّبِيْنٍ ﴿١٠﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ
اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ
نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ
عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى
مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿١٢﴾ ع ٢ ١٤

ترجمہ :- کہا اُن کے رسولوں نے ، کیا اللہ کے بارے
میں شک ہے جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا - وہ
تم کو بلاتا ہے تاکہ معاف کرے تمہارے کچھ گناہ اور مہلت دے
تم کو ایک مقررہ وقت تک - تو کہا اُن (کافر) لوگوں نے
نہیں ہو تم مگر انسان ہمارے جیسے - تم چاہتے ہو کہ ہمیں

روک دو اُس چیز سے کہ ہمارے آباؤ اجداد عبادت کرتے تھے
پس لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل (۱۰) کہا ان کے لیے اُن
کے رسولوں نے، نہیں ہیں ہم مگر انسان تمہارے جیسے۔
لیکن اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے جس پر چاہے اپنے بندوں میں
سے۔ اور نہیں ہے ہمارے اختیار میں کہ لائیں ہم تمہارے
پاس کوئی سند مگر اللہ کے حکم سے، اور اللہ کی ذات پر
ہی چاہیے کہ بھروسہ رکھیں ایمان والے (۱۱) اور کیا ہے
ہمارے لیے کہ ہم نہ بھروسہ رکھیں اللہ پر حالانکہ اُس نے
ہمیں ہدایت دی ہمارے راستوں کی۔ اور ہم ضرور صبر کریں
گے اُس چیز پر کہ تم ہمیں تکلیفیں پہنچاتے ہو۔ اور اللہ
کی ذات پر ہی چاہیے کہ بھروسہ کریں بھروسہ کرنے والے (۱۲)

ربط آیات

رسالت کا بیان وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا سے شروع ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم کو تاریخی واقعات اور اللہ کے انعامات یاد دلائیں۔ پھر اسی ضمن میں فرمایا کہ اے لوگو! اگر تم اللہ کے احسانات کا شکریہ ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں مزید عطا کرے گا اور اگر ناقدری اور ناشکری کرو گے تو اس کا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔ آپ نے قوم کو یہ بات بھی سمجھائی کہ اگر سارے روئے زمین والے مل کر بھی خدا تعالیٰ کا انکار کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی سلطنت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ خدا تعالیٰ غنی اور حمید ہے۔ پھر آپ نے قوم کو یہ بھی یاد دلایا کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے پاس پہلی قوم کی خبریں آئیں۔ انہوں نے ناشکر گزاری کی تو اُن کا کیا حشر ہوا۔ قوم نوح، عاد اور ثمود کے بعد آنے والے لوگوں کا بھی یہی حال ہوا جن کی تفصیلات اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اُن اقوام کے پاس اُن کے رسول آئے مگر اُن لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم اُس چیز کا صریحاً انکار کرتے ہیں جس کی طرف تم ہمیں دعوت

دعوت الی اللہ

دیتے ہو۔ اب آج کی آیات میں اُن رسولوں کا جواب آ رہا ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ کہا اُن کے رسولوں نے۔ جو نبی جس قوم کی طرف آیا ہے اُس نے منکر قوم سے کہا اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ کیا تم اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو۔ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی توحید کے متعلق کوئی تردد ہے اور خدا کی ذات وہ ہے جو کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ فاطر اور بدیع ہم معنی الفاظ ہیں یعنی وہ ذات جو بغیر کسی نمونے، آلے اور مادے کے کسی چیز کو ایجاد کر دے۔ کائنات کو مجموعی طور پہ اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا اور اس تخلیق کے لیے نہ تو پہلے کوئی نمونہ موجود تھا اور نہ اس کے لیے کسی آلے اور مادے کی ضرورت تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت کے ساتھ اس کائنات کو پیدا فرمایا۔ تو اللہ کے رسولوں نے کہا کہ کیا تم اُس خدا تعالیٰ کے بارے میں شک کرتے ہو جو ہر چیز کا موجد ہے۔ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وہ تمہیں اپنی طرف اس لیے بلاتا ہے کہ تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے۔ روزمرہ زندگی میں انسان سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں اور اگر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے تو وہ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کرتا رہتا ہے۔ اور اگر بندہ اپنے پروردگار کی طرف بالکل توجہ نہ کرے تو اس کے گناہ جمع ہو کر اُس کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

مِّنْ ذُنُوبِكُمْ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سارے کے سارے گناہ معاف نہیں کرتا بلکہ بعض کو معاف فرما دیتا ہے۔ ہر انسان سے دو قسم کے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ ایک قسم کا تعلق حقوق اللہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے معاف کر

دیتا ہے بشرطیکہ بندہ اس کے دروازے پر آکر معافی طلب کرلے۔ گناہوں کی دوسری قسم حقوق العباد سے متعلق ہے، جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جب تک متعلقہ بندہ اُن گناہوں کو معاف نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی اُن کو معاف نہیں کریگا۔ بعض مقامات پر مطلق گناہوں کی معافی کا ذکر بھی آتا ہے مگر اُن سے بھی وہی گناہ مراد ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہے بہرحال فرمایا کہ وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے۔ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى اور پھر تمہیں مہلت دے ایک مقررہ مدت تک اللہ تعالیٰ کے علم میں تمہاری جتنی عمر مقرر ہے، اُسے گزارنے کے لیے تمہیں مہلت دے تاکہ گناہوں کی معافی کے بعد تم اچھی زندگی بسر کر سکو۔ اسی مضمون کو سورۃ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے استغفار کر لو گے اور اس کی طرف رجوع کرو گے۔ "يُمَتِّعْكُم مَّتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى" تو وہ تمہیں ایک مقررہ مدت تک اچھی زندگی بسر کرائیگا۔ دوسرے مقام پر "حَيٰوةً طَيِّبَةً" کے الفاظ بھی آتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ انہیں پاکیزہ زندگی نصیب کریگا۔ اور پاکیزہ زندگی وہ ہے جس کا تعلق ایمان نیکی اور اطاعت کے ساتھ ہے۔ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے کہلوایا کہ تم اللہ کی طرف آجاؤ، وہ تمہارے گناہ معاف کر کے ایک مقررہ وقت تک پاکیزہ زندگی عطا فرمائے گا۔

بشری رسالت کا انکار

اللہ کے نبیوں کی اس دعوت کے جواب میں قَالُوٓا کافر اور نافرمان لوگوں نے کہا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا نہیں ہو تم مگر ہمارے جیسے انسان۔ ان لوگوں نے نبیوں کی بشریت کے پیش نظر اُن کی رسالت کا انکار کر دیا۔ قرآن میں اس بات کو کئی مقامات

پہ بیان کیا گیا ہے۔ کافر کہتے تھے کہ تم بھی تو ہمارے جیسے آدمی ہو تمہیں کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں جو تم رسول بن بیٹھے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بناتا، اس پہ وحی نازل کرتا تو وہ کوئی بڑا آدمی ہوتا، تم جیسے غریب آدمی کو کیسے رسول بنا لیا ہے جس کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ نوکر چاکر ہیں، نہ باغات ہیں، نہ فوج اور جتھہ ہے۔ ہم تمہاری بات کو کیسے تسلیم کر لیں کہ تم اللہ کے رسول ہو۔ کہنے لگے تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا تم ہمیں اُن چیزوں سے روک دینا چاہتے ہو جنکی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں۔ ہم تو اُسی دین کی پیروی کریں گے جس پہ ہمارے باپ دادا تھے، تم ان سے زیادہ عقلمند نہیں ہو جو اُن کے طریقے سے ہٹانا چاہتے ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے بھی یہی کہا تھا کہ تم ہمیں ہمارے معبودوں سے دور رکھنا چاہتے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے تو خاص طور پہ کہا تھا "لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ" (نوح) لوگو! نوح علیہ السلام کے کہنے پہ اپنے معبودوں کو نہ چھوڑ بیٹھنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخاطبین نے بھی یہی کہا تھا۔ "قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ" (الانبیاء) کہ اُن کو زندہ جلا دو، اپنے معبودوں پہ جمے رہو۔ ان کو ترک نہ کرنا۔

کہنے لگے اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ تو ہمارے پاس اپنی رسالت کی کوئی کھلی سند لے آؤ۔ اس سے اُن کی مراد یہ تھی کہ ہماری مرضی کی کوئی نشانی یا معجزہ پیش کرو تب ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے ہاتھ پہ بیشمار معجزات ظاہر فرمائے مگر کافر لوگ محض ضد اور عناد کی وجہ سے انہیں تسلیم نہ کرتے تھے بلکہ اُن کے مطالبات

اس قسم کے ہوتے تھے کہ ہمارے سامنے سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے لکھی لکھائی کتاب لے کر آؤ۔ یا فرشتے آکر آپ کی رسالت کی گواہی دیں۔ یا خود خدا تعالیٰ سامنے آکر کہے کہ ہاں! میں نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کھلی سند سے وہ اس قسم کی نشانیاں مراد لیتے تھے کہ ان کے بغیر ہم آپ کو رسول نہیں مانیں گے۔

بشری رسالت کی تصدیق

اس سوال کے جواب میں قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ ان کے رسولوں نے انہیں کہا۔ جہاں تک انسان ہونے کا تعلق ہے اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ نہیں ہیں ہم مگر تمہارے جیسے انسان تمام انبیاء اور رسل انسان ہوتے ہیں، البتہ رسول۔ انسانوں کے علاوہ فرشتے بھی ہوتے ہیں، لیکن نبی ہمیشہ انسان ہی ہوتے ہیں۔ علم عقائد والے نبی کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں "هُوَ اِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ لِتَبْلِيْغِ مَا اُوْحِيَ اِلَيْهِ" نبی ایک انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس چیز کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے جس کو وہ وحی سے نازل کرتا ہے۔

جہاں تک ماہیت انسانیہ کا تعلق ہے اس میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب لوگ برابر ہیں، سب کے سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، لیکن جہاں تک درجے اور مرتبے کا تعلق ہے، اس میں عظیم تفاوت ہے۔ نبی انسان ہوتے ہیں مگر صاحب کمال۔ انبیاء علیہم السلام اللہ کے کامل ترین انسان ہوتے ہیں جو ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اور امت کے لیے بطور نمونہ، باقی امت انہی کے نقش قدم پر چل کر کمال کو پہنچتی ہے اور پھر اولیاء اللہ میں بعض وہ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں تو کامل ہوتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کو بھی کامل بنا سکیں، اور بعض خود بھی کامل ہوتے ہیں۔

اور دوسروں کو بھی کامل بنانے والے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض کاملین دو آدمیوں کو کامل بناتے ہیں اور بعض ایک جماعت کو کامل بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو سب سے زیادہ صلاحیت عطا فرمائی اور آپ نے ایک جہان کو کامل بنایا۔ پھر جو لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ ناقص کہلاتے ہیں۔ ان میں بھی دو گروہ ہوتے ہیں۔ بعض آدمی وہ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں گمراہ ہو جاتے ہیں، وہ ضال کہلاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص راہ راست سے ہٹا ہوا ہے اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ وہ مضل کہلاتے ہیں۔ بہر حال نبیوں کا کمال بہت بلند درجے کا ہوتا ہے مگر وہ بھی نسل انسانی سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً حضور علیہ السلام کے لیے مِنْکُمْ اور مِنْ اَنْفُسِکُمْ کے الفاظ استعمال کیے ہیں یعنی آپ تمہاری ہی نسل اور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسولوں نے فرمایا کہ ہم تمہاری طرح ہی انسان ہیں وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرماتا ہے اسے نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرما لیتا ہے، اور اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ اُس سے گناہ نہیں سرزد ہونے دیا جاتا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے جو انبیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ باقی رہ گیا من مانی نشانی ظاہر کرنا تو اس کے متعلق رسولوں نے کہا وَمَا کَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِیَکُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ اور ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم کوئی کھلی سند یا نشانی پیش کریں مگر اللہ کے حکم سے۔ جب اللہ کی مشیت ہوتی ہے کوئی معجزہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب

پریشانی پیش کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ کسی کو ایسے مطالبات نہیں کرنے چاہئیں بلکہ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ مومنوں کو چاہیئے کہ اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھیں۔

توکل بر خدا

اب اگلی آیت میں اللہ کے نبیوں نے اپنی جماعت کے صبر، توکل اور استقامت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ اور کیا ہے ہمارے لیے کہ ہم نہ توکل کریں اللہ تعالیٰ کی ذات پر وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ط حالانکہ اس نے ہمارے لیے ہدایت کے راستے واضح کیے ہیں۔ توکل کا معنی یہ ہے کہ تمام اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے نتیجے کا اعتماد صرف خدا تعالیٰ پر رکھا جائے، اس کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اسباب پر بھروسہ رکھے گا۔ تو مشرک ہو جائے گا کیونکہ اس نے اسباب کو مؤثر حقیقی سمجھ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص درجے تک اسباب میں اثر رکھا ہے جیسے غذا استعمال کرتے سے بھوک مٹتی ہے اور دوائی پینے سے صحت حاصل ہوتی ہے مگر ان کے متعلق یہی گمان رکھنا چاہیے کہ اگر اللہ اثر پیدا کرے گا تو غذا کے استعمال سے بھوک مٹے گی۔ اگر اللہ کی مشیت نہ ہو تو غذا کھانے کے باوجود ہضم نہ ہوتی اور انسان الٹا تکلیف میں مبتلا ہو جاتا۔ بعض لوگوں کو جوع الکلب کی بیماری ہوتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ کھانے کے باوجود ان کی بھوک نہیں مٹتی۔ لہٰذا غذا ایک سبب ہے مگر اس میں اثر ڈالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اسی طرح بیماری میں دوا استعمال کی جاتی ہے مگر شفا اسی وقت ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ اس دوا میں فائدہ ڈال دے۔ تو گویا دوا مؤثر بالذات نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت مفید ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اس میں اثر پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ کیا ہے ہمارے لیے کہ ہم

اللہ کی ذات پر توکل نہ کریں۔

اسباب کی تین قسمیں

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اسباب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم اسباب مقطوعہ ہیں اور یہ ایک حد تک قطعی ہوتے ہیں۔ اِن کو ہر حالت میں اختیار کرنا ضروری ہے اور ترک کرنا حرام ہے۔ مثلاً کھانے اور پینے میں بقائے حیات مضمر ہے اگر کوئی شخص توکل کرتے ہوئے کھانا پینا چھوڑ کر بھوکوں مر جائے تو یہ توکل نہیں ہوگا بلکہ ایسا شخص حرام موت مرے گا۔ یہ اسباب مقطوعہ ہیں جن کو ترک کرنا حرام ہے، البتہ عقیدہ یہی ہونا چاہیئے کہ خوراک اور پانی وغیرہ مؤثر بالذات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ان میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔

دوسری قسم کے اسباب مظنونہ کہلاتے ہیں۔ اگرچہ گمان غالب ہوتا ہے کہ اِن اسباب میں تاثیر ہوگی مگر یہ بالکل ضروری بھی نہیں ہوتا۔ اس کی مثال بیماری میں استعمال کی جانے والی دوائیں ہیں۔ بعض اوقات ان کے استعمال سے شفا حاصل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتی ایک ہی بیماری میں ایک دوائی کسی شخص کے لیے مؤثر ہوتی ہے اور دوسرے کے لیے نہیں ہوتی۔ لہٰذا دوا استعمال کرنے کے بعد بھروسہ اللہ کی ذات پر ہی ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص اِن اسباب کو ترک کر کے محض خدا پر بھروسہ رکھے تو یہ کمال درجے کا توکل ہوگا۔

حدیث شریف میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر آیا ہے جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں جائیں گے یہ ایسے ہی کمال درجے کے متوکل لوگ ہوتے ہیں کہ وہ اسباب مظنونہ کو اختیار نہیں کرتے۔

اسباب کی تیسری قسم اسباب موہومہ کہلاتی ہے۔ یہ صرف وہم ہوتا ہے کہ اِن اسباب کے اختیار کرنے سے ہو سکتا ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اِن میں جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا وغیرہ آتے ہیں۔

اگر کوئی شخص ان اسباب کو ترک کر دے تو یہ ادنیٰ درجے کا توکل سمجھا جائے گا۔ بہرحال یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ کسی سبب میں تاثیر پیدا کر دے یا اسے موقوف کر دے۔

باقی رہی یہ بات کہ اللہ نے ہمارے لیے ہدایت کے راستے واضح کیے ہیں۔ یہاں سُبُلَنَا جمع کا صیغہ آیا ہے یعنی ہدایت کے بہت سے راستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی کے مختلف شعبوں میں ہدایت کے راستوں کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔ سب سے پہلے دین کے معاملے میں اللہ نے راہنمائی فرمائی ہے اور توحید کی طرف دعوت دی ہے۔ کفر، شرک، نفاق، تردد، شک اور بداعتقادی کو واضح کیا ہے تجارت، معیشت اور سیاست کے راستے واضح کیے ہیں تاکہ ہم اپنی زندگی میں ان راستوں پر چل سکیں۔ اخلاقیات، صلح و جنگ، لین دین، آپس کے معاملات، ایک دوسرے کے حقوق، غرضیکہ تمام شعبوں میں ہدایت کے راستے واضح کیے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے کیا ہے کہ ہم اس ذات پر توکل نہ کریں۔

صبر کی دولت

اللہ کے رسولوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہ بھی کہا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا اور ہم ضرور صبر کریں گے اس پر جو تم ہمیں تکالیف پہنچاتے ہو۔ نبی کے متعلق کہنا کہ اسے ہم پر کوئی فوقیت حاصل نہیں یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے یہ بیوی بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کاروبار کرتا ہے۔ یہ نعوذ باللہ مفتری اور کذاب ہے اس کے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے، یہ جادوگر ہے۔ وغیرہ وغیرہ سب تکلیف دہ باتیں ہیں، جن سے اللہ کے نبیوں کو ذہنی طور پر بڑی کوفت ہوتی تھی، مگر انہوں نے ان سب باتوں پر صبر کیا جو کہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان تمام تر تکالیف کے باوجود وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ بھروسہ رکھنے والوں کو چاہیئے

کہ اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھیں، تعلیم و تبلیغ کے مشن کو جاری رکھیں اور ان مصائب پر دل برداشتہ نہ ہوں۔ ہر مومن کا یہی عقیدہ ہونا چاہیئے۔ کہ مؤثر حقیقی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور بھروسہ کرنے کے لائق صرف وہی ہے۔

درس پنجم ۵ — آیت ۱۳ تا ۱۷

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ
مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ فَأَوْحَىٰ
إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ
الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ
مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ
عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ
صَدِيدٍ ﴿۱۶﴾ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ
الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ
وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ﴿۱۷﴾

ترجمہ :۔ اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا اپنے
رسولوں سے کہ ہم ضرور نکال دیں گے تمہیں اپنی سرزمین
سے، یا تم پلٹ آؤ ہماری مِلّت میں پس وحی کی اُن (رسولوں)
کی طرف اُن کے پروردگار نے کہ بیشک ہم ضرور ہلاک کریں
گے ظلم کرنے والوں کو ﴿۱۳﴾ اور ہم ضرور بسائیں گے تم کو
زمین میں اِن کے بعد، اور یہ بات اُس شخص کے لیے
ہے جو خوف کھاتا ہے میرے روبرو کھڑا ہونے سے اور
خوف کھاتا ہے میری وعید سے ﴿۱۴﴾ اور فیصلہ طلب کیا

انہوں نے اور ناکام ہوا ہر متکبر اور عناد کرنے والا (۱۵) اُس کے آگے جہنم ہے اور پلایا جائیگا اُس کو پیپ والا پانی (۱۶) اُس کو گھونٹ گھونٹ کر کے اتارے گا ، اور قریب نہیں کہ اُس کو حلق سے اتار سکے ۔ اور آئیگی اُس کے پاس موت ہر طرف سے اور وہ مرنے والا نہیں ہو گا ،

اور اس کے آگے سخت قسم کا عذاب ہو گا (۱۷)

ربط آیات

اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حقانیت ، اس کے کتاب ہدایت ہونے اور اس کے ذریعے لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کا ذکر کیا ۔ پھر منکرین قرآن کے انجام کو بیان فرمایا ۔ اس کے بعد "وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ" سے رسالت کا سلسلہ شروع ہوا ۔ پھر قوم موسیٰ ، نوح ، عاد اور ثمود کا ذکر ہوا اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان اقوام کے مکالمے کا بیان آیا ۔ پھر نبیوں کے طریق کار کا تذکرہ ہوا کہ انہوں نے کس طرح خدا کی ذات پر بھروسہ کیا ۔ راہِ حق پر گامزن رہے ، اور صبر و برداشت کا دامن تھامے رکھا ۔

منکرین نے رسولوں کی بشریت پر بھی اعتراض کیا ، جس کے جواب میں رسولوں نے کہا کہ ہم نے کب کہا ہے کہ ہم انسان نہیں ہیں ، کبھی فرشتہ یا دیگر مخلوق ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ۔ نیز یہ کہ تمہاری من مانی نشانیاں پیش کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے کسی بھی معجزے اور نشانی کا اظہار اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے ۔ البتہ تم ہمیں جو کچھ تکالیف پہنچاتے ہو ہم اس پر ضرور صبر کریں گے کیونکہ اللہ نے ہمارے لیے ہدایت کے راستے واضح کیے ہیں ۔ اور ہم پر احسان فرمائے ہیں ۔ ہم تو صرف اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ کرتے ہیں ۔

کفار کی دھمکی

انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اقوام کے لوگوں کے درمیان سلسلہ کلام جاری ہے

جب اللہ کے نبیوں نے اپنی بات کی وضاحت دلیل کے ساتھ کی تو انکی اقوام تشدد پر اتر آئیں۔ وہ دلیل سے تو کوئی جواب نہ دے سکے، البتہ دھمکی دی وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ اور کہا اُن لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا اپنے رسولوں سے یعنی اپنے اپنے زمانے میں اپنے اپنے رسولوں کو ایک ہی طرح کی دھمکی دی لَنُخْرِجَنَّکُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ ہم ضرور نکال دیں گے تمھیں اپنی سرزمین سے اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا یا واپس پلٹ آؤ ہماری ملّت یعنی دین میں۔ مطلب یہ کہ یا تو ہمارا دین قبول کر لو اپنا دین چھوڑ دو۔ ورنہ ہم تمھیں ملک بدر کر دیں گے۔

زمین سے نکالنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی صورت یہی ہے کہ کسی کو ملک بدر کر دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اُسے قید میں ڈال دیا جائے اور اس طرح اس سرزمین میں چلنے پھرنے سے روک دیا جائے۔ تیسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قتل کر دیا جائے گویا اُس سرزمین کی سطح سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔ اللہ کے اکثر نبیوں کے ساتھ اُن کی قوموں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کی قوم نے بھی آپ سے یہی کہا "اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِکُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ" (الاعراف) یہ لوگ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ انہیں اپنی بستی سے نکال دو۔ شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا "لَنُخْرِجَنَّکَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَکَ مِنْ قَرْیَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا" (الاعراف) اے شعیب علیہ السلام! ہم آپ کو اور آپ کے ساتھی ایمانداروں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا ہماری ملّت میں واپس آجاؤ۔ غرضیکہ باطل پرستوں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ حق بات سننے کی بجائے دھینگا مشتی اور تشدد پہ اُتر آتے ہیں۔ مکے کے مشرکین

بھی ایسا ہی کہتے رہے۔ اللہ نے قرآن میں بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے، جن کو بلاوجہ تکلیفیں دی گئیں، اور بعض کو جان سے مار دیا گیا۔ نبی تو معصوم ہوتا ہے مگر کافر جان بوجھ کر اُن کو تنگ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اپنے نئے دین کو چھوڑ کر ہمارے پرانے دین میں واپس آجاؤ۔

قرآن پاک میں موجود ہے کہ اللہ کے نبی یہ پیش کش بھی کرتے تھے کہ اگر تمہیں ہماری بات پسند نہیں تو تم اپنے راستے پر کام کرتے رہو، ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔ پھر دیکھنا نتائج کس کے حق میں نکلتے ہیں مگر کافر لوگ یہ بات بھی نہیں مانتے تھے اور پیغمبروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنا مشن ترک کر دیں۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا مگر خدا تعالیٰ نے اُسے ناکام بنا دیا۔ پھر آپ کو مکے سے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ ہزار کوشش کے باوجود کفار مکہ نے آپ کی بات کو برداشت نہ کیا۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے مخالفین اُن کو دھمکیاں دیتے رہے۔ کہ ہمارے دین میں واپس جاؤ ورنہ ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔

ایک اشکال

اس آیت کریمہ میں لَتَعُوْدُنَّ کے لفظ سے اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا اللہ کے نبی ابتداً کفار کے دین پر ہوتے تھے اور پھر انہوں نے سچا دین اختیار کیا اور اس وجہ سے کفار انہیں پہلے دین پر واپس لانا چاہتے تھے۔ مفسرین کرام اس کا جواب دیتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اللہ کے نبی کبھی ایک لحظہ بھر کے لیے بھی کفر و شرک کے دین پر نہیں ہوتے بلکہ وہ ابتدا سے ہی کفر اور شرک سے بیزار ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا "وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰھِیْمَ رُشْدَہٗ مِنْ

قَبْلُ (الانبیاء) ہم نے ابراہیم کو ابتدا ہی سے ہدایت عطا فرمائی۔ لفظ عَوْد کا عام فہم معنیٰ اگرچہ پلٹ آنا ہوتا ہے مگر یہ لفظ محض ہو جانے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ یٰسین میں موجود ہے کہ ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ یہاں تک کہ وہ پرانی شاخ کی طرح بالکل باریک اور ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نبوت ملنے سے پہلے اللہ کا نبی اگرچہ ایمان پر ہوتا ہے مگر فریضہ تبلیغ ادا نہ کرنے کی وجہ سے کافر لوگ انہیں اپنے دین پر ہی سمجھتے ہوں گے، لہٰذا انہوں نے اپنے زعم باطل کے مطابق کہہ دیا کہ تم پہلے بھی ہمارے دین پر تھے۔ اب پھر اسی میں پلٹ آؤ۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کافروں نے عود کا لفظ صرف انبیاء علیہم السلام کے لیے نہیں بلکہ ان کے پیروکاروں کے لیے بھی استعمال کیا ہے اور ان کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ نبی اور اس کے ماننے والے سارے کے سارے پرانے دین میں واپس آجائیں۔ ان کی یہ بات جزوی طور پر درست ہو سکتی ہے کیونکہ نبی کے پیروکار تو بہرحال ابتداً باطل دین پر ہی تھے اور کافر لوگوں نے ان کی واپسی کے مطالبے کے ساتھ پیغمبروں کو بھی شامل کر لیا، حالانکہ اللہ کے نبی کبھی بھی باطل دین میں نہیں رہے۔ اس طرح آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ کافروں نے نبی کے پیروکاروں سے کہا کہ تم ہمارے دین میں واپس لوٹ آؤ اور پیغمبروں سے کہا کہ تم ہمارا دین اختیار کر لو۔

اللہ کی طرف سے تسلی

کافروں کی اس دھمکی کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ کہ ان کے رب نے وحی کی ان (رسولوں) کی طرف اور ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ فکر نہ کرو کہ اگر یہ لوگ تمہیں تکالیف پہنچا رہے

ہیں لَنُهۡلِكَنَّ الظّٰلِمِيۡنَ تو ہم بھی اِن ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے
کفر اور شرک سب سے بڑے ظلم ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے "وَالۡكٰفِرُوۡنَ
هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ" (البقرہ) کافر لوگ ہی ظالم ہیں" اِنَّ الشِّرۡكَ
لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ" (لقمان) شرک بہت بڑا ظلم ہے منکرین رسول
کفر و شرک کا ارتکاب کر کے ظالموں کی فہرست میں شامل ہو گئے، تو
اللہ نے فرمایا کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے، ظلم حقوق اللہ اور
حقوق العباد میں بھی ہوتا ہے مگر عقیدے میں کفر و شرک کی موجودگی ظلم
عظیم ہے۔ اور ظلم کی دوسری صورت یہ بھی تھی کہ کافر لوگ اہل ایمان پر
تشدد کرتے تھے اور انہیں زبردستی اپنے دین میں لانا چاہتے تھے جب
ابراہیم علیہ السلام نے کلمۂ حق بلند کیا تو کہنے لگے "حَرِّقُوۡهُ" اس کو جلا
ڈالو، یہ تمہارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم
نے آپ کو کہا کہ اے نوح! اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔
لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِيۡنَ" (الشعراء) تو ہم تمہیں
سنگسار کر دیں گے لوط علیہ السلام سے بھی یہی کہا گیا کہ اگر باز نہ آؤ گے
لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُخۡرَجِيۡنَ" تو تمہیں نکال دیا جائے گا
اللہ نے فرمایا، ہم اِن ظالموں کو ضرور ہلاک کرینگے وَلَنُسۡكِنَنَّكُمُ
الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ اور اُن کے بعد ہم تمہیں اس
سرزمین میں آباد کریں گے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر ایسا ہوا ہے کہ عنادی لوگ
ہلاک ہوئے اور ان کے بعد اللہ کے نبی مع اپنے متبعین کے وہاں
پر آباد ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین کو اللہ نے غرق کر دیا۔ خود
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام مخالفین دب گئے۔ وہ یا تو ایمان
لے آئے، یا مارے گئے یا ملک بدر ہوئے اور بالآخر حضور علیہ السلام
اور آپ کے صحابہؓ اُس سرزمین پر غالب آئے فرمایا ذٰلِكَ لِمَنۡ

خَافَ مَقَامِیۡ یہ چیز اُس شخص کو حاصل ہوگی جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا۔ جس شخص کو محاسبہ اعمال کا خوف ہے ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق و کردار کا مالک ہوگا اور وہی اس زمین میں خلافت کا حقدار ہوگا۔ فرمایا وہ شخص بھی حقدار ہے وَخَافَ وَعِیۡدِ جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔ ہم ایسے شخصوں کو زمین میں نیابت عطا کرتے ہیں اور ان کے مخالفین کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ جب اس زمین پر تم آباد ہو جاؤ گے تو پھر تمہاری آزمائش بھی شروع ہو جائے گی کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ کہ تم کس قسم کے کام انجام دیتے ہو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے یہی فرمایا تھا کہ وہ تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر کے اس سرزمین میں تمہیں آباد کرے گا "فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ" (الاعراف) پھر وہ آشکارا کر دے گا کہ تم کیا کاروائی کرتے ہو۔ بہر حال اللہ نے اپنے نبیوں کو تسلی دی کہ وہ ظالموں کو ہلاک کر کے ان کی جگہ اہل ایمان کو آباد کرے گا۔

فیصلے کا مطالبہ

آگے ارشاد فرمایا وَاسۡتَفۡتَحُوۡا اور فیصلہ طلب کیا انہوں نے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کا ذکر ہو رہا ہے تو فیصلہ کس نے طلب کیا، انبیاء نے یا مخالفین نے؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فیصلے کی ضمیر انبیا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور ان کے مخالفین کی طرف بھی۔ مخالفین کی طرف اس طرح کہ جب بھی اللہ کے نبی انہیں خدا کا پیغام سناتے تھے تو وہ انکار کر دیتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ سے فیصلہ طلب کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ اِنۡ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِکَ فَاَمۡطِرۡ عَلَیۡنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ" (انفال) اے اللہ! اگر یہ قرآن تیری سچی کتاب ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب بھیج دے

ہم تو اس کتاب کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو ہمارے معبودوں کی مذمت کرتی ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی آپ سے یہی کہا تھا "فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا" (ھود) جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو، اس کو لے آؤ۔ حضرت شعیب علیہ السلام سے بھی اسی قسم کا فیصلہ طلب کیا گیا۔ "فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ" (الشعراء) اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے۔

وَاسْتَفْتَحُوا کی ضمیر انبیاء کی طرف لوٹانا بھی درست ہے۔ اکثر انبیاء کے واقعات میں ملتا ہے کہ ان کی پوری سعی کے باوجود جب قوم راہِ راست پر نہ آئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے آخری فیصلہ طلب کیا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے تنگ آ کر رب العزت سے دعا کی "فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا" پروردگار میرے اور ان کے درمیان اب فیصلہ کر دے "وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ" (الشعراء) اور مجھے اور میرے ایماندار ساتھیوں کو نجات دے دے۔ لوط علیہ السلام نے بھی یہی عرض کیا تھا۔ کہ مولا کریم! میں ان ظالموں سے تنگ آ چکا ہوں۔ اب تو اپنا فیصلہ دے دے۔ "رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ" مجھے اور میرے لواحقین کو ان کے گندے کاموں سے نجات دے یہ بھی فیصلے کی درخواست تھی۔ شعیب علیہ السلام نے بھی ان الفاظ کے ساتھ فیصلہ طلب کیا "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ" (الاعراف) پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ سورۂ یونس میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی آتا ہے کہ انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں اس طرح دعا کی۔ اے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے حواریوں کو مال و دولت دیا ہے

یہ تو نعمت ہے۔ کیا یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے عطا کیا ہے۔ "رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" پروردگار ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے اور پھر یہ عذاب الیم کا شکار بن جائیں۔ بہر حال فیصلہ طلب کرنے والے انبیاء بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے مخالفین بھی۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس درخواست کو انبیاء کی طرف منسوب کرنے کو ترجیح دی ہے۔

منکرین کے لیے سزا

فرمایا، انہوں نے فیصلہ طلب کیا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ اور ہر ضدی آدمی ذلیل و خوار ہوا۔ عناد رکھنے والے ظالم لوگوں کو کبھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی بلکہ وہ تو سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ فرمایا مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ اس کے آگے جہنم ہے۔ عنادی لوگ جب اگلے جہان میں پہنچیں گے تو جہنم ان کے آگے پیش کر دی جائے گی۔ وراء کا لفظ ظرف ہے، اور یہ آگے اور پیچھے دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے، تاہم یہاں پر آگے کا معنیٰ زیادہ موزوں ہے۔ اس معنی کی مثالیں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہیں جیسے "مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" (المومنون) جب مرتے ہیں تو ان کے آگے برزخ ہوتا ہے۔ "مِنْ وَّرَآءِ الْمَرْءِ مَا يَعْلَمُ" آدمی کے آگے وہی چیز ہوتی ہے جس کو وہ جانتا ہے۔ فرمایا انسان کی زندگی دائمی نہیں ہے اور اس کے آگے جہنم ہے، اس میں وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ پلایا جائے گا وہ شخص پیپ ملا ہوا پانی یعنی خون کو زرد رنگ کا بدبودار پانی پینے کے لیے دیا جائے گا جو جہنمیوں کے زخموں سے نکلے گا۔ جب پیاس کی شدت محسوس ہو گی يَّتَجَرَّعُهٗ تو اس پانی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پیئے گا وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ اور قریب نہیں کہ اس کو حلق سے نیچے اتار سکے۔ سیاغت کا معنی خوشگواری

کے ساتھ نگلنا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوزخی آدمی اس پیپ ملے پانی کو آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے نہیں اتار سکے گا۔ یہ پانی اس قدر گرم ہوگا کہ منہ کے قریب آکر اُسے جلا ڈالے گا۔ سورۃ محمد میں موجود ہے کہ پانی اتنا گرم ہوگا جس سے "فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ" اُن کی آنتیں کٹ کر نیچے گر پڑیں گی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آجائیں گی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ اس طرح جہنمی اُس پانی کو آسانی سے نہیں پی سکے گا۔ یہ اُس کو دی جانے والی سزا کا ذکر ہو رہا ہے۔

ایسے شخص کے متعلق اللہ نے مزید فرمایا وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اس کو ہر طرف سے موت آئے گی۔ موت سے مراد اسباب موت ہیں، یعنی ایسی کڑی سزائیں ملیں گی کہ ہر سزا موت کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے، مگر وہ شخص مریگا نہیں۔ وہاں تو امر ہی ہوگا۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا (النساء) جب جہنم کی کھال آگ کی تپش سے جل جائے گی تو اس کی جگہ فوراً دوسری کھال پہنادی جائے گی۔ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ اور اُس شخص کو موت نہیں آئیگی بلکہ وہ ہمیشہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہی رہے گا۔ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيظٌ اور اس کے آگے سخت قسم کا عذاب ہوگا جس کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

یہ جواب ہے اُن لوگوں کو جو اللہ کے نبیوں کو دھمکیاں دیتے تھے کہ تم ہمارے دین کو قبول کرلو، ورنہ ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ اللہ نے اپنے نبیوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ایسے لوگوں کا یہ انجام ہونے والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ
اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ
مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ
الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

ترجمہ:۔ مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ہے اپنے رب کے ساتھ، اُن کے اعمال مثل راکھ کے ہیں کہ سخت ہوگئی ہے اس کے ساتھ ہوا شدید آندھی کے دِن ۔ نہیں قادر ہوں گے وہ اس چیز میں سے کسی شئے پر بھی جس کو انہوں نے کمایا، اور یہ گمراہی ہے دور کی ﴿۱۸﴾ (اے مخاطب) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور لائے وہ نئی مخلوق ﴿۱۹﴾ اور نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ پر کوئی دشوار ﴿۲۰﴾

ربطِ آیات — گذشتہ آیات میں ذکر ہوچکا ہے کہ کافر لوگ اللہ کے نبیوں کو دھمکی دیتے تھے کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے اور ان کے بعد

اس زمین میں تمہیں آباد کریں گے۔ فرمایا یہ سعادت اس شخص کو حاصل ہوگی جو محاسبہ اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے اور اس کی وعید سے خوف کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام یا اُن کی قوموں نے اللہ سے فیصلہ طلب کیا جس کے نتیجے میں ہر متکبر اور ضدی آدمی ہلاک ہوا۔ ایسے لوگوں کو جہنم میں پیپ ملا پانی پینے کو ملیگا۔ جسے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے نگلنے کی کوشش کریں گے مگر اس کا نگلنا مشکل ہوگا جہنمی لوگوں کو اسبابِ موت ہر طرف سے گھیریں گے مگر انہیں موت نہیں آئے گی۔ بلکہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں عذاب میں مبتلا رہیں گے

کفار کے اعمال کی مثال

انبیاء علیہم السلام کو تسلی دینے اور کفار کا انجام بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعمال کا حال ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرنے والے لوگوں کے اعمال کی مثال كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ راکھ کی ہے جو ہوا کے ساتھ سخت ہوگئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کے اعمال راکھ کے ڈھیر کے مانند ہیں کہ جب تیز ہوا چلے تو سارا ڈھیر اڑ جائے اور اُن کے پاس کچھ نہ رہے۔ کفر سے مراد اللہ کی ذات، صفات، اس کی وحدانیت نبوت و رسالت، قیامت، ملائکہ اور تقدیر کا انکار ہے۔ اعمال سے مراد اگر کفریہ اور شرکیہ اعمال ہیں تو ظاہر ہے کہ اللہ کے نزدیک ان کی کیا وقعت ہے۔ وہ جتنے بھی اعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے وبال جان بن جائیں گے۔ البتہ کافروں کے بعض نیک اعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض کافر لوگ بھی صدقہ خیرات کرتے ہیں، انسانی ہمدردی کے جملہ امور انجام دیتے ہیں، سکول اور ہسپتال بناتے ہیں، تو کیا اُن کے یہ اعمال بھی اکارت جائیں گے؟ فرمایا فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ آندھی

کے دن یعنی جب قیامت کی آندھی آئے گی تو یہ سب اعمال راکھ کی مانند اڑ جائیں گے۔ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ اس دن اپنی کمائی کی کسی چیز پر قادر نہیں ہوں گے۔ اور ان کے رفاہِ عامہ کے کام بھی ضائع ہو جائیں گے۔

ایمان شرط قبولیت ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال کی قبولیت ایمان پر موقوف ہے۔ اگر ایمان نہیں ہے تو بڑے سے بڑا عمل بھی کام نہیں آئے گا قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے کہ پسندیدہ لوگ وہ ہیں "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" جو ایمان لائے اور پھر نیک اعمال انجام دیے جب تک ایمان نہیں ہوگا، اعمال کی کچھ قدر نہیں ہوگی۔ سورۃ الانبیا میں ہے۔ "فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ" جس شخص نے نیک اعمال انجام دیے بشرطیکہ وہ مومن ہے تو اس کی محنت کی ناقدری نہیں کی جائے گی اس سے بھی معلوم ہوا کہ قبولیت اعمال کے لیے ایمان کا ہونا شرط ہے۔ اگر انسان کا ایمان درست نہیں، فکر پاک نہیں، عقیدہ صحیح نہیں تو اچھے سے اچھا عمل بھی فائدہ نہیں دیگا۔ جس طرح نماز کے لیے طہارت شرط ہے اسی طرح اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ کافر لوگ اپنے زعم میں جو بھی اچھے کام کرتے ہیں، ان کا بدلہ انہیں دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔ اور پھر آخرت میں ان کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہی ان کی شہرت ہو جاتی ہے۔ مال و دولت حاصل ہو جاتا ہے، اقتدار مل جاتا ہے اولاد حاصل ہوتی ہے مگر آخرت سے خالی ہوتے ہیں۔ جب تک ایمان درست نہیں ہوگا، اعمال میں ثقل نہیں ہوگا اور وہ قیامت کی آندھی میں راکھ کی طرح اڑ جائیں گے۔ بے وزن اور ہلکے اعمال کے متعلق

سورۃ القارعہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ" ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

آج کی دنیا میں بھی ایمان سے خالی کافر، مشرک، یہودی، عیسائی، کیمونسٹ، دہریے، ہنود اور سکھ ہیں جو رفاہِ عامہ کے بڑے بڑے کام انجام دیتے ہیں۔ برطانیہ، امریکہ اور روس نے یونیورسٹیاں اور ہسپتال قائم کر رکھے ہیں، دنیا میں جہاں کہیں تباہی آتی ہے، قحط واقع ہوتا ہے، سیلاب اور زلزلہ آتا ہے، تو فوراً مدد کو پہنچتے ہیں اور انہیں ان کاموں پر بڑا فخر ہے۔ پرانے زمانے میں بھی بڑی بڑی تہذیبیں گزری ہیں جنہوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ ٹیکسلا کے مقام پر گندھارا تہذیب آج سے تین ہزار سال پہلے بڑے عروج پر تھی، ان کی عمارات، برتن صنعت و حرفت آج بھی لوگوں کو حیرت میں ڈال رہی ہے موہنجوڈھارو اور ہڑپہ میں ملنے والی چھ ہزار سالہ پرانی تہذیب کے عجیب و غریب نشانات ملے ہیں۔ پرانی قوموں میں قوم عاد اور ثمود کے پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے مکانات آج بھی دنیا کی توجہ کا مرکز بنے ہوتے ہیں۔ بابل کی پرانی عمارتیں، چین اور جاپان کے بڑے بڑے معبد، مصریوں کے اہرام وغیرہ ان قوموں کی عظمت کے نشان ہیں۔ آج کے زمانے میں بھی لوگ بڑی بڑی عمارتوں، کھیل کے میدانوں، ناچ گھروں اور آرٹ گیلریوں پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ ایمان کی عدم موجودگی میں ان کے تمام کام راکھ کے ڈھیر کی طرح اڑ جائیں گے اور وہ لوگ خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ میو کا قائم کردہ ہسپتال، دیال سنگھ کالج اور لائبریری، گلاب دیوی اور گنگا رام کا ہسپتال، ان کے ہزاروں اوقاف اور رفاہِ عامہ کے کام قیامت والے دن بے سود ثابت ہوں گے آج دنیا میں ان کا نام لیا جا رہا ہے، ان کو شہرت حاصل ہے مگر

یہ اسی دُنیا تک محدود ہے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، کیونکہ وہ ایمان سے خالی گئے۔

دور کی گمراہی

فرمایا ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ یہ سب کچھ دور کی گمراہی ہے۔ کافر لوگ باطل زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ انسانی ہمدردی کے کام کر رہے ہیں مگر حقیقت میں وہ بہک کر دور جا پڑے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کتنا بھی مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ سمجھیں حقیقت میں وہ جہنم کے کندۂ ناتراش ہیں۔ صدر ہو یا وزیر، تاجر ہو یا صناع، سائنسدان ہو یا فلاسفر، اگر ایمان سے خالی ہے تو کچھ بھی نہیں، چونکہ انہیں ایمان کی قدر و قیمت نہیں، اس لیے وہ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

مخلوق کی تبدیلی

فرمایا، اے مخاطب! اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق ان چیزوں کو ایسا ہی پیدا کیا ہے جیسا ان کو ہونا چاہیئے تھا۔ تو جس طرح ان چیزوں کا آغاز ہوا ہے، اسی طرح ان کا انجام بھی ہوگا اور پھر جزائے عمل واقع ہوگی ورنہ حکمت ہی باطل ہو جائیگی۔ اللہ تعالےٰ نے انسانوں کو اپنے قانون کی پابندی پر مامور کیا ہے۔ ملکیت کی ترقی اور بہیمیت کی کمزوری اس قانون پر عمل درآمد سے ہی ممکن ہوگی۔ نبیوں کی بات برحق ہے اور بہتر انجام کے لیے ایمان لازمی ہے۔

فرمایا، جس طرح اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق ہے، اسی طرح وہ علیم کل اور قادر مطلق بھی ہے۔ اگر تم اس کے قانون کی خلاف ورزی کرو گے، مقصدِ تخلیق کا حق ادا نہیں کرو گے، تو اللہ تعالےٰ کو تمہاری کچھ پرواہ نہیں اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ اور تمہاری جگہ کوئی دوسری

مخلوق لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سابقہ اقوام کی مثالیں بیان کی ہیں کہ وہ کیسے کیسے متمدن سلطنتوں کے مالک، جسیم اور طاقتور تھے مگر نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحاقۃ میں قوم عاد کا ذکر کر کے فرمایا "فَهَلْ تَرَىٰ لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ کیا ان میں سے فرد واحد بھی باقی بچا؟ سب نابود ہو گئے۔ اللہ نے ان کو چن چن کر ہلاک کیا۔ آج بھی اگر اللہ چاہے تو تمام کافروں، مشرکوں، یہود و نصاریٰ، دہریوں اور بے دینوں کو ہلاک کر دے، مگر یہ اس کی حکمت اور مصلحت ہے کہ وہ مہلت دیتا رہتا ہے "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" (الفجر) تیرا رب تو گھات میں رہتا ہے۔ وہ حظیرۃ القدس سے نگرانی کر رہا ہے جب چاہے گا نافرمانوں کی رسی کھینچ لے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر اللہ چاہے تو تم کو اس دنیا سے مٹا دے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق لے آئے فرمایا وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ دشوار نہیں۔ وہ ہر کام کرنے پر قادر ہے۔ اس میں اہل ایمان کے لیے عبرت ہے کہ اگر وہ دین پر قائم نہ رہے، تو ان کا حشر بھی سابقہ قوموں سے مختلف نہیں ہو گا۔ جو وعید سابقہ اقوام پر آئی وہ ان پر بھی آسکتی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ اگر تم اس کے احکام پر عمل نہیں کرو گے تو اس کو حق حاصل ہے کہ "وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" (التوبۃ) تمہیں ملیامیٹ کر کے تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے۔ جو تم جیسے بدعمل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو کھڑا کر دے گا۔ جو تمہاری طرح ناہنجار، مفسد شرارتی، مادہ پرست، جاہ طلب اور خود غرض نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون انبیاء کی تسلی کے لیے نازل فرمایا ہے

اور ساتھ ساتھ اہل ایمان کے لیے عبرت کا مقام بھی ہے۔ کہ اگر وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں گے (کفر، شرک، نفاق اور الحاد کا راستہ اختیار کریں گے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو بھی ختم کر کے دوسروں کو اُن کی جگہ پر لانے پر قادر ہے۔ کافروں کو زعم تھا کہ انہوں نے دنیا میں بڑے اچھے اچھے کام کیے، دنیا میں ان کی پوزیشن بھی اچھی خاصی تھی مگر ان کے سارے اعمال راکھ کا ڈھیر ثابت ہوئے۔ اگر کسی کو اس دنیا میں مہلت مل رہی ہے، تو اُسے مغرور نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ خدا تعالیٰ جب چاہے گا رسی کھینچ لے گا اور ایسا کرنا اس کے لیے کچھ دشوار نہیں۔

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِينَ
اسْتَكْبَرُوٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ
قَالُوا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ
اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ ﴿۲۱﴾ ع ۳ / ۹ / ۱۵

ترجمہ :- اور ظاہر ہوں گے یہ لوگ سب کے سب اللہ کے سامنے۔ پس کہیں گے کمزور لوگ اُن لوگوں سے جنہوں نے تکبر کیا، بیشک ہم تھے تمہارے تابع، پس کیا ہو تم بچانے والے ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کچھ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تم کو ہدایت کرتے۔ برابر ہے ہمارے اُوپر کہ ہم بے قراری کا اظہار کریں یا ہم صبر کریں۔ نہیں ہے ہمارے لیے خلاصی کی کوئی صورت ﴿۲۱﴾

ربط آیات رسالت کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے منکرین توحید رسالت کا انجام بھی بیان فرمایا اور یہ بھی کہ جو کفر شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور جن کا عقیدہ پاک نہیں، اُن کے اچھے اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ قیامت کے دن ایسے اعمال راکھ کے ڈھیر کی مانند ہوں گے جنہیں آندھی اڑا لے جائے۔ فرمایا اعمال کا دارومدار ایمان پر ہے۔ جب تک ایمان درست نہیں ہوگا، عقیدہ خالص نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ

کی وحدانیت پر یقین نہیں ہوگا۔ اس وقت تک اعمال بے سود ہونگے ایسے لوگوں نے کارخانۂ قدرت کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ اس بات کو نہیں پا سکے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں برحق پیدا کیا ہے اور جزائے عمل واقع ہو کر رہے گی۔

خدا کے حضور پیشی

اب آج کی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے منکرین کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جو قیامت کے دن پیش آئے گی اور جس میں انہیں ندامت اور شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا اور ظاہر ہوں گے یہ سب اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے دربار میں پیشی ہو گی۔ بَرَزَ کا لغوی معنیٰ ظاہر ہونا ہے اور اس کے مقابلہ میں کمون آتا ہے جس کا معنیٰ چھپ جانا ہے۔ بروز اور کمون فلسفے کی اصطلاح بھی ہے جب پانی ٹھنڈا ہوتا ہے تو اس کی برودت ظاہر اور حرارت مخفی ہوتی ہے اور جب اسے گرم کیا جائے تو برودت چھپ جاتی ہے اور حرارت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا ظاہر ہو جانا بروز کہلاتا ہے۔ اسی طریقے سے ہر انسان کے اندر بھی بروز اور کمون ہے۔ آج کی دنیا میں مادیت اور بہیمیت ظاہر ہے اور نوع انسانی پر غالب ہے اس کے مقابلے میں ملکیت دبی ہوئی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ جہان تبدیل ہو جائے گا تو پھر بہیمیت غائب ہو کر ملکیت نمایاں ہو جائے گی اس وقت لوگوں کو بڑی تکلیف ہو گی۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں ملکیت کو طاقتور نہیں بنایا۔

مخفی کاموں کا ظہور

مفسرین کرام اس مسئلہ کو مختلف طریقوں سے سمجھاتے ہیں۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ کافر، نافرمان اور اصحاب معاصی لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں جو کام چھپ کر کرتے ہیں، وہ کبھی ظاہر نہیں ہوں گے۔

بلکہ ہمیشہ مخفی ہی رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ برائی کے اکثر کام چھپ کر ہی کیے جاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ساری مخلوق خدا کے سامنے پیش ہوگی تو ان غلط کاروں پر اس وقت واضح ہوگا کہ آج پوشیدہ طور پر انجام دیے گئے کام چھپ نہیں سکیں گے۔ بلکہ سارے کے سارے ظاہر ہو جائیں گے۔ سورۃ الطارق میں آتا ہے "یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ" اس دن تمام راز آشکارہ ہو جائیں گے۔ یہی بروز ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ بروز دو قسم سے ہے۔ پہلا بروز اس وقت ہوتا ہے جب انسان کی موت واقع ہوتی ہے۔ یہ قیامت صغریٰ ہے مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ[1] جو شخص مر گیا، اس کی قیامت تو واقع ہو گئی۔ اور اس موقع پر زندگی بھر کی تمام پوشیدہ باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور مرنے والے کی زندگی کا پورا نقشہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ بروز کا دوسرا موقع وہ ہوگا جب قیامت برپا ہو جائے گی، اور میدانِ محشر میں محاسبے کی منزل آئیگی۔ اس وقت بھی تمام پوشیدہ باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ اکثر حکما، یہی بیان کرتے ہیں کہ ملکیت اور کمال والی باتیں آج چھپی ہوئی ہیں مگر میدانِ محشر میں سب نمایاں ہو جائیں گی۔ اور یہاں کی مادیت اور بہیمیت والی باتیں، وہاں چھپ جائیں گی۔ اس دن سب کے سب لوگ اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے اور منکرین خجالت اور شرمندگی میں غلطاں ہوں گے۔

تابع اور متبوع

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے میدانِ حشر کے حوالے سے وہاں پر جمع ہونے والے تابع اور متبوع کے درمیان ہونے والے مکالمے کا ذکر فرمایا ہے۔ آج دنیا میں تابع اور متبوع کی بے شمار مثالیں دیکھنے میں آرہی ہیں کوئی کسی لیڈر کا تابع ہے تو کوئی کسی سیاسی پارٹی کا۔ کسی شخص نے کسی مولوی کو اپنا متبوع بنا رکھا ہے تو کوئی کسی پیر کا تابع ہے اس مسئلے کو اللہ تعالیٰ

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص۲۳۴

نے قرآن میں کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس دنیا میں کسی کے پیچھے بلا سوچے سمجھے اندھا دھند چلنے والے قیامت کے دن کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکیں گے، بلکہ اس دن انہیں اس فعل پر حسرت اور ندامت ہوگی۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ قیامت کے دن تابع اور متبوع کے تمام اسباب ٹوٹ جائیں گے، وہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اس وقت تابع متبوعین سے کہیں گے کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم تم سے اسی طرح بیزار ہو جاتے جس طرح آج تم نے برات کا اظہار کر دیا۔ سورۃ احزاب میں ہے کہ تابع کہیں گے "رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا" اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہا مانا تو انہوں نے ہمیں صراطِ مستقیم سے گمراہ کر دیا۔ اب ان کو دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، آج سب کو دگنا عذاب دیا جائیگا کیونکہ تمہارے بڑوں نے تمہیں بہکایا اور تم نے آگے دوسروں کو گمراہ کیا، اس لیے تمہارے لیے بھی ڈبل سزا ہے۔

غرضیکہ تابع اور متبوع آپس میں جھگڑیں گے۔ آنکھیں بند کر کے کسی کا اتباع کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ زندگی بھر سوچا ہی نہ کہ یہ ہمیں کدھر لے جا رہا ہے۔ وہ تو اپنی چوہدراہٹ، خودغرضی اور مقصد برآری کے لیے لوگوں کو پیچھے پیچھے چلا رہے تھے مگر تابعین اپنے اعمال کو ضائع کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل جیسا عظیم جوہر عطا کیا تھا، ہدایت کے جملہ اسباب مہیا کیے تھے مگر انہوں نے ان سے کوئی کام نہ لیا اور اندھا دھند اتباع کرتے رہے جس کے نتیجے میں شرمندگی اٹھانا پڑی۔

ایسے ہی تابعین اور متبوعین کے متعلق فرمایا کہ جب وہ سب کے

عذا
تخف
کی

سب اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا تو کہیں گے کمزور لوگ متکبرین یعنی اپنے بڑوں سے۔ اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا ہم دنیا میں تمہارے تابع تھے، تمہارے کہنے پر چلتے تھے، تمہاری ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ تم نے جونسی رسم ادا کرنے کو کہا ہم کرتے رہے اور جو افعال تم انجام دیتے تھے، وہ ہم بھی انجام دیتے رہے فَھَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ تو کیا آج تم ہم پر سے اللہ کے عذاب میں سے کچھ ٹال سکتے ہو یعنی آج ہمیں عذاب الٰہی سے تخفیف دلا سکتے ہو؟ قَالُوْا وہ لوگ جواب دیں گے۔ لَوْ ھَدٰنَا اللّٰہُ لَھَدَیْنٰکُمْ اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں بھی ہدایت کے راستے پر ڈال دیتے۔ مگر ہم تو خود زندگی بھر گمراہ رہے، تمہیں سیدھا راستہ کیسے دکھاتے؟

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ متبوعین کا یہ کہنا کہ اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم تمہیں بھی اس راستے پر ڈال دیتے، خدا پر الزام دینے کے مترادف ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ ایسا کہنے سے بچ جائیں گے کہ ہمیں تو اللہ نے ہدایت ہی نہیں دی، ہم کیا کر سکتے تھے؟ فرمایا اس قسم کا عذر مشرکین بھی کریں گے اور کہیں گے "لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا" (الانعام) اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ سورۃ النحل میں مشرکین کے یہ الفاظ بھی آتے ہیں لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے۔ فرمایا اس طرح کے حیلے بہانے سے کفار و مشرکین اپنی بے گناہی کا جواز

پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر رب العزت کی عدالت میں کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں کہ لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ افسوس کا اظہار کریں گے کہ ہماری ضد اور عناد کی وجہ سے ہمیں ہدایت کی توفیق ہی نہ مل سکی۔ اگر ہم کو توفیق نصیب ہوتی تو ہم تمہاری راہنمائی بھی ہدایت کی طرف کرتے، ہم تو خود بھٹکے ہوئے تھے، تمہیں سیدھے راستے پر کیسے لے آتے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اور سارے ہی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

بے قراری یا صبر

ملعونین یہ بھی کہیں گے سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا برابر ہے ہمارے لیے، اب ہم بے قراری کا اظہار کریں یا صبر کریں ہم اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ کافر اور نافرمان لوگ آپس میں مشورہ کر کے کہیں گے کہ چلو بے صبری اور جزع فزع کریں، چیخ و پکار کریں، شاید ہمارے عذاب میں کچھ کمی واقع ہو جائے۔ چنانچہ وہ لوگ پانچ سو سال تک گریہ وزاری کرتے رہیں گے مگر کوئی جواب نہیں آئے گا۔ پھر مشورہ کریں گے اور کہیں گے کہ اچھا صبر کر کے دیکھتے ہیں۔ پھر وہ خاموش ہو جائیں گے اور مزید پانچ سو سال گزر جائیں گے مگر کوئی جواب نہیں آئے گا۔ امام زہریؒ اور بعض دوسرے بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ ایک ہزار سال گزرنے کے بعد یہ جواب آئے گا کہ تم اسی میں ذلیل ہو کر رہو وَلَا تُكَلِّمُوْا اور کوئی بات نہ کرو کہ تمہاری بات نہیں سنی جائے گی۔

غرضیکہ وہ کہیں گے کہ بے صبری کا اظہار کریں یا صبر کریں مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ہمارے لیے خلاصی کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ ہمارا رونا پیٹنا اور گڑگڑانا کسی کام نہیں آئے گا اور ہم عذاب سے کسی

صورت میں بھی رہائی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اب ہمارا یہی انجام ہے
تابع اور متبوع کا یہ مکالمہ اللہ نے ذکر کیا ہے پہلے تابع اپنے
متبوعین سے مدد کے لیے کہیں گے مگر ان کی طرف سے جواب نے
دیا جائے گا۔ پھر متبوعین عاجز آکر کہیں گے کہ جس بلا میں ہم گرفتار ہو
چکے ہیں، اس سے چھٹکارا کسی طور ممکن نہیں خواہ ہم چیخ و پکار کریں
یا صبر کا دامن تھامے رکھیں۔

درس ہشتم ۸ آیت ۲۲ تا ۲۳

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ
اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ
فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ
سُلْطٰنٍ إِلَّآ أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ
فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا أَنْفُسَكُمْ ۖ مَآ أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ
وَمَآ أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۖ إِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ أَشْرَكْتُمُوْنِ
مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾
وَأُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

ترجمہ :- اور کہے گا شیطان جب کہ فیصلہ کر دیا جائیگا معاملے کا۔ بیشک اللہ نے وعدہ کیا تھا تمہارے ساتھ سچا وعدہ ، اور میں نے وعدہ کیا تھا تمہارے ساتھ ، پس میں نے اس کی خلاف ورزی کی ۔ اور نہیں تھا میرے لیے تمہارے اُوپر کوئی غلبہ مگر یہ کہ میں نے تم کو دعوت دی تو تم نے میری بات قبول کر لی ۔ پس نہ ملامت کرو مجھ کو اور ملامت کرو اپنی جانوں کو ۔ میں نہیں فریادرسی کرنے والا

تمہاری اور نہ تم میری فریادرسی کرنے والے ہو ۔ بیشک میں نے
انکار کیا اس چیز کا کہ تم نے مجھے شریک بنایا اس سے پہلے
بیشک ظالموں کے لیے عذاب الیم ہے ﴿۲۲﴾ اور داخل کیے
جائیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام
کیے بہشتوں میں ۔ بہتی ہیں اُن کے نیچے نہریں ۔ ہمیشہ رہنے
والے ہوں گے ان میں اپنے رب کے حکم سے ۔ ان کی
ملاقات اُن (بہشتوں) میں سلام سے ہو گی ﴿۲۳﴾

بطہ آیات

گذشتہ آیات میں تابع اور متبوع کا ذکر تھا ۔ جن لوگوں نے کفر، شرک اور معاصی میں ایک دوسرے کا اتباع کیا عقل سے کام نہ لیا اور آنکھیں بند کر کے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہے ، اللہ نے اُن کا حال بیان کیا جو قیامت کے دن پیش آنے والا ہے اُس وقت پیچھے چلنے والے کمزور لوگ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے ، تم جس طرح کہتے رہے ، ہم کرتے رہے ، لہٰذا آج اللہ کے عذاب میں کچھ تخفیف کرا کے دو ۔ مگر متبوعین صاف جواب دیں گے کہ ہم تو خود کفر، شرک اور گمراہی میں غرق تھے ۔ تمہیں راہِ راست پر کیسے لاتے ۔ اب ہم سب برابر کے مجرم ہیں اور سزا کے مستحق ہیں ۔ ہم بیقراری کا اظہار کریں یا صبر کریں ۔ اب یہاں سے رہائی ممکن نہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ نے تابع اور متبوع کا مکالمہ اور اُن کی پریشانی کا حال بیان کیا ہے ۔

ن اور شیطان
بسامنے

اب اسی سلسلے میں اللہ نے شیطان کا حال بیان کیا ہے ۔ جو تمام گمراہوں کا سردار اور تمام انسانوں کا ازلی دشمن ہے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اور کہے گا شیطان جب معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا ۔ یہاں پر قَالَ ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جب کہ یہ بات آئندہ قیامت کے بعد پیش آنے والی ہے ۔ قرآنِ پاک کا یہ اسلوب بیان ہے کہ قطعی طور پر پیش آنے

والی چیز کیلیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بیان میں کسی قسم کا شک نہیں، یہ ضرور ہو کر رہے گا۔ قیامت برپا ہونے کے بعد جب تمام انسانوں کا حساب کتاب ہو کر جزائے عمل واقع ہو جائے گی۔ نیک لوگ جنت میں اور کفر اور شرک کرنے والے دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو اس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا۔ دنیا میں شیطان کی پیروی کرنے والے لوگ شیطان کو گلے سے پکڑ کر ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تیرے بہکانے کی وجہ سے بڑے مقام میں پہنچے ہیں۔ اب ہمیں یہاں سے بچ نکلنے یا عذاب میں تخفیف کے لیے کوئی تدبیر بتا، تو اس وقت شیطان ان کو یہ جواب دیگا۔ جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں آ رہا ہے۔

بعض مفسرین لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ سے اللہ تعالیٰ کا وہ آخری فیصلہ مراد لیتے ہیں کہ جس کے ذریعے جنت اور دوزخ والوں کا بالکل آخری فیصلہ کر دیا جائے گا۔ حساب کے نتیجے میں بعض لوگ جنت میں چلے جائیں گے اور بعض دوزخ میں۔ بعض ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کا عقیدہ صحیح اور ایمان پختہ تھا۔ مگر انہوں نے اعمال میں کوتاہی کی تھی یا مخلوق کے حقوق تلف کیے تھے۔ ایسے لوگ اپنے اعمال کی سزا پائیں گے۔ پھر ان کی سفارش کا ذکر بھی صحیح احادیث میں ملتا ہے کہ انبیاء، شہداء اور صالحین اور سب سے بڑھ کر حضور علیہ السلام لوگوں کی سفارش کریں گے تو انہیں دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ بعض کو سزا بھگتنے کے بعد رہائی مل جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس آدمی کا حال بھی بتلایا جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکلے گا۔ بڑے عرصے کے بعد وہ آہستہ آہستہ بتدریج جنت کے دروازے میں داخل ہو سکے گا۔ حضور کا فرمان ہے کہ

اب دوزخ میں وہی لوگ رہ جائیں گے جن کو قرآن نے روک دیا ہے وہ قطعی طور پر بدعقیدہ لوگ ہوں گے اور انہیں وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہوگا۔ ایسے موقع پہ ابدی جہنمی شیطان کو کہیں گے کہ تو نے ہمیں بہکایا تھا اب تو ہی ہمیں یہاں سے خلاصی کی کوئی تدبیر بتا، تو اس وقت اُن دوزخیوں کے سامنے یہ تقریر کرے گا۔

نعمیؒ

امام ابوحنیفہؒ کے استاد امام شعبیؒ عظیم المرتبت، امام، محدث اور فقیہہ تھے آپ نے پانچ سو صحابہ کی زیارت کی ہے اور اس لحاظ سے تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں اور کوفے میں قیام تھا۔ آپ کے علم و ورع کی بنا پر حکومت وقت نے آپ کو عہدہ قضا پر فائز کرنا چاہا مگر آپ اس ذمہ داری سے بچنا چاہتے تھے کیونکہ آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ قول یاد تھا کہ جس کو قاضی بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا آج تو جج کی بڑی قدر و منزلت ہے اور یہ خوب عیش کرتے ہیں مگر پتہ تو اُس وقت چلے گا جب خدا کی عدالت میں فیصلے ہوں گے امام شعبیؒ کی طرح امام ابوحنیفہؒ کو بھی قضا کی پیش کش کی گئی مگر آپ نے قبول نہ کی کیونکہ آپ کو خطرہ تھا کہ وقت کے حکمران کوئی غلط کام نہ کروا لیں۔ امام مالکؒ کو بھی اسی لیے سزا بھگتنا پڑی کہ وہ حکومتِ وقت کی غلط کارروائیوں پر تنقید کرتے تھے۔ امام شافعیؒ کو بھی ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا۔ یہ سب لوگ دین کے معاملہ میں بڑے محتاط تھے، ان میں تقویٰ اور پرہیزگاری تھی، جبھی تو کروڑوں آدمی اِن حضرات کے متبعین میں سے ہیں۔ غرضیکہ امام شعبیؒ نے قضا سے بچنے کے لیے کئی حیلے کیے۔ ایک موقع پہ ہاتھی آگیا تو بچے دیکھنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو گئے، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امام صاحب بھی بچوں

میں شامل ہو گئے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ کوئی اعلیٰ مرتبے کے آدمی نہیں ہیں، لہٰذا یہ عہدہ قضا کے قابل نہیں۔ ایک دفعہ کبوتر اڑانے والے بچوں کا تماشہ دیکھنے چلے گئے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ کوئی لاابالی قسم کے آدمی ہیں، مقصد یہ تھا کہ لوگ مجھ سے بدظن ہو جائیں اور قضا کے عہدے پہ فائز نہ ہو سکوں، آپ اتنے محتاط تھے۔ یہ واقعات امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب سیر الکبیر میں نقل کیے ہیں۔

الغرض! امام شعبیؒ کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ میں نے دو شخصوں کو بہت مبغوض دیکھا جن میں سے ایک جنوں میں سے ہے اور دوسرا انسانوں میں سے۔ جنوں میں سے شیطان ہے کہ اللہ نے اسے سجدے کا حکم دیا تو اس نے انکار کر دیا۔ اور انسانوں میں سے فرعون ہے جس نے کہا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النزعت) کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔

شیطان کی تقریر

بہر حال جب اہل دوزخ شیطان کو گھیر لیں گے اور اس کو ملامت کریں گے کہ ہماری رہائی کی کوئی صورت پیدا کر تو اس وقت شیطان یہ جواب دیگا اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ بےشک اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا سچا وعدہ کہ اگر ایمان لاؤ گے، نیکی اختیار کرو گے تو تمہیں رحمت کے مقام تک پہنچاؤں گا۔ اللہ نے تمہیں حکم دیا تھا کہ اس کی وحدانیت کو تسلیم کرو۔ اس کے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لاؤ، قیامت کو برحق مانو تو میں تمہیں عزت کا مقام عطا کروں گا۔ اللہ نے تو تم سے بالکل سچا وعدہ کیا تھا۔ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا پس میں نے اس کی خلاف ورزی کی یعنی میں نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ سورۃ نساء میں شیطان کا یہ قول موجود ہے وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ

اِذَانَ الْاَنْعَامِ" میں اولادِ آدم کو ضرور گمراہ کروں گا، ان کو جھوٹی آرزوئیں دلاؤں گا اور انہیں جانوروں کے کان کاٹنے کا حکم دونگا اگلی آیت میں ہے "یَعِدُهُمْ وَیُمَنِّیْهِمْ" شیطان انہیں جھوٹے وعدے اور جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے۔ "وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا" مگر شیطان کے وعدے تو نرا دھوکا ہیں سورۃ انعام میں ہے "وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" شیطان ان کے برے اعمال کو مزین کر کے دکھاتا ہے۔ کھیل تماشہ، لھو ولعب اور بُری رسومات کو خوش کن بنا کر پیش کرتا ہے اور آخر کار لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔

بہر حال شیطان اُن دوزخ والوں سے کہے گا کہ میں نے تم سے جو بھی جھوٹا وعدہ کیا تھا، اس کو ایفا نہ کیا اور حقیقت یہ ہے وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اور میرا تم پر کوئی غلبہ تو نہیں تھا۔ میں نے تم سے کوئی چیز زبردستی تو نہیں منوائی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ کہ میں نے تمہیں دعوت دی، تم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ پس تم نے میری دعوت قبول کر لی۔ میں نے تمہیں جس طرف لگایا تم اسی طرف چلے گئے۔ تم نے اللہ کے سچے وعدے کا کوئی خیال نہ کیا۔ بائبل کے بیان کے مطابق شیطان نے کہا کہ افسوس کا مقام ہے کہ میرے جھوٹے وعدے پر تم نے یقین کر لیا۔ اور ابراہیم خلیل اللہ اور موسیٰ کلیم اللہ کی زبان پر یقین نہ کیا۔ اب صورت حال یہ ہے فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ کہ اب مجھے ملامت نہ کرو۔ اس وقت تم نے خود بے عقلی کا ثبوت دیا، میرے جھوٹے وعدے اور جھوٹی آرزوں پر یقین کر لیا اور اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں کی زبان پر یقین نہ کیا، لہٰذا تم اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہو۔

ملامت کے قابل کون

شیطان کہے گا کہ مجھے ملامت نہ کرو وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ بلکہ اپنی جانوں کو ملامت کرو۔ تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ایک جھوٹے، غلط کار اور بدترین دشمن کی بات پر یقین کر رہے ہو اور خدا تعالیٰ اور اس کے انبیاء کے وعدوں پر تمہیں اعتماد نہیں۔ اب مجھے کیوں ملامت کرتے ہو۔ میں تو خود مبتلائے عذاب ہوں۔ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ اور تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتا وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔ اگر میں تمہیں پکاروں کہ میرے عذاب میں تخفیف کا بندوبست کر دو تو جس طرح تم آج میری مدد نہیں کر سکتے اسی طرح میں بھی بے بس ہوں۔

شیطان مزید کہے گا اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ میں تو انکار کرتا ہوں اس چیز کا کہ تم نے مجھے اس کے ساتھ شریک بنایا اس سے پہلے۔ تم نے خدا کی بات کو نہ مانا اور مجھے اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر میری بات کے پیچھے لگ گئے۔ میرے ہی کہنے پر تم کفر، شرک اور معاصی میں مبتلا ہوئے۔ میں نے تو تمہیں صرف دعوت دی تھی، مگر تم نے بلا سوچے سمجھے اور بغیر غور و فکر کیے مجھے اللہ کا شریک بنا لیا۔ میں ان سب چیزوں کا انکار کرتا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ظلم کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ شیطان نے صاف کہہ دیا کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں اور اب اس کا بھگتان عذاب کی صورت میں کرنا ہو گا۔

اہل ایمان کی کامیابی

کفر اور شرک کے مقابلے میں ایمان اور اہل ایمان کی کامیابی کا ذکر بھی ہو رہا ہے کیونکہ قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے کہ جہاں ترہیب کی بات ہوتی ہے ساتھ ترغیب کا ذکر بھی کیا جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے

وَ اُدۡخِلَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ اور داخل کیے جائیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیے جنت میں۔ نیک اعمال میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بنیادی عبادات شامل ہیں اور باقی تمام نیک امور انہی کے تابع ہیں وہ باغات یا بہشت ایسے ہوں گے تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ باغات ہر وقت سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدے ہوئے ہوں گے۔ ان میں نہ کوئی گندگی ہوگی اور نہ آلودگی۔ انسانی ذہن کے مطابق اللہ نے جنت کی روحانی، مادی اور جسمانی راحتوں کا ذکر کیا ہے جو وہاں میسر ہوں گی۔ اور پھر یہ ہے کہ یہ نعمتیں عارضی نہیں ہونگی اور نہ اہل جنت کو کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ بلکہ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اپنے پروردگار کے حکم سے جنتی وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے، وہاں سے نکالے جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں کتنی بڑی سے بڑی نعمت میسر ہو مگر اس کے چھن جانے کا خطرہ ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے، وگرنہ موت تو انسان کے سر پر ہر وقت کھڑی ہے جو تمام دنیاوی نعمتوں کو یکسر ختم کر دینے والی ہے مگر جنت کی نعمتیں ایسی ہیں جو کبھی ختم نہ ہوں گی کہ یہاں پر تو نہریں خشک ہو جاتی ہیں، پھل موسمی ہیں لگتے ہیں مگر جنت کی نہریں بھی سدا بہار اور اس کے پھل بھی سارا سال قائم رہیں گے۔ جونہی ایک پھل توڑ کر استعمال کیا جائے گا، اس کی جگہ فوراً دوسرا پھل آجائے گا۔

سلامتی کی دعائیں

ان بہشتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو سلام کے ساتھ ملیں گے تَحِیَّتُهُمۡ فِیۡهَا سَلٰمٌ کا یہی مطلب ہے کہ ہر طرف سلامتی کا چرچا ہوگا، اور فرشتے

بھی اہل جنت کو سلام کریں گے۔ اُدھر پروردگار کی طرف سے بھی پیغام سلام ہی آئے گا۔

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (یٰسٓ) اے میرے بندو! تم پر سلامتی ہو۔ شاہ عبدالقادرؒ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ سلام ایک دعا ہے، اسی لیے ملاقات کے وقت سلام مسنون قرار دیا گیا ہے حضور کا فرمان ہے اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَہٗ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْہُ آپس میں سلام کو پھیلاؤ خواہ کسی کو جانتے ہو یا نہیں جانتے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ سلام میں پہل کرنے والے کا اجر بھی زیادہ ہے یہ مطلب یہی ہے کہ تمہیں دینی، دنیاوی، مادی، اور روحانی اعتبار سے سلامتی نصیب ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جنت میں سلام کا مطلب مبارک باد ہے۔ تمام جنتی ایک دوسرے کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کریں گے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

ترجمہ:- کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کیسے اللہ نے بیان کی ہے مثال پاک کلمے کی جیسا کہ ایک پاکیزہ درخت ہوتا ہے۔ اس کی جڑ بہت مضبوط اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں ہوتی ہیں ﴿۲۴﴾ وہ لیتا ہے اپنے پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے، اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۵﴾ اور مثال گندے کلمے کی جیسا کہ ایک گندا درخت ہوتا ہے جس کو اکھاڑ دیا گیا ہے زمین کے اوپر سے۔ نہیں اس کے لیے ٹھہراؤ ﴿۲۶﴾

ربط آیات

اس سے پہلے رسالت اور قیامت کے متعلق ذکر تھا اور اب توحید کا بیان آرہا ہے۔ آج کی آیات کریمہ میں اللہ کی وحدانیت کی بنیاد ذکر کی جارہی

ہے جب کہ اس کے دلائل اگلی آیات میں آرہے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ دروس میں بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مکی سورتوں میں دین کے بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ جن میں توحید، رسالت، قیامت اور جزائے عمل کے عقائد شامل ہیں۔ ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معترضین کا رد اچھے طریقے سے کیا ہے۔

کلمہ طیبہ کی مثال

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا مسئلہ ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ بعض اوقات مثال کے ذریعے کسی چیز کی کما حقہ وضاحت ہو کر وہ چیز انسانی ذہن کے قریب تر آجاتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن میں بہت سے مسائل کو مثالوں کے ذریعے سمجھایا ہے۔ اس درس میں کلمہ طیبہ کی مثال ایک پاک درخت سے اور کلمہ خبیثہ کی مثال گندے درخت کے ساتھ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح مثال بیان فرمائی ہے۔ ضرب کا لغوی معنی مارنا اور سفر کرنا ہوتا ہے اور یہ بیان کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس مقام پہ بیان کرنے والا معنیٰ ہی موزوں ہے۔ اَلَمْ تَرَ کی ترکیب کسی بات کی طرف خصوصی توجہ دلانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر بھی یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے کہ اے مخاطب! کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح مثال بیان فرمائی ہے كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ پاک کلمے کی مثال پاک درخت کی سی ہے۔ اور اس درخت کی خصوصیات یہ ہیں اَصْلُهَا ثَابِتٌ اس کی جڑ مضبوط ہے وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ایسا سرسبز و شاداب اور بار آور درخت ہے تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۢبِاِذْنِ رَبِّهَا کہ اپنے

رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا رہتا ہے۔

اِس مقام پر پاک کلمے سے مراد کلمہ توحید ہے جو کہ تمام شرائع الٰہیہ کی بنیاد ہے۔ اللہ نے اس کی مثال ایک درخت کے ساتھ دی ہے۔ درخت بھی مختلف الانواع ہوتے ہیں، کوئی خوبصورت اور شیریں پھل والے جب کہ بعض دوسرے بدصورت اور ذائقہ میں کڑوے۔ درخت اور دیگر نباتات کی اللہ نے اتنی قسمیں پیدا کی ہیں جو انسانی شمار سے باہر ہیں۔ علم نباتات (BOTONY باٹنی) کے ماہرین نباتات کی دس لاکھ قسمیں بتاتے ہیں یہ سب انسان کی مصلحت کے لیے ہیں۔ بعض درخت چھوٹے قد کے اور بعض بہت لمبے ہوتے ہیں۔ بعض کے تنے باریک اور بعض کے بہت موٹے ہو جاتے ہیں۔ بعض درختوں کی چھاؤں بہت کم ہوتی ہے اور بعض بڑے گھنے اور دور دور تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے پھل بھی مختلف ہوتے ہیں، بعض نہایت شیریں اور ذائقہ دار جبکہ بعض دوسرے کڑوے کسیلے اور بدبودار۔ فلسفے والے بھی مخلوق کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات۔ بہر حال اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ کلمے یعنی کلمہ توحید کو نباتات میں سے پاکیزہ درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

بت اور
علم مز

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ معمول تھا کہ بعض اوقات کسی بات کو سمجھانے کے لیے سوالیہ انداز اختیار فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مجلس میں آپ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا اِنَّ مِنَ الشَّجَرَةِ كَرَجُلٍ مُّسْلِمٍ حَدِّثُوْنِيْ مَاهِيَ درختوں میں سے ایک درخت مسلم مرد کی مانند ہے، میرے صحابہ! بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ اُس مجلس میں بڑے بڑے اکابر صحابہ موجود تھے جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے

مگر کسی نے لب کشائی کی جرأت نہ کی حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے سوال کا جواب میرے ذہن میں آچکا تھا مگر اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں اپنی کم سنی کی بدولت میں نے جواب دینے کی ہمت نہ کی بالآخر حضور علیہ السلام نے خود ہی جواب دیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے جسے مردِ مسلم کے ساتھ مشابہت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں اپنے والد گرامی سے اس جواب کے متعلق ذکر کیا کہ یہ میرے ذہن میں آچکا تھا مگر آپ کی موجودگی میں خاموش رہا۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم یہ جواب مجلس میں دے دیتے تو یہ میرے لیے نہایت خوشی کا مقام ہوتا اور مجھے تمہاری ذہانت پر فخر ہوتا۔

درخت پاکیزہ کی خصوصیات

امام بغویؒ، امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جس پاک کلمہ کی مثال اس مقام پر دی گئی ہے، وہ کلمہ توحید ہے۔ اور جس درخت کے ساتھ مثال دی گئی ہے۔ وہ کھجور کا درخت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک پاک درخت کی تین خصوصیات ہو سکتی ہیں یعنی اس کی جڑ مضبوط ہو، تنا قائم ہو اور شاخیں پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ تینوں خصوصیات کھجور کے درخت میں پائی جاتی ہیں۔ کھجور کے درخت کی جڑ بہت مضبوط اور زمین کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ صحرائی علاقوں میں جہاں پانی نایاب ہوتا ہے۔ کھجور کی جڑ دور دور سے مادہ حیات جذب کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ درختوں کو غذا تو زمین سے جڑ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جب کہ تازہ ہوا پتوں کے ذریعے ملتی ہے۔ چنانچہ درختوں کی یہ خصوصیت ہے کہ رات کے وقت اپنا گند ابخار باہر نکالتے ہیں جب کہ دن کے وقت گندی ہوا پتوں کے ذریعے اپنے اندر جذب کرتے ہیں۔ اسی لیے دن کے وقت درختوں کی ٹھنڈی ہوا انسانی صحت کے لیے مفید اور رات کو درختوں کے نیچے سونا مضر ہوتا ہے۔

کلمہ طیبہ کی خصوصیات

جس طرح پاکیزہ درخت کی تین خصوصیات ہیں، اسی طرح پاکیزہ کلمہ بھی تین صفات کا حامل ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کلمہ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے لیے تصدیقِ قلبی کا ہونا ضروری ہے۔ یہ تصدیق درخت کی جڑ کی مانند ہے۔ جس طرح جڑ کے بغیر درخت قائم نہیں رہ سکتا، اسی طرح تصدیقِ قلبی کے بغیر کلمے کا کچھ اعتبار نہیں۔ مومن اور منافق میں یہی فرق ہے کہ منافق زبانی اقرار کے باوجود دل سے تصدیق نہیں کرتا، لہٰذا وہ ایماندار نہیں ہوتا۔ دوسری صفت یہ ہے کہ انسان زبان سے اس کا اقرار کرے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص زبان سے کلمۂ توحید کا اقرار نہیں کرتا، اُسے مسلمان نہیں سمجھا جاتا، نہ اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے۔ اور نہ اس پر اسلامی احکام جاری ہوتے ہیں۔ تو گویا اجرائے احکام کے لیے اقرار باللسان ضروری ہے۔ جس طرح درخت کے لیے تنا ضروری ہے۔ اسی طرح زبانی اقرار کے ساتھ کلمہ توحید کو ثبات حاصل ہوتا ہے۔ زبانی اقرار کے ساتھ ہی کوئی شخص صاحب ایمان سمجھا جاتا ہے، اُس سے رشتے ناطے کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب کوئی کافر یا مشرک زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا کلمہ ادا کر دے تو اس کی عزت و آبرو، جان و مال محفوظ ہو جاتا ہے، اور اس سے لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ گویا زبانی اقرار درخت کے تنے کی مانند ہے۔ کلمہ توحید کے لیے تیسری صفت عمل بالارکان ہے، یعنی انسان تصدیقِ قلبی اور اقرار باللسان کے بعد کلمہ توحید کے احکام پر عمل بھی کرے، ہر ایماندار پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اعضاء و جوارح کے ذریعے اپنے رب تعالےٰ کی عبادت کرے۔ اور اسی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکام پر کما حقہ عمل کرے اس کی مثال درخت کی شاخوں کی مانند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسان کا عمل بھی دور دور تک

تک ہر شعبہ زندگی میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ پاکیزہ درخت اور کلمہ طیبہ کی مثال کا ذکر ہو گیا۔

۱۴م

مردِ مسلمان اور کھجور کا درخت

مفسرین فرماتے ہیں کہ کھجور کے درخت کو ایک مردِ مسلمان سے اس لحاظ سے بھی مشابہت ہے کہ جس طرح کھجور کا درخت سدا بہار ہوتا ہے نہ اس کے پتے گرتے ہیں اور نہ شاخیں خشک ہوتی ہیں، اسی طرح مردِ مومن بھی ہمیشہ ایمان اور نیکی کے ساتھ متلبس ہوتا ہے۔ اس کے دل میں نورِ ایمان اور نورِ توحید ہوتا ہے اور زبان سے اس کا اقرار ہوتا ہے۔ اس کے اعضاء و جوارح ہمیشہ اعمالِ صالحہ انجام دیتے رہتے ہیں اور ایسا شخص ہر آن بنی نوع انسان کے لیے مفید ہوتا ہے۔

اس درخت کے ساتھ مردِ مومن کی مشابہت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح انسان کا سر کٹ جانے سے کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح اگر کھجور کے درخت کا اُوپر کا حصہ کاٹ دیا جائے تو وہ بھی خشک ہو جاتا ہے، اس کی چوٹی دوبارہ پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ بھی مقولہ ہے کہ اگر آدمی کے سر کے اوپر سے پانی گزر جائے تو جس طرح وہ زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح سیلاب میں اگر کھجور کے درخت کا سر ڈوب جائے تو وہ بھی مر جاتا ہے۔ غرضیکہ کھجور کے درخت اور مردِ مسلمان میں یہ بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔

سدا بار آور کھجور

کھجور کے درخت کے بار آور ہونے کے متعلق کُلَّ حِیْنٍ کے الفاظ آئے ہیں حین کا اطلاق مطلق وقت پر ہوتا ہے مگر امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر حین سے مراد چھ ماہ ہیں کہ جن کے دوران کھجور میں تازہ پھل آجاتا ہے۔ کھجوریں دیر تک ذخیرہ کی جا سکتی ہیں اور دیگر پھلوں کی طرح یہ جلدی گل سڑ کر خراب نہیں ہوتیں ابھی سابقہ فصل کی کھجوریں گھروں اور منڈیوں میں موجود ہوتی ہیں۔ جب کہ تازہ پھل بھی اتر نا

شروع جاتا ہے۔ اس لیے اسے سدا بار آور درخت بھی کہا جاتا ہے، مومن آدمی کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ وہ ہر وقت اعمال صالحہ انجام دیتا رہتا ہے جس سے دوسرے لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔ ایسا آدمی تینوں شرائط پوری کرتا ہے، اس کے ایمان کی جڑ مضبوط ہوتی ہے یعنی وہ دل سے تصدیق کرتا ہے، زبان سے اقرار کرتا ہے اور اعمال صالحہ بھی انجام دیتا رہتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی توجیہہ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مومن آدمی کا کلمہ توحید تمام شرائع الٰہیہ کی بنیاد ہے اور شرائع الٰہیہ کا منبع عالم ملکوت میں ہے اس کی شاخیں اور پھل اس جہان میں ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے برخلاف کفر و شرک کا کلمہ ناپاک ہے۔ عالم ملکوت میں اس کا کوئی استقرار نہیں ہوتا اگرچہ دنیا میں کسی وقت تھوڑا بہت پھیلاؤ ہو جاتا ہے تو پاک کلمہ سے کلمہ توحید مراد ہے۔ اگر انسان زبان سے خدا کی تسبیح، تنزیہہ، تحمید اور تکبیر بیان کرتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتا ہے یا نصیحت کی کوئی بات کرتا ہے تو وہ سب کچھ کلمہ توحید کے ضمن میں آئے گا جس طرح درخت کی بنیاد اس کی جڑ ہوتی ہے اسی طرح تمام شرائع کی بنیاد عالم ملکوت میں قائم ہے جو ہر مومن کے دل میں راسخ ہے، اور اس کا عمل دور دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ درخت کی شاخوں کے پھیلاؤ کے لیے فِی السَّمَآءِ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے عربی زبان میں السماء آسمان کے علاوہ چھت اور ہر اس بلند چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سر پر سایہ فگن ہو۔ چونکہ پاکیزہ اخلاق دور دور تک پھیل جاتے ہیں، اس لیے اس کا اطلاق السماء پر بھی کیا گیا ہے اس کی جڑ تصدیق قلبی، اس کا تنا زبانی اقرار اور اس کی شاخیں عمل بالارکان ہیں۔

فرمایا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ مثال بیان کرنے سے بعض اوقات بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، لہٰذا اللہ نے جگہ جگہ مثالیں بیان فرمائی ہیں۔

کلمہ خبیثہ کی مثال

فرمایا وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اور گندے کلمے کی مثال گندے درخت کی ہے اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ جسے زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو۔ اس درخت کی جڑ بھی مضبوط نہیں اور یہ بدبودار اور کڑوا بھی ہے۔ مفسرین کرام نے خبیث درخت سے مختلف درخت مراد لیے ہیں۔ تاہم زیادہ مشہور یہ ہے کہ اس سے اندرائن یعنی تنبہ کا پودا مراد ہے۔ اس کی بیل زمین پہ پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ جڑ بالکل کمزور جو ذرا سا کھینچنے سے اکھڑ جائے اور مزا کڑوا۔ پہلے پارے میں گزر چکا ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا اللہ نے زمین کی ہر چیز تمہارے فائدے کے لیے پیدا کی ہے، چنانچہ بعض کڑوی کسیلی اور زہریلی چیزیں بھی کارآمد بنائی جا سکتی ہیں۔ اقبال نے بھی تو کہا ہے، "میں وہ ہوں کہ زہر سے بھی شہد اور تریاق بنا لیتا ہوں۔" اللہ تعالیٰ نے انسان کو کمال عطا فرمایا ہے کہ وہ مضر چیزوں سے بھی مفید چیزیں بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ طبیب، لوگ تُنبے جیسی کڑوی چیز سے اچار، مربہ اور اسہال لانے والی دوائی تیار کر لیتے ہیں۔ تاہم بنیادی طور پر یہ پودا ناپختہ، بدبودار اور اس کا پھل کڑوا ہے۔ کفر و شرک والا گندا کلمہ بھی اس پودے کی طرح بے بنیاد، بدبودار اور بدذائقہ ہوتا ہے۔ فرمایا یہ خبیث پودا ایسا ہے مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ جس کو ثبات حاصل نہیں ہے حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے اور اس کے نتائج تمام جہان والوں پر واضح

ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف کفر اور شرک وقتی طور پر دنیا میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اس کی تہ میں بڑا شور و شر اور ہنگامہ ہوتا ہے مگر یہ ناپائیدار ہوتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی۔ جب اگلا جہان آئے گا تو اس کی حقیقت معلوم ہوگی۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے کلمہ توحید کی مثال پاک درخت سے دی ہے جبکہ کفر و شرک کو بدبودار اور بدذائقہ درخت کے مشابہ قرار دیا ہے۔ دونوں کا فرق واضح کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت پکڑیں۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ ع ۱۶

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ ثابت قدم رکھتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان لائے مضبوط بات کے ساتھ دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں ، اور گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو ، اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے ﴿۲۷﴾

ربط آیات — گذشتہ آیات میں رسالت ، قیامت اور جزائے عمل کا ذکر تھا۔ اب توحید کا ذکر ہو رہا ہے۔ گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے بات سمجھائی کہ توحید کے پاک کلمے کی مثال پاکیزہ درخت کی ہے جس کی جڑ مضبوط، تنا ثابت اور شاخیں فضا میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ایسا درخت سدا بار آور ہوتا ہے۔ اسی طرح کلمہ توحید کی جڑ عالم ملکوت میں ہے۔ اور اس کلمے کو دنیا میں اپنا کر لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مومن کے دِل میں اس کلمے کی تصدیقِ قلبی بہت گہری ہوتی ہے۔ زبان سے اس کا اقرار بھی بڑا سچا ہوتا ہے اور اعضا و جوارح کے ساتھ وہ ہمیشہ صداقت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کے اعمال و اخلاق ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

فرمایا برخلاف اس کے کلمہ کفر کی مثال گندے درخت کی ہے جس کا پھل بدبودار اور کڑوا ہو۔ مفسرین اس ضمن میں تنبے کا ذکر کرتے ہیں اس پودے کی جڑیں زمین میں مضبوط نہیں ہوتیں بلکہ زمین کے اُوپر ہی ہوتی ہیں اور ذراسی جنبش سے اکھڑ جاتی ہیں۔ ایسے کلمے کو عالم ملکوت میں کوئی استقرار نہیں ہوتا۔ امام شاہ ولی اللہؒ

فرماتے ہیں کہ بعض اوقات دنیا میں اس کا بڑا پھیلاؤ ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے ابھرتا ہے مگر جلد ہی ناپید ہو جاتا ہے۔

ثابت قدمی کا وعدہ

یہ مثال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مومن آدمیوں کی ثابت قدمی کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ اللہ تعالیٰ مضبوط رکھتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان لائے مضبوط بات کے ساتھ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا دنیا کی زندگی میں وَفِی الْاٰخِرَةِ اور آخرت میں بھی۔ مضبوط بات سے مراد کلمہ توحید و رسالت ہے۔ چونکہ اہل ایمان کی اس کلمے کے ساتھ تصدیق ہوتی ہے اور اس پر راسخ ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے ایمان اور توحید کی بدولت اللہ تعالیٰ انہیں اس دنیا میں ثابت قدم رکھتا ہے اور گمراہی کی ہر منزل سے بچاتا ہے۔ ایسے لوگ کفر، شرک، بدعات اور معاصی سے بچے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا اعتقاد صحیح ہو۔ اگر دل میں شک، تردد یا نفاق ہوگا۔ تو انسان ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور شرور اور فتنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت کا حال یہ ہے "یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ" (یونس) اللہ تعالیٰ ایمان کی بدولت ان کی راہنمائی فرمائیگا اور وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔

قبر کی منزل

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر آخرت سے مراد قبر کی منزل ہے جس وقت کوئی انسان اس جہان کی مادی زندگی پوری کر لیتا ہے، تو حشر سے پہلے برزخ کا جہان آتا ہے، یہ قبر کی زندگی ہے "وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" (المومنون) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے درمیان برزخ یعنی قبر کی زندگی ہے۔ حشر میں تو دوسرے حالات پیش آئیں گے، یہ درمیانی منزل ہے۔ غرضیکہ انسانی زندگی میں ایک تسلسل ہے۔ اس زندگی کے

بعد برزخ اور برزخ کے بعد حشر کا سلسلہ ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اس کلمہ توحید کی بدولت مومن آدمی کو اللہ تعالی قبر میں ثابت قدم رکھتا ہے اور وہ صحیح جواب دیتا ہے قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ جب قبرستان جاتے تو اتنا روتے کہ داڑھی تر ہو جاتی۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنَازِلِ مِّنْ مَّنَازِلِ الْاٰخِرَۃِ قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے اگر آدمی اس امتحان سے بچ گیا تو آگے بھی بچتا چلا جائے گا اور اگر یہاں پھنس گیا تو اگلی منزلیں اور زیادہ مشکل ہوں گے۔ آپ نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ جب میں قبر کا حال سنتا ہوں یا اسے دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار رونا آجاتا ہے۔

قبر کا حال

صحیحین کی روایت میں ہے کہ جب قبر میں کسی مرد مومن سے سوال کیا جاتا ہے، تو اللہ تعالی اس کے دل کو ثابت قدم رکھتا ہے اور وہ صحیح جواب دے پاتا ہے اور اسے آرام و سکون حاصل ہوتا ہے قبر کا عذاب اور راحت دونوں برحق ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا علم عقائد پر ایک چھوٹا سا رسالہ فقہ اکبر ہے، جس میں صاف موجود ہے کہ کافروں اور بعض گنہگار مسلمانوں کے لیے عذاب قبر برحق ہے۔ قبر میں روح کا جسم کی طرف اعادہ بھی برحق ہے، اور منکر نکیر کا سوال بھی برحق ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مرنے والے کو اس کے ساتھی دفن کر کے قبر سے پیچھے ہٹتے ہیں تو مردہ اُن کے جوتوں کی آہٹ بھی سنتا ہے اس وقت منکر اور نکیر نامی دو فرشتے قبر میں آتے ہیں اور اس کو بٹھا دیتے ہیں۔ اگر مرنے والا مومن آدمی ہے تو فرشتوں کی ہیئت بہت اچھی ہوتی ہے۔ ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ

مومن آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عصر کے بعد سورج غروب ہونے کے قریب ہو۔ چنانچہ جب فرشتے اُس سے سوال کرنا چاہتے ہیں تو وہ شخص کہتا ہے دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ مجھے وقت دو کہ میں نماز عصر ادا کر لوں۔ اسے کوئی دہشت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اُس کا دل مضبوط رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ زندگی کے دور انفرادی بھی ہوتے ہیں اور اجتماعی بھی۔ جب انسان ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو انفرادی حیثیت میں ہوتا ہے۔ اُس کا بچپن کا دور بھی انفرادی ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں بڑا ہوتا ہے تو اس کا میلان اجتماعیت کی طرف ہو جاتا ہے۔ وہ سوسائٹی کا رُکن بنتا ہے، کوئی عہدہ قبول کرتا، ذمہ داریاں سنبھالتا ہے اور اجتماعی کام انجام دیتا ہے۔ گویا عالم شباب میں انسان اجتماعیت میں آجاتا ہے۔ پھر جب انسان مر جاتا ہے تو ایک لحاظ سے برزخ میں پھر انفرادی زندگی ہی گزارتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان کے لیے قبر میں جو چیز مفید ہو سکتی ہے وہ عقیدے کی درستگی ہے، دنیا میں اس کی فکر پاک ہو، ایمان صحیح ہو، توحید خالص ہو اور کفر، شرک اور نفاق سے بچا ہوا ہو۔

کے ... ت ... جواب

بہر حال جب ایماندار آدمی کو قبر میں دفن کر کے چلے جاتے ہیں تو دو فرشتے قبر میں داخل ہوتے ہیں، اُس کو اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں مَنْ رَّبُّكَ تیرا رب کون ہے؟ تو مومن آدمی جواب دیتا ہے رَبِّیَ اللّٰهُ میرا رب اللہ ہے۔ پھر فرشتے پوچھتے ہیں مَا دِیْنُكَ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے دِیْنِیَ الْاِسْلَامُ میرا دین اسلام ہے۔ پھر تیسرا سوال ہوتا ہے مَنْ نَّبِیُّكَ تیرا نبی کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے نَبِیِّیْ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے مَا تَقُوْلُ فِیْ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْکُمْ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جیسے تمہارے درمیان مبعوث کیا گیا۔ مومن آدمی جواب دیتا ہے هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں ان پہ ایمان لایا ہوں۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں کہ تو کامیاب ہے۔ پھر آگے اور بھی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو احادیث میں مذکور ہیں۔ پھر اس کے لیے جہنم کی طرف سے ایک دروازہ کھولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تو ایمان نہ لاتا تو تیرا ٹھکانا یہ ہوتا۔ پھر اس دروازے کو بند کر کے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے جبکی خوشبو مرنے والا محسوس کرتا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں، تیرا ٹھکانا یہ ہے یہاں تک کہ تجھے اس مقام سے اٹھایا جائے۔ یعنی قیامت تک تو یہیں رہیگا، اور اس کے بعد جنت میں داخل ہوگا۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ فرشتے اس شخص سے کہتے ہیں۔ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ دلہن کی طرح سو جاؤ اور آرام سے رہو۔

قبر کا عذاب

اس کے برخلاف جب کافر، منافق اور بدعقیدہ آدمی کو دفن کیا جاتا ہے تو اسکے پاس دو فرشتے آتے ہیں اَسْوَدَانِ سیاہ رنگ کے جن کی آنکھیں خَضْرَتَانِ نیلگوں ہوتی ہیں اور انہیں دیکھ کر دہشت طاری ہوتی ہے جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے تو وہ جواب دیتا ہے هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِیْ افسوس مجھے کچھ علم نہیں۔ پھر فرشتے سوال کرتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے، تو وہ وہی جواب دیتا ہے هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِیْ مجھے کچھ علم نہیں۔ نبوت کے متعلق تیسرے سوال کا جواب بھی یہی دیتا ہے صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ یہ جواب سن کر فرشتے لوہے کا گُرز اس شخص کو مارتے ہیں جس کی آواز کو جنوں اور انسانوں کے سوا ارد گرد کی تمام مخلوق سنتی ہے۔ بعض نافرمانوں پر

ستانویں سانپ مسلط کر دیے جاتے ہیں جو اُس کو ڈستے رہتے ہیں وہ سانپ اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک سانپ اس دنیا میں ایک پھونک مار دے تو دنیا میں کوئی نباتات پیدا نہ ہو۔ بعض لوگوں پر بچھو مسلط کر دیے جاتے ہیں جو اُن کو کاٹتے ہیں۔ ان پر یہ آزمائش بھی آتی ہے کہ قبر کو حکم ہوتا ہے۔ سمٹ جا۔ پھر جب وہ سمٹتی ہے تو مردے کے جسم کی پسلیاں ایک دوسری کے اندر دھنس جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ کیفیت اہل ایمان پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ حضور کے صحابی سعد ابن معاذؓ غزوہ خندق میں زخمی ہو کر شہید ہوئے۔ اُن کی بڑی فضیلت آئی ہے حدیث میں آتا ہے کہ اُن کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے شامل ہوئے تھے۔ جب آپ کو دفن کیا گیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قبر پہ دیر تک تسبیح و تکبیر بیان کرتے رہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس عبد صالح پہ بھی ضغط (قبر کی تنگی) آیا تھا۔ پھر اللہ نے اُس کو اٹھا دیا۔ یہ ابتلا تھی۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اِنَّکُمْ تُبْتَلُوْنَ فِیْ قُبُوْرِکُمْ بلاشبہ تمہیں قبروں میں آزمایا جائیگا۔ فرمایا قبر کی آزمائش اتنی بڑی ہوگی جیسے کَفِتْنَۃِ الدَّجَّالِ جیسے دجال کا فتنہ ہے تخلیق آدم سے لے کر صورِ اسرافیل تک اتنا بڑا فتنہ نہیں ہوگا جتنا دجال کا فتنہ ہوگا۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے تعلیم دی ہے تَعَوَّذُوْا بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ یعنی عذاب قبر سے اللہ کی ذات کے ساتھ پناہ چاہو۔ آپ نے یہ دعا بھی سکھائی ہے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَۃِ مَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَمِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَمِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔ نہ قبر

غرضیکہ صحیح عقیدے والے لوگ اس امتحان میں پورے اترتے ہیں اور صحیح جواب دیتے ہیں۔ اور غلط عقیدے والے لوگ صحیح جواب نہ

دے کر ناکام ہو جاتے ہیں۔ اُن کے لیے اگلی منزل مزید دشوار ہو جاتی ہے۔ بہر حال عذابِ قبر برحق ہے مگر اس کی کیفیت کو اس دنیا میں کوئی نہیں جان سکتا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ وہ آنکھ نہیں جو ان حالات کو دیکھ سکے کیونکہ یہ عالمِ ملکوت سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں۔ یہ چیزیں اُس وقت سمجھ میں آئیں گی جب خود وہاں انسان پہنچیں گے۔

انگریزوں اور بعض دوسرے محققین نے قبر کی کیفیت معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی ہے مگر انہیں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پارہ ایک نہایت ہی حساس چیز ہے۔ تھرمامیٹر میں پارہ ہی ہوتا ہے جو ذرا سی حرارت پر اوپر کو چڑھنے لگتا ہے، بعض پرانے زمانے کے منکرین نے تازہ مردے کی آنکھوں میں پارہ ڈال کر دفن کیا اور پھر دوسرے یا تیسرے دن اکھاڑ کر دیکھا تو پارہ اسی طرح موجود تھا، اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس سے انہوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قبر میں مردے کے ساتھ کوئی معاملہ پیش نہیں آتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں کسی کو کوئی مار نہیں پڑتی، وہاں کوئی سانپ بچھو وغیرہ مشاہدہ میں نہیں آئے۔ وہاں کسی کی پسلیوں کو آپس میں گڈمڈ نہیں دیکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان آنکھوں سے وہاں کی دنیا کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں جو کہ ممکن نہیں۔ اس کا حال قبر میں جا کر ہی معلوم ہو سکے گا۔

روح اور جسم کا تعلق

بعض گمراہ فرقے کہتے ہیں کہ قبر میں روح اور جسم کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، حالانکہ تمام محدثین، متکلمین اور مفسرین اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ قبر میں عذاب یا راحت روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے جب تک جسم سلامت رہتا ہے، روح کا تعلق اس سے قائم رہتا ہے اور تکلیف و آرام کا احساس دونوں کو ہوتا ہے جسم کے گل سڑ جانے کے بعد بھی حضور علیہ السلام کا صحیح حدیث میں فرمان موجود ہے کہ انسانی جسم کی

دمچی کی ہڈی کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور باقی رہتا ہے جس کے ساتھ روح کا تعلق قائم رہتا ہے اور پھر مرنے والے کو عذاب یا راحت کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ اور بعض دوسرے بزرگان کا قول ہے کہ روح کا تعلق انسان کے نسمے کے ساتھ ہوتا ہے۔ نسمہ مادی روح ہوتی ہے یہ جسم سے لطیف اور روح سے کثیف ہوتا ہے۔ نسمہ سماوی روح کی سواری ہوتا ہے۔ انسان کا ظاہر ایک خول اور اندر نسمہ ہے۔ جب موت واقع ہوتی ہے تو نسمہ بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ نسمے سے روح کبھی جدا نہیں ہوتی وہ ایک لحاظ سے مادی چیز بھی ہے کیونکہ نسمہ مادی عناصر سے پیدا ہوتا ہے اور روح عالم بالا سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ تاہم فقہا اور محدثین کہتے ہیں کہ جسم خواہ سارا فنا ہو جائے مگر اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور باقی رہتا ہے جس کے ساتھ روح کا تعلق قائم ہوتا ہے اور انسان کو جزا یا سزا کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

عذاب قبر کا انکار کرنے والے معتزلہ وغیرہ اہل بدعت میں شمار ہوتے ہیں موجودہ زمانے کے نیچری بھی اسی قماش سے ہیں اور ان دیکھی چیزوں کا انکار کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ عرض کیا اس جہان کی کیفیت کو اس دنیا کی زندگی میں معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ پر علمائے کرام نے بڑا کلام کیا ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور امام شاہ ولی اللہؒ نے اس پر بڑی بحث کی ہے۔

بہرحال ثابت قدمی سے مراد قبر میں ثابت قدمی ہے، اور قبر کا جہان برزخ میں داخل ہے۔ علیین اور قبر دونوں برزخ کا حصہ ہیں قبر میں روح کا تعلق قائم رہتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک قبر میں جزا اور سزا کا احساس بھی ہوتا ہے۔ محقق امام ابن ہمامؒ نے شرح

ہدایہ میں لکھا ہے کہ شفاعت اور عذابِ قبر کا منکر گمراہ ہے ، اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ۔

ظالموں کی گمراہی

فرمایا پختہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو پختہ بات یعنی کلمہ ایمان اور توحید کے ساتھ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت یعنی برزخ میں بھی اس کے بعد جب حشر کا موقع آئے گا تو فرمایا وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے ۔ یہ لفظ خود بتلا رہا ہے کہ جو شخص ظلم پہ مصر ہوتا ہے شرکیہ رسوم کو ترک نہیں کرتا ، کسی کے سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتا ، ایسے لوگوں کو اللہ گمراہی میں ہی مبتلا رکھتا ہے ۔ راہِ راست اس شخص کو میسر آئے گا جو کفر ، شرک ، نفاق اور معاصی کو ترک کرے گا ۔ ایسے شخص ہدایت کے طالب ہوتے ہیں " وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ " (محمد) ان کی ہدایت میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں ، سورۃ لقمان میں ہے " اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ " شرک سب سے بڑا ظلم ہے تو اس قسم کے لوگوں کو کبھی ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی بلکہ وہ گمراہ ہی رہیں گے ۔

فرمایا وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔ اس کا ہر کام اس کی حکمت اور مصلحت کے مطابق ہوتا ہے ۔ وہ حکیم ہے ، اپنی حکمت کے مطابق جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے گمراہی میں رکھے ۔ اور پھر اس کے نتیجے میں جس کو چاہے راحت دے اور جس کو چاہے سزا میں مبتلا کر دے ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا
وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا
وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا
عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى
النَّارِ ﴿۳۰﴾ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ
وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

ترجمہ:- کیا تو نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جنہوں نے تبدیل کیا اللہ کی نعمت کو کفر کے ساتھ، اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر (۲۸) جہنم میں، جس میں داخل ہوں گے وہ، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے (۲۹) اور ٹھہرائے انہوں نے اللہ کے لیے شریک تاکہ گمراہ کریں وہ اُس کے راستے سے۔ (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے کہ فائدہ اٹھا لو پس بیشک تمہارا لوٹنا دوزخ کی طرف ہے (۳۰) (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے میرے بندوں سے جو ایمان لائے کہ وہ قائم کریں نماز اور خرچ کریں اس میں سے جو ہم نے اُن کو رزق دیا ہے، پوشیدہ طور پہ اور ظاہر طور پر پہلے اس

سے کہ آجائے ایسا دن کہ جس میں نہ سوداگری ہو گی اور نہ دوستی (۳۱)

رابط آیات

سب سے پہلے قرآن کی حقانیت اور صداقت بیان ہوئی پھر قیامت کا ذکر آیا۔ اس کے بعد رسالت کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا پھر اللہ نے ایمان اور کلمۂ توحید کی مثال پاکیزہ درخت کے ساتھ بیان فرمائی اور کفر و شرک کے کلمے کو ناپاک اور بد ذائقہ درخت کے ساتھ تشبیہ دی۔ پھر اللہ نے اہل ایمان کے ثابت قدم رہنے کی بات کی کہ اللہ تعالیٰ اسی پاک کلمے کے ساتھ اہل ایمان کو اس دنیا میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے اور مرنے کے بعد قبر میں اور پھر حشر میں بھی ثابت قدمی عطا فرمائے گا۔ اب آج کی آیات میں اللہ نے کفر اور شرک کرنے والوں کا شکوہ بیان کیا ہے اور ان کے شرک کی تردید کی ہے۔ ساتھ ساتھ ایمان والوں کو ترغیب بھی دی ہے کہ وہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتے رہیں۔ ان میں دو اصولوں کا خاص طور پر ذکر ہے جن پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

کفرانِ نعمت

ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا اے مخاطب! کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا یعنی تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ ان کے لیے لازم تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کرتے مگر انہوں نے ناشکری اور ناقدردانی کا شیوہ اختیار کیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ اپنی قوم اور برادری کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں اتار دیا۔ وہ خود تو راہ راست سے ہٹ چکے تھے، اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بھی بنے اور انہیں بھی اپنے ساتھ جہنم میں لے گئے۔

اس سوال کے جواب میں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے کفرانِ نعمت کیا، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے قریش مکہ مراد ہیں۔ جو قرآن پاک کے اولین مخاطبین ہیں۔ یہی لوگ قرآن پاک کی مخالفت اور کفر و شرک کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ پھر اُن کے بعد سارے عرب تھے جو کفر و شرک کے پروگرام کو ہی غالب کرنا چاہتے تھے۔ حضرت علیؓ نے بھی اس سے قریش مکہ ہی مراد لیے ہیں۔

انعاماتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بے شمار نعمتیں نازل فرمائی ہیں اگلی آیت میں آرہا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کوئی انہیں شمار کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتا، چہ جائیکہ ہر ایک کی تفصیل معلوم ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی نعمت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر بطورِ خاص ذکر فرمایا ہے اور جس کی لوگوں نے قدر نہیں کی۔ مفسرین کرام نے اس کی بہت سی توجیہات کی ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس نعمت سے اللہ کا عظیم المرتبت رسول مراد ہے۔ اس کا ذکر اگلی سورۃ میں آئے گا وہاں نعمت کے ساتھ رسول کی تصریح موجود ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے مگر قریش مکہ نے ان دونوں نعمتوں کی قدر نہ کی۔ اللہ کی ایک اور بڑی نعمت یہ تھی کہ اُس نے قریش مکہ کو خانہ کعبہ اور حرم کا متولی بنایا۔ سورۃ قریش میں اس کی تصریح موجود ہے "لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ" اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ کو پورے عرب میں اُن کی عزت و وقار کی وجہ سے مانوس کر دیا تھا۔ لوگ ان کی عزت و احترام کرتے تھے، چنانچہ موسم گرما یا سرما میں جب بھی قریش تجارتی سفر پر جاتے تھے تو لوگ ان سے مانوس تھے۔ اللہ نے انہیں یہ عزت بیت اللہ شریف کا متولی ہونے کی بنا پر ہی عطا کی تھی۔ اسی لیے اللہ نے اُن کو حکم دیا تھا فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ

هٰذَا الْبَيْتِ اس گھر کے رب کی عبادت کرو جس کی وجہ سے اس نے تمہیں عزت بخشی ہے۔ بہر حال یہ بھی اللہ کی عظیم نعمت تھی مگر قریش نے اس کی بھی قدر نہ کی۔ انہوں نے کفر اور شرک کا راستہ اختیار کیا جو کہ حد درجے کی نمک حرامی اور ناشکری تھی۔ امام جعفر صادقؑ کے قول سے ملتا ہے کہ دنیا کی مادی نعمتیں تو ہر مومن اور کافر کو میسر ہیں مگر اہل ایمان کے حق میں اللہ کی دو عظیم نعمتیں ہیں۔ ایک اللہ کا قرآن ہے اور دوسرا نبی علیہ السلام کا وجود مبارک ہے۔ قریش نے ان دونوں نعمتوں کی قدر نہ کی۔

حضرت علیؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس نعمت سے مراد ایمان اور توحید لیا ہے مگر ان لوگوں نے اس سے انکار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی جہنم میں گئے اور دوسروں کو بھی وہیں اتارا۔ شیخ ابن عربیؒ صاحب فتوحات مکیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس نعمت سے مراد وہ صلاحیت بھی ہو سکتی ہے جو اللہ نے ہر فرد بشر کو عطا کی ہے۔ "فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" یہ اللہ کی فطرت سلیمہ ہے جس پر اس نے سب لوگوں کو پیدا فرمایا۔ كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ہر بچہ فطرت سلیمہ پر ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا بڑا انعام ہے۔ مگر دنیا میں آکر لوگ اس فطرت کو خراب کر لیتے ہیں اور اس نعمت کی ناقدری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ ایسا انعام ہے جو ہر انسان کو بلا استثناء حاصل ہے اِنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ خدا تعالیٰ نے یہ صلاحیت ہر شخص کے دل میں رکھ دی ہے۔ اگر اس کو صحیح طریقے سے استعمال کرے تو ایمان پر قائم رہ سکتا ہے اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے اکثر لوگ اس صلاحیت کو خراب کر لیتے ہیں بس اور پھر کوئی یہودیت کی طرف چلا جاتا ہے، کوئی نصرانیت کی

طرف، کوئی کافر بن جاتا ہے اور کوئی مشرک، اس صلاحیت کو بگاڑنے کی وجہ سے انسان جہنم کا شکار بنتے ہیں۔ بہرحال یہ شکوہ ہے کہ دیکھو! اللہ نے انسانوں کو کیسی کیسی نعمتیں عطا کیں۔ انسان کا اپنا وجود بہت بڑی نعمت ہے اور اسکو تمام مادی نعمتوں کے علاوہ روحانی ترقی کے تمام اسباب بھی مہیا کیے مگر انہوں نے کچھ قدر نہ کی۔

قوم کی جہنم رسیدگی

فرمایا، اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری کے ساتھ تبدیل کر دیا وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ اور انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں اتار دیا جَهَنَّمَ ج يَصْلَوْنَهَا یہ جہنم ہی تو ہے جس میں داخل ہوں گے کفر و شرک کے نتیجے میں خود بھی جہنم رسید ہوئے اور اپنی قوم کو بھی ساتھ ہی لے گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قریش کے بڑے بڑے سرداروں ابوجہل اور ابولہب نے قوم کو کس طرح ہلاکت کے گڑھے میں ڈالا۔ بدر کے مقام پر اِن کے ساتھ کیا ہوا۔ بڑے بڑے آئمۃ الکفر اپنی قوم سمیت جہنم رسید ہوئے۔ احد اور دوسرے مقامات پہ جتنے کافر مرے، سب جہنم میں گئے۔ اِن کے لیڈر تو اپنے وقار کے لیے مخالفت کرتے تھے مگر ان کے پیروکار جو بلا سوچے سمجھے ان کی اتباع کرتے رہے وہ بھی ان کے ساتھ ہی اپنے انجام کو پہنچے۔ موجودہ دور میں غیر ملکی مشنریاں بھی یہی کام انجام دے رہی ہیں۔ یہودی ہوں یا عیسائی، ہندو ہوں یا آغاخانی سب مسلمانوں کے ایمان پہ ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف خود گمراہ ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ جہنم میں لے جانا چاہتے ہیں وَبِئْسَ الْقَرَارُ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ وہاں پہنچ کر کسی کو چین حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہاں تو ہر آن دکھ ہی دکھ ہوں گے۔

کی ذریعہ رہی ہے

فرمایا وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا اور ٹھہرائے انہوں نے اللہ کے

بھی شریک، ند، مقابل کہتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کا کوئی مدِمقابل نہیں نہ ذات میں، نہ صفات میں اور نہ عبادت میں، مگر انہوں نے انسانوں اور جنوں کو خدا کا شریک بنایا، کسی نے شجر و حجر کی پوجا شروع کر دی اور کسی نے ستاروں اور سیاروں میں کرشمہ مان لیا، یہ سب شرکیہ باتیں ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں۔ سورۃ بقرہ میں اللہ کا یہ ارشاد بھی گزر چکا ہے "فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ" اللہ کے مدِمقابل نہ بناؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔

اللہ نے اُن کی اس قباحت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں تَمَتَّعُوا مزا اڑا لو، چند دن تک اس زندگی میں فائدہ اٹھا لو فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ کیونکہ بالآخر تمہارا لوٹنا دوزخ ہی کی طرف ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ڈاکٹر مریض سے کہے کہ تو بدپرہیزی کر لے۔ تیری موت آنے ہی والی ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ تم دنیا میں عیش و آرام کر لو، کفر، شرک اور ناشکری کا ارتکاب کر لو، تم اپنے انجام کو پہنچنے والے ہو۔ اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں گزر چکا ہے "وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ" اگر تم نے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کیا تو اس کا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔ یہ چند دن کی مہلت ہے اس سے فائدہ اٹھا لو، پھر تمہیں عذابِ الٰہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون امہال و تدریج ہے کہ وہ مہلت دیتا رہتا ہے۔ سورۃ اعراف میں اُس کا فرمان ہے "وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ" میں ایسے لوگوں کو مہلت دیتا رہتا ہوں۔ میری گرفت بڑی مضبوط ہے جب چاہتا ہوں، اُن کو پکڑ لیتا ہوں۔ مہلت دینا خدا تعالیٰ کی مصلحت ہے

وگرنہ وہ فوراً گرفت کرنے پر بھی قادر ہے۔

اقامت صلوٰۃ

کفار و مشرکین کے لیے ترہیب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے ترغیب کا ذکر بھی کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں لِعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میرے ان بندوں سے جو ایمان لائے۔ میرے وہ بندے جنہوں نے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کیا، کتاب الٰہی، قیامت اور رسالت کی گواہی دی، فرمایا میرے اُن بندوں سے کہہ دو، کہ تمہارے ایمان کے کچھ تقاضے بھی ہیں جنہیں پورا کرنا ضروری ہے۔ اِن تقاضوں کی تکمیل سے ہی تمہیں مکمل فلاح نصیب ہوگی۔ ان میں سے دو چیزوں کا اللہ نے بطورِ خاص ذکر کیا ہے یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ پہلی بات یہ ہے کہ نماز کو قائم رکھیں۔ نماز ایک بہت بڑی چیز ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (البقرہ) یہ منافق صفت لوگوں پر بڑی بوجھل ہوتی ہے، البتہ خشوع کرنے والے لوگوں پر آسان ہوتی ہے۔ وہ اس کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ یہ انسان کی طرف سے اپنے پروردگار کی وفاداری اور غلامی کا ثبوت ہے۔ اُمُّ الْعِبَادَاتِ الْمُقَرِّبَاتِ خدا کا قرب دلانے والی عبادتوں کی یہ جڑ اور بنیاد ہے[1]۔ یہ اللہ کے ساتھ تعلق قائم رکھنے والی عبادت ہے۔ اسی لیے اللہ نے اسے ہر بالغ مرد اور عورت پر فرض قرار دیا ہے۔ اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ حضور کا فرمان صَلِّ قَائِمًا نماز کھڑے ہو کر پڑھو فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا اگر کھڑے ہو کر پڑھنے کی استطاعت نہیں۔ تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ اگر ایسا بھی نہیں کر سکتے تو لیٹ کر پڑھو مگر چھوڑنا نہیں کیونکہ یہ تعلق باللہ کی درستگی کا ذریعہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے[2] اپنے گورنروں کو مراسلہ بھیجا تھا جس میں یہ بھی لکھا کہ جس نے نماز

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۷۳ ج ۱ ، [2] موطا امام مالک ص ۵

کی حفاظت کی، اس نے سارے دین کی حفاظت کی اور جس نے نماز کو برباد کیا، اس نے ساری چیزوں کو برباد کیا۔ نماز وہی مقبول بارگاہ ہوگی جو سمجھ کر اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، ورنہ اللہ کی وعید یہ بھی ہے "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" (الماعون) ہلاکت، تباہی اور بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں، جنہیں اس کی حقیقت کا ہی علم نہیں اور جو ریاکاری کی خاطر نمازیں پڑھتے ہیں۔ لہذا نماز کو سمجھ کر پڑھنا چاہیئے کہ یہ کیا چیز ہے اور کیوں ضروری ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

فرمایا میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ نماز ادا کریں وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً" اور جو ہم نے ان کو روزی دی ہے اس میں سے پوشیدہ طور پر خرچ کریں اور ظاہری طور پر بھی۔ ساتھ یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ یہ روزی ہماری عطا کردہ ہے، تم گھر سے نہیں لائے۔ ہم نے وسائل مہیا کیے اور پھر تمہیں ان اشیاء کا مجازی طور پر مالک بنایا کہ تم اس میں تصرف کر سکتے ہو۔ ہم نے سارے مال کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ اس کا کچھ حصہ ہماری راہ میں خرچ کرو۔ زکوٰۃ ہے تو چالیسواں حصہ دو، عشر ہے تو دسواں یا بیسواں حصہ ادا کرو۔ پھر صدقہ فطر ادا کرو، قربانی دو، خویش و اقارب کا حق ادا کرو، غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کرو۔ سورۃ محمد میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارا سارا مال طلب نہیں کرتا، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا، تو اسے حق حاصل تھا مگر تم بخل میں مبتلا ہو جاتے اور پھر تباہی و بربادی آتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد مال کا کچھ حصہ نکالنے کا حکم دیا ہے، اس کی راہ میں خرچ کرو گے تو فضیلت حاصل ہوگی۔ فرض سے سبکدوشی ہوگی اور اگر روک رکھو گے تو تمہارے لیے شر کا باعث ہوگا۔ فرض، واجب اور سنت ادا نہیں کیا تو پکڑے

جاؤ گے اور اگر مستحب سے محروم رہے تو فضیلت سے محرومی ہو گی۔
اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کل مال کا چوتھا حصہ خرچ کرنے کا حکم دیا تھا، جب کہ ہماری امت کے لیے چالیسواں، بیسواں اور دسواں حصہ مقرر فرمایا۔ البتہ کانوں کی پیداوار میں سے پانچواں حصہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان بخل کا مظاہرہ کریگا تو اس کے لیے وبالِ جان ہو گا۔ نماز تعلق باللہ کی درستگی کا ذریعہ ہے جب کہ انفاق فی سبیل اللہ مخلوق کے ساتھ تعلق کی درستگی کا پیش خیمہ ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا فلسفہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے بخل کا مادہ نکل جاتا ہے اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات فروغ پاتے ہیں فرمایا میرے ایمان دار بندوں کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور ہمارے دیے ہوئے مال میں سے ہمارے راستے میں خرچ کریں۔

بر محل اور بروقت خرچ

انفاق فی سبیل اللہ کے مختلف محلات اور مختلف اوقات ہیں۔ بعض اوقات ظاہری خرچ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسروں کو ترغیب دلانا مقصود ہو۔ اور جب رضائے الٰہی اور فضیلت مقصود ہو تو پوشیدہ طور پر خرچ کرنا افضل ہے۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ اگر ظاہر طور پر خرچ کرو تو یہ اچھی بات ہے "وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" اور اگر پوشیدہ طور پر محتاجوں کو دو گے تو یہ مزید بہتر ہو گا۔ ریاکاری سے بچ جاؤ گے اور خدا تعالیٰ کے ہاں مقبولیت بھی زیادہ ہو گی۔

فرمایا ہمارے دیے ہوئے رزق سے خرچ کریں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ قبل اس کے کہ وہ دن

آجائے جس میں کوئی سوداگری نہیں ہوگی۔ اس دنیا میں انسان کاروبار کرتا ہے اور تجارت کرتا ہے تاکہ فائدہ اٹھا سکے۔ مگر قیامت کا دن ایک ایسا دن ہوگا جس میں اس قسم کی کوئی سودے بازی نہیں ہو سکے گی۔ اگر کوئی چاہے کہ وہاں جاکر اس دنیا کی فوت شدہ نمازیں خریدے، روزوں کی تجارت کرلے یا کوئی دیگر نیکی خریدلے تو ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ جو کچھ کمانا اور خریدنا ہے، وہ اسی دنیا میں ممکن ہے۔ یہیں کی کمائی ہوئی نیکی وہاں کام آئے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ اُس دن سے پہلے خرچ کرلو جس دن کوئی خرید و فروخت نہیں ہوگی۔

وَلَا خُلَّةٌ اور نہ ہی اُس دن کوئی دوستی کام آئے گی۔ اس دنیا میں بعض کام دوستی کی بناء پر بھی حل ہو جاتے ہیں۔ سفارش کام آجاتی ہے کہیں جبقہ کام نکالتا ہے، دوست دوست کی مدد کرتا ہے مگر قیامت کے دن یہ بھی ناممکن ہوگا۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی سورۃ الزخرف میں ہے "اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ" آج کے دوست وہاں دشمن بن جائیں گے البتہ وہ متقی لوگ جن کی دوستی تقوے اور ایمان پر قائم تھی، وہ وہاں بھی قائم رہیگی اور اُن کی کوشش اور سفارش بھی وہاں کام آئے گی، وہ ایک دوسرے کی نجات کے لیے پوری کوشش کریں گے اس کے علاوہ دنیا کی تمام دوستیاں ختم ہو جائیں گی۔ لہٰذا اللہ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ وہ دو باتوں میں ایمان کے تقاضے ضرور پورے کریں ایک نماز قائم کریں اور دوسرا ہمارے عطا کردہ مال میں سے ہمارے حکم کے مطابق خرچ کریں۔ چنانچہ جہاں پر اللہ نے جماعت المسلمین کا ذکر فرمایا ہے، وہاں ارشاد ہے "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ" (التوبۃ) اگر کافر

مشرک، منافق، بے دین توبہ کر لیں، نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ کی ادائگی شروع کر دیں تو وہ تمہارے بھائی ہیں. گویا نماز اور زکوٰۃ جماعتی نشانی ہے جو یہ کام کرتا ہے، وہ ہماری جماعت کا آدمی ہے اور جو نہیں کرتا وہ جماعت المسلمین کا ممبر نہیں ہے۔ یہی جماعتی خصوصیت اور یہی مسلمان کی پہچان ہے۔ ایک بدنی عبادت ہے اور دوسری مالی۔ اللہ نے اِن دونوں کا بیان بطورِ خاص ذکر فرمایا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى
الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝۳۲ وَسَخَّرَ
لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝۳۳ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ
ع لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝۳۴ ۵

ترجمہ: اللہ جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور اتارا ہے آسمان کی طرف سے پانی۔ پس نکالا ہے اس کے لیے پھلوں سے رزق تمہارے لیے۔ اور اُس نے مسخر کیا ہے تمہارے لیے کشتیوں کو تاکہ چلیں وہ دریا میں اُس کے حکم سے۔ اور مسخر کیا ہے تمہارے لیے نہروں کو (۳۲) اور مسخر کیا ہے اُس نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو جو مسلسل چلتے ہیں۔ اور اُس نے مسخر کیا ہے تمہارے لیے رات اور دن کو (۳۳) اور دی ہیں اُس نے تمہیں تمام اُن چیزوں میں سے جو تم نے اُس سے مانگی ہیں۔ اور اگر تم شمار کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو، تو اس کو پورے طریقے سے

نہیں کہہ سکتے۔ بیشک انسان بہت بے انصافی
کرنے والا اور ناشکر گزار ہے (۳۴)

ربط
گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا اثبات اور کفر و شرک کا رد فرمایا تھا۔ اس سلسلہ میں کلمہ توحید کی مثال پاکیزہ درخت کے ساتھ اور کلمہ کفر و شرک کی مثال ایک گندے درخت کے ساتھ بیان فرمائی فرمایا کہ دنیا و آخرت میں ایمان والوں کی ثابت قدمی کلمہ توحید کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ منکرین نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کی جس کی وجہ سے خود بھی جہنم میں پہنچے اور دوسروں کو بھی ساتھ لے گئے۔ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ فرمایا، یہ لوگ چند دن تک فائدہ اٹھالیں، بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ایمان کے تقاضے میں دو باتوں کو پورا کرتے رہیں۔ نماز ادا کریں اور انفاق فی سبیل اللہ بھی کرتے رہیں تاکہ اپنے لیے اس دن سے پہلے کوئی سامان پیدا کر لیں جس دن نہ کوئی سوداگری ہوگی۔ اور نہ کوئی دوستی کام آئیگی۔ گویا ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اشقیا اور سعدا دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اشقیا وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی نعمت کا انکار کرتے ہیں، اور سعدا وہ ہیں جو ایمان لانے کے بعد نماز قائم کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی پہچان
اب اس درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی پہچان کے دلائل ذکر فرمائے ہیں۔ ان دلائل کو قرآن کے مختلف مقامات پہ تکرار بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ باتیں لوگوں کے اذہان میں بیٹھ جائیں اور وہ ان سے نصیحت حاصل کریں جو شخص خدا تعالیٰ کو پہچان کر اس کی وحدانیت کو تسلیم کریگا، وہ سعدا میں شامل ہو کر فلاح پا جائے گا، ورنہ ناشکر گزاروں

کے ٹولے میں شامل ہو کر جہنم کا شکار بنے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا کہ نجران کے نصاریٰ کو سب سے پہلے توحید ورسالت کی دعوت دینا وَاِذَا عَرَفُوا اللّٰہَ اور جب وہ اللہ تعالیٰ کو صحیح طریقے سے پہچان لیں تو پھر انہیں کہنا کہ اللہ نے دن میں پانچ نمازیں، ایک ماہ کے روزے اور اگر استطاعت ہو تو زکوٰۃ اور حج بھی فرض کیا ہے۔ دین اسلام میں خدا کی پہچان سب سے پہلا مرحلہ ہے جب تک صحیح پہچان نہیں ہو گی، انسان اپنے دل میں توحید کو جگہ نہیں دے سکے گا اور نہ ہی کوئی عبادت مقبول ہو گی۔ "مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ" انہوں نے خدا تعالیٰ کو کما حقہٗ پہچانا ہی نہیں۔ اگر پہچان صحیح ہو جاتی تو پھر نہ شرک میں مبتلا ہوتے اور نہ رسالت کا انکار کرتے۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ حجابات میں سے تیسرا حجاب سوءِ معرفت ہے۔ لوگوں کی اکثریت اسی حجاب میں مبتلا ہے، یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی صحیح پہچان نہیں ہوتی۔ وہ یا تو اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دے کر عقیدہ تشبیہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا خدا تعالیٰ کی صفات مخلوق میں مان کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ توحید کو وہی سمجھے گا۔ جسے اللہ کی صحیح پہچان ہو گی۔ جب توحید کو سمجھ لے گا تو فکر پاک ہو جائے گی اور اس کی عبادت بھی ٹھکانے لگے گی۔

اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کو اس کی ذات سے پہچاننا چاہے، تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ وہاں تک کسی مخلوق کی رسائی نہیں، اللہ تعالیٰ وراء الوراء ہے۔ اس کی صفات کو بھی انسان براہ راست نہیں پہچان سکتا۔ اس کی پہچان اس کی مخلوق پر غور کرنے سے ہوتی ہے جب اللہ کی صفت سمجھ میں آ جائے تو پھر انسان اللہ کی ذات کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔

آسمان و زمین کی تخلیق

اپنی پہچان ہی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے پیدا کیے ہیں آسمان اور زمین۔ تخلیق اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ آسمان اور زمین ہمیں نظر آتے ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا تعلق ہے۔ آسمانی چیزوں سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں اور زمین پر چلتے پھرتے اور اس سے ضروریات زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ان کو پیدا کرنا خدا کا کام ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کو ابداع اور فاطر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جیسے فرمایا "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یا "فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" دونوں کا معنیٰ ایک ہے کہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا فقط اللہ ہے۔ اللہ کی ان صفات میں ابداع یعنی ایجاد کرنا پہلے نمبر پر ہے اس نے آسمان اور زمین کو بغیر کسی مادے، آلے اور نمونے کے پیدا فرمایا پھر دوسری صفت خلق ہے۔ اس نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے اور جنات کو آگ کے مادے سے پیدا کیا۔ آگے تیسرے نمبر پر صفت تدبیر ہے "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" (الم سجدہ) عالم بالا سے لے کر عالم زیریں تک تمام چیزوں کی تدبیر وہ خود کرتا ہے اللہ کی یہ تینوں صفات آگے پیچھے آتی ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اسی حصہ آیت میں اپنی صفت ابداع کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے اس کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔

بارش اور اس کے فوائد

اللہ تعالیٰ نے اپنی پہچان کی یہ دلیل بھی دی ہے وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اس نے آسمان کی طرف سے پانی نازل فرمایا۔ سماء بلندی اور فضا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں، ہوائیں انہیں فضا میں چلاتی ہیں اور بادلوں میں پانی کے قطرات

منجمد ہو کر زمین پر برسنے لگتے ہیں۔ بارش کے پورے نظام میں محض بخارات سے اٹھنے والی مون سون ہواؤں ہی کا دخل نہیں بلکہ اس میں عالم بالا کا حکم بھی شامل ہوتا ہے، تب جا کر بارش برستی ہے۔

فرمایا، آسمان کی طرف سے پانی نازل کیا فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ پھر اس پانی کے ذریعے پھل اگائے جو تمہارے لیے روزی کا سامان ہے۔ اللہ تعالیٰ پانی ہی کے ذریعے زمین میں نشوونما پیدا کرتا ہے اور پھر اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر موسم کے لیے حسب ضرورت مختلف رنگ، ذائقے اور تاثیر کے پھل پیدا کرتا ہے۔ کسی پھل کی تاثیر سرد ہوتی ہے کسی کی گرم، کسی کی خشک اور کسی کی مرطوب۔ انسانی غذا کے طور پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے لوگ ہر موسم میں بے دریغ پھل استعمال کرتے ہیں مگر جیسا کہ آگے آرہا ہے اس مالک ارض وسما کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔

دیگر انعامات الٰہیہ

پانی کی اور بھی بہت سی حکمت بیان کی گئی ہے پچھلی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ پہاڑوں پر بارش برسا کر پانی کو ندی نالوں کی صورت میں بہاتا ہے، جس سے دور دور تک آبپاشی ہوتی ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسانوں اور حیوانوں کی غذائی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اسی طرح زمین بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو انسانوں اور حیوانوں کے قدم کہاں ٹکیں، ان کی خوراک کا انتظام کہاں سے ہو، معدنیات کہاں سے حاصل ہوں۔ اسی طرح آسمان کے بغیر چاند، ستارے اور سورج کہاں چلیں۔ ان سے روشنی اور حرارت کیسے حاصل ہو۔ اللہ نے انسان کی بنیادی ضروریات کو فری رکھا ہے۔ ذی روح مخلوق کو سب سے زیادہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے جسے اللہ نے بالکل مفت عطا کیا ہے۔ اس کے بعد انسانی ضروریات میں پانی کو سب سے

زیادہ اہمیت حاصل ہے اور وہ بھی اللہ نے وافر مقدار میں پیدا فرمایا ہے اس کے ذرائع میں بارش، ندی نالے اور کنوئیں وغیرہ ہیں جہاں سے یہ بآسانی دستیاب ہے اس کے بعد خوراک لازمی چیز ہے جس کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی عام نعمتیں ہیں جو اس نے انسان پر کی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا۔ پروردگار! تیری ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت کون سی ہے، فرمایا، سانس لو۔ جب آپ نے سانس لیا تو اللہ نے فرمایا یہ میری ادنیٰ سی نعمت ہے جو مدارِ حیات ہے۔ ہر سانس کے ذریعے انسان کو خدا تعالیٰ کے دو انعامات حاصل ہوتے ہیں۔ ہر چوبیس گھنٹے میں انسان چوبیس ہزار سانس لیتا ہے تو اندازہ لگائیے کہ صرف سانس کے ذریعے انسان کو کتنے انعامات حاصل ہوتے ہیں مگر اس کے مقابلے میں انسان کی طرف سے شکریہ کی ادائیگی صفر کے برابر ہے۔

تیسری دلیل یہ بیان فرمائی ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ اور تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ تاکہ وہ اس کے حکم سے دریاؤں میں چلیں۔ پانی پر چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے لے کر بڑے بڑے جہازوں تک کا تیرنا اللہ تعالیٰ کے خاص قانون کے مطابق ہے۔ اگر قدرت کا یہ قانون موجود نہ ہوتا تو کوئی چیز پانی میں نہ تیر سکتی۔ آبی شاہراہوں کے ذریعے انسانوں کے علاوہ لاکھوں ٹن وزنی اشیاء ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے مال بردار جہاز ایک ایک ماہ تک ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک محوِ سفر رہتے ہیں۔ ابھی چند سال کی بات ہے کہ فیصل آباد کے ایک شخص نے اپنے سمندری سفر کا حال بیان کیا۔ کہنے لگا ہم چھہتر ہزار ٹن لوہا بذریعہ بحری جہاز لے کر جا رہے تھے۔ خدا کی قدرت سمندر میں زبردست طوفان آیا جس میں جہاز

پھنس گیا اور اس کے بچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ بعض انگریز ملازمین
نے شراب پی کر سمندر میں چھلانگ لگا دی جب کہ میں نے ایک چھوٹی
کشتی کے ذریعے جان بچائی۔ جہاز ڈوب گیا، میں ہسپتال میں بیہوشی کی حالت
میں پڑا رہا اور کئی روز بعد ہوش آیا۔ غرضیکہ پانی بڑی زبردست طاقت
ہے مگر قانونِ خداوندی کے تحت اس پر جہاز اور کشتیاں تیرتی رہتی ہیں
اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ڈوب بھی جاتی ہیں۔ فرمایا
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ اور تمہارے لیے ندی، نالوں اور
نہروں کو بھی مسخر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق ندی نالوں کو زمین
کے اندر چلاتا ہے جن سے وہ لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں جہاں بارش
نہیں ہوتی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے دلائلِ توحید میں سے ہے۔

تسخیر شمس و قمر

آگے فرمایا وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اور تمہارے
لیے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا دَآئِبَيْنِ جو دستور کے مطابق چل رہے
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو راستے مقرر کر دیے ہیں، ان پر بلا
کم و کاست رواں دواں ہیں اور اس میں منٹ سیکنڈ تک کا فرق بھی
نہیں آتا۔ تسخیر کا ایک معنی تو کسی چیز کا کسی کے قابو میں آنا ہوتا ہے جیسے
جانور نوکر غلام وغیرہ انسان کے قبضے میں ہوتے ہیں اور وہ ان سے حسب
منشا کام لیتے ہیں۔ مگر تسخیر کا دوسرا معنی فائدہ اٹھانا بھی ہے۔ شمس و قمر
کی تسخیر کا یہی معنی ہے۔ اللہ نے انہیں انسان کے فائدے کے لیے
کام پر لگا دیا ہے۔ سورج انسانوں کو روشنی اور حرارت فراہم کرتا ہے۔
جب کہ چاند کے ذریعے دھیمی روشنی اور پھلوں میں رس پیدا ہوتا ہے
اسی طرح ستارے، سیارے اور ہوائیں بھی انسان کی خدمت پر مامور ہیں، اسی
لیے فرمایا کہ ہم نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے دَآئِبَيْنِ
کا مطلب یہ ہے کہ سورج اور چاند مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ

ابن عباسؓ اور امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ان سیاروں کی دو حرکتیں ہیں سورج کی یومیہ حرکت مشرق سے مغرب کی طرف ہوتی ہے، اور پھر کیلی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے۔ شمس و قمر کسی مکان یا احاطہ میں جا کر چھپ نہیں جاتے بلکہ یہ مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ ان کا طلوع و غروب باعتبار ایک افق کے ہوتا ہے، لیکن ان کی حرکت بند نہیں ہوتی۔ ان مختلف منزلوں کی تبدیلی سے موسم بدلتے ہیں اور یہ بھی انسانی ضرورت میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر سارا سال ایک ہی موسم رہے تو ایک ہی قسم کے اناج یا پھل پیدا ہوں گے جس سے انسانی زندگی پر بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔

فرمایا وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اور مسخر کیے تمہارے لیے رات اور دن۔ رات دن کی ادلا بدلی بھی انسانی صحت کے لیے نہایت ضروری ہے دن لوگوں کو کام کاج فراہم کرتا ہے جب کہ رات کو سکون حاصل ہوتا ہے اور پھر انسان تازہ دم ہو کر اگلے دن دوبارہ کام میں لگ جاتا ہے غرضیکہ اللہ نے رات اور دن کو بھی انسانی خدمت پر مامور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان چند نعمتوں کا ذکر کر کے اپنی پہچان کی دلیل قائم کی ہے۔

پھر اللہ نے بطور قانون فرمایا وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ اور دیا تم کو جو کچھ تم نے مانگا۔ انسان کی طلب کبھی زبانِ قال سے ہوتی ہے کہ انسان زبان سے بول کر کسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے، اور کبھی یہ طلب زبانِ حال سے ہوتی ہے۔ یعنی انسان کی حالت جس چیز کا تقاضا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے بغیر مانگے ہی عطا کر دیتا ہے۔ یہ عطا کرنے کا قانون اللہ نے بیان کر دیا ہے اس مقام پر مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی تم نے جو کچھ مانگا، وہ سارا نہیں بلکہ اس

میں سے کچھ دے دیا۔ دُعا کے بارے میں یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنا، اس کی عبادت کے مترادف ہے، اس سے مانگنا چاہیے وہ کسی کی دعا رد نہیں کرتا۔ البتہ یہ ہے کہ انسان کی مصلحت کے مطابق کبھی مطلوبہ چیز فوراً عطا کر دیتا ہے۔ اور اگر مصلحت میں مفید نہیں ہوتی تو اس کے بدلے میں کوئی مصیبت ٹال دیتا ہے۔ اگر ایسا بھی نہ ہو تو دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا لیتا ہے۔ وہ اس مانگنے والے کے لیے آخرت میں مفید ہوگی۔ چونکہ انسان کا علم محدود ہے اس لیے بعض اوقات وہ ایسی چیز طلب کر لیتا ہے جو اس کے لیے مضر ہوتی ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سی چیز مفید اور کون سی مضر ہے لہٰذا وہ اس کے مطابق ہی عطا کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

نعمت شماری پیہ عدم قدرت

آگے ارشاد ہوتا ہے وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ ہر نعمت مخلوق ہے اور ہر مخلوق محدود ہوتی ہے جو کہ شمار کی جا سکتی ہے، مگر اللہ نے فرمایا کہ میری نعمتیں شمار نہیں کی جا سکتیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا کہنا باعتبار انسان کے ہے کیونکہ بوجہ ضعف وہ ان نعمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ سورۃ النساء میں موجود ہے وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا انسان کو بالطبع کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا محدود چیزوں پر حاوی ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ تم اللہ کی نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتے۔ جب شمار نہیں کر سکتے تو حق شکریہ کیسے ادا ہو سکتا ہے؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کے تین دفتر پیش ہوں گے ایک میں نیکیاں، دوسرے میں گناہ اور تیسرے میں نعمتیں درج ہوں گی۔ پھر نعمتوں میں سے ایک نعمت کھڑی ہو کر اللہ کی بارگاہ میں عرض کرے گی، پروردگار! مجھے اس شخص کی نیکیوں میں سے بدلہ دیا جائے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس کی نیکیوں میں

سے اپنا حق وصول کرلو۔ جب وہ ایک نعمت اپنا حق لینا شروع کرے گی تو اُس آدمی کی تمام نیکیاں ختم ہو کر صرف گناہ باقی رہ جائیں گے۔ وہ پھر عرض کرے گا وَعِزَّتِكَ مَا اسْتَوْفَيْتُ تیری عزت کی قسم مجھے پورا حق ابھی تک نہیں ملا۔ اگر اللہ تعالیٰ اُس بندے پر رحم نہیں فرمانا چاہے گا تو کہے گا کہ اے بندے! تیری نیکیاں تو ایک نعمت ہی کھا گئی، اب تیرے پاس کچھ نہیں بچا۔ جب ایک نعمت کا پورا حق ادا نہیں ہوسکا تو باقیوں کا کیسے ہوگا۔ اور اگر اللہ اُس شخص پر رحم کرنا چاہے گا تو کہے گا، جاؤ! ہم نے تمہاری نیکیاں دگنی چوگنی کر دی ہیں اور تمہاری غلطیاں معاف کر دیں اور وہ شخص بچ جائے گا۔ بصورتِ دیگر اُسے ایک نعمت ہی پکڑ کر بیٹھ جائے گی اور وہ شخص جان نہیں چھڑا سکے گا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اس قدر زیادہ ہیں مگر انسان اس کی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے منہ میں جانے والے ایک لقمہ میں اللہ تعالیٰ کے بیشمار احسانات پوشیدہ ہیں۔ ذرا غور فرمائیں، کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر محنت کروا کے اور بارش کا انتظام کر کے گندم کو کس طرح پیدا کیا۔ پھر اُس کے آٹا بننے تک اُسے کتنے مراحل سے گزرنا پڑا۔ گندم کے اُگنے، پکنے، ہیدا شت کرنے، پیسنے اور روٹی پکنے تک کتنے ہاتھوں اور مشینوں سے کام کیا، تب جا کر انسان کو ایک لقمہ نصیب ہوا۔ اگر کسی کل کا ایک پرزہ بھی خراب ہو جائے تو سارا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے گندم کے دانے کو تمام مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزارنے کے بعد انسان کے منہ تک ایک لقمہ پہنچایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہیں جو واقعی شمار سے باہر ہیں۔ یہ تو ایک لقمے جیسی نعمت کی بات ہے، اس کے علاوہ انسان کو لاکھوں کروڑوں نعمتیں میسر ہیں

جن کو نہ شمار کر سکتا ہے اور نہ اُن کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہ کر سکو گے۔

انسانی کمزوریاں

فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ بیشک انسان البتہ بہت ہی بے انصاف اور ناشکر گزار ہے۔ شب و روز خدا تعالیٰ کے انعامات میں غرق ہے مگر اُس مالک کا شکر ادا نہیں کرتا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ سبا میں فرمایا قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ میرے شکر گزار بندے تھوڑے ہیں۔ جب کہ ناشکر گزار بہت زیادہ ہیں۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پہچان کرائی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے یہ تمام نعمتیں مہیا کی ہیں۔ اگر انسان اِن میں غور و فکر کرے تو اُسے معرفت الٰہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اُسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان تمام نعمتوں کو مہیا کرنے والا صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے جب یہ بات سمجھ میں آجائے تو توحید کا مسئلہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے یہ تو اللہ نے عام نعمتوں کا ذکر کیا ہے، آگے خصوصی نعمتوں کا ذکر بھی آرہا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا
وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ
فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ
مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ
اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ :۔ اور (اس بات کا خیال کرو) جب کہ کہا ابراہیم علیہ السلام نے اے پروردگار ! بنادے اس شہر کو امن والا ، اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم بتوں کی عبادت کریں ﴿۳۵﴾ اے پروردگار ! بیشک انہوں نے گمراہ کیا ہے بہت سے لوگوں کو ۔ پس جس نے میری پیروی کی بیشک وہ مجھ سے ہے ، اور جس نے میری نافرمانی کی ، پس بیشک تو بخشش کرنے والا مہربان ہے ﴿۳۶﴾ اے ہمارے پروردگار ! بیشک میں نے بسایا ہے اپنی اولاد میں

سے ایسی وادی میں جو کھیتی باڑی والی نہیں ہے تیرے محترم گھر کے پاس ۔ اے ہمارے پروردگار ! تاکہ یہ نماز قائم کریں ۔ پس بنا دے لوگوں کے دلوں کو کہ مائل ہوں اِن کی طرف ، اور روزی دے اِن کو پھلوں سے شاید یہ شکر ادا کریں (۳۷)

ربطِ آیات

پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عام نعمتوں کا ذکر تھا جن میں سے ہر نعمت اللہ کی وحدانیت کی دلیل بنتی ہے ۔ اب اللہ نے خاص نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے ۔ اس ضمن میں قریش مکہ کو یہ بات سمجھائی ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا اور جدامجد مانتے ہو ۔ انہوں نے جس خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی اس کی بنیاد توحید پر تھی مگر تم کفر اور شرک میں کیسے مبتلا ہو گئے ہو ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اُن دعاؤں کا ذکر کیا ہے جن سے کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی وجہ سے سرزمین مکہ پر جو خصوصی انعامات فرمائے تھے ، اُن کا ذکر بھی کیا ہے ۔ توحید کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ کفار و مشرکین کو تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو اختیار کریں اور خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں ۔

شہرِ امن

ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ اُس وقت کو دھیان میں لاؤ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا اے پروردگار ! اس شہر کو امن والا بنا دے ۔ شہر سے مراد شہر مکہ ہے جسے ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے آباد کیا تھا ۔ دراصل آپ نے خانہ کعبہ کی عمارت از سرِ نو تعمیر کی اور پھر اپنی بیوی ہاجرہ اور بچے اسماعیل علیہ السلام کو وہاں چھوڑ گئے اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ وادی تھی مگر اللہ تعالیٰ کا فرمان تھا کہ اس جگہ پر عظیم الشان اور فضیلت والا شہر آباد ہو گا ، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر کے مامون ہونے کی دعا کی ۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا جس کا ذکر

قرآنِ پاک میں دوسرے مقامات پر بھی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر احسان جتلاتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے ارد گرد امن وامان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ لوگوں کو اچک لیا جاتا سوائے حرمت والے مہینوں کے کوئی آدمی سفر نہیں کر سکتا تھا۔ سال کے آٹھ مہینے تک لوگ افراتفری کے عالم میں گزارتے، پھر باقی چار ماہ میں تجارت وغیرہ اور دوسرے سفر کرتے۔ پھر اللہ نے تم پر احسان فرمایا کہ حرمِ مکہ کو بالکل پر امن بنا دیا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے شہرِ مکہ کو امن والا شہر بنا دیا۔ اس کا ذکر سورۃ والتین میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے جن چار چیزوں کی قسم اٹھائی ہے ان میں "هَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ" یہ امن والا شہر بھی شامل ہے۔

شرک سے بیزاری

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہرِ مکہ کو مامون بنانے کی دعا کی اور شرک سے پناہ بھی مانگی۔ وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ اے پروردگار مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے دور رکھ۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی تو کفر و شرک بلکہ ہر گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی معصیت میں مبتلا نہیں ہوتے تو اس صورت میں ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بت پرستی میں ملوث نہ ہونے کی دعا کا کیا مطلب ہے؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے انبیاء جس قدر بلند مرتبت ہوتے ہیں اسی قدر وہ اللہ سے زیادہ ڈرنے والے ہوتے ہیں اور اسی بنا پر وہ خدا تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے ہمیشہ عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتے رہتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی اللہ کے حضور نیاز مندی کی ایک علامت ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ بت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جو بت کسی خاص شکل و صورت پر بنایا گیا ہو اُسے صنم کہتے ہیں اور جو بغیر شکل کے ان گھڑا

ہو۔ وہ وثن کہلاتا ہے۔ عربوں میں بھی دو قسم کے بت پائے جاتے تھے۔ جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں صلیب کو بھی وثن کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب عدیؓ بن حاتم طائی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے گلے میں صلیب لٹکا رکھی تھی۔ آپ نے فرمایا اَلْقِ هٰذَا الْوَثَنَ اس بت کو اتار پھینکو۔ غرضیکہ صنم یا وثن وہ بت ہوتا ہے جس کے متعلق زعم ہو کہ یہ نفع نقصان کا مالک ہے یا کسی کی حاجت برائی اور مشکل کشائی کر سکتا ہے۔ اس قسم کے بت خانہ کعبہ میں اور اس کے اردگرد رکھے ہوئے تھے، صفا اور مروہ پہاڑیوں پر بھی بت موجود تھے اور مکے کے لوگ ان کی پرستش کرتے تھے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں یہ دعا کی کہ انہیں اور ان کی اولاد کو اصنام سے پاک رکھا جائے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دعائے ابراہیمی میں مِنْ ذُرِّيَّتِيْ کے الفاظ آئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دعا پوری نسل ابراہیمی کے لیے نہیں تھی بلکہ اس میں سے بعض کے لیے تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابوجہل وغیرہ آپ کی نسل میں آپ کی اولاد ہونے کے باوجود شرک پر اڑے رہے اور اسی پر ان کی موت آئی۔ البتہ آپ کی صلبی اولاد یعنی آپ کے براہ راست بیٹے مکمل طور پر شرک سے مبرا رہے۔ دعا کی قبولیت کا یہی مطلب ہے۔

گمراہی اور معافی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مزید عرض کیا رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یہاں پر پھر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بت تو پتھر اور مٹی کے بے جان بت ہوتے ہیں، وہ کسی کو گمراہ کیسے کر سکتے ہیں؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ وہ خود تو گمراہ نہیں کر سکتے، البتہ تَسَبَّبْنَ الْاِضْلَالَ گمراہی کا سبب

ضرور بنتے ہیں۔ انہی بتوں کی پوجا کرکے لوگ گمراہی کے گڑھے میں گرے لہٰذا اسے بتوں کی گمراہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگے یہ بھی عرض کیا، پروردگار! فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ جس نے میری پیروی کی، وہ مجھ سے ہے یعنی میری جماعت کا آدمی ہے۔ اور جو آپ کے گروہ میں شامل ہو گیا، وہ حنیف ہو گیا اور اس نے اللہ کی توحید کو تسلیم کر لیا۔ ایسا شخص کفر اور شرک سے بیزار ہو گیا۔ فرمایا وَمَنْ عَصَانِیْ اور جس نے میری نافرمانی کی فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اس مقام پہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عاجزی، نرمی اور رأفت کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ پر یہ بات خوب واضح ہے کہ کافر اور مشرک جن کا خاتمہ اسی باطل عقیدے پہ ہوا ہو، اس کی بخشش کی کوئی صورت نہیں۔ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایسا شخص کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا "حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ" حتیٰ کہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر سکتا ہے مگر مشرک جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے "اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ" (المائدہ) جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ تاہم ابراہیم علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ مولا کریم! تیرا فیصلہ تو یہی ہے کہ تو مشرک کو معاف نہیں کرے گا، مگر تو غفور اور رحیم بھی ہے۔ تیرے اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اگر تو معاف کر دے تو تو غفور اور رحیم ہے ایسا کر سکتا ہے۔

اولادِ ابراہیم رزقِ حرم کی

ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی عرض کیا رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ

مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اے پروردگار! میں نے بسایا ہے اپنی اولاد میں سے یہاں پر مِن تبعیضیہ ہے یعنی ساری اولاد نہیں بلکہ اس میں سے بعض کو آباد کیا ہے۔ آپ کے بیٹوں میں سے اسحاق علیہ السلام تو شام اور فلسطین کے علاقے میں ہی رہے۔ البتہ حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ مکرمہ کی بے آب وگیاہ زمین میں آباد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کے ہمراہ مصر پہنچے تو شاہ مصر نے حضرت ہاجرہ کو بطور خادمہ دے دیا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کر لیا تو ان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس پر آپ کی پہلی بیوی سارہ کو رشک ہوا اور اس نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو کہیں دور چھوڑ آئیں۔ چنانچہ ان حالات میں ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو اس سرزمین عرب میں آباد کیا۔ غرضیکہ جس طرح آدم علیہ السلام کا دانہ کھانے کی وجہ سے زمین پر نزول ہوا۔ اسی طرح حضرت سارہ کا رشک سرزمین مکہ کی آبادی کا سبب بن گیا۔

فرمایا میں نے بسایا ہے اپنی اولاد میں سے بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ کھیتی باڑی کے ناقابل وادی میں۔ یہ خطہ بحر احمر سے اڑتالیس میل کے فاصلے پر گرم خشک، پتھریلا اور بے آب وگیاہ علاقہ ہے جہاں پر بارش کے علاوہ سیرابی کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں پر بظاہر کشش کا کوئی سامان موجود نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے محترم گھر کے لیے اسی خطہ کو منتخب کیا۔ اب اسی بیت اللہ شریف کی کشش کا یہ عالم ہے کہ اطراف عالم سے لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں پہنچ جاتے ہیں سخت گرمی ہو یا سردی، بارش ہو رہی ہو یا آندھی چل رہی ہو، چوبیس گھنٹے میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا۔ جب کہ اس گھر کا طواف

نہ ہو رہا ہو۔ یہ عاشقانِ الٰہی کی بستی ہے، ایک دفعہ جاکر تسلی نہیں ہوتی اور ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں کی حاضری کا بار بار موقع ملتا ہے۔

نطۂ عرب بسبزہ زار

حدیث[1] میں آتا ہے کہ قیامت کے قریبی زمانہ میں تَصِيرُ اَرْضَ الْعَرَبِ مُرُوجًا وَّاَنْهَارًا عرب کی سرزمین سبزہ زار اور باغات میں تبدیل ہو جائیگی۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، مگر اب وہاں پر سبزہ اور باغات کی ابتداء ہو چکی ہے۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کے علاوہ مکہ اور مدینہ کی شاہراؤں پر بھی درخت لگائے جا رہے ہیں عرفات کے پورے میدان میں درختوں کی لمبی لمبی قطاریں اب نظر آرہی ہیں اور اس طرح حضور علیہ السلام کی پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔

سبزہ زار اور عام استعمال کے لیے میٹھے پانی کی اشد ضرورت ہے وہاں پر زیرِ زمین پانی تو موجود نہیں، قریبی سمندر کا پانی سخت کھڑوا ہے جسے صاف کرنے پر بہت زیادہ خرچ آتا ہے، لہٰذا سعودی حکومت اب قابلِ استعمال پانی کی بہم رسانی کے لیے دوسرے ذرائع تلاش کر رہی ہے اس منصوبے میں دور دراز کے دریاؤں سے پانی کی سپلائی یا پھر بحرِ منجمد سے بڑے بڑے تودوں کی ترسیل شامل ہے۔

محترم گھر

فرمایا میں نے بسایا اپنی اولاد میں سے بے آباد زمین میں عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ تیرے محترم گھر کے پاس۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اللہ نے جس دن سے زمین کو پیدا کیا ہے، اسی دن سے اس خطۂ ارض کو عزت والا مقام عطا کیا ہے۔ یہاں پر لڑائی جھگڑا قطعی حرام ہے۔ فتح مکہ کے دن اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو اجازت دی تھی کہ اگر کافر مقابلہ کریں تو ان کے خلاف ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔ وگرنہ

اس کے بعد قیامت تک کے لیے یہ سرزمین واجب الاحترام ہی رہے گی۔

فرمایا میں نے اپنی اولاد کو یہاں اسلیے آباد کیا ہے رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ اے پروردگار! تاکہ وہ نماز قائم رکھیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں اپنی اولاد کے لیے نماز جیسی اہم ترین عبادت کا ذکر کیا۔ نماز کا قیام ایک عظیم مقصد ہے جسے انبیاء علیہم السلام خود اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کو تلقین کرتے آئے ہیں۔ نماز کے بغیر انسان کا تعلق اپنے پروردگار کے ساتھ درست نہیں رہ سکتا۔ نماز کوئی پرائیویٹ معاملہ نہیں کہ جب جی چاہا ادا کر لی اور جس کے دل نے نہ مانا اس نے چھوڑ دی بلکہ یہ تو اہم ترین عبادت ہے جس کی دعا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کیلیے کی۔

دلوں کی کشش

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی عرض کیا، اے پروردگار! فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے۔ آپ نے بعض لوگوں کے لیے دعا کی جو مستجاب ہوئی اور اب دنیا کے تمام انسان تو اس سرزمین کی طرف نہیں آتے، البتہ کچھ اہل ایمان نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اللہ کے اس گھر کی زیارت کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کرتے ہیں یہاں پر تجارت بھی کرتے ہیں اور دل کی پیاس بھی بجھاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے اس بستی کے باشندوں کے لیے یہ دعا بھی کی کہ اے پروردگار! وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ ان کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ اس لیے آب و گیاہ زمین میں کہیں کہیں کھجور کے نخلستان یا ریگستان کے کسی حصہ میں تربوز تو ہو سکتا ہے عام پھلوں کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا، مگر اللہ نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ دنیا بھر کے بہترین پھل تر و تازہ حالت میں اس سرزمین میں پہنچ رہے

ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ انہیں عرفات کے میدان میں لیموں کی ضرورت محسوس ہوئی تو اللہ نے وہاں بھی مہیا کر دیا۔ ورنہ عام حالات میں وہاں لیموں بیچنے کے لیے کون جاتا ہے؟ الغرض اب مملکت سعودی عربیہ میں ہر موسم میں ہر قسم کا پھل بافراط میسر ہے۔

فرمایا ان کو پھلوں سے روزی عطا فرما لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ تاکہ یہ تیرا شکریہ ادا کریں۔ اسی سورۃ میں پہلے گزر چکا ہے لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ اگر تم شکریہ ادا کرو گے تو میں مزید عطا کروں گا مگر عام طور پر اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ "انسان بے انصاف اور ناشکر گزار ہی ہوتے ہیں کفر اور شرک سے بڑھ کر کون سی ناشکری ہو سکتی ہے۔ مگر آج بھی انسانوں کی اکثریت اس میں مبتلا ہے۔ بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے حق میں یہی دعا کی کہ وہ اپنے پروردگار کے شکر گزار بندے بن جائیں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِىۡ وَمَا نُعۡلِنُ ؕ وَمَا
يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا
فِى السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ وَهَبَ لِىۡ
عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ
لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجۡعَلۡنِىۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ
وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا
اغۡفِرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَىَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ
الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع

ع ۱۸/۷

ترجمہ :۔ اے ہمارے پروردگار! بیشک تو جانتا ہے جس چیز کو ہم چھپاتے ہیں اور جس کو ہم ظاہر کرتے ہیں اور نہیں ہے مخفی اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں ﴿۳۸﴾ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام بخشے۔ بیشک میرا پروردگار البتہ دعاؤں کو سننے والا ہے ﴿۳۹﴾ اے میرے پروردگار! بنا دے مجھے نماز قائم کرنے والا، اور میری اولاد میں سے بھی ۔ اے ہمارے پروردگار! اور ہماری دعا قبول فرما ﴿۴۰﴾ اے ہمارے پروردگار! بخش دے مجھے اور میرے والدین کو، اور مومنوں کو کہ جس دن حساب قائم ہوگا ﴿۴۱﴾

یات

گذشتہ درس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا تھی جس میں انہوں نے قریش مکہ پر ہونے والے خصوصی انعامات کا ذکر کیا تھا۔ خود مکہ مکرمہ کے حق میں آپ کی دُعا تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے پُرامن شہر بنا دے۔ پھر اپنے لیے اور اپنے متعلقین کے لیے شرک سے بچنے کی دُعا کی کیونکہ اصنام پہلے ہی بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بن چکے تھے۔ پھر عرض کیا کہ میں اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے گھر کے قریب بے آب و گیاہ سرزمین میں چھوڑ رہا ہوں تاکہ نماز قائم کریں کیونکہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس سے تعلق باللہ قائم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی دُعا کی کہ اے اللہ! لوگوں کے دلوں کو میری اولاد کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے روزی عطا کر تاکہ یہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب دل اس طرف مائل ہوں گے تو آمدورفت میں اضافہ ہو کر وسائلِ رزق میں توسیع ہو گی۔ چنانچہ آج سے تقریباً پانچہزار سال پہلے مانگی گئی دُعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ اب مکہ مکرمہ کی طرف مخلوقِ خدا کا سارا سال تانتا بندھا رہتا ہے اور موسمِ حج میں تو بے انتہا رش ہو جاتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی قبولیت کا صلہ ہے کہ اُس سرزمین میں اچھے سے اچھا پھل اور ہر چیز دستیاب ہے۔

اللہ کا علمِ محیط

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِیۡ وَمَا نُعۡلِنُ اے ہمارے پروردگار! بیشک تو جانتا ہے جس چیز کو ہم مخفی رکھتے ہیں اور جس کو ہم ظاہر کرتے ہیں۔ ارض و سما میں کوئی چیز تیری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ تو ہماری نیت، ارادے اور عزائم کو بھی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس اخلاص اور نفاق کو بھی جانتا ہے جو دلوں کی گہرائیوں میں پنہاں ہوتے ہیں اور جو لوگ ریاکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے بھی واقف ہے۔

اس دعا کے ذریعے ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حضور نہایت عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ آگے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا ذکر بھی آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی دعا میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خاص اشارہ پایا جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ اور دیگر سورتوں میں آپ کی واضح دعا بھی موجود ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ یعنی اے اللہ! ہماری اولاد میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کے چھپانے اور ظاہر کرنے میں آپ کا اشارہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے متعلق ہی تھا۔ بہر حال آگے پھر وضاحت کی وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ خدا تعالیٰ پر آسمان و زمین کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کائنات کے کسی گوشے میں موجود ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

عطائے اولاد پر شکریہ

آگے ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اس نے بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ اس خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام جیسے فرزند عطا فرمائے۔ امام بیضاویؒ کی روایت کے مطابق جب ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے ۹۹ برس کی ہوئی تو اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ یہ آپ کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ کے بطن سے تھے جو کہ شاہِ مصر نے آپ کو خادمہ کے طور پر دی تھی۔ پھر جب آپ کی عمر مبارک ۱۱۲ سال ہوئی تو پہلی بیوی حضرت سارہ کے بطن سے اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ یہ آپ کی چچازاد تھی اور اس نے آپ کے ساتھ عراق سے ہجرت بھی کی تھی۔ آپ کو ساری عمر اولاد کی خواہش رہی مگر اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور تھا کہ اس نے جوانی کے بعد

بڑھاپے میں بیٹا عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بھی خاص مہربانی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹے یعنی اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ہوئے اور پھر انہی کی نسل سے انبیاء کا سلسلہ آگے بھی چلا۔

اس ضمن میں بائیبل کی روایت قدرے مختلف ہے۔ اس کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کا پہلا بیٹا ۸۳ سال کی عمر میں اور دوسرا بیٹا سو سال کی عمر میں پیدا ہوا۔ جب کہ آپ مایوسی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ پھر اللہ نے بیٹے کے ساتھ پوتے کی بشارت بھی دی، فرمایا "وَمِن وَّرَآءِ إِسْحَٰقَ يَعْقُوبَ" (ھود) یعنی تم اپنی زندگی میں پوتے کو بھی پالو گے۔ چنانچہ آپکی زندگی میں ہی حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پیدا ہوئے، وہ بھی اللہ کے عظیم رسول تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ۱۷۵ برس عمر پائی۔ آپ نے یہ بھی کہا "إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَآءِ" بیشک میرا پروردگار البتہ دعا کو سننے والا ہے۔ اُس نے ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو شرف قبولیت بخشا "رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّٰلِحِينَ" (الصّٰفٰت) اے پروردگار! مجھے نیک اولاد عطا فرما۔ اللہ نے اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام جیسی نیک اور صالح اولاد عطا فرمائی، جس پر آپ نے پروردگار کا شکریہ ادا کیا۔

اقامت صلوٰۃ کی دعا

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے اقامت صلوٰۃ کی دعا بھی کی۔ "رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَوٰةِ" اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دے "وَمِن ذُرِّيَّتِي" اور میری اولاد میں سے بھی ایسے لوگ پیدا فرما جو نماز کو قائم کریں۔ اقامت صلوٰۃ بہت بڑی حقیقت ہے جس کے ذریعے تعلق باللہ درست ہوتا ہے۔ تو آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کے حق میں یہی دعا کی کہ ہمیں مکمل شرائط اور اخلاص کے ساتھ نماز ادا کرنے والے بنا دے۔

اگر نماز درست ہوگئی تو ہر چیز درست ہو جائیگی، اور اگر نماز ہی درست نہ ہوئی، تو نہ دین درست ہوگا اور نہ دنیا۔ انسان الحاد اور بدعملی کا شکار ہی رہے گا۔

ہمارے بزرگوں میں سے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیریؒ ایک دفعہ دیوبند سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں بارہ چودہ کوس کا سفر پیدل طے کر کے پہنچے۔ حضرت گنگوہیؒ نے آمد کا مقصد پوچھا تو عرض کیا کہ میرے حق میں دُعا کریں کہ میں نماز ٹھیک طریقے پر ادا کر سکوں میرا یہاں آنے کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اس پر حضرت گنگوہیؒ نے عجیب جملہ ارشاد فرمایا، کہنے لگے اگر نماز ٹھیک طریقے پر آگئی تو سب کچھ آگیا۔ پھر باقی کیا رہ گیا۔ فرمایا یہی بات تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ جس کام کی جڑ بنیاد صحیح ہوگئی اُس کے سارے معاملات صحیح ہو گئے۔ اللہ کے ساتھ تعلق بھی درست ہو جائے گا اور دُنیا کے سارے معاملات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ سیاست ہو یا معیشت، حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد نماز کی درستگی کے ساتھ ہی سب کچھ درست ہو جائے گا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی دُعا کی کہ مولا کریم! مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنا دے۔

ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو اس کی نماز کا صرف دسواں حصہ قبول ہوتا ہے جبکہ نو حصے ضائع ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا نواں حصہ بعض کا آٹھواں حصہ اور بعض کی نصف نماز قبول ہوتی ہے۔ جس کی آدھی نماز قبول ہو جائے تو وہ بڑی شان والا آدمی ہوتا ہے اور جس کی پوری کی پوری

نماز قبول ہوجائے وہ مقربین الٰہی میں شمار ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی قبولیت کا دارومدار اخلاص، صلاحیت اور نیکی پر ہے نماز میں جس قدر ان چیزوں کا حصہ ہوگا، اسی قدر نماز کی قبولیت بھی ہوگی۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ اے ہمارے پروردگار ہماری اس دعا کو قبول فرمالے۔ پھر آخر میں عرض کیا رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ اے ہمارے پروردگار! مجھے معاف فرمادے۔ مجھے بخش دے۔ جو کوتاہی اور لغزش ہوئی ہے اس سے درگزر فرما۔ نہ صرف مجھے معاف کردے وَلِوَالِدَیَّ بلکہ میرے والدین کو معاف فرمادے وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ اور جس دن حساب قائم ہو، تمام مومنوں کو بھی بخش دے۔ سب کی خطاؤں کو معاف فرمادینا۔

شرک کے لیے دعائے مغفرت

یہاں پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تو کفر پر تھے اور اسی پر اُن کا خاتمہ ہوا تو ایسی حالت میں ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے لیے مغفرت کی دعا کیسے کی جب کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء) وہ مشرک کو نہیں بخشے گا۔ اس کے علاوہ جسے چاہے معاف کردے۔ مفسرین کرام نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں بعض فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے باپ کے لیے دعا ابتدائی دور میں کی تھی۔ پھر جب ان کو علم ہوگیا کہ اُن کا خاتمہ کفر پر ہی ہے تو آپ نے اپنے والد سے بیزاری کا اعلان کردیا۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی باپ کے لیے دعا ایک وعدہ کی بنا پر تھی فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗۤ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنْہُ پھر جب آپ پر واضح ہوگیا کہ ان کا باپ دشمنِ خدا ہے تو آپ نے بیزاری کا اعلان کر

دیا غرضیکہ جب تک کسی کے کفر پر خاتمے کا یقین نہ ہو جائے اس کے لیے بخشش کی دُعا کی جا سکتی ہے اور دُعا کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ اے اللہ! اس کو مغفرت کا اہل بنا دے یعنی اسے توبہ کی توفیق عطا کر دے۔ ملتِ ابراہیمیہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ مومنین کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیئے خواہ وہ فاسق اور گنہگار ہی کیوں نہ ہو۔

بعض نے یہ توجیہہ بھی کی کہ جس شخص آذر کے حق میں اللہ نے مشرک ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا بلکہ چچا تھا اور آپ کے والد کا نام "تارخ" تھا۔ شیعہ حضرات کا یہ مسلک درست نہیں ہے۔ سورہ انعام میں صاف موجود ہے "وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ" جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آذر سے کہا۔ دراصل آذر اور تارخ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ چونکہ ابراہیم علیہ السلام کے والد بڑے مندر کے پروہت تھے، اس لیے ان کا لقب آذر تھا اور نام تارخ ہی تھا۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ایک نو مسلم جس کے والدین کفر و شرک پر ہوں وہ بھی "رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ" کہہ کر اپنے والدین کے حق میں دعائے مغفرت کر سکتا ہے۔ امام بیضاویؒ، صاحبِ کشاف زمخشری اور صاحبِ تفسیر حسینی نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ ایسے شخص کے والدین سے مراد اُس کے حقیقی والدین نہیں ہوں گے جن کا خاتمہ کفر اور شرک پر ہوا، بلکہ اس سے مراد اُس کے اولین والدین حضرت آدم علیہ السلام اور حوا ہوں گے لہذا اس اصول کے تحت کوئی مسلمان اپنے غیر مسلم والدین ہونے کے باوجود دعائے مغفرت کہہ سکتا ہے اور اس سے مراد اولین والدین ہوں گے نہ کہ وہ والدین جن کے گھر میں اس کی پیدائش ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی اسی اصول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے ان کی والدہ کے متعلق تو یہ تفصیلات

معلوم نہیں، تاہم ان کے والد کے کفر و شرک میں کوئی شبہ نہیں۔ تو ان کی دعائے مغفرت کی بھی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے اولین والدین حضرت آدم اور حوا کے حق میں دعا کی۔

عرض کیا، اے ہمارے پروردگار! مجھے میرے والدین اور تمام ایمان والوں کو معاف کر دے جس دن قیامت برپا ہوگی اور حساب کتاب قائم ہوگا۔ اس دعا میں ملت ابراہیمیہ کا پورا تذکرہ آگیا ہے اس کے بنیادی اصولوں اور خصوصی نعمتوں کا تذکرہ ہوگیا ہے پہلے عام نعمتوں کا ذکر تھا، پھر خصوصی انعامات کا ذکر ہوا، اور محاسبہ اعمال کی بات ہوئی۔ اب سورۃ کے آخر میں قرآن کی دعوت کو عام کرنے کا بیان ہوگا۔

درس پانزدہم ١٥ — آیت ٤٢ تا ٤٦

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬
اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ ﴿٤٢﴾
مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ
طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ ﴿٤٣﴾ وَاَنْذِرِ النَّاسَ
يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ
دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا
اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ
زَوَالٍ ۙ ﴿٤٤﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ
وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿٤٥﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ
وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ
لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿٤٦﴾

ترجمہ :۔ اور نہ خیال کرو اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہ وہ غافل ہے اُن کاموں سے جو ظالم لوگ کرتے ہیں بیشک وہ اُن کو مہلت دیتا ہے اس دن کے لیے کہ

جس دِن اُوپر اٹھی رہیں گی آنکھیں (۴۲) دوڑنے والے ہوں گے اور سر اُوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ نہیں پلٹیں گی اُن کی طرف اُن کی نگاہیں اور دِل اُن کے اڑ رہے ہوں گے (۴۳) اور آپ ڈرا دیں لوگوں کو اُس دِن سے کہ آئیگا اُن کے پاس عذاب۔ پس کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، اے ہمارے پروردگار! ہمیں مہلت دے دے تھوڑی مدت کے لیے تاکہ ہم قبول کریں تیری دعوت کو، اور ہم پیروی کریں رسولوں کی (اُدھر سے جواب آئیگا) کیا نہیں تھے تم قسمیں اٹھاتے اس سے پہلے کہ تمہارے لیے کوئی زوال نہیں ہے (۴۴) اور ٹھہرے تم ان لوگوں کے گھروں میں جنہوں نے ظلم کیا اپنی جانوں پر، اور واضح ہو گیا تمہارے لیے کہ ہم نے کیسا سلوک کیا اُن کے ساتھ، اور بیان کیں ہم نے تمہارے سامنے مثالیں (۴۵) اور تحقیق ان لوگوں نے تدبیر کی اپنی تدبیر۔ اور اللہ کے پاس تھی اُن کی تدبیر، اگرچہ، اُن کی تدبیر ایسی تھی کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں اپنی جگہ سے (۴۶)

ربطِ آیات

پہلے قرآنِ کریم کی حقانیت اور قیامت کا ذکر ہوا، پھر رسالت اور توحید کا بیان آیا۔ اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا جن میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل بنتی ہے۔ پھر اللہ نے قریشِ مکہ و عرب پر ہونے والی خاص نعمتوں کا تذکرہ کیا اور اس ضمن میں شرک اور اُن کی بدعقیدگی کا ذکر کیا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ذکر کیا جن میں توحید کی ترغیب اور شرک سے بیزاری کا سبق ملتا ہے۔ اُدھر انعاماتِ الٰہی کے حصول پر اس کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے اور

کفر و شرک سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں، لہٰذا اس سے بچنا چاہیئے۔ پھر اللہ نے قیامت کے محاسبے کا ذکر کیا اور پھر اسی ضمن میں دعائے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہوا کہ اے پروردگار! مجھے، میرے والدین اور سب مومنوں کو معاف کر دے، کل بیان کیا تھا کہ یہاں پر والدین سے مراد ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی والدین نہیں ہیں بلکہ ان کے اولین ماں باپ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا مراد ہیں۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور امام زہریؒ کی قرأت کے مطابق وَالِدَیَّ کو وَلَدَیَّ پڑھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ مولا کریم مجھے اور میرے دونوں بیٹوں کو بخش دے۔ وہ آپ کی آخری عمر کی اولاد حضرت اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام ہیں۔ اب اس قرأت میں یہ اعتراض باقی نہیں رہتا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک والدین کے لیے کیوں دعا کی۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے محاسبہ اعمال کی منزل کا ذکر کیا ہے۔

ظالموں کے لیے مہلت

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اللہ تعالیٰ کو اُن کاموں سے غافل نہ سمجھو جو ظالم لوگ کرتے ہیں۔ ظالم لوگ کون ہیں؟ اس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ" بیشک اکثر انسان ظالم اور ناشکر گزار ہیں، جو منعم حقیقی اور مالک حقیقی کی توحید میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ ان کافر، مشرک اور معاصی کے مرتکب لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی کارگزاری سے غافل ہے، بلکہ وہ علیم کل ہے اور سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا ہے۔ البتہ اس کا قانون یہ ہے اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ وہ ان کو مہلت دیتا ہے اس دن کے لیے جب آنکھیں پتھرا جائیں گی یعنی اُوپر اٹھی رہیں گی۔ وہ سرکشوں کو فوری طور پر گرفت نہیں کرتا۔ یہ مضمون سورۃ اعراف میں بھی گزر چکا ہے کہ جو لوگ

ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں "سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ"
ہم انہیں بتدریج ایسے طریقے سے پکڑیں گے جہاں سے انہیں علم ہی نہ ہوگا۔
"وَأُمْلِي لَهُمْ" میں انہیں مہلت دیتا ہوں "إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ"
میری تدبیر بڑی مضبوط ہے لوگ قدرت کے قانونِ امہال و تدریج سے
فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور گرفت کے مؤخر ہونے کی وجہ سے مغرور ہو
جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں۔
فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں اس دن تک کے لیے مہلت دیتا ہے جب
اُن کی آنکھیں پھٹرا جائیں گی اور "مُهْطِعِينَ" وہ دوڑنے والے ہونگے
"مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ" اپنے سروں کو اوپر اٹھائے ہوں گے۔ اس حالت
میں "لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ" ان کی نگاہیں اُن کی طرف واپس
نہیں پلٹیں گی یعنی اوپر ہی لگی رہیں گی اور نیچے کی طرف آ ہی نہیں سکیں گی،
اتنی تکلیف دہ حالت ہوگی۔ اس کے علاوہ "وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ" ۔
دہشت کے مارے اُن کے دل اڑے جا رہے ہوں گے۔ یہ قیامت
والے دن کے مناظر ہیں۔ سورۃ فرقان میں ہے "وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ
بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنزِيلًا" اُس دن آسمان پھٹ
جائے گا اور فرشتے نیچے اترتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سورۃ النبا میں "وَ
فُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا" اُس دن آسمان کو کھول دیا جائیگا
اور اس میں دروازے بن جائیں گے۔ جہاں تک قیامت
کے دن لوگوں کے دوڑنے کا ذکر ہے تو سورۃ القمر میں ہے "مُّهْطِعِينَ
إِلَى الدَّاعِ" بلانے والے کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے۔ سورۃ
المعارج میں ہے "يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا"
اس دن قبروں سے نکل کر تیزی کے ساتھ دوڑیں گے "كَأَنَّهُمْ
إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ" گویا کہ وہ شکار کے جال کی طرف دوڑتے

ہیں۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ ظالموں کو اسی دن کے لیے مؤخر کیا گیا ہے، یعنی اس وقت تک مہلت دیدی گئی ہے۔

دنیا میں واپسی کی خواہش

آگے اللہ نے حکم دیا وَأَنذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ لوگوں کو اس دن سے ڈرا دیں کہ جس دن ان کے پاس عذاب آجائے گا۔ اُس وقت یہ لوگ حیلے بہانے کریں گے مگر وہ کچھ مفید نہیں ہوں گے۔ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا پھر کہیں گے ظالم لوگ رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی دیر کیلئے مہلت دے کر دنیا میں واپس بھیج دے نُّجِبْ دَعْوَتَكَ اب ہم تیری دعوت کو قبول کر لیں گے وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اور رسولوں کا اتباع کریں گے۔ سورۃ المنافقون میں ہے کہ جب کسی کو موت سامنے نظر آجاتی ہے "فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ" "پھر وہ کہتا ہے کہ پروردگار! مجھے تھوڑی دیر کے لیے مہلت دے دے فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ" اب میں صدقہ خیرات اور نیکی کے کام کروں گا اور نیکوکاروں میں ہو جاؤں گا۔ مگر ادھر سے جواب آتا ہے وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا جب وقت آجاتا ہے تو پھر ایک سیکنڈ کی مہلت بھی نہیں دی جاتی اور فوری طور پر کام تمام کر دیا جاتا ہے۔

جہاں تک دعوت قبول کرنے کا تعلق ہے تو وہی دعوتِ ایمان ہے جو اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعے اپنے بندوں کو بھیجی۔ جب یہ دعوت اس کے بندوں کو پہنچتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں "رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا" (آل عمران) ہم نے ایمان کی دعوت سننے والے منادی کنندہ کو سن لیا اور اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بجائے ظالم لوگ کہیں گے کہ دنیا

میں ہم تیری دعوت کو قبول نہ کر سکے۔ اب ہمیں ایک اور موقع دے کر دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ تیری دعوت کو قبول کر لیں اور تیرے رسولوں کی پیروی کر لیں۔ اللہ نے بعض دوسرے مقامات پر بھی قیامت کے دن پیش آنے والے ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ الم سجدہ میں ہے کہ مجرم لوگ سر جھکائے اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے اور عرض کریں گے رَبَّنَآ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا "اے اللہ ہم نے سب کچھ دیکھ لیا اور سن لیا۔ اب ہمیں واپس بھیج دے، ہم نیک اعمال انجام دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا جواب

ادھر سے اللہ تعالیٰ کا جواب آئے گا اَوَلَمۡ تَكُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ کیا تم نے اس سے پہلے دنیا میں قسمیں نہیں اٹھائی تھیں مَا لَكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ کہ تمہیں کبھی زوال نہیں آئے گا۔ دنیا میں تم غرور میں مبتلا تھے اور کہتے تھے کہ ہم اسی طرح شان و شوکت کے ساتھ ہی رہیں گے، ہمارے اقتدار کو کبھی زوال نہیں آسکتا" وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ" ہمیں کون سزا دیگا۔ سورۃ النحل میں اللہ نے فرمایا" وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ۙ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ" اللہ کی پختہ قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ مرنے والے کو اللہ دوبارہ نہیں اٹھائیگا اللہ فرمائے گا کیا تم وہی لوگ نہیں جو دنیا کی زندگی پر مغرور و مفتون تھے۔ اور پھر جن لوگوں نے زبانی قسمیں نہیں اٹھائی تھیں، ان کی حالت تبلا رہی تھی گویا کہ وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مزید یہ بھی فرمائے گا کہ تم وہی لوگ ہو۔ وَسَكَنۡتُمۡ فِىۡ مَسٰكِنِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جو اُن لوگوں کی رہائش گاہوں میں ٹھہرے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تم نے قوم عاد اور ثمود جیسی بڑی بڑی قوموں کی عالیشان عمارات میں رہائش

اختیار کی۔ وَتَبَیَّنَ لَکُمْ اور تمہیں واضح ہو چکا تھا کَیْفَ فَعَلْنَا بِھِمْ کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ سابقہ اقوام کے انجام سے تمہیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ قوم عاد، ثمود، قوم لوط، قوم صالح اور قوم فرعون کے ساتھ ہم نے کیا معاملہ کیا۔ یہ لوگ بڑی بڑی تہذیبوں کے وارث تھے، بڑے کاریگر اور انجنیئر تھے مگر جب ہماری گرفت آئی تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔ آج تم انہیں کے بنائے ہوئے عالیشان محلات میں رہ کر بھی ان سے عبرت نہیں پکڑتے فرمایا وَضَرَبْنَا لَکُمُ الْاَمْثَالَ ہم نے تمہارے سامنے ان لوگوں کو بطور مثال پیش کر دیا ہے۔ یہ نافرمان قومیں تھیں جنہیں اللہ نے نیست و نابود کر دیا ہے۔ پھر تم کس بات پر مغرور ہو۔ اگر تم بھی نافرمانی اور ظلم سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہو سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرما دی۔

کفار کی مخفی تدبیریں

فرمایا وَقَدْ مَکَرُوْا مَکْرَھُمْ انہوں نے مخفی تدبیریں کر کے دیکھ لیا وَعِنْدَ اللّٰہِ مَکْرُھُمْ اور ان کی تدبیریں تو اللہ کے پاس تھیں وہ جو کچھ بھی مخفی طور پر تدبیر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ پنجابی زبان میں مکر کا معنی فریب اور دھوکہ ہوتا ہے جب کہ عربی زبان میں یہ لفظ پوشیدہ تدبیر کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا ”وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ“ وہ بھی مخفی تدبیر اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ایسی ہی تدبیر کرتا ہے۔ ظالموں کی یہ مخفی تدبیریں اللہ کے انبیاء کی مخالفت میں اور قرآن پاک کے پروگرام کو ناکام بنانے کے لیے ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں اور آج بھی دنیا میں ہو رہی ہیں۔ غیر مسلم اقوام نہیں چاہتیں کہ دنیا میں اللہ کا دین اور قرآن کا پروگرام غالب آئے۔ پرانی اقوام میں سے فرعون، نمرود، اہل تبوک اور اہل حجر نے کیا کیا تدبیریں اختیار کیں؟ یمن کے باشندوں اور مصریوں نے اللہ

کے دین کے خلاف کیسے کیسے پروگرام بنائے، جسمانی اور ذہنی تکالیف پہنچائیں اور لوگوں کو دین کے راستے سے روکنے کے لیے بڑے بڑے لالچ دیے اور مال صرف کیا۔

آج بھی دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ یہود، نصاریٰ، ہنود، دہریے، قرآن پاک کے خلاف طرح طرح کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔ کہیں ہسپتال کھول کر لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے اور کہیں سکول و کالج جاری کر کے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ عورتوں اور ایڈ کی پیش کش کر کے اہل ایمان کو دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیا یہ بہت بڑا سانحہ نہیں کہ پاکستان بننے کے بعد اس سرزمین میں تیس چالیس لاکھ لوگوں کو عیسائی بنایا گیا ہے۔ یہ سب اُن کی مخفی تدابیر کا نتیجہ ہے مگر مسلمان اس سے بالکل غافل پڑے ہیں اور اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لے رہے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے مغربی ممالک میں مستشرقین کے نام پر اڈے قائم کر رکھے ہیں جہاں مغربی باشندوں کو مشرقی علوم کی تربیت دی جاتی ہے ان کی یونیورسٹیوں میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے، انہیں ڈگریاں دی جاتی ہیں اور پھر انہی سے اسلام کے خلاف کتابیں اور مضامین لکھائے جاتے ہیں تاکہ لوگ دینِ اسلام سے محروم ہو جائیں اُن کا مقصد یہ ہے کہ لوگ دین کا فتویٰ علمائے حقہ سے لینے کی بجائے یہودی اور عیسائی ماہرین علوم شرقیہ کی طرف رجوع کرنے لگیں اور اس طرح اسلام کا پروگرام تہ و بالا ہو جائے۔

مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج ہندو، عیسائی اور یہودی تو اپنے مذہب پر کاربند ہیں مگر مسلمان اپنے سچے دین سے غافل ہیں ہندوؤں نے اپنے مبلغ مغربی ممالک میں بھیج رکھے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے امریکن ہندو مت قبول کر چکے ہیں۔ مگر مسلمان اپنے حال میں مست

ہیں۔ انہیں اپنے دین کی کوئی فکر نہیں۔ اگر تبلیغ کے نام پر کوئی بیرون ملک جاتا ہے تو وہ انہی کے رنگ میں رنگ کر رہ جاتا ہے، اور اپنی بات کو بھول جاتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف پانے والے مسلمان کتنے ہیں جو اپنا ایمان سلامت لے کر واپس آتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس وسائل موجود ہیں مگر صلاحیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج ساری دنیا میں انحطاط کا شکار ہیں۔ یہ سب کافروں کی باریک تدبیروں کا نتیجہ ہے۔

فرمایا ان کفار کی تدبیریں اتنی بڑی بڑی تھیں وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ کہ ان کی وجہ سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی بقاء کی خاطر انہیں ناکام کیا۔ پہاڑوں کو سرکا دینے والی محض تدابیر بھی کارگر نہ ہو سکیں۔ انگریزوں نے قرآن پاک کے متن میں تغیر و تبدل کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے۔ انہیں بعد میں پتہ چلا کہ قرآن ایک معجزہ ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں مسلمانوں کی ایک ارب کی آبادی میں کم و بیش ایک کروڑ حافظِ قرآن موجود ہیں۔ اگرچہ مسلمان قومی اور اخلاقی لحاظ سے تنزل کا شکار ہیں مگر پھر بھی قرآن کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ حضور نے فرمایا تھا کہ یہ تو وہ کتاب ہے جس کو نہ پانی دھو سکتا ہے اور نہ آگ جلا سکتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ آج ساری دنیا میں انجیل کا ایک بھی حافظ موجود نہیں مگر قرآن کے حافظ آپ کو چپے چپے میں ملیں گے، لہٰذا اغیار کی مخفی تدبیریں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ
وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى
الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾
سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ
النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

ترجمہ :- آپ نہ خیال کریں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہ وہ وعدے کی خلاف ورزی کرے گا جو اپنے رسولوں کے ساتھ کیا ہے ۔ بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے اور انتقام لینے والا ہے ﴿۴۷﴾ جس دن تبدیل کی جائے گی زمین اس زمین کے علاوہ دوسری زمین کے ساتھ اور (اسی طرح تبدیل کیے جائیں گے) آسمان (دوسرے آسمانوں کے ساتھ) اور لوگ ظاہر ہوں گے اللہ کے سامنے جو اکیلا اور زبردست ہے ﴿۴۸﴾ اور دیکھے گا تو مجرموں کو اُس دن کہ جکڑے ہوئے ہوں گے زنجیروں میں ﴿۴۹﴾ اُن کے کرتے گندھک کے مادے سے ہوں گے اور ڈھانپے گی اُن کے چہروں کو آگ ﴿۵۰﴾ تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ہر نفس کو جو اُس نے کمایا ۔ بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۵۱﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں کافروں کی مکاری اور چالبازی کا ذکر تھا کہ حق کے مقابلے میں وہ کس قسم کی تدبیریں اختیار کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نافرمان مشرکوں اور کافروں کی بری حالت کا ذکر کیا کہ کس طرح وہ قیامت والے دن ذلیل وخوار ہوں گے۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو تسلی دی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے کہ اگر دنیا میں کفار کو مہلت ملتی رہتی ہے۔ وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں تو اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے اور نہ بددل ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حالات کا ذکر کیا ہے جو ان بدبختوں کو آخرت میں پیش آنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ

ارشاد ہوتا ہے فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ آپ یہ نہ گمان کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں سے کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ اور اس کا وعدہ یہ ہے کہ وہ اپنے انبیاء کے مشن کو ضرور غالب کرے گا اور دین حق کے مخالفین بالآخر مغلوب ہوں گے۔ سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ مجھے اور میرے رسولوں کو ضرور غلبہ حاصل ہوگا۔ یعنی دنیا میں انہی کے مشن کو کامیابی حاصل ہوگی اللہ تعالیٰ صحیح بات کو غالب کرتا ہے چاہے بظاہر کتنی ہی کمزوری نظر آئے اور کتنی ہی آزمائشوں سے گزرنا پڑے۔ سورۃ المؤمن میں بھی اللہ کا فرمان ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ بیشک ہم اپنے رسولوں اور اہل ایمان کی ضرور مدد کرتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور اس دن بھی مدد کریں گے جس دن گواہ کھڑے ہوں گے یعنی جو قیامت کا دن ہوگا۔ بہرحال اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں کے مشن کو ضرور غالب کرے گا۔ لہٰذا کافروں کی

ظاہری حالت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے اور یہ کبھی گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ بیشک اللہ تعالیٰ کمالِ قدرت کا مالک اور غالب ہے وہ ذُوانْتِقَامٍ یعنی انتقام لینے والا بھی ہے وہ مہلت دیتا ہے، مگر مجرموں کو چھوڑتا نہیں۔ وہ ان سے ضرور انتقام لے گا کیونکہ وہ حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر دنیا میں پوری زندگی بھی ان کی گرفت نہ ہو تو آخرت میں تو ضرور ہی پکڑے جائیں گے اور انہیں اپنے اعمال کی سزا بھگتنا ہوگی۔

زمین و آسمان کی تبدیلی

فرمایا یہ مجرم خدا تعالیٰ کے انتقام کا کب شکار ہوں گے یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ جس دن تبدیل کر دی جائے گی زمین دوسری زمین کے ساتھ وَالسَّمٰوٰتُ اور یہ آسمان بھی تبدیل کر دیے جائیں گے، گویا قیامت کے دن یہ زمین و آسمان نہیں ہوں گے بلکہ ان کی جگہ دوسرے لائے جائیں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آسمان اور زمین کی یہ تبدیلی دو صورتوں میں ہوگی، یعنی ان کی صفت بھی تبدیل کر دی جائے گی اور حقیقت بھی۔ صفت کی تبدیلی کے متعلق سورۃ الانشقاق میں آتا ہے "وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ" اور زمین کو اس طرح پھیلا دیا جائے گا جیسے کھال کو کھینچا جاتا ہے اور اس کی تمام سلوٹیں نکل جاتی ہیں۔ اسی طرح جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا تو اس پر نہ کوئی غار رہیگا اور نہ پہاڑ بلکہ سب ہموار ہو جائیں گے یہ تو صفت کی تبدیلی ہوگی۔ اور حقیقت کی تبدیلی اس طرح ہو گی کہ پہلے صور پھونکے جانے پر تو اس کی اونچ نیچ ختم ہو جائیگی اور جب دوسرا صور پھونکا جائے گا اور حساب کتاب کی منزل آئے گی تو اس زمین کی جگہ بالکل دوسری زمین لائی جائے گی اور محاسبہ اعمال کی ساری کاروائی اسی نئی زمین پر کی جائیگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ نئی زمین میدے

یا چاندی کی طرح سفید ہو گی۔ یہ زمین کی حقیقت کی تبدیلی ہو گی۔ جس موجودہ زمین پہ انسان گناہ کا ارتکاب کیا کرتے تھے، اس کو یکسر بدل دیا جائے گا۔ البتہ محاسبہ اعمال کے وقت اللہ تعالیٰ اس زمین کے جس خطے کو چاہیگا گواہی کے لیے حاضر کر دیگا۔ صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا، حضور! جب یہ زمین تبدیل کی جائیگی تو اس وقت انسان کہاں ہوں گے تو آپ نے فرمایا علی الصراط حیدون الجسی اس وقت سارے لوگ پلصراط کے ایک تاریک کنارے پہ کھڑے ہوں گے۔ اسی طرح موجودہ آسمان بھی تبدیل کر دیے جائیں گے، نہ یہ آسمان باقی رہیں گے اور نہ یہ کرسے، بلکہ یہ سارا نظام ہی تبدیل کر دیا جائے گا۔ موجودہ تمام چیزیں درہم برہم ہو جائیں گی۔

اللہ کے حضور پیشی

فرمایا جب زمین و آسمان تبدیل ہو جائیں گے تو اس وقت وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ تمام لوگ اس اللہ تعالیٰ کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے جو اکیلا بھی ہے۔ اور قہار بھی یعنی زبردست طاقت کا مالک ہے فرمایا اس وقت حق کے منکرین، توحید کو مٹانے والے، کفر و شرک کے پروگرام کو غالب بنانے، شرکیہ رسوم قائم کرنے والے اور انبیاء کی بات کو ٹھکرانے والے لوگوں کا حال یہ ہو گا وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ تو اس دن ان مجرموں کو دیکھے گا مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ سورۃ الحاقہ میں ہے "ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا" ستر گز لمبی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے جنہیں فرشتے گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ سورۃ یٰس میں ہے "فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا" ان کے گلے میں طوق پڑے ہوں گے۔ وہ اس وقت اس قدر ذلیل و رسوا ہوں گے۔ یہی محاسبے اور انتقام کی منزل ہو گی۔

فرمایا سَرَابِیْلُھُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ اُن کے کُرتے گندھک آمیز مادے سے بنائے گئے ہوں گے۔ اُن کی قمیضوں کا خام مال تارکول، گندا بروزہ یا گندھک وغیرہ کا ہوگا جو فوراً آگ پکڑ لے گا۔ عربی میں قطران اُس مرکب وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو اونٹوں کی خارش زدہ جگہوں پر لگایا جاتا ہے تاکہ متاثرہ جگہ سے زہریلا مادہ گل سڑ جانے اور جسم میں تندرست گوشت آنے لگے۔ بہرحال اس دن مجرمین کے کپڑے اس قسم کے ہوں گے جو خود آگ کو دعوت دیں گے اور فوراً بھڑک اٹھیں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اُس نوحہ کرنے والی عورت کو بھی گندھک کا کُرتہ پہنایا جائے گا اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِھَا جو مرنے سے پہلے اس قبیح فعل سے توبہ نہیں کر لیتی۔

اس قسم کے بارود آمیز کپڑوں کا نتیجہ یہ ہوگا وَتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ آگ اُن کے چہروں کو ڈھانپ لے گی۔ چہرہ چونکہ جسم کا افضل عضو ہے اس لیے اس کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے، وگرنہ تو سارا جسم ہی بھڑک اٹھے گا۔ دوسری جگہ دل کا ذکر آتا ہے کہ دوزخ کی آگ سب سے پہلے دل پر اثر انداز ہوگی اور ظاہری اعضا میں سے اس کا پہلا شکار چہرہ ہوگا۔ اور یہ اس لیے لِیَجْزِیَ اللّٰہُ کُلَّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ تاکہ اللہ تعالیٰ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ چونکہ مجرمین نے دنیا میں کفر، شرک، الحاد، انکارِ معاد، انکارِ توحید، انبیاء کی مخالفت اور کفر کے پیروکاروں کی حمایت جیسے اعمال کمائے، لہٰذا ان اعمال کا بدلہ انہیں دوزخ کی آگ کی صورت میں ہی ملے گا اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے اگر وہ دنیا میں چند دن مہلت بھی دے دے تو ہو سکتا ہے مگر بالآخر وہ پکڑ لے گا اور ایک ایک عمل کا حساب لے گا کیونکہ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایمان والوں کو تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں، اپنا کام کرتے جاؤ کیونکہ ہمیشہ فتح حق کی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا

میں کافروں کو مہلت مل جائے مگر آگئے وہ دن یقیناً آنے والا ہے جس دن مجرموں کا یہ حال ہوگا جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے وہ لوگ آتشین لباس میں ملبوس ہوں گے جو فوراً آگ پکڑ لے گا اور ان کا چہرہ فوراً جھلس جائے گا۔ یہ اُن کے کئے کا بدلہ ہوگا۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا
ع ۱۱/۱۹ اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع

ترجمہ:- یہ پیغام ہے لوگوں کے لیے تاکہ اِن کو ڈرایا جائے اس کے ساتھ اور تاکہ وہ جان لیں کہ بیشک وہ ایک ہی معبود ہے اور تاکہ نصیحت حاصل کریں عقلمند لوگ ﴿۵۲﴾

ماحصہ مضامین

یہ سورۃ ابراہیم کی آخری آیت ہے۔ مکی سورۃ ہونے کی بناء پر اس میں بھی زیادہ تر اسلام کے چار بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ پہلی بات قرآن کی صداقت و حقانیت اور اس کا وحی الٰہی ہونا ہے۔ اس سورۃ میں قرآن پاک کی ضرورت اور اس پر اعتراض کرنے والوں کا خاص طور پر رّد کیا گیا ہے۔ اس کی غرض و غایت اس کے ابتدائی حصے میں ہی بیان کی گئی ہے "لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" کہ آپ اس قرآن کے ذریعے لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور بداعمالی سب اندھیرے ہیں جن کی وجہ سے انسان کی روح اور عقل تاریک ہو جاتی ہے اور انسان بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں اس کے برخلاف ایمان، توحید، اخلاص اور نیکی روشنی ہے۔ جس کی دعوت یہ قرآن حکیم دیتا ہے۔

اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ معاد بھی اس سورۃ میں بیان ہوا ہے۔ قیامت پر ایمان، اس کا وقوع۔ بعث بعد الموت اور جزائے عمل اس عقیدہ کی جزئیات ہیں۔ اس سورۃ میں ان موضوعات پر بھی بحث کی گئی ہے اور معترضین کے اعتراضات

کے شافی جوابات دیے گئے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا بنیادی عقیدہ رسالت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں بعض انبیاء کے تذکرہ میں اُن کی اقوام کی نافرمانی اور پھر اُن پر آنے والے عذاب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخر میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔

اسلام کا چوتھا اور اہم ترین بنیادی عقیدہ توحید پر ایمان ہے توحید تمام مسائل کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعے یہ مسئلہ سمجھایا ہے۔ پھر ابراہیم کی دعاؤں کا ذکر ہے جن میں ملت حنیفیہ کے اصول ہیں اور آخر میں اللہ نے محاسبہ اعمال کا ذکر کیا ہے، یہ تمام باتیں بنیادی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ نے بدنی اور مالی دونوں قسم کی عبادات کا ذکر بھی اس سورۃ مبارکہ میں کیا ہے "قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ" بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں مذکورہ چار بنیادی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اکثر سورتوں کے آخر میں ان کا خلاصہ بیان ہوتا ہے اب اس سورۃ کے آخر میں بھی اللہ نے خلاصے کے طور پر چار باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔

پیغام نذار بھی[1]

ارشاد ہوتا ہے ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ یہ پیغام ہے لوگوں کے لیے اس سے مراد اس سورۃ مبارکہ کے مندرجات بھی ہو سکتے ہیں، اور پورا قرآن پاک بھی ہو سکتا ہے یعنی جو کچھ اس سورۃ یعنی پورے قرآن حکیم میں ہے وہ لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پیغام ہے مفسرین کرام بلاغ کے دو معانی بیان کرتے ہیں۔ پہلا معنی تو کفایت ہے اور مطلب یہ ہے کہ سورۃ مبارکہ یا قرآن پاک میں جو کچھ بھی ہے، وہ انسان کی نصیحت حاصل کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے کافی ہے، اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور دوسرا

معنی اجیسا کہ میں نے ترجمے میں عرض کیا پیغام ہے تمام لوگوں کے لیے ظاہر ہے کہ اگر یہ پیغام ہے تو پھر اس کو پہنچانے والے بھی ہونے چاہیئں تاکہ اس کی تعلیمات تمام متعلقین تک پہنچ سکیں۔ قرآن پاک اللہ نے اپنے نبی پر براہ راست نازل فرمایا اور پھر اہل ایمان کو پابند کیا ہے کہ وہ اس پیغام کو آگے پہنچائیں۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان خود اس پر عمل پیرا ہو، اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو، اس کی صحت پر یقین ہو کیونکہ خود قرآن پاک کا بیان ہے کہ اس کلام الٰہی پر یقین نہیں رکھوگے "فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ" (المرسلات) تو پھر اس کے بعد کون سی چیز آنیوالی ہے جس پر ایمان لاؤگے۔ غرضیکہ انسان کو یقین ہو جائے کہ یہ اللہ کا آخری اور جامع کلام ہے اور حدیث رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی شرح ہے اس کا متن وحی جلی ہے اور اس کی تشریح وحی خفی ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ بھی فرماتے ہیں کہ "تمام احادیثِ صحیحہ قرآن کی شرح ہیں"، اور یہی بات شاہ ولی اللہؒ امام شافعیؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھی ہے۔ الغرض! اس یقین ایمان اور عمل کے ساتھ اگر اس پیغام کو پہنچانا ہی اپنی ذمہ داری کی تکمیل ہے۔

تو میں نے عرض کیا کہ بلاغ کا لفظ عام ہے اور اس پیغام کو لے جانے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات پر یقین ہو کہ یہی پروگرام صحیح ہے چنانچہ سورۃ البقرہ کی ابتداء میں ہے "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" یہ وہ کتاب ہے جو شک و شبہ سے پاک ہے۔ پھر اس کی تعلیمات اور پروگرام پر عمل پیرا ہونے والوں کے متعلق فرمایا "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" یہی لوگ ہیں کہ جن کو فلاح نصیب ہوگی، اور جو قوم قرآن پاک کے پروگرام کو قبول نہیں کرے گی۔ وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔ اگر اس کتاب کے پیروکار اس پر عمل کرتے ہوئے بلا شک و تردد کے اسے آگے لے جائیں گے، تو اس کا یقیناً اثر ہوگا۔ اور اگر اس کی تعلیمات کا علم ہی نہ ہو یا اس پر

یقین ہی نہ ہو، اس کی شرح اور اپنے اعمال سے ناواقفیت ہو اور اس کے عقائد اور فکر کا علم نہ ہو، تو یہ قرآن موثر نہیں ہو سکتا، بلاغ کے لفظ سے یہ ساری بات سمجھ میں آتی ہے۔ اور اگر قرآن کے ماننے والوں کے پاس کوئی سلطنت اور ملک ہی نہ ہو جہاں اس کے پروگرام کو عملی طور پر نافذ کر سکیں تو وہ اس کی دعوت دوسروں کو کیسے دے سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس کی حقانیت کو جبھی سمجھیں گے جب کہ وہ دنیا کے کسی خطے میں اس پر عمل ہوتا اور اس کے متبعین کو فیض یاب ہوتا دیکھیں گے

امیر شکیب ارسلان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب میں روس گیا تو میں نے سٹالن اور اس کے حواریوں کے سامنے اسلام کی حقانیت پر تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی بڑا اچھا پروگرام ہے مگر یہ بتائیں کہ اس پروگرام پر عمل کہاں ہو رہا ہے اور اس کے ثمرات کیا مرتب ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کیونکہ دنیا کی پچاس سے زیادہ مسلم ریاستوں میں سے کسی ایک میں بھی اسلام کے پروگرام پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ اسلام کی ترویج کے لیے اور اس کی تبلیغ کے لیے انفرادی طور پر تو کوشش ہو رہی ہے اور یہ بھی مبارک بات ہے کہ تبلیغی جماعتوں کے گشت دنیا بھر میں ہو رہے ہیں مگر یہ اجتماعی فریضہ کہاں ادا ہو رہا ہے وہ کون سا ملک ہے جس نے قرآنی پروگرام کو اپنے ملک میں نافذ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حدود و تعزیر کے قوانین نازل فرمائے ہیں مگر کہاں ہیں وہ لوگ جو ان کو اپنے سینوں، معاشرے اور ملک میں جگہ دیں، جب یہ بات نہیں ہے تو ہم ابلاغ کا فریضہ ادا نہیں کر رہے ہیں اور قرآن کے پیغام حق ہونے کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اسلام میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اخلاقی تعلیم اور تعزیرات، اگر کوئی اخلاقی تعلیمات سے

مستفید نہیں ہوتا اور قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پھر اس کے لیے تعزیرات کا نظام ہے تاکہ معاشرے میں فساد برپا نہ ہو، مگر تعزیرات کا نظام اجتماعیت اور حکومت کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ اور جو حکومتیں اس وقت موجود بھی ہیں ان کے کارپردازان بھی اسلامی تعزیرات نافذ کرنے کی بجائے من مانی کاروائیاں کر رہے ہیں۔ کافروں کی شاگردی اختیار کرتے ہیں۔ ان سے سکیمیں بنواتے ہیں اور پھر انہی کے مطابق دولت خرچ کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نہ تو قرآنی پروگرام پر عمل ہوتا ہے اور نہ اس کے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ مسلمان خود اپنی عقل کو استعمال کرتے، سلف صالحین کی طرح ہر کام کے خود بانی مبانی بنتے، دوسروں سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے خود دنیا کے استاد بنتے تو انہیں عزت کا مقام حاصل ہوتا، مگر انہوں نے قرآن کریم کے پروگرام کو نہ خود سمجھا ہے اور نہ اس پر عمل کیا ہے حالانکہ یہ تمام لوگوں کے لیے پیغام ہے اور اس کی تبلیغ کا کام خود اس کے پیروکاروں کو آگے بڑھ کر کرنا چاہیئے تھا۔

(۱۴) انذار بذریعہ قرآن

بہر حال اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے متعلق پہلی بات تو یہ فرمائی کہ یہ لوگوں کے لیے پیغام ہے اور دوسری بات یہ وَلِيُنذَرُوا بِهِ تاکہ اس کے ساتھ ڈرایا جائے، لوگوں کو خبردار کیا جائے۔ منذر انبیاء کی صفت ہے اور لوگوں کو محاسبہ عمل اور برے انجام سے خبردار کرنا ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس وقت جب کہ دنیا فسق و فجور سے بھری پڑی ہے، انذار کی زیادہ ضرورت ہے۔ لوگوں کو خبردار کرنا چاہیئے کہ اگر قرآن پاک میں مذکورہ اصولوں کو تسلیم نہیں کریں گے تو انجام بہت برا ہوگا۔ انذار ایک عظیم مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو بھی فرمایا "قُمْ فَأَنذِرْ" (المدثر) آپ اٹھیں اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے خبردار کر دیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ دنیا کی پانچ ارب آبادی میں سے سوا چار ارب کفر، شرک اور معاصی میں مبتلا ہیں، لہٰذا قرآن کے پیروکاروں کا فرض ہے کہ وہ اس پروگرام کو لے کر اٹھیں اور لوگوں کو اُن کے بُرے انجام سے خبردار کریں اور ڈرائیں۔

(۳) دعوتِ توحید

سورۃ ہٰذا کی آخری آیت میں اللہ نے تیسری بات یہ بیان کی ہے۔ وَلِيَعْلَمُوٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تاکہ وہ جان لیں کہ بیشک وہ ایک ہی معبود ہے۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی پہچان نہایت ہی ضروری ہے یہ پورے دین کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام میں توحید کے بیشمار عقلی اور نقلی دلائل پیش کر کے توحید کی بات سمجھائی ہے امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یاد رکھو! انسان کی سعادت دو باتوں میں ہے ایک انسان کی فکری قوت پاک ہو اور دوسرا اس کی عملی قوت کمال درجے کی ہو۔ اگر انسان کو فکری یا نظری قوت میں کمال حاصل ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو صحیح طور پر پہچان لیا ہے اور یہی چیز انسان کے عروج اور سعادت کی انتہا ہے۔ اور یہی چیز قرآن پاک پیش کرتا ہے۔

جہاں تک انسان کی قوتِ عملی کا تعلق ہے تو یہ بھی کمال درجے کی ہو تاکہ وہ بدنی اور مالی عبادت انجام دے سکے، اور ان دونوں چیزوں کا تذکرہ اس سورۃ مبارکہ میں ہو چکا ہے لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ وہ نماز قائم کریں کہ یہ بدنی عبادت ہے اور ہمارے دیے ہوئے مال میں سے انفاق فی سبیل اللہ کر کے مالی عبادت کا حق بھی ادا کریں۔ بہرحال اس آیت کریمہ میں تیسری بات یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کو پہچاننا ہی سعادت ہے جس کو یہ چیز حاصل نہیں، وہ سعادت مند نہیں بلکہ شقی اور بدبخت ہے۔

(۴) نصیحت برائے اہل عقل

چوتھی چیز کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے وَلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ تاکہ عقلمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔ یہ بھی قوت عملی کا کمال ہے کہ لوگ اچھی بات سے نصیحت حاصل کریں اور تمام عبادات منجملہ بدنی اور مالی، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تبلیغ، اور جہاد وغیرہ انجام دیں اور یہی چیز قرآن پاک انسانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کہ انسانوں کی قوت فکری اور عملی دونوں درست ہوں تاکہ وہ اللہ کی وحدانیت کو پہچان سکیں۔ یہ چاروں باتیں ہوگئیں۔

خلاصہ کلام

اب آپ اس سورۃ مبارکہ کے تمام مضامین پر نظر ڈالیں گے تو خلاصہ یہی نکلے گا جو اس آخری آیت کریمہ میں ذکر کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ کا آخری پیغام ہے، اس کے ذریعے لوگوں کو ان کے برے انجام سے خبردار کر دیا جائے کہ آگے محاسبے کی منزل آنے والی ہے۔ نیز یہ بھی کہ لوگ اللہ کی وحدانیت پر یقین کر لیں کہ معبود برحق ایک ہی ہے۔ جب وہ قرآنی دلائل، شواہد اور انعامات الٰہی میں غور کریں گے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا یقین آجائے گا۔ اور پھر یہ بھی کہ اس نصیحت پر عمل کرنا عقلمندوں کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں عقلمندوں کی یہ صفت بیان کی ہے اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ" جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان[1] بھی ہے لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ تمہاری زبان ہمیشہ ذکر الٰہی سے تر رہنی چاہیئے۔ اگر دلائل قدرت میں غور و فکر کرو گے تو روح اور قلب کا ذکر ہوگا اور زبان کا ذکر تو عام ہے اور ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ حضرت ام المؤمنین فرماتی ہیں[2] كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ اَحْيَانِهٖ

[1] ترمذی ص ۴۸۶ [2] ابوداؤد ص ۲ ج ۱

حضور علیہ السلام ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے کہ عقلمندوں کا یہی کام ہے۔ دھوکہ، فریب اور برائی عقلمندوں کا کام ہرگز نہیں۔ یہ بات عقل معاش تو ہو سکتی ہے مگر عقل معاد نہیں ہو سکتی۔ تو فرمایا صحیح معنوں میں عقلمند وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، بدنی اور مالی عبادات انجام دیتے ہیں اور قرآن پاک کے پروگرام پر یقین رکھتے ہیں۔ اللہ نے سورۃ کے آخر میں خلاصے کے طور پر چار باتیں فرمائی ہیں

سُورة

الحجر

مُكمل

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا سِتُّ رُكُوْعَاتٍ
سورۃ حجر مکی ہے اور یہ ننانوے ۹۹ آیات اور اسمیں چھ ۶ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

الٓرٰ وقف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①
رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ②
ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ
اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ مِنْ
اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤

ترجمہ:۔ الٓرٰ وقف یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور قرآن کی جو کھول کر بیان کرنے والا ہے ① بسا اوقات آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، کاش کہ وہ مسلمان ہوتے ② چھوڑ دیں اِن کو کھا لیں اور فائدہ اٹھالیں اور غفلت میں ڈالے اُن کو آرزو۔ پس عنقریب وہ جان لیں گے ③ اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس کے لیے ایک نوشتہ تھا

مقرر لکھا ہوا ④ نہیں سبقت کرتی کسی امت سے
اُس کی اجل (یعنی موت کا وقت) اور نہ وہ کسی سے
ہٹتے ہیں ⑤

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ الحجر ہے۔ حجر ایک وادی کا نام ہے جو مکہ اور شام کے درمیان تبوک کے قریب واقع ہے۔ ہزاروں سال پہلے ثمود جیسی متمدن قوم اس وادی میں آباد تھی۔ یہاں پر ان کے سترہ سو بڑے بڑے شہر اور قصبات تھے۔ اِس سُورۃ کا نام اسی وادی کے نام سے الحجر موسوم ہے اِن لوگوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی جس کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب آیا اور وہ ہلاک ہوئے
یہ سورۃ مبارکہ مکی دور میں نازل ہوئی۔ اس کی ۹۹ آیات اور چھ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۶۵۴ الفاظ اور ۲۷۷۰ حروف پر مشتمل ہے۔

مضامین سورۃ

سابقہ مکی سورتوں کی مانند اس سورۃ مبارکہ میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد قرآن پاک کی حقانیت، معاد، رسالت اور توحید ہی کا ذکر ہے۔ گذشتہ سورۃ میں رسالت کا بیان تفصیل کے ساتھ آیا تھا جب کہ اس سورۃ میں مجرمین کی مہلت کے مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ سورۃ میں حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کا تذکرہ تھا تو اس سورۃ میں حضرت شعیب اور لوط علیہما السلام کی قوم کی نافرمانی کا ذکر ہے۔ البتہ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس سورۃ میں بھی آیا ہے۔ توحید کے عقلی اور نقلی دلائل اس سورۃ میں بھی بیان ہوئے ہیں اور دلائلِ قیامت اور محاسبے کا عمل حسب سابق بیان ہوا ہے۔ بہر حال اس سورۃ میں بھی زیادہ تر بنیادی عقائد ہی بیان کیے گئے ہیں۔

گذشتہ سورۃ کی طرح اس سورۃ کا بھی ایک اہم مضمون حضور علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے تسلی کا مضمون ہے۔ اللہ نے اہل ایمان کو فرمایا کہ آپ مجرمین کی ریشہ دوانیوں سے گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مہلت

دے رہا ہے مگر بالآخر اُس کی گرفت میں آجائیں گے۔

حروف مقطعات

اِس سورۃ مبارکہ کا آغاز بھی حروفِ مقطعات الٓرا سے ہو رہا ہے۔ جیسا کہ سورۃ ابراہیم کی ابتداء میں بھی عرض کیا تھا مفسرین نے اِن حروف کے مختلف معانی بیان کیے ہیں تاکہ لوگوں کے اذہان قرآنِ پاک سے مانوس رہیں بعض مفسرین فرماتے ہیں ا سے انا، ل سے اللہ اور ر سے رؤیت مراد ہے اور تینوں حروف کو ملانے سے انا اللہ ارای بنتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہاری تمام حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہوں۔ گویا یہ جزائے عمل کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اے میرے بندو! تمہارا کوئی عمل میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ میں ایک ایک عمل کا حساب لوں گا اور پھر اس کے مطابق جزا اور سزا کا فیصلہ کروں گا۔

بعض فرماتے ہیں کہ ا سے اللہ ل سے جبرائیل اور ر سے رسول مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآنِ پاک کے حقائق اللہ رب العزت نے جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ذوقی طریقے سے میرے ذہن میں ڈالا ہے کہ ان حروف سے مقاماتِ انبیاء کی طرف اشارہ ہے۔ عالم غیب کے حقائق الٰہیہ اس مادی جہان میں آکر متعین ہوتے ہیں اور نافرمان لوگوں کے باطل عقائد اور بُرے اعمال کے ساتھ ٹکراتے رہتے ہیں۔ پھر انبیاء کی کوشش سے باطل باتیں مٹتی رہتی ہیں اور حق ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ یہ گویا مقاماتِ انبیاء کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم جیسا کہ صاحب جلالین فرماتے ہیں[1]، زیادہ سلامتی والا طریقہ یہ ہے اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ ان کی حقیقی مراد کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے، کہ اللہ کی جو بھی مراد ہے وہ برحق ہے۔ ہر چیز کی حقیقت کو جاننا

---

[1] جلالین ص۲

ہمارے لیے ضروری نہیں۔

قرآن کی حقانیت

ارشاد ہوتا ہے "تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ" یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور کتاب سے مراد ہے "وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ" کہ وہ قرآن ہے جو کھول کر بیان کرنے والا ہے۔ صحیح معنوں میں کتاب کہلانے کی حقدار صرف یہی کتاب قرآن پاک ہے جو پڑھ کر سنائی جارہی ہے اور جس کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں پوری انسانیت کی فلاح اور نجات کا پروگرام موجود ہے۔ جہاں تک قرآن کے مبین ہونے کا تعلق ہے تو اس کی یہ صفت خود قرآن میں بتکرار بیان ہوئی ہے قرآن اپنے مطالب کبھی خود براہ راست کھولتا ہے۔ اگر کسی ایک مقام پہ کسی معاملہ میں اجمال پایا جاتا ہے تو دوسرے مقام پہ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی وضاحت کا دوسرا ذریعہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات کا پابند کیا ہے "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ" تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے کھول کر بیان کر دیں۔ چنانچہ قرآن پاک کی تفسیر و تشریح احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ اگر کوئی بات نبی کی زبان سے بھی واضح نہ ہوئی ہو یعنی اس کے بعض جزوی مسائل کی تشریح مطلوب ہو تو خود اللہ کا فرمان ہے "لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ" (النساء) تو اسے استنباط اور اجتہاد کرنے والے آئمہ کے سپرد کر دو، وہ تحقیق کر کے مسئلہ کا حل بتا دیں گے۔ امام ابوبکر جصاص چوتھی صدی کے عظیم المرتبت حنفی امام گزرے ہیں جنہوں نے "تفسیر الاحکام" جیسی عمدہ تفسیر لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں، کہ قرآن پاک کی تبیین کبھی براہ راست قرآن سے ہوتی ہے، کبھی نبی کی زبان سے اور کبھی مجتہد اور علماء قرآنی اصولوں کے مطابق تشریح کرتے ہیں۔ یہ سارے طریقے قرآن کی وضاحت میں داخل ہیں۔ بہر حال اس سورۃ کی پہلی

ار کی
رزو

آیت میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجرمین کے متعلق فرمایا ہے رُبَمَا بسا اوقات یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کافر لوگ آرزو کریں گے لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ کاش کہ وہ مسلمان ہوتے۔ یہ اس وقت کی بات اللہ نے بیان کی ہے جب کافر لوگ عذاب میں مبتلا ہو چکے ہوں گے مگر بعض لمحات ایسے بھی آئیں گے جب وہ تمنا کریں گے، کہ کاش وہ بھی ایمان لے آتے تو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حساب کتاب کے مرحلے سے گزرنے کے بعد بعض ایمان والے بھی اپنے گناہوں کی پاداش میں کچھ عرصہ کے لیے جہنم میں جائیں گے تو اس وقت کافر ان کو طعنہ دیں گے کہ تم نے تو دنیا میں ایمان کو قبول کیا، اب ہمارے ساتھ جہنم میں کیوں پڑے ہو۔ پھر وہ سزا بھگتنے کے بعد آہستہ آہستہ جہنم سے نکلتے جائیں گے تو اس وقت کافر لوگ آرزو کریں گے کہ اگر ہم بھی دنیا میں ایمان لے آتے تو آج ان کے ساتھ ہی دوزخ سے نکل جاتے۔ مگر اس وقت کا پچھتانا کچھ کام نہ آئے گا، کیونکہ عمل کا وقت ختم ہو کر جزا کا وقت آچکا ہوگا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کفار کی یہ حسرت صرف آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عام ہے اور اس کا اطلاق اس دنیا پر بھی ہو سکتا ہے چنانچہ بدر اور بعض دوسرے مواقع پر جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور کفار کو ذلت و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، تو انہوں نے اس وقت آرزو کی کہ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو آج ذلیل و خوار نہ ہوتے۔ تاہم زیادہ قرینِ قیاس یہی بات ہے کہ کافر لوگ آخرت میں یہ آرزو کریں گے۔

ار کے
ہلت

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ارشاد فرمایا ذَرْهُمْ آپ ان کو چھوڑ دیں۔ یَاْکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا یہ کھالیں اور فائدہ اٹھالیں۔ فرمایا آپ

ان کی طرف سے زیادہ تشویش میں نہ پڑیں بلکہ انہیں دنیا کی ترغیبات سے مستفید ہونے دیں۔ انہیں مہلت دیں کہ یہ فائدہ اٹھالیں۔ سورۃ محمد میں کفار کے متعلق آتا ہے "یَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ" کہ یہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جیسے مویشی کھاتے ہیں مگر بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ اور غفلت میں ڈالے ان کو ان کی آرزو۔ اس دنیا میں تو یہ بلاتمیز حلال و حرام چوپایوں کی طرح کھاتے رہتے ہیں اور دنیا کے لوازمات سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں انہیں کوئی فکر نہیں مگر فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ انہیں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ ان کی غفلت، لاپرواہی اور عیش و عشرت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا اَلْکَافِرُ یَاْکُلُ فِیْ سَبْعَۃِ اَمْعَاءٍ یعنی کافر آدمی سات آنتوں میں کھانا کھاتا ہے وہ خوب پیٹ بھرتا ہے کیونکہ اسے آخرت کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف وَالْمُؤْمِنُ یَاْکُلُ فِیْ مِعًی وَّاحِدٍ مومن آدمی صرف ایک آنت میں کھاتا ہے۔ یعنی وہ صرف اتنا کھانا کھاتا ہے جس سے اس کی روح اور جسم کا رشتہ برقرار رہ سکے اور اس میں اتنی قوت موجود رہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دیگر فرائض انجام دے سکے اسی لیے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دیں، کھانے دیں اور فائدہ اٹھانے دیں، انہیں جلد ہی نتیجے کا پتہ چل جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشویش

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ دو چیزوں کے متعلق میں اپنی امت کے لوگوں پر خوف رکھتا ہوں یعنی اتباع الھویٰ و طول الامل ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے اور دوسری لمبی لمبی آرزوئیں ہیں۔ اتباع ہویٰ کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے قانون

کو چھوڑ کر شیطان کے پیچھے چلتا رہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرہ) لوگو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ حق کے مقابلے میں رسم و رواج اختیار کرنا خواہشات اور شیطان کی پیروی کے مترادف ہے۔ اگر سنت کا خیال نہیں رکھو گے، خدا تعالیٰ کے حکم اور شریعت کی پرواہ نہیں کرو گے، خوشی اور غمی کے موقع پر قوم، خاندان اور برادری کے کہنے پر چلو گے، تو یہی خواہشات کی پیروی ہے۔ فرمایا، مجھے دوسرا خطرہ لمبی لمبی آرزوؤں کا ہے۔ انسان بے شمار منصوبے بناتے ہیں کہ یہ کریں گے، پھر وہ کریں گے، اتنا فائدہ ہو گا، اتنی شہرت ہو گی، انسان اسی بات میں لگا رہتا ہے آخرت کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا حتیٰ کہ اُسے موت آجاتی ہے اور اس کی ساری آرزوئیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے اتباع ہوا ایسی چیز ہے يَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ جو حق بات سے روکتی ہے وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِي الْاٰخِرَةَ اور لمبی آرزو وہ ہے جو آخرت کو فراموش کرا دیتی ہے۔ انسان کو آخرت کی فکر کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جتنی لمبی آرزو ہو گی اتنی ہی آخرت سے غفلت ہو گی۔

ہلاکت کا مقررہ وقت

فرمایا کہ کافر لوگ جو کچھ کرتے ہیں انہیں کرنے دیں، اس وقت انہیں مہلت مل رہی ہے مگر ہر فرد اور قوم کے لیے ہم نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کی ہلاکت کا مقررہ وقت لکھ دیا گیا تھا۔ ہم نافرمان قوموں کو مہلت دیتے رہے، پھر جب ان کا مقررہ وقت آگیا تو وہ گرفت میں آگئے اور ہلاک ہو گئے۔ فرمایا یہاں پر ایک یہ قانون بھی ہے مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ کسی امت کی موت آگے پیچھے نہیں ہوتی، مگر

عین وقتِ مقررہ پر وارد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سورۃ میں اللہ نے کئی قوموں کے حالات بیان کیے ہیں جن کو مہلت دی گئی اور پھر جب ان کی ہلاکت کا وقت آگیا تو لحظہ بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوا، بلکہ عین وقت پر ان کا کام تمام کر دیا گیا۔

اس میں حضور علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے تسلی کا مضمون بھی ہو گیا کہ کفار کے جوش و جذبے اور ان کے غلبے کو دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور آخرت میں ان کا انجام بہت بُرا ہو گا۔ فرمایا ان کو چھوڑ دیں اور دُنیا کے لوازمات سے فائدہ اٹھانے دیں۔ ایک مقررہ وقت آنے والا ہے جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی اور یہ مجرم لوگ پکڑے جائیں گے اگر دنیا میں مصلحتِ خداوندی کے مطابق سزا سے بچ بھی گئے تو اگلے جہان میں یقینی طور پر سزا میں مبتلا ہوں گے۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ
لَمَجْنُونٌ ⑥ لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ
كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ⑦ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ
إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ⑧ إِنَّا نَحْنُ
نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ⑨ وَلَقَدْ
أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ⑩
وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ⑪ كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ
الْمُجْرِمِينَ ⑫ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ
الْأَوَّلِينَ ⑬ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ
السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ⑭ لَقَالُوا إِنَّمَا
ع ۱ سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ ⑮

ترجمہ:۔ اور کہا اُن لوگوں نے، اے وہ شخص کہ
اتارا گیا ہے جس پر ذکر، بیشک تو البتہ دیوانہ ہے ⑥
کیوں نہیں لاتا تو ہمارے پاس فرشتوں کو، اگر
تو سچا ہے ⑦ (فرمایا) نہیں اتارتے ہم فرشتوں کو
مگر حق کے ساتھ۔ اور نہیں ہوں گے وہ مہلت یافتہ

لوگوں میں سے ⑧ بیشک ہم نے اتارا ہے ذکر کو،
اور بیشک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ⑨
اور البتہ تحقیق بھیجے ہم نے آپ سے پہلے رسول،
پہلے گروہوں میں ⑩ اور نہیں آتا تھا اُن کے پاس کوئی
رسول مگر وہ اس کے ساتھ ٹھٹا کرتے تھے ⑪ اسی
طرح ہم چلاتے ہیں اس کو مجرموں کے دلوں میں ⑫
نہیں ایمان لاتے اس پر، اور تحقیق گذر چکا ہے دستور
پہلے لوگوں کا ⑬ اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان
سے اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگ جائیں ⑭ تو کہیں
گے بیشک ہماری آنکھوں کی نظربندی کر دی گئی ہے،
بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر سحر کر دیا گیا ہے ⑮

ربطِ آیات

سورۃ ہٰذا کی پہلی آیت کریمہ میں قرآنِ پاک کی حقانیت اور صداقت بیان ہوئی پھر کفر کرنے والوں کا آخرت میں آرزو کرنا مذکور ہوا کہ وہ کہیں گے کاش کہ وہ مسلمان ہوتے تو اس دِن کی ذلت سے بچ جاتے پھر اُس مہلت کا ذکر ہوا جو کافر مشرک اور معصیت شعار لوگوں کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا، اِن کو چھوڑ دیں اور کھانے پینے دیں، یہ دنیا میں فائدہ اٹھاتے رہیں اور آرزوئیں اِن کو غفلت میں ڈالتی رہیں، بالآخر اِن کو پتہ چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ ہر قوم اور جماعت کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر ہے جس پر وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ مجرموں کو مہلت دیتا ہے مگر انہیں سزا دیے بغیر چھوڑتا نہیں۔

دیوانگی کا الزام

اب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی بعض حرکات کا شکوہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَقَالُوْا انہوں نے کہا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اے وہ

شخص کہ جس پہ ذکر اُتارا گیا ہے کفار و مشرکین کا یہ خطاب حضور علیہ السلام سے ہے کہ آپ ہی پہ ذکر یعنی قرآن پاک اتارا گیا۔ قرآن پاک کے بہت سے ناموں میں سے ذکر بھی ایک نام ہے جس کا معنیٰ نصیحت ہے تو نافرمان اور سرکش لوگ کہتے تھے اِنَّكَ لَمَجۡنُوۡنٌ کہ تُو تو دیوانہ ہے (العیاذ باللہ) وہ لوگ اپنے تعصب عناد، نادانی اور حماقت کی بناء پر آپ سے استہزا کرتے تھے کہ آپ تو دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہیں، مثلاً آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی عقلمندی کی بات ہے؟ اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ (ص۔ ۲) کیا ہم سارے معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک الٰہ کو مان لیں، یہ تو عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یا آپ کہتے ہیں کہ قیامت برپا ہوگی، محاسبہ کا عمل آئیگا، اور پھر جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ بھلا یہ بھی کوئی قابلِ یقین بات ہے کہ مرنے کے بعد پھر سارے جی اٹھیں گے؟ یہ تو پاگلوں جیسی باتیں ہیں ہم ان کو نہیں مانتے۔

نزولِ ملائکہ کی فرمائش

کہنے لگے اگر آپ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں لَوۡ مَا تَاۡتِیۡنَا بِالۡمَلٰٓئِکَةِ تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتے اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ اگر آپ سچے ہیں اللہ کے فرشتے ہمارے سامنے آکر گواہی دیں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں تو پھر ہم مانیں گے۔ کہ اللہ نے واقعی آپ کو ہماری طرف مبعوث فرمایا ہے۔ اور آپ پر قرآن بھی نازل کیا ہے، اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَةَ اِلَّا بِالۡحَقِّ ہم نہیں فرشتوں کو اتارتے مگر حق کے ساتھ۔ جب اللہ کی حکمت اور مصلحت ہوتی ہے، تو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جب فرشتے اتریں گے وَمَا کَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِیۡنَ تو پھر انہیں مہلت بھی نہیں ملے گی، فوری گرفت ہوگی اور عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے

حفاظت قرآن کا ذمہ

اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ قرآن کریم میں تردد کرتے ہیں اور اسے خدا کا کلام نہیں مانتے مگر حقیقت یہ ہے إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ اور بیشک ہم ہی البتہ اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ کہ منکرین اس خدائی پروگرام کو مٹانے کی جتنی بھی کوشش کر لیں، ہم خود اس کے محافظ ہیں۔ اس قرآن کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا اور یہ اپنی اصلی حالت میں قیامت تک محفوظ رہے گا۔ مشرکین نے جنگ و جدل کے ذریعے قرآن کو ختم کرنے کی کوشش کی جب کہ یہودیوں نے سازشوں کے ذریعے اہل ایمان اور ان کی کتاب کو مٹانا چاہا، مگر اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھا لیا۔

حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَنْزَلْتُ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ میں نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل فرمائی ہے، جسے نہ آگ جلا سکتی ہے اور نہ پانی دھو سکتا ہے۔ اللہ نے سورۃ العنکبوت میں یہ بھی فرمایا ہے "بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ" یہ تو ایسی واضح آیات ہیں جو اللہ نے اہل علم کے سینوں میں جمع کر دی ہیں لہٰذا اسے کون مٹا سکتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ نے اس کتاب کی حفاظت کا ایسا انتظام کر دیا ہے جس سے متعصب اور مغرور مخالفین کے سر بھی نیچے ہو گئے ہیں اور انہوں نے اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔

میور ایک انگریز پادری تھا، ہندوستان میں یوپی کا گورنر بھی رہا۔ شدید متعصب عیسائی تھا۔ اس کا مقولہ ہے کہ دو چیزیں انسانیت کی دشمن ہیں ایک محمد کا قرآن اور دوسری محمد کی تلوار۔ اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے دنیا بھر میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک تحریف سے پاک رہی ہو۔ بعض دوسرے یورپی محققین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ جس طرح مسلمان قرآن پاک کو خدا کا کلام سمجھتے

ہیں اسی طرح ہم بھی اُسے بعینہٖ محمد کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اگرچہ قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتے مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ وہ بھی ماننے پر مجبور ہیں۔

حفاظتِ قرآن کا قدرتی نظام

تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے میں علماء کا ایک عظیم گروہ موجود رہا ہے جس نے قرآنِ پاک کے علوم و مطالب اور اس کے لاانتہا عجائبات کی ہمیشہ حفاظت کی ہے۔ یہ حضرات ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کو یاد کرتے رہے ہیں اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ قرآنِ پاک کا رسم الخط بھی اس کی حفاظت کا ذمہ دار رہا ہے۔ پرانے کوفی رسم الخط نستعلیق نسخ اور دیگر خطوں میں قرآن پاک ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ حفاظ نے اس کو حرف بحرف زبانی یاد کر کے اور قاری حضرات نے اس کی صحت لفظی کے لحاظ سے حفاظت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی جزئیات کو شمار کر کے اس کی حفاظت کی ہے۔ کسی نے قرآن کے رکوع شمار کیے تو کسی نے آیات، کسی نے اس کے الفاظ کو گنا ہے اور کسی نے حروف کو شمار کر لیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ سے لے کر آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں لاکھوں کی تعداد میں حفاظ موجود نہ ہوں، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آٹھ دس سال کا پاکستانی یا ہندوستانی بچہ، افریقی یا ملائی جس کی اپنی مادری زبان بھی عربی نہیں اور وہ خود اپنی زبان میں چھوٹی سی کتاب بھی یاد نہیں رکھ سکتا مگر قرآن پاک اُسے حرف بحرف زبانی یاد ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی اگر تلاوت میں غلطی کرتا ہے تو وہ بچہ فوراً ٹوک دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ایسا اچھا نظام قائم کر رکھا ہے۔

قبول اسلام کا ایک واقعہ

صاحب "معارف القرآن" مفتی محمد شفیعؒ نے امام قرطبی کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اس واقعہ کا راوی خلیفہ مامون الرشید عباسی کا بڑا قاضی اکثم تھا۔ خلیفہ کے دربار میں بڑے بڑے فقہا، عالم اور ماہرین جمع ہو

کہ مختلف مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسی ہی ایک بحث چل رہی تھی کہ ایک نہایت ہی وجیہہ شخص محفل میں شامل ہوا اور اس نے نہایت فصیح و بلیغ زبان اور عالمانہ انداز میں بحث میں حصہ لیا۔ اختتامِ مجلس پر خلیفہ نے اُس شخص سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ یہودی مذہب رکھتا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید نے کہا کہ اگر تم مسلمان ہوتے تو ہم تمہاری بہت قدر و منزلت کرتے، اُس شخص نے کہا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور چلا گیا۔ کوئی ایک سال بعد دربار میں پھر اُسی قسم کی مجلس برپا تھی کہ وہ شخص پھر داخل ہوا اور بحث میں پورا پورا حصہ لیا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو مامون الرشید نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم وہی شخص نہیں جو گذشتہ سال بھی یہاں آئے تھے؟ اس نے کہا میں وہی شخص ہوں۔ اس وقت میں یہودی تھا۔ مگر اب مسلمان ہو چکا ہوں۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تم نے اسلام کیسے قبول کر لیا حالانکہ تم اپنا پہلا مذہب چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ اُس شخص نے جواب دیا کہ آپ کی گذشتہ سال کی پیش کش پر میں نے بڑا غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مختلف مذاہب پر تحقیق کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں نے نہایت عمدہ خط میں توراۃ کا ایک نسخہ لکھا اور اس میں کہیں کہیں تغیر و تبدل کر دیا۔ وہ نسخہ میں نے یہودی علماء کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ پھر میں نے انجیل کی بڑی خوش خط کتابت کر کے عیسائیوں کے سامنے پیش کی، تو انہوں نے اُسے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

میرا تیسر النشانہ قرآنِ پاک تھا۔ میں نے اس کو بھی بہت اچھے خط میں تحریر کیا اور حسبِ معمول اس میں تحریف بھی کر دی۔ پھر جب میں نے اُسے مسلمان علماء کی خدمت میں پیش کیا تو کسی نے بھی بلا تحقیق اُسے قبول نہ کیا۔ انہوں نے حفاظ سے اس کی تصدیق چاہی مگر جب معلوم ہوا کہ اسمیں

رد و بدل کیا گیا ہے تو نسخہ واپس کہہ دیا کہ یہ ہمارے کام کا نہیں ہے. وہ شخص کہنے لگا کہ اس بات پر مجھے یقین آگیا کہ قرآنِ پاک ہی ایک واحد کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے اور یہی اس کی صداقت کی دلیل ہے۔ اس پر میں نے اسلام قبول کر لیا۔

لفظی اور معنوی حفاظت

جب حج کے لیے مکہ مکرمہ گئے تو قاضی اکثم نے یہ واقعہ امام سفیان ابن عیینہؒ کے سامنے ذکر کیا۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے تلمیذ اور امام بخاریؒ کے استاد ہیں اور اپنے زمانے کے امام، محدث اور فقیہ ہیں اس پر امام سفیان ابن عیینہ نے فرمایا کہ یہ واقعہ ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ اللہ نے تورات وغیرہ کے متعلق فرمایا ہے بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (المائدہ) کہ ان لوگوں کو کتابِ الٰہی کا محافظ بنایا گیا تھا مگر وہ اس کی حفاظت میں ناکام رہے۔ پھر اللہ نے قرآن پاک کے متعلق فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کہ اسے ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، لہٰذا قرآنِ کریم ہر قسم کی لفظی اور معنوی تحریف سے بالکل پاک ہے اگر کوئی بدبخت اس کے معانی میں غلط بیانی کی جسارت کرتا بھی ہے تو اللہ تعالیٰ اہلِ علم کو کھڑا کر دیتا ہے جو فوراً اس غلطی کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ سر سید احمد خاں، پرویز، نیاز فتحپوری اور غلام احمد قادیانی وغیرہ نے غلط سلط معانی کیے تو علمائے حق نے ان کے دجل و فریب کو چاک کر دیا اہل بدعت اور رافضی وغیرہ جو بھی خرابی کرتے ہیں، اہلِ علم اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ حضور کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسے لوگوں کو کھڑا کر دیتا ہے جو قرآن پاک کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہودیوں نے قرآن میں تحریف کرنے کی بڑی کوشش کی اور افریقہ کے نومسلموں کو تحریف شدہ نسخے بھیجے مگر اللہ نے مصر میں کرنل ناصر کو کھڑا کر دیا جس نے اس سازش کو چاک کیا، لاکھوں کی تعداد میں غلطی سے پاک نسخے تیار کر لئے اور انہیں

پورے افریقہ میں تقسیم کرایا۔

رسولوں کے ساتھ استہزاء

آگے تسلی کا مضمون آرہا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ اور تحقیق ہم نے بھیجے آپ سے پہلے رسول پہلے گروہوں میں۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ اور نہیں آتا تھا اُن کے پاس کوئی رسول مگر وہ اس سے ٹھٹا کرتے تھے۔ کہتے لاؤ ہمارے سامنے فرشتوں کو اتارو، تم تو دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہو، اللہ نے فرمایا كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ اسی طرح ہم چلاتے ہیں اسے مجرموں کے دلوں میں یعنی مجرم لوگ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ اس رسول پر ایمان نہیں لاتے بلکہ اُسے جھٹلاتے ہیں۔ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اور پہلے لوگوں سے بھی دستور چلا آرہا ہے۔ کہ وہ اپنے رسولوں کے ساتھ استہزاء کرتے رہے ہیں اور اللہ کی کتاب کا انکار کرتے رہے ہیں فرمایا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو آپ کو پیش آرہی ہے بلکہ پہلے رسولوں کے ساتھ بھی اسی قسم کے معاملات پیش آتے رہے ہیں۔ مجرم لوگ پہلے رسولوں کا بھی انکار کرتے رہے اور اُن کو مجنون، شاعر اور کاہن کا خطاب دیتے رہے ہیں۔ بہرحال یہ حضور علیہ السلام کے لیے تسلی کا مضمون بھی ہو گیا۔

کفار کا مسلسل انکار

کفار کے اس مطالبے کے جواب میں کہ آسمان سے فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے، اللہ نے فرمایا وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ اگر ہم ان پر آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ کہ یہ اس میں سیڑھی کے ذریعے چڑھتے رہیں تو پھر بھی یہ متعصب اور ضدی لوگ لَقَالُوْآ یہی کہیں گے اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے۔ بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر سحر کر دیا گیا ہے مطلب یہ کہ لوگ آسمان پر چڑھ کر بھی اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئیں

گے اور قرآن اور نبی برحق کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔ اللہ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ ان کے اعتراضات کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ اپنا کام کرتے رہیں۔ یہ تو اپنی مطلوبہ نشانیاں دیکھ کر بھی یہی کہتے ہیں "سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ" (القمر) یہ تو چلتا ہوا جادو ہے پہلے بھی لوگ ایسا جادو کیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں شق القمر کا معجزہ دیکھ کر انہوں نے یہی کہا تھا۔ فرمایا ایسے لوگ ہدایت سے محروم رہیں گے۔ آپ ان پہ زیادہ افسوس نہ کریں۔ اپنا حق تبلیغ ادا کرتے رہیں جس کے نتیجے میں منصف مزاج لوگ ہدایت حاصل کر لیں گے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنّٰهَا
لِلنّٰظِرِينَ ⑯ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ
رَّجِيمٍ ⑰ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ
شِهَابٌ مُّبِينٌ ⑱ وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَأَلْقَيْنَا
فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ
مَّوْزُونٍ ⑲ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ
وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرٰزِقِينَ ⑳ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ
إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ
مَّعْلُومٍ ㉑

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق بنائے ہم نے آسمان میں بُرج اور مزین کیا ہم نے ان کو دیکھنے والوں کے لیے (۱۶) اور ہم نے حفاظت کی ہے ان کی ہر شیطان مردود سے (۱۷) مگر وہ جو چوری چھپے سنتا ہے، پس پیچھا کرتا ہے اس کا ایک روشن شہاب (۱۸) اور زمین کو پھیلایا ہم نے اور رکھے ہیں ہم نے اس میں بوجھل پہاڑ، اور اگائی ہم نے ہر چیز اس میں ایک اندازے سے (۱۹) اور بنائے ہیں ہم نے تمہارے لیے اس (زمین) میں

معیشت کے سامان ، اور اُن کے لیے بھی کہ نہیں ہو تم اُن
کو روزی پہنچانے والے (۲۰) اور نہیں ہے کوئی چیز مگر ہمارے
ہی پاس ہیں اس کے خزانے ۔ اور نہیں اتارتے ہم اس 356
کو مگر ایک معین اندازے پر (۲۱)

ربط آیات

کافر اور مشرک قرآن حکیم کی حقانیت پر شبہ کرتے تھے اور صاحب قرآن کو کہتے تھے کہ تو دیوانہ ہے ۔ اور اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ہمارے سامنے فرشتوں کو نازل کر تاکہ وہ تیری اور قرآن پاک کی صداقت کی گواہی دیں ۔ اللہ نے مشرکین کے اس اعتراض کے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو حق کے ساتھ اتارتا ہے اور جب اتارتا ہے تو پھر نافرمانوں کو مہلت نہیں ملتی بلکہ ان کا کام تمام کر دیا جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے حق میں گواہی دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کو ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں ، لہٰذا حفاظت کے سامان ہم خود پیدا کریں گے ۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے نشانیاں طلب کرنے کے جواب میں فرمایا ہے کہ تمہارے اردگرد قدرت کی بیشمار نشانیاں بکھری پڑی ہیں ۔ اگر نیت صاف ہو تو ایمان لانے کے لیے یہی کافی ہیں ، اور اگر ضد اور عناد پر ہی قائم رہنا ہے تو پھر کوئی بھی نشانی کارگر نہیں ہو سکتی ۔

آسمانی برج

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجًا البتہ تحقیق ہم نے آسمانوں میں برج بنائے ہیں ۔ پرانی ریاضی اور ماہرین فلکیات بارہ برجوں کا تصور پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چاند اور سورج ہر ماہ جدا جدا برج میں ہوتے ہیں ۔ ہر برج یا محل کی تاثیر مختلف ہوتی ہے جس سے موسموں کا تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے ۔ بارہ برجوں کا تصور یونانیوں سے آیا ہے ۔ انہوں نے یہ تصور ایرانیوں سے اور ایرانیوں نے بابلیوں یعنی آشوریوں سے اخذ کیا تھا ۔ تاہم بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ برج ل

سے مراد مطلق ستارے یا بڑے بڑے سیارے ہیں۔ جہاں سے فرشتے اللہ کے حکم سے نیچے اترتے ہیں۔ وہاں پہ دروازے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں سے فرشتے آتے جاتے ہیں۔ اور پھر برجوں، سیاروں یا ستاروں کو اللہ نے اس طریقے سے ترتیب دیا ہے وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ کہ دیکھنے والوں کے لیے بڑے پُر رونق معلوم ہوتے ہیں۔ دن کے وقت تو سورج کی حکومت ہوتی ہے اور رات کو چاند روشن ہوتا ہے اور جب چاند بھی موجود نہ ہو تو اس وقت ستارے خوب روشن ہوتے ہیں جن کا منظر بڑا خوش کن ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے ستاروں کو دیکھنے والوں کے لیے مزین کر دیا ہے۔ اندھیری راتوں میں ستاروں کا نظارہ بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔

شیاطین کے لیے شہاب

ارشاد ہوتا ہے وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اور ہم نے آسمانوں کی حفاظت کی شیطان مردود سے۔ ان کو اوپر جانے سے روک دیا گیا ہے اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ مگر وہ جو چوری چھپے سن گن لگانا چاہتا ہے فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ۔ پھر اس کے پیچھے روشن انگارا آتا ہے۔ اسے شہاب ثاقب کہتے ہیں جو کسی ستارے سے ٹوٹ کر شیطان کا پیچھا کرتا ہے۔ سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق اوپر اٹھنے والے بخارات میں حرارت ہوتی ہے۔ پھر جب ان میں آگ لگتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ٹوٹا ہوا ستارہ ہو۔ اس نظریے کی نفی نہیں کی جا سکتی کیونکہ قرآن پاک نے اس قسم کے امکان کی نفی نہیں کی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح سورج میں ایک بہت بڑا مادہ ہے جو جلتا رہتا ہے، روشنی اور حرارت دیتا ہے، اس طرح ستاروں کے اندر کوئی ایسا مادہ ہو جو پھٹ جاتا ہو اور وہ ٹوٹا ہوا ستارہ نظر آتا ہو۔ بہر حال قدیم زمانے سے یہی کچھ مشاہدے میں آرہا ہے۔ اس

ضمن میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جنات کی تخلیق سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک شیاطین کے لیے آسمان پر جانے میں کوئی خاص رکاوٹ نہیں تھی، لہٰذا وہ اوپر جا کر فرشتوں کی کچھ کچھ باتیں سن لیتے۔ پھر وہ اسے واپس آ کر اپنے چیلوں، کاہنوں وغیرہ کے کانوں میں پھونکتے جو اس میں سو جھوٹ ملا کر آگے چلا دیتے۔ پھر جب حضور علیہ السلام کا زمانہ آیا اور قرآن کا نزول شروع ہوا تو شیاطین کے اوپر جانے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اب اگر یہ اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو اللہ کے فرشتے ان پر شہاب پھینکتے ہیں۔ پھر ان شیاطین میں سے کچھ زخمی ہو جاتے ہیں اور بعض ہلاک ہو جاتے ہیں۔ سورۃ جن میں ہے کہ جنات نے کہا کہ جب ہم اوپر جاتے ہیں "مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَّشُهُبًا" تو سخت پہرے لگ جاتے ہیں اور آگے سے شہاب پڑتے ہیں۔

بعض جدید ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ اوپر فضا میں کائناتی شعاعیں (COSMIC RAYS) کاسمک ریز) ہیں جو ہر اوپر جانے والی چیز کو جلا ڈالتی ہیں اسی لیے فضا میں بھیجی جانے والی خلائی گاڑیوں کی حفاظت کا خصوصی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو بھگانے کے لیے شہاب مقرر کر رکھے ہیں۔ بہرحال یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا یقین آ جاتا ہے۔ انصاف پسند آدمی ایسے دلائل سے بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

زمین کے فوائد

یہ تو عالم علوی کا حال تھا، آگے اللہ نے عالم سفلی کا حال بھی بیان کیا ہے۔ وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا اور ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے۔ اگرچہ زمین بظاہر چپٹی نظر آتی ہے مگر حقیقت میں بالکل گیند کی طرح گول ایک بہت بڑا کرہ ہے۔ چونکہ اس کا حجم بہت بڑا ہے اس لیے یہ ہر حصے سے پھیلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کی گولائی محسوس نہیں

ہوتی ، فرمایا ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ اور اس میں بوجھل پہاڑ رکھ دیے ہیں ۔ راسیہ جمے ہوئے پہاڑ کو کہتے ہیں ۔ ان پہاڑوں کو بھی اللہ نے بے سود نہیں پیدا کیا بلکہ ان کے ساتھ بھی انسانی زندگی کے بہت سے مفادات وابستہ ہیں ۔ اگر پہاڑ نہ ہوں تو انسان ان سے پیدا ہونے والے پھلوں ، جڑی بوٹیوں اور معدنیات سے محروم ہو جائیں ۔ تو پہاڑ بھی اللہ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائے ہیں ۔

فرمایا وَاَنْبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ اور ہم نے اس زمین میں ہر چیز ایک اندازے کے مطابق اگائی ہے ۔ انسان کمالِ قدرت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نباتات کی ہر قسم کو موزون پیدا فرمایا ہے ۔ اناج کا دانہ ہو یا ٹہنیاں اور پتے ، چھوٹی سی بیل ہو یا تناور درخت ، ہر چیز میں موزونیت پائی جاتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر اگنے والی چیز میں مختلف قسم کے رنگ ، خوشبو اور تاثیر رکھی ہے جو انسان کی بے شمار ضروریات پوری کرتے ہیں ۔ ان کو دیکھ کر دل و نگاہ خوش ہو جاتے ہیں ۔ ذرا غور فرمائیں کہ جس قسم کا بیج بوئیں گے ، ہزار دفعہ بھی اگائیں تو اسی قسم کا پودا ، درخت اور پھل پیدا ہوں گے اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی ، وہی رنگ ، وہی ذائقہ اور وہی شکل و صورت ہوگی ۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ اتنے بڑے بڑے نشاناتِ قدرت دیکھ کر بھی لوگ کفر و شرک کو چھوڑ کر اللہ کی وحدانیت کے قائل نہیں ہوتے ۔ یہ ان کی ناشکر گزاری کی علامت ہے ۔

معیشت کے سامان

ارشاد ہوتا ہے وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں معیشت کے سامان پیدا کیے ہیں ۔ ہم نے تمہاری زندگی کے لیے اسباب فراہم کیے ہیں ۔ ان اسباب

کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ انسان انہیں شمار بھی نہیں کر سکتے۔ فرمایا ہم نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہاری روزی کا سامان بھی مہیا کیا ہے، اور اُن کو بھی پیدا کیا ہے وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ جن کی روزی کے ذمہ دار تم نہیں ہو۔ اللہ نے تمہاری خدمت کے لیے کتنے غلام اور نوکر چاکر پیدا کیے مگر اُن کا روزی رساں بھی میں ہوں، تم نہیں ہو۔ پھر اللہ نے کتنے چوپائے، پرندے، درندے، مچھلیاں، کیڑے مکوڑے اور لاتعداد مخلوق پیدا کی ہے اور اُن کے لیے معیشت کے سامان بھی خود ہی پیدا کیے ہیں۔ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اللہ نے کسی دوسری مخلوق کی روزی تمہارے ذمے نہیں لگائی۔ بلکہ ہر جاندار کا روزی رساں وہ خود ہے، تو فرمایا یہ باتیں اہل خرد کے لیے بڑے بڑے دلائل ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لے آنا چاہیئے، نہ کہ من مانی نشانیاں طلب کی جائیں اللہ نے تو پہلے ہی بیشمار نشانیاں پھیلا رکھی ہیں جنہیں تم ہر وقت دیکھتے ہو، مگر ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

آگے فرمایا وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ اور ایسی کوئی چیز نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔ اناج کی کوئی قسم لے لیں، پھولوں اور پھلوں پر نگاہ ڈال لیں، پانی ہوا، جمادات، نباتات، اور معدنیات کو دیکھ لیں، ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ہی انہیں تقسیم کر رہے ہیں۔ انسانی دل و دماغ، شکل و صورت، حسن، علم اور صحت ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں سے عطا کر رکھی ہے۔ اور اس کے خزانے اتنے وسیع ہیں کہ ان میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ فرمایا وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ہم یہ تمام نعمتیں ایک معین اندازے کے مطابق نازل فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کو دوسری کوئی مخلوق نہیں سمجھ سکتی، وہ اپنی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ

کے مطابق جہاں جس چیز کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، اتنی مہیا فرما دیتا ہے
یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی کی شکل و صورت کیسی بنانی ہے، کسی
کو حسن و جمال اور علم و صحت کتنی دینی ہے۔ یہ سب چیزیں اس کے علم
و قدرت میں ہیں اور وہ اسی کے مطابق انہیں نازل فرماتا ہے۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ
بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ
الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ
مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

ترجمہ :- اور بھیجیں ہم نے ہوائیں بوجھل۔ پس اتارا ہم نے آسمان کی طرف سے پانی۔ پس ہم نے پلایا وہ پانی تم کو اور نہیں تھے تم اس کو خزانہ کرنے والے (۲۲) اور بیشک البتہ ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں (۲۳) اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں اُن لوگوں کو جو آگے بڑھنے والے ہیں تم میں سے، اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں اُن لوگوں کو جو پیچھے رہنے والے ہیں (۲۴) اور بیشک تیرا پروردگار اِن کو اکٹھا کرے گا۔ بیشک وہ حکمت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (۲۵)

ربطِ آیات

سورۃ کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا ذکر کیا، اور اس کی حفاظت کا قانون بتلایا۔ پھر منکرین قرآن کی مذمت بیان فرمائی پھر اللہ نے اپنی وحدانیت اور قیامت کے دلائل ذکر کیے۔ پہلے علوی دلائل

بیان کیے یعنی آسمانی برج اور ان کی حفاظت کا ذکر کیا۔ پھر سفلی دلائل میں زمین کا پھیلانا، اس میں پہاڑوں کو پیدا کرنا اور ہر چیز کو موزوں طریقے سے رکھنا بیان ہوا۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ ہر چیز کے خزانے اسی کے پاس ہیں۔ پانی صحت، علم اور مادی زندگی کے تمام لوازمات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ ہر چیز کو معلوم مقدار کے مطابق نازل فرماتا ہے۔

پانی کی قدرتی بہم رسانی

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے علوی اور سفلی دلائل کے بعد اب تیسری دلیل یہ بیان فرمائی ہے وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ اور ہم نے بوجھل ہوائیں چلائیں۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ "رس بھری ہوائیں" کرتے ہیں۔ یعنی وہ ہوائیں جو پانی سے بھرپور ہوتی ہیں۔ لقح حاملہ یا دودھ دینے والی مادہ کو کہا جاتا ہے۔ تلقیح کا معنی پیوند کاری بھی ہوتا ہے۔ اس سے بھی چیز بوجھل ہو جاتی ہے اور آگے دوسری چیز نکلتی ہے آجکل کی میڈیکل سائنس میں اسے ٹیکہ لگانا ——— (INOCULATION) انوکیولیشن کہتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے انسانی جسم میں خاص قسم کے جراثیم پہنچائے جاتے ہیں جن سے بیماری کو ابھارنا مقصود ہوتا ہے تاکہ اس کا واضح طور پر علاج کیا جا سکے یا خود انسانی طبیعت کو اس قابل بنایا جا سکے کہ وہ بیماری کا مقابلہ کر سکے۔

بہرحال یہ بوجھل ہوائیں سمندر سے اٹھنے والے بخارات کو اٹھاتی ہیں اور پھر قدرت کو جہاں بارش برسانا مقصود ہوتا ہے۔ وہاں لے جاتی ہیں۔ بارش برستی ہے جس سے انسان، حیوان، کیڑے مکوڑے اور نباتات سیراب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا خود کار انتظام کر رکھا ہے جس سے پانی جیسی بنیادی ضرورت ہر ایک تک فری پہنچتی ہے اللہ نے اس نظام کو اس حکمت کے ساتھ قائم کیا ہے کہ بارش حسب ضرورت کبھی کبھی ہوتی ہے اگر ہر وقت بارش برستی رہے تو دنیا کا سارا

کاروبار ہی ٹھپ ہو جائے اور زمین اس قابل ہی نہ ہو سکے کہ اس میں کاشت کی جا سکے اور وہ بار آور ہو سکے، اللہ تعالیٰ کی ایک اور حکمت یہ ہے کہ اس نے سمندری پانی کو کھاری بنایا ہے اس میں ایسی تیزابیت پائی جاتی ہے کہ پانی میں پہنچنے والی غلاظت اور اس میں مرنے والے جانور اس طرح گل سڑ جاتے ہیں کہ اُن کا تعفن باقی نہیں رہتا۔

پانی کی بہم رسانی کا اللہ نے یہ عجیب نظام قائم کیا ہے کہ سمندروں کے کھاری پانی سے بخارات اٹھتے ہیں۔ ہوائیں انہیں اٹھا کر مختلف سمتوں میں پھیل جاتی ہیں اور پھر ان سے مختلف مقامات پر بارش ہوتی ہے مگر کھڑوے سمندر کے بخارات جب پھر پانی میں تبدیل ہوتے ہیں تو وہ پانی میٹھا ہوتا ہے جو حیوانات اور نباتات کے استعمال کے قابل ہوتا ہے۔ یہی پانی اونچے پہاڑوں پر برستا ہے تو ندی نالوں کی صورت میں میدانی علاقوں میں پہنچ کر پیاسی زمین کو سیراب کرتا ہے جس سے کھیتی باڑی ہوتی ہے، انسان اور جانور سیراب ہوتے ہیں۔ اور کچھ پانی برف کی صورت میں جم جاتا ہے۔ پھر موسم گرما میں برف پگھلتی ہے جس سے چشمے، ندی نالے اور پھر دریا سارا سال جاری رہتے ہیں اور اس طرح سال بھر کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کچھ پانی کو زمین کی گہرائی میں اتار دیتا ہے جسے کنوؤں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعے نکال کر انسانی ضروریات اور کھیتی باڑی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

بہر حال اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بوجھل ہوائیں چلائیں فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً اور آسمان کی طرف سے پانی نازل فرمایا۔ آسمان کا اطلاق فضا پر بھی ہوتا ہے۔ بادل فضا میں ہی گھومتے پھرتے ہیں جن سے بارش ہوتی ہے۔ اگرچہ بادل ہی بظاہر ذریعہ

بارشیں ہیں مگر اس کے لیے عالم بالا کا حکم بھی ضروری ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو بارش نہیں ہوتی۔ ہوا، روشنی، خوراک، لباس، مکان کی طرح پانی بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے جو بنیادی طور پر اللہ تعالےٰ ہی نازل فرماتا ہے فرمایا فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ ہم نے یہ پانی تمھیں پلایا اور تمہارے ساتھ دیگر جانداروں اور نباتات کو بھی سیراب کیا۔ پانی مدارِ حیات ہے۔ اس کی اصل قدر صحرائی علاقوں کے باشندوں کو ہوتی ہے۔ جہاں سینکڑوں میلوں تک اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔

فرمایا پانی ایک ایسی چیز ہے کہ بنیادی ضرورت ہونے کے باوجود وَمَآ أَنتُمْ لَهُۥ بِخَٰزِنِينَ تم اس کو ذخیرہ (STORE سٹور) نہیں کر سکتے۔ تم چند دن کے لیے تو پانی جمع کر سکتے ہو مگر سالوں تک اس کی بہم رسانی کے لیے تمہارے پاس کوئی انتظام نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ اللہ نے چشموں، جھیلوں، ندی نالوں، دریاؤں اور برف کے تودوں کی صورت میں ایسا مربوط نظام قائم کر دیا۔ کہ انسان، حیوان اور نباتات سال بھر کی ضروریات پوری کرتے رہتے ہیں اور اللہ کے یہ خزانے ختم نہیں ہوتے موجودہ دور میں پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈیم بنائے گئے ہیں مگر پھر بھی سال میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں کہ ضرورت کے مطابق پانی میسر نہیں آتا جس کا اثر نہ صرف کھیتی باڑی پر پڑتا ہے بلکہ ہمارے ملک کی بجلی کی پیداوار میں بھی کمی آجاتی ہے اور پھر لوڈ شیڈنگ کرنا پڑتی ہے۔

میڈیکل سائنس والے بتاتے ہیں کہ انسان کی رگوں میں گردش کرنے والے خون پر زندگی کا دارومدار ہے اور اس خون میں اسی فیصد پانی اور بیس فیصد باقی غذائی اجزا ہوتے ہیں۔ اگر پانی جیسی عظیم نعمت نہ ہو تو نہ کوئی انسان زندہ رہ سکے، نہ کوئی جانور، اور نہ ہی نباتات پیدا ہو سکے۔ اسی لیے

تو اللہ نے فرمایا ہے "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (الانبیاء) ہم نے ہر چیز کی زندگی کا انحصار پانی پر رکھا ہے۔ اور پانی بھی ایسا کہ جو گندا یا بدبودار نہیں بلکہ "وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا" (الفرقان) ہم نے پاکیزہ پانی نازل فرمایا ہے جو خود بھی پاک ہے اور دوسری چیزوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ چنانچہ غلاظت کو دور کرنے کے لیے بھی پانی ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے آسمان کی طرف سے پانی نازل فرما کر تمھیں سیراب کیا ہے۔ اب تمھارا یعنی تمام حکومتوں کا بھی فرض ہے کہ لوگوں کے لیے پانی کی فری سپلائی کا بندوبست کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی یہ تیسری دلیل بیان فرمائی ہے۔

زندگی اور موت کا نظام

اب اپنی وحدانیت کی چوتھی دلیل اللہ نے یہ بیان فرمائی وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی موت طاری کرتے ہیں۔ گویا موت و حیات اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے یہ کسی انسان، جن، فرشتہ یا دیوی دیوتا کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کی حکمت بالغہ کے مطابق جب تک کسی کی زندگی مقصود ہوتی ہے، اُسے زندہ رکھتا ہے اور پھر موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب تک چاہے گا کائنات کو مجموعی طور پر زندہ رکھیگا اور جب چاہے گا قیامت برپا کر کے ہر چیز کو فنا کر دیگا۔ غرضیکہ جس طرح پیدائش اس کے اختیار میں ہے اسی طرح موت بھی اُس کے ہاتھ میں ہے اس کی مرضی کے خلاف نہ کوئی پیدا کر سکتا ہے اور نہ کسی کو مار سکتا ہے پھر فرمایا وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ اور ہر چیز کے وارث بھی ہم ہی ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وارث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو اس کی چھوڑی ہوئی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں

ہوتی ہے۔ یہاں پر اولاد والی وراثت مراد نہیں بلکہ ہر انفرادی موت اور پھر قیامت کو مجموعی موت کے بعد ہر چیز کا وارث اللہ ہی ہے سب کی کمائی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہوتی ہے۔

متقدمین اور متاخرین

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھنے والوں کو وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو بھی۔ مفسرین کرام نے متقدمین اور متاخرین کی تفسیر مختلف طریقے سے بیان فرمائی ہے۔ امام ابن جریر طبری اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ متقدمین سے پہلی امتوں کے لوگ مراد ہیں اور متاخرین سے حضور علیہ السلام کی امت یعنی آخری امت کے لوگ مراد ہیں۔ فرمایا ہم تمام اولین اور آخرین کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ متقدمین سے وہ لوگ مراد ہیں جو نیکی میں آگے بڑھنے والے ہیں۔ اسی لیے اللہ نے حکم دیا ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (المائدہ) نیکی کے کاموں میں آگے بڑھو۔ اور متاخرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے متقدمین سے مراد نماز اور جہاد کی صفوں میں آگے بڑھنے والے لوگ ہیں بعض لوگ سستی کرتے ہیں نماز کی اگلی صفوں میں پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ پچھلی صفوں میں ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اذان کہنے کا کتنا اجر ہے اور اگلی صفوں میں نماز پڑھنے کی کتنی فضیلت ہے تو لوگ اگلی صفوں میں شامل ہونے کے لیے قرعہ اندازی کرنے لگیں۔ حضرت کعب احبارؒ تابعین میں سے ہیں۔ امام قرطبیؒ نے ان سے روایت نقل کی ہے کہ حضور علیہ السلام کی امت میں بعض ایسے مقبول بندے بھی ہوں گے کہ ان سے پچھلی

صف میں نماز ادا کرنے والے لوگوں کی بھی بخشش ہو جائے گی۔ اگر کوئی مقبول الہیٰ بندہ اگلی صف میں نماز ادا کرتا ہے تو پیچھے والوں کے سب کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ تاہم فضیلت اگلی صف کو ہی حاصل ہے اور اگلی صف والے کی وجہ سے ہی پچھلی صف والوں کے گناہوں کی معافی کا ذکر آیا ہے لہٰذا حتی الامکان اگلی صفوں میں پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

عورتوں اور مردوں کی صفیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں ایک خوبصورت عورت نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتی تھی اس لیے بعض آدمیوں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اگلی صف میں چلے جائیں تاکہ ان کی نگاہ عورت پر نہ پڑے۔ اور بعض منافق صفت آدمی ایسے بھی تھے کہ وہ پچھلی صفوں میں رہنا پسند کرتے تھے تاکہ انہیں "تاک جھانک" کا موقع مل سکے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں آگے بڑھنے والوں کو اور پیچھے رہنے والوں کو۔ ان کی نیت اور ارادہ بھی ہمارے علم میں ہے اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ مردوں میں سب سے اچھی اگلی صفیں ہیں اور عورتوں میں اچھی صفیں پچھلی ہیں۔ مرد و زن اختلاط سے جتنے دور رہیں گے اتنے ہی فتنے سے محفوظ رہیں گے اس سے یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نیکی میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے والوں کو جانتے ہیں۔ یا میدانِ کارزار میں آگے بڑھ کر حصہ لینے والوں کو بھی جانتے ہیں اور پیچھے رہنے والوں سے بھی واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حالات، نیت اور عزم کو جانتا ہے۔

قیامت اور جزائے عمل

دلائلِ توحید کے بعد اللہ نے فرمایا وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اور بیشک اللہ تعالیٰ ان سب کو اکٹھا کرے گا، اور سب کو جزائے عمل کے مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ اور سب کو اپنے اپنے کیے کی جزا یا سزا بھگتنا ہوگی۔ فرمایا اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ وہ اللہ تعالیٰ کمال حکمت

کا مالک ہے۔ اس کی ہر بات حکیمانہ ہے اور اسی کے مطابق وہ فیصلے کرتا ہے۔ وہ علیم بھی ہے کہ ہر شخص کے مخفی عزائم کو بھی جانتا ہے۔ قیامت کے دن ہر ایک کو اس کی نیت اور ارادے اور عمل کے مطابق جزا دے گا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ
حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ
مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ
مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٨﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ
رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿٢٩﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ
كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٣٠﴾ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰٓی اَنْ
یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ
مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ لَمْ
اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ
مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٣٣﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ
رَجِیْمٌ ﴿٣٤﴾ وَّاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ
الدِّیْنِ ﴿٣٥﴾

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیا انسان
کو بجنے والے ، متغیر، سڑے ہوئے گارے سے (٢٦)
اور جنوں کو ہم نے پیدا کیا اس سے پہلے آگ کی
لُو سے (٢٧) اور (اس) بات کو [illegible]

فرمایا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہ بیشک میں پیدا کرنے والا ہوں انسان کو ایک بجنے والے ،متغیر سڑے ہوئے گارے سے (۲۸) پس جب میں اس کو برابر کر لوں، اور پھونک دوں اس میں اپنی طرف سے روح ۔پس گر پڑو تم اس کے سامنے سجدے میں (۲۹) پس سجدہ کیا فرشتوں نے سب کے سب نے (۳۰) لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا ۔اس نے انکار کیا کہ ہو وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ (۳۱) فرمایا (اللہ نے) اے ابلیس! کیا ہے تجھ کو کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا (۳۲) کہنے لگا، میں نہیں ہوں کہ سجدہ کروں انسان کے سامنے جس کو پیدا کیا ہے تو نے بجنے والے ،متغیر، سڑے ہوئے گارے سے (۳۳) فرمایا (اللہ نے) نکل جاؤ یہاں سے ۔بیشک تم مردود ہو (۳۴) اور بیشک تجھ پر لعنت ہے انصاف کے دن تک (۳۵)

رابطہ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت کے دلائل بیان ہوئے ۔ پہلے بیرونی دلائل کا ذکر ہوا جن میں آسمانوں کی تخلیق، اس میں ستاروں اور سیاروں کو چلانا، پھر زمین کو پھیلانا اور اس میں طرح طرح کی چیزیں پیدا کرنا۔ پھر زمین و آسمان کے درمیان فضاؤں میں ہواؤں کو چلانا، بادلوں کو اٹھانا، باران رحمت کا نزول، انسانوں، جانوروں اور نباتات کے لیے پانی کی بہم رسانی اور اس کے نتیجے میں خوراک کا مہیا کرنا وغیرہ بیرونی دلائل تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے قیامت کا ذکر بھی فرمایا "اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ" تیرا پروردگار ان سب کو اس دن اکٹھا کرے گا۔ وہ انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر

قدرت رکھتا ہے۔ پھر حساب کتاب کی منزل آئے گی اور جزائے عمل واقع ہوگی۔ کہ یہ انسان کی پیدائش کے ساتھ لازم ہے۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اور اس میں اپنی قدرت اور وحدانیت کے اندرونی دلائل ذکر کیے ہیں۔ بیرونی دنیا کے علاوہ اللہ نے انسان کے اندر بھی غور و فکر کرنے والوں کے لیے بہت سے دلائل رکھے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ موجود ہے "وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" (الذاریات) تمہارے نفسوں کے اندر بھی اللہ نے بہت سے دلائل رکھے ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟ اسی طرح حشر اموات بھی خود انسان کے اندرونی دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔

تخلیق انسان

اللہ نے انسان کو پیدا کر کے اور اس کو وجود عطا کر کے بہت بڑا احسان فرمایا کہ اس سے نوع انسانی قائم ہوئی ہے انسان میں اگرچہ نافرمانی کا مادہ بھی پایا جاتا ہے مگر اللہ نے اس میں کمالات بھی بہت زیادہ پیدا کیے ہیں۔ اگر انسان ان سے کام لے تو ہر کمال خدا تعالیٰ کی معرفت کی دلیل بن سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ اور البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیا انسان کو مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ بجنے والے متغیر سڑے ہوئے گارے سے۔ صلصال اس خشک مٹی کو کہتے ہیں کہ جب اسے آگ پر پکایا جائے تو ٹھوکر لگانے سے بجنے لگتی ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ" انسان کو پیدا کیا خشک مٹی سے جیسے ٹھیکری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق ٹھیکری یعنی پکی ہوئی مٹی سے ہوئی ہے تو اس میں حرارت کا جزو بھی یقیناً موجود ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تمام روئے زمین کی مٹی اکٹھی کر کے لاؤ

انسانی و
کے عنا

پھر اس کو گوندھا گیا، اس کا گارا بنایا گیا، اور پھر اس سے انسان کا مجسمہ تیار ہوا عام مشہور ہے کہ انسان عناصر اربعہ یعنی مٹی، آگ، ہوا اور پانی کا مجموعہ ہے۔ یہ نظریہ یونانیوں کے ہاں مانا جاتا تھا جسے بعض دوسروں نے بھی تسلیم کیا۔ تاہم بعض لوگ انسان کو پانچ، سات یا اس سے بھی زیادہ عناصر کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ موجودہ سائنسی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان بیرونی دنیا میں پائے جانے والے لاتعداد عناصر کا مرکب ہے۔ باہر کی دنیا میں جتنے عناصر موجود ہیں، انسانی وجود ان سب کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کی مشینری بڑی پیچیدہ بنائی ہے اس کی باریک باریک رگیں اور دماغ کے پیچ وخم میں اپنی قدرت کے بے شمار کمالات اور حکمتیں رکھی ہیں اور پھر یہ ہے کہ روئے زمین کی مٹی کہیں نرم ہے کہیں سخت کہیں سفید ہے، کہیں سیاہ اور کہیں سرخ، اسی طرح یہ خواص انسان میں بھی پائے جاتے ہیں بعض لوگ نرم مزاج ہوتے ہیں اور بعض سخت مزاج بعض رنگت میں کالے، گورے اور سرخ ہوتے ہیں یہ مختلف خطوں کی مٹی کی تاثیر ہے۔

بہر حال اللہ نے انسان کی تخلیق کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو صلصال یعنی کھنکھنانے والی، حما یعنی بدلی ہوئی اور مسنون یعنی گلی سڑی مٹی سے پیدا کیا۔ اس بات کی تفصیل تو نہیں ملتی کہ آدم علیہ السلام کا مجسمہ تیار ہو کر کتنی دیر تک پڑا رہا اور پھر خشک ہوا۔ البتہ فرشتے اور ابلیس اس مجسمے کو دیکھ رہے تھے۔ ابلیس کے متعلق آتا ہے کہ اُس نے دیکھا کہ یہ مجسمہ اندر سے خالی ہے اور اس میں وسوسے ڈالنے کی گنجائش موجود ہے۔ اُدھر فرشتے بھی اس عجیب وغریب مجسمے کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ یہ کیسی مخلوق ہے۔ کافی عرصہ کے بعد اس مجسمے میں روح ڈالی گئی۔ بہر حال فرمایا کہ ہم نے کھنکھنانے والے متغیر اور سڑے

ہوئے گارے سے انسان کو تخلیق کیا۔ اس مٹی میں اللہ نے وہ کمال رکھا جو کسی دوسرے مادے میں نہیں پایا جاتا۔ اس میں خدا تعالیٰ کی ذاتی تجلیات کو برداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہے جو کسی دوسری مخلوق جنات ملائکہ وغیرہ میں بھی نہیں رکھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کائنات میں انسان کو برتری عطا فرمائی ہے۔

فرشتوں کی تخلیق انسان کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے ہوئی۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ایک ایسا دور بھی آیا جب اللہ تعالیٰ نے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں جبرائیل اور میکائیل کو پیدا فرمایا۔ ان فرشتوں کے مادہ تخلیق کی مثال شاہ صاحبؒ[1] نے اُس آگ سے دی ہے جسے موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر دیکھا تھا۔ وہ ایک خاص نوری یا ناری مادہ تھا جو درخت سے ظاہر ہو رہا تھا مگر درخت کو جلاتا نہیں تھا۔ جوں جوں اس کی روشنی میں اضافہ ہوتا تھا۔ درخت کی سرسبزی اور شادابی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ تو اس قسم کے حیرت انگیز مادے سے اللہ تعالیٰ نے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی تخلیق کی۔ پھر ملاءِ اعلیٰ کے دوسرے طبقے کے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے عالمِ مثال کے لطیف مادے سے[2] پیدا کیا، پھر باقی فرشتے پیدا کیے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تمام فرشتوں کا تعلق ایک ہی طبقے سے نہیں بلکہ ملاءِ اعلیٰ سے زمین تک ان کے[3] سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا مادہ تخلیق مختلف ہے۔ بعض کا مادہ برف کے ٹکڑے کی مانند ہے جس سے دھواں سا نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے بہرحال فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی مصلحت کی خاطر پیدا فرمایا۔ فرشتے، جنات، زمین اور آسمان وغیرہ تمام چیزیں پہلے پیدا کیں اور اس کے بعد انسان کو پیدا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو باقی تمام مخلوقات پر برتری اور فضیلت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۲۳ ج۱ ، [2] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۶ ج۱ [3] الخیر الکثیر ص۴۶، ص۴۷

عطا فرمائی ہے کیونکہ اس کے مادہ تخلیق میں جو لطافت اور کمال رکھا ہے اور جو خوبیاں اور صفات اس میں ودیعت کی ہے، وہ کسی دوسری مخلوق میں نہیں پائی جاتیں۔ مٹی جیسی حقیر چیز کو دیکھیں اور پھر اس سے پیدا ہونے والا اللہ کا شاہکار ملاحظہ کریں کہ انسان کو کیسی عظیم ہستی بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (التین) ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت اور بہترین قد وقامت میں پیدا فرمایا۔ اللہ کا یہ بھی ارشاد ہے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (بنی اسرائیل) ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔ انسان کا مجسمہ بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی طرف سے روح ڈالی۔ انسان کا شرف و کمال اسی روح کی وجہ سے ہے روح نہایت ہی لطیف چیز ہے اور اسی کی بدولت انسان کی صفات اور کمالات قائم ہیں۔

جنات کی تخلیق

انسان کی تخلیق کے بیان کے ساتھ اللہ نے نافرمان عنصر یعنی جنات کی تخلیق کا ذکر بھی کیا ہے۔ "وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ" اور اس سے پہلے ہم نے جنوں کو آگ کی لُو سے پیدا کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ جان سے مراد جنوں کا جد امجد ابلیس ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ وہ ان میں شامل نہیں بلکہ الگ ہے۔ تاہم ابلیس کی ساری اولاد نافرمان ہے مگر جنات میں سے فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی جیسا کہ سورۃ جن میں آتا ہے "وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ" ان میں نیک بھی ہیں اور بد بھی۔ بہر حال جنات کو اللہ تعالیٰ نے نارِ سموم سے پیدا کیا۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے "وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ" جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کی تخلیق میں مٹی کا عنصر زیادہ ہے جب کہ جنات اور شیاطین کی تخلیق میں آگ کا عنصر غالب ہے۔

انسان کی تخلیق

اب اللہ نے انسان کی تخلیق کا مفصل حال بیان فرمایا ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اور جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے یہ انسان کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے۔ فرمایا اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا میں بشر یعنی انسان کو پیدا کرنے والا ہوں۔ انسان کو بشر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی کھال نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ انسان کا خاصہ ہے کہ اس کی کھال واضح طور پر نظر آتی ہے جب کہ جانوروں اور پرندوں کی کھال پوشیدہ ہوتی ہے اور واضح طور پر نظر نہیں آتی۔ فرمایا میں انسان کو پیدا کرنے والا ہوں مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کھنکھنانے والے متغیر اور سڑے ہوئے مادے سے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انسان کی پیدائش کے متعلق پہلے ہی آگاہ کر دیا۔

روح کا مسئلہ

فرمایا فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ پھر جب میں اس کو برابر کر دوں وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں۔ برابر کرنے سے مراد ہے کہ جب میں آدم علیہ السلام کے تمام اعضا و قویٰ اپنے اپنے مقام پر رکھ دوں۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے، یہ حادث یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے اپنی روح پھونک دی۔ اس طرح حلول کا مسئلہ بن گیا کہ انسان خدا ہو گیا اور خدا آدم بن گیا۔ بلکہ روح تو مخلوق ہے اور اس کا تعلق عالم امر اور عالم خلق دونوں سے ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے کہ اے پیغمبر! لوگ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں تو کہہ دیں "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا"، کہ وہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔

روح کا مسئلہ بڑا پیچیدہ اور مشکل ہے۔ بڑے بڑے فلاسفروں اور علماء

نے اس پہ کلام کیا ہے۔ امام رازیؒ نے کتاب النفس لکھی ہے جس میں روح اور نفس کی جملہ معلومات جمع کی ہیں اور اس میں قدیم نظریات کا ذکر بھی کیا ہے۔ امام غزالیؒ نے بھی کتاب الروح کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں روح کی حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد امام ابن قیمؒ نے بھی کتاب الروح جیسی کتاب پیش کی۔ تاہم اس مسئلہ میں سب سے زیادہ کلام امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ روح کے بارے میں خواص تو بحث کر سکتے ہیں مگر عوام کے لیے یہی کافی ہے کہ روح امر ربی ہے جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل کا حوالہ پہلے دے دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روح کی نسبت اللہ کی طرف اس کی شرافت کی وجہ سے کی گئی ہے جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ کو یہ نام اُن کی شرافت کی وجہ سے دیے گئے ہیں۔

فرشتوں کو سجدے کا حکم

فرمایا جب میں آدم کو برابر کر دوں اور اس میں اپنی طرف سے روح ڈال دوں فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اللہ نے آدم علیہ السلام میں روح ڈال دی فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ اس ضمن میں متکلمین اور علما سارے یہی کہتے ہیں کہ عالم بالا اور عالم زیریں کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حکم ملا اعلیٰ کے فرشتوں کو نہیں تھا بلکہ ملائکہ عنصرین کو تھا جن کی تخلیق عناصر سے ہوئی تھی۔ ابلیس اور شیاطین بھی منجملہ ان میں سے ہیں، اس لیے اُن کو بھی سجدے کا حکم ہوا تھا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے کہ جب ابلیس نے سجدہ نہ کیا تو اللہ نے فرمایا "مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ" تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح فرشتوں کو سجدے کا حکم ہوا تھا، اسی طرح

ابلیس کو بھی حکم تھا، مگر اس نے انکار کر دیا۔

سجدۂ تعظیمی

اللہ تعالیٰ نے جس سجدے کا حکم فرشتوں اور ابلیس کو دیا تھا، وہ سجدہ تعظیمی تھا۔ سجدہ عبادت اللہ کے سوا کسی کے لیے روا نہیں۔ اگر کوئی کرے گا تو اس پر کفر لازم آئے گا۔ یہ سجدہ تعظیم و تکریم ایسا ہی ہے جیسا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کے سامنے کیا تھا۔ قدیم زمانے میں لوگ سجدہ تعظیمی بادشاہ یا کسی بڑے آدمی کے سامنے بھی کرتے تھے۔ اس کو سجدہ تحیہ یعنی ملاقات کا سجدہ بھی کہتے ہیں اور یہ پہلی امتوں میں ممنوع نہیں تھا مگر اس آخری امت کے لیے سجدہ تعظیمی بھی حرام ہے خواہ یہ کسی بادشاہ پیر، استاد یا قبر کے سامنے کیا جائے۔ البتہ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ فرق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی انسان یا قبر کو سجدہ تعظیمی کرتا ہے، تو وہ حرام ہے، سجدہ کرنے والے پر کفر کا فتویٰ نہیں لگ سکتا۔ اور اگر کوئی شخص کسی مخلوق کے سامنے عبادت کا سجدہ بجا لاتا ہے تو یہ صریح کفر ہوگا کیونکہ عبادت کا سجدہ ہر امت میں حرام ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ سجدہ آدم علیہ السلام کے سامنے نہیں ہوا تھا بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کو ہی تھا۔ اور آدم علیہ السلام بمنزلہ قبلہ کے تھے جس طرح ہم بیت اللہ شریف کو قبلہ اور جہت مان کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں، اسی طرح فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو قبلہ مان کر اللہ کو سجدہ کیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ خانہ کعبہ مرکزِ عالم ہے، اس کی سمت پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات بہت زیادہ پڑتی ہیں، تو ہمارا سجدہ دراصل اس تجلی الٰہی کو ہوتا ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام بھی بمنزلہ قبلہ تھے جن کی طرف فرشتوں نے سجدہ کیا۔

بعض فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کے لیے سجدے کا حکم ہوا تو اس وقت اُن کے قلبِ مبارک پر اللہ تعالیٰ کی ذاتی تجلیات

پڑھ رہی تھیں اس لیے آدم علیہ السلام کی سمت میں فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا۔
بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی محض تعظیم کرائی تھی اور فرشتوں
نے اس حکم کی بجا آوری کی۔

ابلیس کا انکار

بہرحال تمام فرشتوں نے سجدہ کیا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ماسوائے ابلیس کے
اَبٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ اس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے
والوں کے ساتھ ہو قَالَ اللہ نے فرمایا یٰٓاِبْلِیْسُ مَا لَکَ اَلَّا تَکُوْنَ
مَعَ السّٰجِدِیْنَ اے ابلیس! تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا
قَالَ کہنے لگا لَمْ اَکُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ
صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ میں اس بشر کو سجدہ نہیں
کر سکتا جسے تو نے کھنکھنانے والے متغیر گارے سے پیدا کیا ہے
گویا ابلیس نے آدم علیہ السلام پر اپنی برتری ظاہر کی۔ سورۃ اعراف میں
ہے "قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں "خَلَقْتَنِیْ
مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ" تو نے مجھے آگ سے
پیدا کیا ہے اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق کیا ہے۔ اور آگ مٹی
سے فائق ہے، لہٰذا میں مٹی جیسی ادنیٰ چیز کے سامنے سجدہ نہیں کر سکتا
بشار ابن برد شاعر نے کہا ہے ؎

اِبْلِیْسُ اَفْضَلُ مِنْ اَبِیْکُمْ اٰدَمَ
فَتَبَیَّنُوْا یَا مَعْشَرَ الْاَشْرَارِ
اَلنَّارُ عُنْصُرُهٗ وَاٰدَمُ طِیْنَةٌ
وَالطِّیْنُ لَا یَسْمُوْ سُمُوَّ النَّارِ

ابلیس تمہارے جد امجد آدم علیہ السلام سے زیادہ فوقیت رکھتا
ہے کیونکہ ابلیس کا عنصر آگ ہے اور آدم کا مٹی۔ اور آگ کو مٹی پر فوقیت
حاصل ہے یہ ابلیس کا تکبر اور حسد تھا کہ اس نے آدم علیہ السلام پر

اپنی برتری ظاہر کی تکبر بہت بری بیماری ہے۔ اسی لیے بزرگان دین جب کسی کی تربیت کرتے ہیں تو تکبر سب سے آخر میں نکلتا ہے۔ یہ سب سے خطرناک اخلاق ہے تو شیطان نے اکڑ کی وجہ سے کہا کہ میں آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔

شیطان راندۂ درگاہ

قَالَ اللہ نے فرمایا فَاخْرُجْ مِنْهَا یہاں سے نکل جاؤ۔ فَإِنَّكَ رَجِيمٌ بیشک تم مردود ہو، تم میں تکبر پیدا ہوگیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے آبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ" اس نے انکار اور تکبر کیا تو کافروں میں ہوگیا۔ حضرت شمس الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں ہے کہ ابلیس نے سات لاکھ سال عبادت کی مگر اللہ کے ایک حکم کی سرتابی کی وجہ سے ساری عبادت رائیگاں چلی گئی۔ فرمایا، یاد رکھو! وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ تم پر قیامت تک لعنت ہی برستی رہیگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت آنے پر لعنت سے نکل جائیگا بلکہ قیامت برپا ہونے کے بعد تو جزائے عمل کی منزل آنے والی ہے اور پھر اس کا عذاب تو مزید بڑھ جائے گا۔ کافروں کے متعلق سورۃ بقرہ میں اللہ کا واضح حکم ہے" إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ" جو شخص کفر کی حالت میں مر گیا، اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے عذاب میں نہ تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائیگی۔ بہرحال فرمایا کہ اے ابلیس! تم پر قیامت تک لعنت پڑتی رہیگی اور پھر آخرت کا عذاب تو دائمی ہوگا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٣٦﴾ قَالَ
فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ
الْمَعْلُوْمِ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ
لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ
مُسْتَقِيْمٌ ﴿٤١﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿٤٢﴾
وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٤٣﴾
لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ
ع ۳ / ۱۹ / ۳ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿٤٤﴾

ترجمہ:- کہا (شیطان نے) اے پروردگار! پس
مہلت دے مجھ کو اُس دن تک جس دن اِن لوگوں
کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا ﴿٣٦﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ
نے) تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے ﴿٣٧﴾ ایک معلوم
وقت کے دن تک ﴿٣٨﴾ کہا (شیطان نے) اے پروردگار!
اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا ہے، میں ضرور

مزین کر کے دکھاؤں گا اُن کے لیے زمین میں (برائیوں کو) اور میں ضرور گمراہ کروں گا اِن سب کو (۳۹) ماسوائے تیرے مخلص بندے اِن میں سے (۴۰) فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) یہ ہے راستہ سیدھا مجھ تک (۴۱) بیشک میرے بندے کہ نہیں ہے اِن پر کوئی غلبہ، مگر وہ جس نے پیروی کی تیری گمراہوں میں سے (۴۲) اور بیشک جہنم اِن سب کے وعدے کا وقت ہے (۴۳) اور اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصہ ہے تقسیم کیا ہوا (۴۴)

ربطِ آیات

پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا ذکر کیا۔ ایک معمولی چیز یعنی سڑے ہوئے بدبودار گارے والی مٹی سے انسان کو پیدا کیا اور اسے کمال درجے کی حیثیت اور شان عطا فرمائی، اس میں روح ڈالی، فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا۔ ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اپنی برتری جتلانے کی کوشش کی کہ میں ناری ہو کر خاکی کے سامنے کیسے سجدہ بجا لاؤں۔ اُس نے تکبر میں آکر اللہ تعالیٰ کے حکم کی سرتابی کی، تو اللہ نے اسے مردود ٹھہرا دیا اور فرمایا کہ قیامت تک تجھ پر لعنت ہی برستی رہے گی۔

مہلت کی درخواست

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے بعد شیطان نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت طلب کی، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے قَالَ شیطان نے کہا رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اے پروردگار! مجھے مہلت دے اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ اُس دن تک کے لیے جب سب لوگ دوبارہ جی اٹھیں گے اَنظار مہلت دینے کو کہتے ہیں۔ اس کی مثال حدیث شریف میں ملتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمانِ مبارک ہے مَنۡ اَنۡظَرَ مُعۡسَرًا اَوۡ تَجَاوَزَ

عَنْهُ فَاَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ یَوْمٍ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ جو آدمی کسی تنگ دست کو مہلت دے یا قرضہ معاف ہی کر دے تو اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن اپنے عرش کے سائے میں جگہ دیگا، جس دن اُس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ تو بہر حال ابلیس نے بھی قیامت تک کے لیے مہلت مانگی تو اللہ رب العزت نے فرمایا قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ پس بیشک تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے شیطان کی درخواست قبول کر لی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان جیسے بدترین کافر کی دعا فوراً قبول کر لی جس کا یہ مطلب نہیں ہے جس کی دعا قبول کر لی جائے وہ لازماً مقبول ہستی ہوتا ہے۔ یعنی دعا کی قبولیت دعا کرنے والے کی مقبولیت کی شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی بدترین مخلوق کی دعا بھی قبول کر لے، اس کا انحصار اس کی حکمت اور مصلحت پر ہے مومن کی دعا کی قبولیت تو اس کی سعادت کی بات ہے مگر ہو سکتا ہے کہ دنیوی مفاد کے لیے دعا کسی نافرمان کی بھی قبول کر لے۔ وہ مالک الملک اور مختارِ کل ہے اُس کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں مگر یہ اس کی سعادت کی علامت نہیں سمجھی جائے گی۔

یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ شیطان نے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک اپنی زندگی کی مہلت طلب کی جس سے اُس کی مراد یہ تھی کہ یوم البعث تک تو اُسے ویسے ہی زندگی حاصل ہو جائے گی اور اُس دن سب کو پھر سے اٹھنا ہے، اس طرح وہ موت کی کٹھن گھاٹیوں سے بچ جائے گا مگر اللہ نے فرمایا کہ تمہیں مہلت دیدی ہے مگر وہ یوم البعث تک نہیں بلکہ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ معلوم وقت کے دن تک یعنی اُس دن تک جس دن قیامت برپا ہوگی۔ گویا اُسے قیامت

کے اعلان کے ساتھ ہی باقی ماندہ مخلوق کی طرح موت سے ہمکنار ہونا پڑیگا
قیامت سے متعلق قرآن وحدیث میں تصریح موجود ہے کہ دو دفعہ صور پھونکا
جائے۔ جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ ہر زندہ ہستی پر
موت طاری ہو گی اور کوئی بھی چیز باقی نہیں رہے گی۔ پھر چالیس سال کے بعد
دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ دوبارہ زندہ ہو جائیں گے تو اللہ تعالےٰ
نے شیطان کو رعایت پہلے صور تک دی تاکہ موت اس پر بھی طاری ہو۔
روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شیطان سخت پریشان ہو گا، فرشتے
اس کو گھیریں گے اُسے بڑی تلخی ہو گی اور وہ بہت تڑپے گا۔ پھر دوسرے صور
پر وہ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور جزائے عمل کے لیے پیش ہو گا

راہ گمراہ کرنا ، لزوم

بہر حال جب شیطان کو مہلت مل گئی قَالَ تو کہنے لگا رَبِّ بِمَآ
اَغْوَيْتَنِیْ اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا ہے۔ اب میں یہ کرونگا
لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ ان لوگوں کے لیے میں زمین میں مزین
کروں گا یعنی اس سطح ارضی پر ہونے والی تمام برائیوں اور بے حیائیوں کو
لوگوں کے لیے خوشنما کر کے دکھاؤں گا تاکہ انہیں کی طرف مائل ہو جائیں اور
تیرے راستے سے ہٹ جائیں گویا کہ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ہ
ضرور سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے، کہ
شیطان نے یوں کہا تھا کہ اے اللہ! جب تک انسانوں کی روحیں ان کے
جسموں میں موجود ہیں۔ میں انھیں گمراہ کرتا رہوں گا اور ان کی گمراہی کا کوئی
موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے تمام وسائل
بروئے کار لاؤں گا۔ سورۃ اعراف میں ہے میں تیری عبادت کے راستے سے
آ کر بھی گمراہ کروں گا۔ میں ان کے آگے سے بھی آؤں گا اور پیچھے سے بھی
ان کی دائیں طرف سے بھی آؤں گا اور بائیں طرف سے بھی۔ میں ان کو دنیا
کے معاملات کے اعتبار سے بھی گمراہ کروں گا اور آخرت کے اعتقاد

کے راستے سے آکر بھی گمراہ کروں گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان نیکی کے راستے پر چلنا شروع کرتا ہے تو شیطان راستے میں آکر بیٹھ جاتا ہے۔ جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے، روزہ رکھتا، جہاد یا حج کے لیے نکلتا ہے تو شیطان اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ مخلوق خدا کو کفر، شرک، بدعات، رسوم باطلہ، عیاشی، فحاشی اور بے حیائی کے کاموں کو مزین کر کے دکھائے گا اور اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا اللہ نے بھی فرمایا کہ مجھے میری عزت و جلال کی قسم جب تک میرے بندے اپنے گناہوں اور غلطیوں کی معافی طلب کرتے رہیں گے، میں انہیں معاف کرتا رہوں گا۔

مخلصین کی حفاظت

لوگوں کو گمراہ کرنے کے عزم کے ساتھ شیطان نے کچھ استثناء بھی کی ہے، کہا میں سب کو گمراہ کروں گا اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ سوائے تیرے مخلص بندوں کے، یعنی تیرے برگزیدہ اور منتخب بندوں پر میرا داؤ نہیں چل سکے گا، باقی سب کو اپنے دام میں پھنسا لوں گا۔ قَالَ اللہ نے فرمایا هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ یہی مجھ تک سیدھا راستہ ہے، اللہ نے مزید فرمایا اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ بیشک میرے بندے ایسے ہیں کہ تجھے ان پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا، یعنی تم انہیں گمراہ نہیں کر سکو گے اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ سوائے ان گمراہوں میں سے جنہوں نے تیری پیروی اختیار کر لی۔ ایسے لوگوں کو تو گمراہ کر سکے گا۔ وگرنہ میرے مخلص بندے تیرے دام میں نہیں پھنسیں گے۔

مفسرین کرام اس بات میں کلام کرتے ہیں کہ شیطان نے تو یہ کہا کہ تیرے مخلص بندے میرے قابو میں نہیں آئیں گے مگر حضرت آدم علیہ السلام

اور جو اللہ کے برگزیدہ بندے ہونے کے باوجود شیطان کے وسوسے میں آگئے۔ اسی طرح بعض دوسرے انبیاء اور بزرگ ہستیوں کے متعلق بھی اس قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ خود موسیٰ علیہ السلام سے جب ایک لغزش ہو گئی تو انہوں نے یہی کہا تھا "هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" (القصص) یہ تو شیطان کا عمل ہوا ہے۔ گویا شیطان نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی پھسلا دیا۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے مخلص بندوں کے استثناء کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان سے کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں کرا سکے گا، جس سے بندے توبہ نہ کر سکیں یا جن کی معافی کی گنجائش نہ ہو۔ اگر شیطان وسوسہ اندازی کرے گا تو اللہ کے بندے معافی مانگ لیں گے اور انہیں معافی مل جائے گی۔ غرضیکہ شیطان مخلص بندوں سے کوئی ناقابل معافی گناہ کا ارتکاب نہیں کرا سکتا۔ اور اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ کے مخلص بندوں پر شیطان کی معمولی معمولی باتیں بھی اثر انداز نہ ہوں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر ایک قلعہ کی مانند ہے جس کی وجہ سے مومن شیطان کے وساوس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ سورۃ اعراف میں یہ بھی موجود ہے "وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ" کہ اے اللہ! تو اپنے اکثر بندوں کو شکر گزار نہیں پائے گا، تو گویا لوگوں کی اکثریت ناشکر گزار ہی ہو گی۔ چنانچہ یہی ہوا "وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ" ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا اور لوگوں کی اکثریت نے شیطان کی پیروی کی۔ چنانچہ دنیا بھر میں نافرمانوں کی اکثریت ہی رہی ہے، اور آج بھی یہی حال ہے کہ فرمانبردار تھوڑے ہیں

فرمایا، جو بھی تیرا اتباع کر کے گمراہ ہو جائے گا "وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ" ایسے تمام لوگوں کے وعدے کا مقام جہنم ہے اور جہنم کی تعریف یہ ہے "لَهَا سَبْعَةُ

اَبْوَابٍ اس کے سات دروازے ہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ سات گیٹ سات طبقات کے لحاظ سے ہیں۔ جہنم کے کل سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا الگ الگ دروازہ ہے۔ ہر طبقے کے لوگ اپنے مخصوص دروازے سے جہنم میں داخل ہوں گے جہنم کے ان سات طبقات کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ یعنی جہنم، سعیر، لظی، حطمہ، سقر، جحیم اور ہاویہ۔

بعض فرماتے ہیں کہ جہنم کے دروازے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے ہوں گے۔ مثلاً کفر اور شرک کرنے والے ایک گیٹ سے داخل ہوں گے، زناکار اور اس سے متعلقین دوسرے دروازے سے ظلم کرنے والوں کا دروازہ علیحدہ ہوگا۔ حقوق ضائع کرنے والوں اور سرکش لوگوں کے داخلے مختلف دروازوں سے ہوں گے۔ گویا کل جرائم کو سات گروپوں میں تقسیم کر کے ان کے لیے ایک ایک دروازہ مختص کر دیا جائے گا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حشر کے میدان میں مختلف گروہ یا جماعتیں بن جائیں گی۔ مثلاً سو نمبر کی نیکی والے ایک صف میں کھڑے ہو جائیں اور ننانوے نمبر والے دوسری صف میں۔ اسی طرح جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے بھی الگ الگ صف بندی ہوگی اور اس طرح لوگ جنت یا جہنم میں داخل ہوں گے۔ تاہم فرمایا کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ ان میں سے ہر دروازے کے لیے انسانوں کا ایک تقسیم شدہ حصہ ہے جو اس میں سے داخل ہوگا۔

جہنم کے سات دروازے ہیں تو جنت کے آٹھ ہیں۔ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جنت میں بھی لوگ اعمال کے لحاظ سے داخل ہوں گے۔ مثلاً ایک دروازے سے صرف روزہ دار داخل ہوں گے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ اور آٹھواں دروازہ محض صحیح عقیدے والے لوگوں کے لیے

مخصوص ہوگا۔ ایسے لوگ جن کے پاس عمل تو کوئی نہیں ہوگا، مگر عقیدہ بالکل درست ہوگا، ان کے ایمان اور توحید کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل وکرم سے اس دروازے میں داخل کریگا۔ جس شخص کا عقیدہ فاسد ہو گا، وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

یہ جزائے عمل کا ذکر بھی ہوگیا، شیطان کے اغوا اور اس کی پیروی کرتے والوں کی بات ہوئی۔ اب اگلی آیات میں اللہ نے اپنے نیک بندوں یعنی متقین اور ان کو ملنے والے انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّٰتٍ وَّعُيُونٍ ﴿٤٥﴾
ادْخُلُوهَا بِسَلَٰمٍ ءَامِنِينَ ﴿٤٦﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي
صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَٰنًا عَلَىٰ سُرُرٍ
مُّتَقَٰبِلِينَ ﴿٤٧﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُم
مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٤٨﴾ نَبِّئْ عِبَادِيٓ أَنِّيٓ أَنَا
الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٤٩﴾ وَأَنَّ عَذَابِي
هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿٥٠﴾ وَنَبِّئْهُمْ عَن
ضَيْفِ إِبْرَٰهِيمَ ﴿٥١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ (وقف لازم)
فَقَالُوا سَلَٰمًا قَالَ إِنَّا مِنكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾
قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَٰمٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾
قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰٓ أَن مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ
فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بَشَّرْنَٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا
تَكُن مِّنَ الْقَٰنِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَن يَقْنَطُ
مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِۦٓ إِلَّا الضَّآلُّونَ ﴿٥٦﴾ قَالَ فَمَا
خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٧﴾ قَالُوٓا إِنَّآ
أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿٥٨﴾ إِلَّآ ءَالَ لُوطٍ

إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٩﴾ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِينَ ﴿٦٠﴾ ع

ترجمہ :- بیشک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۵﴾ (اُن سے کہا جائے گا) داخل ہو جاؤ اس کے اندر سلامتی کے ساتھ امن سے ﴿۴۶﴾ اور ہم نکالیں گے جو کچھ اُن کے سینوں میں ہو گا کچھ کھوٹ (اس حال میں کہ) وہ بھائی بھائی ہوں گے تختوں پر بیٹھے ہوئے آمنے سامنے ﴿۴۷﴾ نہ پہنچے گی اُن کو اِن (بہشتوں) میں کوئی تھکاوٹ، اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے ﴿۴۸﴾ بتلا دیں آپ میرے بندوں کو کہ بیشک میں بہت بخشش کرنے والا مہربان ہوں ﴿۴۹﴾ اور بیشک میرا عذاب وہ دردناک عذاب ہے ﴿۵۰﴾ اور بتلا دیں اُن کو ابراہیم (علیہ السلام) کے مہمانوں کے بارے میں ﴿۵۱﴾ جب وہ داخل ہوئے اُن کے پاس تو انہوں نے کہا سلام۔ (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا تحقیق ہم تم سے کچھ خوف معلوم کرتے ہیں ﴿۵۲﴾ انہوں نے کہا کہ آپ نہ ڈریں، بیشک ہم آپ کو خوشخبری سناتے ہیں ایک علم دار لڑکے کی ﴿۵۳﴾ (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا، کیا تم مجھے خوشخبری سناتے ہو حالانکہ پہنچا ہے مجھ کو بڑھاپا۔ پس کس چیز کی تم مجھے خوشخبری دیتے ہو ﴿۵۴﴾ کہنے لگے ہم خوشخبری سناتے ہیں تم کو حق کے ساتھ پس نہ ہوں آپ نااُمید ہونے والوں میں سے ﴿۵۵﴾

کہا (ابراہیم علیہ السلام نے) اور نہیں ناامید ہوتے اپنے رب کی رحمت سے مگر وہی لوگ جو گمراہ ہوتے ہیں (۵۶)
کہا (ابراہیم نے) پس کیا حال ہے تمہارا، اے بھیجے ہوئے لوگو! (۵۷) کہنے لگے، تحقیق ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف (۵۸) مگر لوط علیہ السلام کے گھر والے، تحقیق ہم بچانے والے ہیں اُن سب کو (۵۹) مگر اس کی بیوی۔ ہم نے ٹھہرا دیا ہے کہ بیشک وہ (اُن کی بیوی) البتہ پیچھے رہنے والوں میں ہو گی (۶۰)

ربط آیات

پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی نعمت کا ذکر کیا اور اس سلسلے میں شیطان کے اغوا اور اس کی طرف سے اللہ کے حکم کی سرتابی کا ذکر کیا۔ اس کے نتیجے میں اللہ نے اُسے مردود ٹھہرایا۔ پھر اس نے مہلت طلب کی تو اللہ نے قیامت تک کے لیے مہلت بھی دے دی شیطان نے قسم اٹھا کر کہا کہ وہ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرتا رہے گا، البتہ مخلص بندوں پر اُس کا وار کارگر نہیں ہو سکے گا۔ اللہ نے فرمایا یہ اخلاص ہی میرا سیدھا راستہ ہے۔ میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو گا۔ البتہ گمراہ لوگ تیری پیروی کر کے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیں گے جو اُن کے وعدے کی جگہ ہے۔ پھر فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے سے نافرمانوں کا منقسمہ حصہ داخل ہو گا۔

متقین کے لیے بہشت

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے متقین کے لیے بہشت اور وہاں ملنے والے انعامات کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ بیشک متقی لوگ باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں متقی وہ لوگ ہیں جو کفر، شرک، کبائر، فواحش سے بچتے ہیں۔ اور پھر بتدریج مشتبہ اور مشکوک چیزوں اور گناہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے

بھی اجتناب کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کمال درجے کے متقی ہوتے ہیں۔ تو تقویٰ کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان بدعقیدگی، اکبائر، کفر، شرک اور نفاق سے بچ جائے سورۃ توبہ میں اللہ نے ایمان والوں کی سات صفات بیان کی ہیں جن میں ساتویں صفت ہے "وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ" یعنی وہ اللہ کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں اور یہی تقویٰ ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ اپنی کتاب "الطاف القدس" میں لکھتے ہیں[1] "تقویٰ محافظت بر حدود شرع است" یعنی شریعت کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرنے اور ان پر قائم رہنے کا نام تقویٰ ہے۔ تو فرمایا متقی لوگ باغات اور چشموں میں ہوں گے جب وہ وہاں پہنچیں گے تو حکم ہوگا۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ داخل ہو جاؤ اس بہشت میں سلامتی اور پورے اطمینان کے ساتھ۔ یہاں تمہیں ہر قسم کی سلامتی حاصل ہوگی۔ دکھ اور تکلیف سے پاک ہوگے۔ اور کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔

کدورت سے پاک دل

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے متعلق ایک اور بات بھی بیان فرمائی ہے وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ" ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کھوٹ، کینہ یا عداوت وغیرہ ہوگی۔ کوئی شخص دل میں اس قسم کی بات لے کر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اس مقام میں کدورت کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ وہاں ہر ایک کا سینہ صاف ہوگا اور تمام جنتی ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں گے اگر دنیا میں کسی کو کسی دوسرے جنتی کے خلاف شکر رنجی بھی تھی، تو وہاں پہنچ کر صفائی ہو چکی ہوگی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ پلصراط سے گزر جانے کے بعد لوگوں کو پھر روک دیا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ اگر کسی جنتی نے کسی سے کوئی بدلہ لینا ہے تو ابھی لے لے کیونکہ جنت میں داخلے سے پہلے

---

[1] الطاف القدس مترجم ص۹۳

ہر قسم کا بغض، عداوت اور دشمنی کو سینوں سے نکال لیا جائے گا۔
پھر جنت میں نہ صرف یہ کہ کدورت کو نکال دیا جائے گا بلکہ تمام جنتی
اِخْوَانًا ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کریں گے، اور ان کی
حالت یہ ہوگی عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے
سامنے بیٹھے ہوں گے۔ رحمت کے اس مقام میں نفرت کی بجائے محبت
اور دشمنی کی بجائے دوستی ہوگی۔ وہاں پر کوئی لغو اور بیہودہ بات نہیں ہوگی
اس کے علاوہ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وہاں پر انہیں کوئی تھکاوٹ
یا تکلیف نہیں پہنچے گی وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ اور وہ وہاں
سے نکالے بھی نہیں جائیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
جنتیوں سے فرمائیگا کہ یہاں پر تمہیں کوئی بیماری لاحق نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ
تندرست اور جوان رہو گے۔ دنیا میں ملنے والی ہر نعمت اور آسائش کے
متعلق کھٹکا رہتا ہے کہ یہ چھن نہ جائے یا انسان خود اس سے مستفید ہونے
کے قابل نہ رہے مگر جنت میں جا کر ایسا کوئی خدشہ نہ ہوگا۔ وہاں پر نہ تو
کوئی نعمت چھن جانے کا خوف ہوگا اور نہ کسی جنتی کے نکالے جانے کا
خطرہ۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کے انعامات کا ذکر کر کے ترہیب
کے بعد ترغیب کا ذکر بھی کر دیا۔ گذشتہ درس میں منکرین کے لیے عذاب
کی بات تھی اور اب اللہ کی رحمت کا ذکر بھی ہو گیا۔

خوف اور امید

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مکی زندگی کے دوران ایک موقع پر حضور
علیہ السلام بیت اللہ شریف کی طرف آ رہے تھے کہ جب باب الی شیبہ
کے قریب پہنچے تو وہاں صحابہؓ کی ایک جماعت موجود تھی جو کسی بات
پر ہنس رہے تھے، حضور علیہ السلام نے فرمایا، کیا بات ہے کہ میں تمہیں
ہنستے ہوئے دیکھ رہا ہوں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آگے جہنم بھی ہے۔
حضور علیہ السلام کی زبان سے یہ بات سن کر صحابہ سخت پریشان ہو گئے۔ پھر

جب آپ حطیم میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی نَبِّئۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ میرے بندوں کو تبلا دو کہ میں بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہوں ۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرما دیں وَ اَنَّ عَذَابِیۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ کہ بیشک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو اللہ کی بخشش اور رحمت سے بالکل مایوس ہی ہو جائیں کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے اور نہ ہی بالکل بے فکر ہو جائیں کیونکہ اس کا عذاب بھی بڑا شدید ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کا ایمان خوف اور اُمید کے درمیان ہونا چاہیئے ۔ اُسے اللہ کی رحمت کی اُمید بھی ہو اور اس کی سزا کا خوف بھی ۔

ابراہیم علیہ السلام کے لیے خوشخبری

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی دو شانوں یعنی رحمت اور غضب کو سمجھانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر کیا ۔ ارشاد ہوتا ہے وَنَبِّئۡهُمۡ عَنۡ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ میرے بندوں کو ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے متعلق تبلا دیں اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا جب وہ مہمان ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کیا ۔

اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے سلام کے جواب کا ذکر نہیں ہے ۔ البتہ سورۃ الذٰریٰت میں ہے "اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ" یعنی جب فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے ...

پاس آئے تو انہوں نے سلام کیا ۔ تو اس کے جواب میں ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کہا ۔ آگے یہ بھی آتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے فوراً چلے گئے "فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِيۡنٍ" اور بچھڑا کا تلا ہوا گوشت لے آئے پھر جب دیکھا کہ مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں ۔

قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ تو کہنے لگے، میں تم سے خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کو نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا تھا، دشمن، چور یا ڈاکو اُس کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اسی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کو بھی خوف محسوس ہوا تو قَالُوْا لَا تَوْجَلْ مہمان کہنے لگے، خوف نہ کھاؤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ہم تمہیں علم والے بچے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ یہ خوشخبری حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق تھی جو حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق سورۃ الصفت میں ہے "فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ" ہم نے آپ کو بُردبار بیٹے کی خوشخبری دی۔ آپ کے حلم کا واقعہ تو تاریخ میں موجود ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ بہر حال حضرت اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام دونوں ہی اللہ کے جلیل القدر نبی تھے۔ بہر حال مہمانوں نے اپنا تعارف خود کرا دیا کہ اُن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ اللہ کے فرشتے ہیں اور آپ کو خوشخبری دینے کے لیے آئے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان فرشتوں کی تعداد دس تھی جن میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام بھی شامل تھے۔

ابراہیم کی حیرانگی

فرشتوں کی زبان سے خوشخبری کی بات سن کر ابراہیم علیہ السلام نے کہا قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ کیا تم مجھے ایسے وقت میں خوشخبری دے رہے ہو۔ جب کہ مجھ پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ تم مجھے کیسی خوشخبری سناتے ہو۔ مترجم، مفسر قرآن شاہ عبدالقادر محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ عالم اسباب میں انبیاء بھی اسباب کی بات ہی کرتے ہیں۔ آپ کی عمر مبارک سو سال ہو چکی تھی اور بیوی بھی بانجھ تھی۔ تو ان حالات میں بیٹے کی خوشخبری پر اُن کی حیرانگی فطری امر تھا

تاہم فرشتوں نے کہا فَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ ہم آپ کو بالکل ٹھیک ٹھیک خوشخبری دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ لہٰذا آپ نا اُمیدوں میں سے نہ ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے جواب میں قَالَ فرمایا، مایوسی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ اپنے پروردگار کی رحمت سے نا اُمید تو گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ کے نبی کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ مگر ظاہری اسباب کی بناء پر حیرانگی ہوئی ہے کہ اس عمر میں یہ کیسے ممکن ہو گا۔

عالمِ اسباب میں رہ کر اسباب پر نگاہ تمام انبیاء علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے۔ جنگ احد کے موقع پر حضور علیہ السلام اوپر نیچے دو زرہیں پہن کر تشریف لائے جس سے امت کی تعلیم مقصود تھی کہ عالمِ اسباب میں اسباب ہی اختیار کرنے کا حکم ہے، اگرچہ فتح و شکست تو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اِن اسباب کو اختیار کرنے کے باوجود حضور علیہ السلام کو بڑی تکلیف پہنچی آپ گڑھے میں گر گئے، سر مبارک اور دانت زخمی ہو گئے۔ سورۃ یوسف میں موجود ہے کہ اللہ نے یعقوب علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی کہلوایا تھا۔ "اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ" اللہ کی رحمت سے تو کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ اور بے فکر ہو جانا بھی کفر کی بات ہے۔ اصل ایمان بین الخوف والرجاء یعنی خوف اور امید کے درمیان ہے۔ اپنے انبیاء کے متعلق بھی اللہ نے یہی فرمایا ہے "يَدْعُوْنَنَا خَوْفًا وَّطَمَعًا" وہ ہمیں خوف اور اُمید کے ساتھ پکارتے ہیں۔

قومِ لوط پر عذاب

ابراہیم علیہ السلام کو یہ تو پتہ چل گیا کہ اُن کے مہمان اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور انہوں نے آپ کو اہلِ علم بیٹے کی خوشخبری بھی

دی مگر پھر بھی ان کی آمد کے متعلق آپ مطمئن نہیں تھے۔ آپ کا قلب صافی گواہی دے رہا تھا کہ ان فرشتوں کے آنے کا کوئی اور مقصد بھی ہے چنانچہ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ کہا اے بھیجے ہوئے لوگو! تمہارے آنے کا اصل مقصد کیا ہے۔ خطب کا لغوی معنی کام یا حالت ہوتا ہے اور مراد یہ بھی تم کس کام کے لیے آئے ہو۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ کہنے لگے ہمیں مجرم قوم کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ اُن کو اُن کے بُرے عمل کی سزا دی جاسکے اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی تباہی کا حال تو ذکر نہیں کیا، البتہ کنایہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے فرشتے اُس بدبخت قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے آئے تھے۔ یہاں پر لوط علیہ السلام کے گھر والوں کا ذکر ہے کہ آپ کی بیوی کے سوا باقیوں کو عذاب الٰہی سے بچا لیا جائے گا۔

فرمایا ہم مجرم کو سزا دینے کے لیے آئے ہیں اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ سوائے لوط علیہ السلام کے گھر والوں کے۔ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ تحقیق ہم بچانے والے ہیں اُن سب کو۔ اِلَّا امْرَاَتَهٗ سوائے ان کی بیوی کے قَدَّرْنَآ ہم نے اندازہ کر لیا ہے۔ ٹھہرا لیا ہے یا ہم جانتے ہیں اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہو گی وہ مجرم قوم کے ساتھ ہی بستی میں رہ جائیگی اور عذاب کا شکار ہو گی جب کہ باقی اہل خانہ آپ کے ساتھ بستی سے نکل جائیں گے اور عذاب الٰہی سے بچ جائیں گے۔ سورۃ ہود میں تفصیلات موجود ہیں کہ ہم نے لوط علیہ السلام سے فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کو بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔ چنانچہ اہل خانہ میں سے آپ کی بیوی ہی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر اس کا حشر بھی نافرمان قوم کے ساتھ ہی ہوا اللہ نے فرمایا ہم نے ان کی پوری بستی کو الٹ دیا اور اوپر سے پتھروں

کی بارش بھی کی جس سے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ یہی مضمون اگلے رکوع میں بھی آ رہا ہے۔ سورۃ تحریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے کافروں کی مثال بیان فرماتے ہوئے نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیوی کا ذکر کیا ہے کہ وہ دونوں دو صالح بندوں کے گھروں میں تھیں مگر انہوں نے خیانت اور نافرمانی کی تو باقی قوم کے ساتھ ہی جہنم واصل ہوئیں۔

اس مقام پہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دونوں شانوں یعنی رحمت اور غضب کا اظہار فرمایا ہے۔ اللہ نے اپنی رحمت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ اولاد نصیب فرمائی جس کا عظیم سلسلہ آگے چلا۔ یہ اس کی مہربانی کی شان تھی اور اُدھر ایک مجرم قوم کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا اور یہ اس کی غضب کی شان ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ
قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا
لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ
وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ
وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ
ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿٦٦﴾
وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالَ
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا
تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾

ترجمہ:- پس جب آئے لوط (علیہ السلام) کے گھر بھیجے ہوئے ﴿٦١﴾ تو کہا (لوط علیہ السلام نے) بیشک تم لوگ کچھ اوپرے سے معلوم ہوتے ہو ﴿٦٢﴾ کہا انہوں نے (نہیں) بلکہ ہم لائے ہیں آپ کے پاس وہ چیز جس میں یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں ﴿٦٣﴾ اور لائے ہیں ہم آپ کے پاس سچی بات اور بیشک ہم سچے ہیں ﴿٦٤﴾ پس اپنے گھر والوں کو لے کر نکل

جائیں رات کے حصے میں ، اور آپ اُن کے پیچھے رہیں ، اور نہ پلٹ کر دیکھے تم میں سے کوئی بھی۔ اور چلو جہاں پر تم کو حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۵﴾ اور ہم نے فیصلہ کیا اُس کی طرف اس معاملے کا کہ بیشک اِن لوگوں کی جڑ کاٹی جائے گی اس حال میں کہ یہ صبح میں ہوں گے ﴿۶۶﴾ اور آئے شہر والے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے ﴿۶۷﴾ تو کہا لوط (علیہ السلام) نے کہ بیشک یہ میرے مہمان ہیں پس نہ رسوا کرو تم مجھے ﴿۶۸﴾ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور مت بے آبروئی کرو ﴿۶۹﴾ وہ کہنے لگے ، کیا ہم نے تمہیں نہیں روکا تھا جہان والوں کی حمایت سے ﴿۷۰﴾

ربط آیات

پہلے اللہ نے شیطان کا اتباع کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا اور پھر متقی لوگوں کے انعامات کا ذکر کیا۔ پھر اللہ کی دونوں شانوں یعنی رحمت اور غضب کی بات ہوئی۔ ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے واقعہ میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ انہیں نئی نسل کے قیام کے لیے ایک عظیم بیٹے کی بشارت دی جا رہی ہے ، اور دوسری طرف ایک پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی بات ہو رہی ہے۔

کل کے درس میں اللہ کے فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آکر بیٹے کی خوشخبری سنانے کا ذکر تھا اور ساتھ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ قوم لوط پر عذاب لانے کے لیے آئے ہیں اور یہ بھی کہ وہ لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو بچا لیں گے ، البتہ آپ کی بیوی پوری قوم کے ساتھ ہی ہلاک ہو گی۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لوط علیہ السلام کے پاس آنے کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو مہمان سمجھ کر ان کی عزت افزائی کرنا چاہی

مگر قوم اپنے تشنیع فعل پر مصر ہوئی۔ ان آیات میں واقعاتی لحاظ سے کچھ تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے۔ واقعہ کے تسلسل کے لحاظ سے آیت ۶۱ کے بعد آیات ۶۷ تا ۷۰ کی تشریح ہوگی اور اس کے بعد آیت ۶۲ تا ۶۶ کا بیان ہوگا، انشاء اللہ۔

فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دینے کے بعد اللہ کے یہ دس فرشتے جن میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام بھی شامل تھے، حضرت لوط علیہ السلام کی جائے قیام سدوم بستی کی طرف چل دیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ ۣ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ۝ قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡكَرُوۡنَ ۝ جب اللہ کے بھیجے ہوئے یعنی فرشتے لوط علیہ السلام کے گھر آئے تو لوط نے کہا کہ تم لوگ کچھ اوپرے سے معلوم ہوتے ہو۔ یہ نوجوان اور حسین و جمیل لڑکوں کی شکل میں تھے۔ لوط علیہ السلام نے انھیں انسان ہی سمجھا، کیونکہ نبی غیب دان تو نہیں تھے۔ غیب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے لوط علیہ السلام کو ان کے مہمان ہونے میں کوئی شک بھی نہیں تھا، کیونکہ بستی میں پہنچ کر فرشتوں نے آپ ہی کے گھر کا پتہ پوچھا تھا۔ لہٰذا ان کی مہمانداری کا حق ادا کرنا بھی ضروری تھا۔ مہمان نوازی ویسے بھی ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول ہے اور اسی لیے خود ابراہیم نے بھی ان مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ انہوں نے ان کے لیے فوراً تلے ہوئے بچھڑے کا گوشت پیش کر دیا تھا۔ مگر انہوں نے نہ کھانا تھا، لہٰذا نہ کھایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی ہے مَنۡ لَّمۡ يُكۡرِمۡ ضَيۡفَنَا فَلَيۡسَ مِنَّا جو شخص مہمان کی مہمان نوازی نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے چنانچہ شریعت نے مہمان نوازی کے حقوق بھی بیان فرمائے ہیں کہ اجنبی کی مہمان نوازی تین دن تک کی جاسکتی ہے۔ اس میں ایک دن رات کا پرتکلف کھانا بھی شامل ہے۔ اگر کوئی میزبان کسی مہمان کو تین دن سے

زیادہ ٹھہر لئے تو یہ اس کی طرف سے صدقہ ہوگا۔ اگر خدمت کر سکتا ہے تو کرے، ورنہ اس پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔ البتہ خاص دوست احباب یا رشتہ دار وغیرہ تین دن سے زیادہ بھی قیام کر سکتے ہیں۔ بہرحال مہمان کی عزت افزائی ضروری ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، لہٰذا اُن کے نزدیک ایسے خوش وضع مہمانوں کی خاطر مدارت سے اُن کی عزت و ناموس کی حفاظت زیادہ ضروری تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کو جو تشویش لاحق ہوئی اس کا ذکر سورۃ ہود میں بیان ہو چکا ہے "سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ"، آپ بہت پریشان ہوئے اور فرمایا آج بڑا مشکل دن آگیا ہے۔ آپ کو فکر اس بات کی تھی کہ قوم کے لوگوں سے مہمانوں کی حفاظت کیسے کریں گے؟ یاد رہے کہ بحر میت کے کنارے جہاں یہ قوم آباد تھی وہاں ان کی پانچ چھ بڑی بڑی بستیاں تھیں جن میں سدوم سب سے نمایاں تھی امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس قوم کی کل آبادی چار لاکھ سے زیادہ تھی لوط علیہ السلام کو اسی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا، یہیں آپ نے شادی کی، آپ کے ہاں بچیاں بھی پیدا ہوئیں جو آپ پر ایمان لائیں مگر آپکی بیوی آپ پر ایمان نہ لائی اور منافقہ کی طرح آپ کے ساتھ ہی رہی۔ حقیقت میں وہ اپنی قوم کے مذہب پر ہی تھی۔

اِدھر لوط علیہ السلام تو پریشان ہو رہے تھے اور اُدھر جب اہل بستی کو اس قسم کے مہمانوں کی آمد کی خبر ہوئی "وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ" شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آئے۔ خلاف وضع فطری فعل کے عادی لوگوں کو خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے مذموم فعل کی تکمیل کر سکیں گے۔ اس بیماری کے موجد بھی دراصل یہی لوگ تھے۔ سورۃ اعراف میں گزر چکا ہے "مَا

سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ" پوری دنیا میں ان سے پہلے یہ قباحت کسی قوم میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اِن لوگوں کی شرم و حیا بالکل ختم ہو کر اِن کی فطرت ہی مسخ ہو چکی تھی۔ اِن کی اخلاقی پستی کا حال اللہ نے سورۃ العنکبوت میں اس طرح بیان فرمایا ہے" وَتَاْتُوْنَ فِىْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ" اپنی مجلسوں میں بہت بُری باتیں کرتے تھے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ان کی ایک یہ بھی بُری خصلت تھی کہ کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کی عزت افزائی کی بجائے اُس کا سامان چھین لیتے اور اگر وہ فریاد کرتا تو مار مار کر بستی سے نکال دیتے۔ ایک دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بڑی بیوی سارہ نے خادم کو بھیجا کہ وہ لوط علیہ السلام کی خبر لائے۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سدومی لوگ کسی دوسرے مسافر کو پیٹ رہے ہیں۔ جب اُس خادم نے مداخلت کی تو اُس کو بھی پتھر مار مار کر زخمی کر دیا۔ بہر حال یہ قوم بے حیائی میں انتہا کو پہنچ چکی تھی مہمانوں کو دیکھ کر وہ لوط علیہ السلام کے گھر پر جمع ہونے لگے۔ بائیبل میں تو صراحتاً مذکور ہے کہ اُن لوگوں نے لُوط علیہ السلام سے کہا کہ شہوت رانی کے لیے اِن مہمانوں کو ہمارے حوالے کر دو۔

لوط علیہ السلام کی طرف سے دفاع

جب لوط علیہ السلام نے قوم کی یہ حالت دیکھی قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فرمایا، ظالمو! یہ تو میرے مہمان ہیں۔ ان پر دست درازی کر کے فَلَا تَفْضَحُوْنِ تم مجھے رسوا نہ کرو۔ اس کی بجائے فَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈر جاؤ وَلَا تُخْزُوْنِ اور مجھے حقیر نہ بناؤ۔ اگر میرے مہمانوں کے ساتھ زیادتی ہوئی تو میری کیا عزت رہ جائیگی۔ قوم نے اس بات سے کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ قَالُوْٓا کہنے لگے اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ کیا ہم نے تمہیں جہان بھر کی حمایت سے نہیں روکا تھا؟ جب بھی لوط علیہ السلام ان کو بُری حرکات سے منع کرتے، انہیں ظلم و

تعدی کرنے سے روکتے، تو وہ کہتے کہ تم اجنبی لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہو، بیرونی لوگوں سے ساز باز کرتے ہو اور پھر اُن کی مدد کرتے ہو۔ لہٰذا ہم نے آپ کو کئی بار منع کیا ہے کہ آپ بلاوجہ لوگوں کی حمایت نہ کیا کریں سورۃ اعراف میں ہے کہ جب لوط علیہ السلام قوم کے لوگوں کو ہم جنسی جیسے فعلِ بد سے منع کرتے، تو وہ کہتے، انہیں اپنی بستی سے نکال دو"اِنَّھُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَھَّرُوْنَ" یہ بڑے پاکباز لوگ بنے پھرتے ہیں، کسی پاک بستی میں چلے جائیں۔ بہر حال قوم نے لوط علیہ السلام کی کوئی بات نہ مانی اور مہمانوں پر قابو پانے کے لیے دیواریں پھلانگنا اور دروازے توڑنا شروع کر دیے۔ سورۃ قمر میں" وَلَقَدْ رَاوَدُوْہُ عَنْ ضَیْفِہٖ فَطَمَسْنَآ اَعْیُنَھُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَ نُذُرِ" اور جب انہوں نے مہمانوں کو لینا چاہا تو ہم نے اُن کی آنکھیں مٹا دیں اور کہا کہ اب میرے عذاب اور ڈرانے کا مزہ چکھو۔ بہر حال لوط علیہ السلام اپنے مہمانوں کا ہر ممکن دفاع کر رہے تھے، لوگوں کو زبان سے سمجھا رہے تھے۔ مگر مہمان بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ"اِنَّکُمْ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ"، کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ لوط علیہ السلام نے مہمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم عجیب لوگ ہو۔ میں ان بدمعاشوں سے تمہارا دفاع کر رہا ہوں مگر تم میری کوئی مدد نہیں کرتے۔

فرشتوں کی مداخلت

جب لوط علیہ السلام مہمانوں کا دفاع کرتے کرتے، بہت ہی تنگ ہو گئے، آپ کی پریشانی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تو پھر مہمانوں نے مداخلت کی۔ لوط علیہ السلام سے کہا کہ آپ پیچھے ہٹ جائیں، ہم فرشتے ہیں اور ان بدمعاشوں سے خود ہی نپٹ لیں گے چنانچہ جبرائیل علیہ السلام نے ذرہ سا پر ہلایا تو جیسا کہ پہلے عرض کیا، اللہ نے فرمایا فَطَمَسْنَآ اَعْیُنَھُمْ (قمر) اُن کی آنکھیں اندھی ہو گئیں

مگر اس کے باوجود وہ دیواریں پھلانگنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ لوگ ممسوخ الفطرت ہو چکے تھے۔ یہود و نصاریٰ کی فطرت تو معکوس ہو چکی ہے، مگر قوم لوط کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو چکی تھی۔

بہر حال اب فرشتے کھل کر سامنے آ گئے قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ کہنے لگے۔ اے لوط علیہ السلام ہم آپ کے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس کے متعلق یہ لوگ جھگڑا کرتے تھے۔ یہ لوگ خدا کے عذاب کا انکار کرتے تھے اور آپ سے جھگڑتے تھے۔ اب ہم ان کے لیے عذاب لے کر آئے ہیں۔ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ اور ہم آپ کے پاس سچی بات لائے ہیں وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ اور بیشک ہم سچے ہیں۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ فکر نہ کریں، یہ لوگ آپ تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے، ہم تک کیسے پہنچیں گے۔

بستی سے خروج کا حکم

اب قوم پر عذاب کا وقت قریب آ رہا تھا۔ فرشتوں نے اللہ کے حکم سے لوط علیہ السلام سے کہا فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے کچھ حصے میں نکل جائیں وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ اور آپ ان کے پیچھے رہیں یعنی اپنے گھر والوں کو اپنے آگے آگے چلائیں۔ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ وَامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ اور جاؤ جہاں تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ بائیبل میں ذکر ہے کہ آپ کو زمر نامی بستی میں چلے جانے کا حکم ہوا تھا۔ آجکل تو اس بستی کا نام و نشان تک باقی نہیں، تاہم لوگ کہتے ہیں کہ یہ بستی بحرِ میت کے جنوب میں واقع تھی۔ بائیبل کی روایت میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام جب سدوم سے نکلے تو ان کے اہلِ خانہ میں سے اُن کی بیوی بھی شامل تھی، مگر اس نے حکمِ خداوندی

کے خلاف پیچھے پلٹ کر دیکھ لیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُسے اُسی وقت پتھر میں تبدیل کر دیا۔ یہ روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ البتہ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی بیوی آپ کے ساتھ روانہ ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ قوم کے ساتھ بستی میں ہی رہ گئی تھی۔ آپ کے ساتھ صرف بچیاں تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی فرد ہو تو اس کا ذکر نہیں ملتا۔ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنے میں یہ حکمت تھی کہ قوم پر عذاب آ رہا تھا اور دیکھنے والا بھی کہیں اُس کی زد میں نہ آ جائے۔

عذاب کا فیصلہ

اللہ نے فرمایا وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَٰلِكَ الْأَمْرَ ہم نے لوط علیہ السلام کے سامنے اس بات کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اور آپ کو اس سے آگاہ کر دیا تھا أَنَّ دَابِرَ هَٰؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ کہ ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائیگی اس حال میں کہ یہ صبح میں ہونگے۔ جب لوط علیہ السلام کے راتوں رات بستی سے نکل جانے کے بعد اگلی صبح طلوع ہو گی تو پوری قوم کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ واقعہ کا باقی حصہ اور عذاب کی تفصیل اگلی آیات میں آ رہی ہے۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمْرُكَ
اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ
الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا
وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ
فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِیْلٍ
مُّقِیْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۷﴾
وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ لَظٰلِمِیْنَ ﴿۷۸﴾
فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۹﴾ ع

وقف لازم ۵ ع ۱۹ ۵

ترجمہ:- کہا (لوط علیہ السلام نے) یہ میری بیٹیاں ہیں، اگر تم کو کچھ بات کرنی ہے ﴿۷۱﴾ (اے پیغمبر) آپ کی عمر کی قسم وہ لوگ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے ﴿۷۲﴾ پس پکڑا انکو ایک چیخ نے سورج نکلتے وقت ﴿۷۳﴾ پس کر دیا ہم نے ان بستیوں کے اُوپر والے حصے کو نیچے اور برسائے ہم نے اُن کے اُوپر پتھر کھنگر کے ﴿۷۴﴾ بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو دھیان کرتے ہیں ﴿۷۵﴾ اور بیشک یہ بستیاں البتہ آباد شاہراہ پر ہیں ﴿۷۶﴾ بیشک اس میں نشانی ہے ایمان والوں کیلیے ﴿۷۷﴾ اور (تحقیق شان یہ ہے) کہ تھے ایکہ والے البتہ ظلم کرنے والے ﴿۷۸﴾ پس ہم نے ان سے انتقام لیا۔ اور تحقیق یہ دونوں بستیاں البتہ ایک واضح

راستے پر واقع ہیں (۷۹)

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ لوط علیہ السلام مہمانوں کے بارے میں قوم سے لجاجت کر رہے تھے کہ خدا کے لیے مجھے رسوا نہ کرو، میرے مہمانوں کی بے آبروئی نہ کرو۔ مگر لوگوں نے کہا کہ تم خواہ مخواہ اجنبی لوگوں کو اپنے گھر میں ٹھہراتے ہو۔ ہم تمہیں منع کر چکے ہیں کہ جہان والوں میں سے کسی کی بھی حمایت نہ کیا کرو۔ غرضیکہ بدمعاش قوم نے اپنے قبیح فعل کے جواز کے لیے الٹا حضرت لوط علیہ السلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

اب لوط علیہ السلام نے قوم کے لوگوں کو دوسرے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ ناپاک کام نہ کرو، اس کی بجائے قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيٓ یہ میری بیٹیاں ہیں اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتے ہو تو میری بیٹیاں حاضر ہیں، مگر ان مہمانوں کو نظرِ بد سے نہ دیکھو۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی طرف سے اپنی بیٹیوں کی پیش کش نکاح کے لیے تھی، نہ کہ کسی ناجائز شہوت رانی کے لیے کیونکہ اللہ کا نبی کسی کو گناہ کی دعوت نہیں دے سکتا۔ دوسری بات جسے عام مفسرین تسلیم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی "میری بیٹیوں" سے مراد قوم کی بیٹیاں تھیں کیونکہ قوم کی ساری عورتیں پیغمبر کی بیٹیاں اور پیغمبر بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ بہرحال اللہ کے نبی نے اپنی قوم کو جائز کام کی دعوت دی۔ قوم ہم جنسی جیسا غیر فطری کام کرنا چاہتی تھی، حالانکہ یہ فعل تو جانوروں میں بھی نہیں پایا جاتا چہ جائیکہ انسان جیسی اعلیٰ وارفع مخلوق اس فعل کا ارتکاب کرے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ تمام جانوروں میں سے صرف بندروں میں یہ قبیح خصلت پائی جاتی ہے، ان کے علاوہ کسی جانور میں نہیں

بلا آیات

لوط علیہ السلام
کی بیٹیاں پیش کش

پائی جاتی۔

ہم جنسی کی سزا

فقہائے کرام نے زنا اور ہم جنسی کے تقابل میں بحث کی ہے قرآن پاک میں دونوں افعال کو فحش کہا گیا ہے۔ دونوں ہی طریقے شہوت رانی کا ذریعہ ہیں مگر فرق یہ ہے کہ زنا میں یہ تعلق مخالف جنس سے قائم کیا جاتا ہے جو کہ فطری امر ہے اور قانون توڑنے کی بناء پر فحش بنتا ہے۔ مگر ہم جنسی تو ہے ہی خلاف فطرت کام، لہٰذا اس کو بھی فحش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس بارے میں آئمہ کرام کا اختلاف ہے کہ آیا زنا کی طرح لواطت کے جرم میں بھی حد جاری ہو گی یا نہیں۔ زنا کی حد یہ ہے کہ شادی شدہ جوڑے کو سنگسار کیا جاتا ہے اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگتے ہیں۔ چنانچہ بعض آئمہ اس فعل کو زنا کے مساوی قرار دیکر اس کے متعلقین پر بھی حد جاری کرنے کے حق میں ہیں۔ البتہ امام ابوحنیفہ رح اور بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں کہ ہم جنسی زنا کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ یہ قابل تعزیر جرم ہے جس کی سزا قید و بند سے لے کر سزائے موت تک ہو سکتی ہے تاہم امام ابن کثیر رح نے بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رح سزائے موت کے قائل ہیں فرماتے ہیں کہ ایسے مجرم کو کسی بلند مینار پر چڑھا کر نیچے پھینک دیا جائے یا کسی دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اوپر دیوار گرا دی جائے، گویا اس فحش عمل پر عبرتناک سزا ملنی چاہیئے۔ جبھی تو لوط علیہ السلام قوم سے کہتے تھے "اِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ" (الشعراء) اے لوگو! میں تمہارے عمل سے سخت نفرت ہوں۔

چونکہ قضائے شہوت بنی نوع انسان پر مسلط کی گئی ہے، لہٰذا اس کو فرو کرنے کے لیے ہماری شریعت کا حکم یہ ہے کہ شہوت رانی جائز نہیں "اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" (المومنون) سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے ساتھ۔ پہلے زمانے میں لونڈی کا رواج

عام تھا اور اب ڈیڑھ دو صدی سے بالکل ختم ہو چکا ہے، لہٰذا اب قضائے شہوت کا جائز طریقہ صرف منکوحہ بیوی ہی رہ گیا ہے۔ فرمایا "وَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ" (المومنون) جو کوئی اس کے علاوہ دوسرا راستہ تلاش کرے گا، تو وہ تعدی کرنے والا ہوگا۔

اسی اصول کی بنا پر شہوت رانی کے دوسرے طریقے بھی ناجائز ہیں مثلاً مشت زنی کرنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔ اپنی منکوحہ بیوی سے مکروہ مقام پر وطی کرنے کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے مَنْ اَتٰی اِمْرَاَةً فِیْ دُبُرِهَا اَوْ جَآءَ كَاهِنًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جو کوئی بیوی سے خلاف وضع فطری فعل کرے گا یا کاہن کے پاس جائے گا، تو اس نے گویا شریعتِ محمدی کا انکار کر دیا۔ اب چونکہ قضائے حاجت کی ایک ہی صورت یعنی نکاح باقی رہ گئی ہے۔ اس لیے شریعت نے نکاح کو آسان تر بنایا ہے۔ نکاح کے معاملہ میں جتنی آسانی ہوگی اتنا ہی بہتر ہے۔ اس میں جہیز اور زیور کی پابندیاں عائد کرنا سخت ناجائز ہے۔ بہرحال لوط علیہ السلام نے قوم کے لوگوں سے کہا کہ قضائے حاجت کے لیے قوم کی لڑکیاں موجود ہیں، ان سے نکاح کرو اور غلط طریقہ اختیار نہ کرو، کہ یہ خدا تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے جملہ معترضہ کے طور پر فرمایا ہے لَعَمْرُكَ آپ کی عمر یعنی آپ کی جان کی قسم اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ بیشک وہ لوگ اپنی بدمستی میں مدہوش، سرگرداں اور اندھے ہو رہے تھے۔ ان پر اس فعل بد کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ کہنے لگے "مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ

حَقٍّ وَّ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ (ہود) ہمیں تیری بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ یعنی ہم تو تمہارے مہمانوں کو حاصل کر کے انہی سے قضائے حاجت کریں گے۔

مسئلہ قسم
یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی قسم اٹھائی ہے حالانکہ کسی مخلوق کے لیے غیر اللہ کی قسم اٹھانا بالکل ناجائز ہے۔ قسم صرف اللہ کے نام اور اس کی صفات کے ساتھ ہی اٹھائی جا سکتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے، وہ جس کی چاہے قسم اٹھائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قسم اٹھانے کی بہت سی مثالیں قرآن پاک میں موجود ہے، جیسے "وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ" قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ" شہر مکہ کی قسم ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم پر مخلوق والی قسم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مخلوق کے کسی چیز کی قسم اٹھانے سے اُس چیز کی حد درجہ تعظیم مراد ہوتی ہے، اور یہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لیے روا نہیں۔ اگر کوئی ایسا کریگا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَقْسَمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ جس نے غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھائی، اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ اور اگر کوئی شخص قسم سے متعلقہ چیز کی خدا جیسی تعظیم نہیں بھی کرتا تو پھر بھی یہ شرک والی شکل و صورت تو ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، صرف اللہ کے نام کی قسم اٹھاؤ۔ ورنہ خاموش رہو۔ کسی طاغوت، نبی، ولی، جن، فرشتہ، ماں باپ یا کسی عزیز کی قسم اٹھانا جائز نہیں ہے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے خود کسی مخلوق کی قسم اٹھانے کا تعلق ہے تو اس سے مراد اُس چیز کو محض بطور گواہ پیش کرنا ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد کی جان سے زیادہ عزیز کسی جان کو پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کی قسم اٹھا کر بات کی ہے۔

بم پر عذاب

الغرض ! قوم نے لوط علیہ السلام کی کسی نصیحت پر کان نہ دھرا۔ بلکہ اپنی ضد پر اڑے رہے، لہٰذا خدا تعالیٰ کی گرفت کا وقت قریب آ چکا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ پس پکڑا ان کو چیخ نے سورج نکلتے وقت۔ اللہ نے کئی قسم کی سزائیں نازل فرمائیں جن کا ذکر مختلف مقامات پر آتا ہے۔ سخت خوفناک آواز کے علاوہ ان پر پتھر بھی برسائے گئے اور جس خطۂ ارضی میں وہ قوم آباد تھی اللہ نے اس پورے خطہ کو الٹ دیا۔ فرمایا فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ہم نے اس کے اوپر والے حصے کو نیچے اور نیچے والے حصے کو اوپر کر دیا۔ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ اور ان پر کھنگر قسم کے پتھروں کی بارش کی۔ تو اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے تین سزاؤں کا ذکر کیا ہے ایک تو زبردست چیخ آئی جس سے ان پر دہشت طاری ہوئی کہ ان کے دل پھٹ گئے۔ اللہ نے ان کی ساری بستیوں کو آسمان کے قریب تک اٹھا کر الٹ دیا، اور پھر ان پر پتھر بھی برسائے۔ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جسے ہلاک کرنا مقصود تھا۔ اس طرح چار لاکھ سے زیادہ آبادی کی یہ بستیاں آناً فاناً صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

فراست

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے۔ توسم کا معنیٰ تاڑنا، دیکھنا، دھیان کرنا اور غور کرنا ہے۔ اصل میں یہ لفظ کسی علامت کے مشاہدے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہاں پر فراست کے معنوں میں آیا ہے۔ فراست ایک قسم کی دانائی اور زیرکی کا نام ہے جس کے ذریعے غور و فکر کرنے سے انسان کو بعض چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے اِتَّقُوۡا مِنۡ فِرَاسَةِ الۡمُؤۡمِنِ فَاِنَّهٗ يَنۡظُرُ بِنُوۡرِ اللّٰهِ ایک روایت

ہیں بِتَوْفِیقِ اللّٰہِ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نور یا اس کی توفیق سے بعض چیزیں دیکھ لیتا ہے۔

امیر عبدالرحمٰن، امیر امان اللہ خان والی کابل کے دادا تھے۔ بادشاہ وقت اور صاحبِ علم آدمی تھے، آپ نے تاریخ کی کتاب بھی لکھی ہے۔ اُن کے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ آپ کے نزدیک کشف اور فراست میں اسی قدر فرق ہے جس قدر ٹیلیفون اور ٹیلگرام (تار) میں جب ٹیلیفون پہ بات ہوتی ہے تو اس میں صریح الفاظ کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔ البتہ ٹیلگرام ایک ایسا ذریعہ مواصلات ہے جس میں ٹِک ٹِک کی صرف آواز ہوتی ہے، اور پیغام وصول کرنے والے ان آوازوں کو الفاظ کا جامہ خود پہناتا ہے۔ تو گویا صاحبِ فراست آدمی بعض اشارات سے بات کا مفہوم خود سمجھتا ہے۔

صاحب تفسیر حسینی لکھتے ہیں کہ مشائخ نقشبندیہ میں سے ایک اونچے درجے کے بزرگ خواجہ عبدالخالق مجلس میں بیٹھے معرفت کی باتیں کر رہے تھے کہ ایک نوجوان آدمی مجلس میں آیا جس نے درویشوں کا خرقہ پہن رکھا تھا اور کندھے پہ مصلّٰی تھا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو وہ درویش منش نوجوان خواجہ صاحب کے قریب ہوا، اور پوچھا حضرت! اِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ والی حدیث کا کیا مطلب ہے؟ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اس حدیث کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے جو زنار پہن رکھا ہے، اُسے توڑ دو اور ایمان قبول کر لو۔ اس پر پہلے تو اس شخص نے انکار کیا، مگر جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے جسم کے ساتھ زنار بندھا ہوا مِلا۔ چنانچہ اس شخص نے اقرار کیا کہ وہ مجوسی ہے اور خواجہ صاحبؒ کی آزمائش کے لیے آیا تھا۔ اُس نے

خواجہ صاحبؒ کی اس فراست کو کرامت پر محمول کیا، اور زنار توڑ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے حاضرین مجلس سے فرمایا کہ دیکھو! اس نومسلم شخص نے ظاہری زنار کو توڑ دیا ہے، آؤ ہم سب مل کر توبہ کریں اور باطنی زنار کو بھی توڑ دیں۔ اس پر مجلس میں شور اٹھا اور سب نے توبہ کی۔ مطلب یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی فراست سے اُس شخص کو پہچان لیا تھا کہ یہ مجوسی ہے۔

نشاناتِ عبرت

اللہؐ نے فرمایا کہ صاحبِ فراست لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو اُن کے جرم کی کیسی عبرتناک سزا دی۔ ہر فرد اور قوم کو جان لینا چاہیئے کہ اگر اس قسم کے جرائم ان میں بھی ہوں گے تو وہ بھی عذابِ الٰہی سے نہیں بچ سکیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ اور بیشک یہ بستیاں البتہ آباد شاہراہ پر واقع ہیں۔ یعنی عبرت کے نشانات ایسے راستے پر ہیں جہاں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ اسی لیے ان میں مومنوں کے لیے بھی نشانی ہے۔ جب وہاں سے گزرتے ہیں اور ان بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھتے ہیں تو انہیں بھی عبرت حاصل کر کے ایسی برائیوں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے باغیوں کو کیسی عبرت ناک سزا دیتا ہے فرمایا وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ اور بیشک شان یہ ہے کہ ایکہ والے بھی بڑے ظالم لوگ تھے۔ مدین اور ایکہ والے ایک ہی قوم کے افراد تھے، مدین شہر تھا اور ایکہ اس کے نواح میں جنگل تھا۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ دو مختلف قومیں تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف حضرت شعیب کو مبعوث فرمایا تھا۔ فرمایا فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ پھر ہم نے اُن سے اُن کی سرکشی کا انتقام لیا۔ لوط علیہ السلام کی قوم اور

ایکہ والے وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ دونوں بڑی شاہراہ پر واقع تھے
عراق سے مصر جانے والے لوگ بھی اسی راستے سے ہو کر گزرتے تھے اور
حجاز سے شام اور فلسطین کے مسافروں کو بھی اسی شاہراہ سے گزرنا ہوتا
تھا اور وہ اِن اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھتے تھے۔ مکے
کے لوگ بھی اسی راستے سے گزرتے تھے، اس لیے اللہ نے ان کو بھی یاد
دلایا کہ وہ اِن ویران بستیوں سے عبرت حاصل کریں۔

جغرافیائی لحاظ سے بھی بحرِ میت کا علاقہ سطحِ سمندر سے کافی نشیب میں
واقع ہے۔ اس کے بعض خطوں کا پانی اس قدر زہریلا ہے کہ اس میں کوئی
مینڈک، مچھلی یا کیڑا مکوڑا زندہ نہیں رہ سکتا۔ سفرِ تبوک کے دوران جب
حضور علیہ السلام کا اس وادی سے گزر ہوا تو آپ نے سر پر چادر ڈال لی اور
جلدی جلدی گزرنے کی کوشش کی۔ فرمایا مجھے ڈر ہے کہ جو عذاب ان قوموں پر
آیا تھا، کہیں ہم بھی اس میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے
کہ جس خطہ کو اللہ تعالیٰ نے جائے عبرت قرار دیا ہے، اُسے جدید روشنی والوں
نے تفریح گاہ بنا لیا ہے۔ وہاں پر عجائب گھر قائم کر دیا گیا ہے ساتھ ہوٹل بھی
ہیں جہاں لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں حالانکہ ایسے مقامات سے عبرت
حاصل ہونی چاہیئے تھی اور لوگوں کو معاصی سے باز آجانا چاہیئے تھا۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾
وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾
وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ
اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا
خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا
بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ
الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ
الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا
بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ
جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ
الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

ترجمہ :- اور البتہ جھٹلایا حجر والوں نے اللہ کے رسولوں
کو ﴿۸۰﴾ اور ہم نے دیں اُن کو اپنی نشانیاں، پس وہ تھے
اِن سے اعراض کرنے والے ﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ پہاڑوں میں
گھر تراشتے تھے بے فکری سے ﴿۸۲﴾ پس پکڑا اُن کو

خوفناک آواز نے اس حال میں کہ وہ صبح کے وقت تھے (۸۳)
پس نہ بچایا اُن کو اُس چیز نے جو وہ کماتے تھے (۸۴) اور
نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو کچھ اُن
کے درمیان ہے، مگر حق کے ساتھ۔ اور بیشک قیامت
البتہ آنے والی ہے، پس آپ درگذر کریں، اچھی طرح
درگزر کرنا (۸۵) بیشک تیرا پروردگار وہ بہت بڑا پیدا کرنے
والا ہے اور سب کی خبر رکھنے والا ہے (۸۶) اور البتہ
تحقیق دی ہیں ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی
آئیتیں اور بڑا قرآن (۸۷) آپ نہ پھیلائیں اپنی آنکھوں کو
اس کی طرف جو ہم نے فائدہ پہنچایا ہے اس کے ساتھ
اِن میں سے مختلف لوگوں کو۔ اور نہ غمگین ہوں آپ
ان پر۔ اور آپ جھکا دیں اپنے بازو ایمان والوں کے
لیے (۸۸) اور آپ کہہ دیں کہ بیشک میں ڈر سنانے
والا ہوں کھول کر (۸۹)

رابطِ آیات

پہلے اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کی قوم کی نافرمانی اور اُن کی سزا کا ذکر کیا۔ اس کے بعد ایکہ والوں کا تذکرہ بھی ہوا۔ ایکہ اور مدین والے قریب ہی راستے پر تھے تو اللہ نے ان کی سزا کا بھی اجمالی طور پر ذکر کیا۔ اِن کا تفصیلی بیان سورۃ اعراف اور سورۃ ہود میں آچکا ہے اور آگے بھی بعض سورتوں میں آئے گا۔ یہ نافرمان لوگ اللہ تعالیٰ کی صفتِ غضب کا نشانہ بنے۔ آج کی ابتدائی آیات میں قومِ ثمود ہی کا مختصراً ذکر ہے۔ جنہیں یہاں پر اصحابِ حجر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اہلِ حجر کی تکذیب

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ اور البتہ تحقیق جھٹلایا حجر والوں نے اللہ کے رسولوں کو۔ اہلِ حجر صالح علیہ السلام کی

قومِ ثمود ہیں جو تبوک سے لے کر وادیٔ قریٰ تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں لکھا[1] ہے کہ اس خطہ میں اس قوم کے سترہ سو شہر، قصبیات اور دیہات آباد تھے۔ یہ لوگ صنعت و حرفت میں بڑے ماہر تھے۔ بڑے متمدن اور آسودہ حال لوگ تھے، حِجر انہی کے مراکز میں واقع ایک جگہ کا نام ہے جس کی نسبت سے انہیں حِجر کہا گیا ہے۔

سورۃ ہود میں ہے "وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا" یعنی ہم نے قومِ ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس قوم کی طرف ایک ہی رسول مبعوث ہوا جب کہ اِس آیتِ کریمہ میں مرسلین جمع کا لفظ ہے یعنی بہت سے رسول مبعوث فرمائے اس ضمن میں امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس قوم کی طرف حقیقت میں حضرت صالح علیہ السلام کو ہی مبعوث کیا گیا مگر یہاں پر جمع کا صیغہ اس لیے آیا ہے کہ کسی ایک رسول کے جھٹلانے سے تمام رسولوں کا جھٹلانا صادق آتا ہے۔ دین کی مرکزی تعلیم اور خاص طور پر عقیدہ توحید کے بارے میں اللہ کے سارے نبی متفق ہیں تو اس لحاظ سے اس قوم نے صرف صالح علیہ السلام کو ہی نہیں جھٹلایا بلکہ انبیاء کی پوری جماعت کی تکذیب کی۔ اس قسم کی مثال حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن میں مذکور ہے۔ وہ بھی اپنی قومِ عاد کی طرف واحد رسول مبعوث ہوئے مگر سورۃ ہود میں اللہ نے اُن کے متعلق فرمایا "جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ" کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی یہاں پر جمع کا صیغہ استعمال کرنے سے مراد یہی ہے کہ کسی ایک رسول کا انکار سارے رسولوں کے انکار کے مترادف ہے۔

نشانیوں سے اعراض

فرمایا اہل حِجر نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا "وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا" اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں دیں "فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ"

---

[1] تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۲۴۷

پس وہ ان نشانیوں سے اعراض کرنے والے تھے۔ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے خود مطالبہ کیا کہ پتھر میں سے اونٹنی کو نکال جو دس ماہ کی گابھن ہو اور ان کے سامنے بچہ جنے۔ جب صالح علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے نشانی پیش کر دی تو قوم پھر بھی انکار کر گئی۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، لوگو! نشانیاں نہ طلب کیا کرو۔ قوم ثمود کو ان کی مرضی کی نشانی دے دی گئی مگر انہوں نے اس نشانی یعنی اونٹنی سے تعرض کیا، اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور ساری قوم ہلاک ہو گئی۔ غرضیکہ اہل حجر کے متعلق فرمایا کہ یہ بھی معجزات سے اعراض کرنے والے لوگ تھے۔

حجر والوں کی کارگزاری کے متعلق اللہ نے فرمایا وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان میں گھر بناتے تھے بے فکری سے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہنر عطا کیا تھا کہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر ان کے اندر ہی نہایت دیدہ زیب مکان تیار کر لیتے تھے۔ ان میں کھدائی کے ذریعے خوبصورت نقش بناتے یہ ایسے محفوظ مکان ہوتے تھے کہ کوئی چور ڈاکو ان میں نقب بھی نہیں لگا سکتا، اس لئے ان کے باشندے بالکل بے فکری کے ساتھ رہتے تھے ان مکانات کے بچے کھچے نمونے آج بھی موجود ہیں جنہیں دیکھنے کیلئے دور دور سے سیاح آتے ہیں۔

پرانی تہذیبوں کے آثار

اس قسم کی پرانی تہذیبوں کے آثار دنیا بھر میں ملتے ہیں۔ یہاں جنوبی ہندوستان میں ایجنٹا اور آلورہ کی تہذیبوں کے نشانات ابھی تک موجود ہیں یہ لوگ بھی پہاڑوں کو تراش تراش کر مکان بناتے اور ان کی چھتوں اور دیواروں پر حیرت انگیز نقش و نگار بناتے۔ ان کی دیواروں پر بنے ہوئے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔ کسی جگہ شادی کی کسی

تقریب کی تصاویر ہیں اور کہیں کوئی ماتمی مجلس دکھائی گئی ہے۔ بعض مقامات پہ عبادت کا طریقہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح ٹیکسلا کی بھی ایک تہذیب تھی۔ یہ قوم زمین میں دب گئی جس کے آثار کو کھنڈرات میں سے نکالا گیا ہے۔ ہڑپہ اور موہنجو دھاڑو کی تہذیب کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے عراق میں آشوریوں کی تہذیب کے بہت سے آثار ملے ہیں مصر میں پانچ چھ ہزار سالہ عمارات ابھی تک موجود ہیں۔ چار چار سو فٹ اونچے اہرام ہیں جو ٹنوں وزنی پتھروں سے تعمیر کیے گئے ہیں جنہیں دیکھ کر لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔

عذاب کی آمد

فرمایا جب ان لوگوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور اللہ کی نشانیوں سے اعراض کیا فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ان کو چیخ نے آلیا صبح کے وقت۔ سورۃ اعراف اور ہود میں چیخ کے ساتھ زلزلے کا ذکر بھی ہے بہرحال جس طرح کل قوم لوط کے متعلق پڑھا تھا کہ ان پہ سورج نکلتے وقت عذاب آیا، اسی طرح قوم ثمود کو بھی عذاب نے صبح کے وقت ہی آن پکڑا۔ اور پھر ان کی حالت یہ تھی فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ پس نہ کام دیا ان کو اس چیز نے جو وہ کماتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس قوم پر عذاب آیا تو ان کی کاریگری، صناعی، اوزار اور ان کی عقل و دانش کچھ کام نہ آئے اور ساری قوم ہلاک ہو گئی۔ پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ نے اپنی صفت غفور اور رحیم کا ذکر فرمایا تھا اور پھر حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ اور اس واقعہ میں صفت غضب کا ذکر کیا ہے۔

حضور علیہ السلام کے لئے تسلی

آگے ارشاد ہوتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، مگر حق کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ کوئی چیز بیکار محض نہیں بلکہ ہر چیز کی تخلیق اس کی حکمت پہ مبنی ہے

زمین، جنگل، پہاڑ، دریا، سمندر، ستارے اور سیارے غرضیکہ ہر چیز کے ساتھ انسان کا مفاد وابستہ ہے۔ اور ان تمام اشیاء کا خالق اور مالک بھی موجود ہے وہی ہر چیز کی تدبیر کر رہا ہے اور ہر چیز کو اپنے اپنے کام پر لگا رکھا ہے۔

فرمایا جو خالق اِن اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ ان کو ختم کرنے کا بھی مجاز ہے، لہٰذا یاد رکھو! وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ بیشک قیامت آنے والی ہے۔ جس کائنات کا آغاز دیکھ رہے ہو اس کا انجام بھی ہوگا۔ پھر محاسبے کی منزل آئیگی، ہر چیز کے متعلق باز پرس ہوگی۔ جو شخص آنکھ میں سلائی ڈالتا ہے یا انگلی کے ساتھ گارے کا ذرا سا حصہ لگاتا ہے اُسے بھی حساب دینا ہوگا۔

اس سورۃ کی ابتداء میں گزر چکا ہے کہ جب حضور علیہ السلام اپنے مخاطبین کو قیامت کی ہولناکیوں اور حساب کتاب کی منزل سے ڈراتے تو لوگ کہتے "اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ" آپ تو دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھلا کسی مردے کو زندہ ہوتے کسی نے دیکھا ہے؟ کوئی قیامت اور جزائے عمل نہیں ہے۔ ایسے ہی توہین آمیز کلمات سے حضور علیہ السلام اور آپکے صحابہ کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ ایسے ہی مواقع پر تسلی کے لیے اللہ نے فرمایا ہے۔ اے پیغمبر! آپ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ درگزر کریں، اچھی طرح درگزر کرنا۔ جب قیامت برپا ہوگی تو یہ لوگ یقیناً پکڑے جائیں گے اور پھر اپنے انجام کو بھی پہنچیں گے، لہٰذا آپ درگزر کریں۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ آپ کا پروردگار بہت بڑا پیدا کرنے والا ہے اور اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اس نے کائنات کا عظیم سلسلہ پیدا کیا ہے، اس میں انسان جیسی اشرف مخلوق پیدا کی ہے پھر ان کی آزمائش بھی لی ہے، لہٰذا آپ خاطر جمع رکھیں اور ان لوگوں کی کارگزاریوں پر بددل نہ ہوں بلکہ اپنا

کام کرتے رہیں۔

سبع مثانی کا نزول

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام پر ہونے والے ایک عظیم احسان کا ذکر کیا وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ البتہ تحقیق ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیتیں اور قرآنِ عظیم عطا فرمایا ہے۔ اللہ نے اس عظیم نعمت کا نزول آپ کے قلبِ مبارک پر کیا۔ سبع مثانی کے متعلق بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے سات لمبی سورتیں مراد ہیں یعنی سورۃ البقرہ سے لیکر سورۃ یونس تک مگر صحیح تفسیر یہ ہے کہ اس سے سورۃ فاتحہ کی سات آیات مراد ہیں اور یہی آیتیں نماز میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ امام بخاریؒ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہی ثابت کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ سبع مثانی بھی سورۃ فاتحہ ہے اور قرآنِ عظیم بھی یہی سورۃ ہے۔ قرآن پاک میں سب سے زیادہ فضیلت والی سورۃ یہی ہے اور یہ پورے قرآن کا لب لباب ہے اس لیے اسے قرآنِ عظیم بھی کہا گیا ہے۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ قرآن پاک میں سب سے زیادہ فضیلت والی آیت آیت الکرسی اور سب سے فضیلت والی سورۃ سورۃ فاتحہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے اس لیے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ جس کو قرآن کریم آتا ہے اسے اپنے آپ کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ اللہ نے اسے عظیم نعمت عطا کی ہے۔ دنیا کا مال و متاع اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا لہٰذا ایسے شخص کو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[1] رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا یعنی نماز فجر سے پہلے دو سنتیں دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہیں۔ دنیا کا مال و اسباب تو عارضی ہے مگر ٹھیک طور پر ادا کی گئی یہ سنتیں اگر مقبول ہو گئیں تو ان کا اجر کبھی ختم نہیں ہو گا، لہٰذا یہ دنیا

---

[1] مسلم ص ۲۵۱ ج ۱

اور ما فیہا سے بہتر ہیں۔ خود قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
کہ قرآن کریم کتاب شفا اور کتاب ہدایت ہے "خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ"
جو چیز یہ لوگ جمع کرتے ہیں، قرآن پاک اس سے بہتر ہے۔

مال و دولت سے بے رغبتی

ارشاد ہوتا ہے، اے پیغمبر! لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا
بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ ہم نے طرح طرح کے لوگوں کو جو سامان دیا ہے
آپ اپنی آنکھوں کو اس کی طرف نہ پھیلائیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو
ملنے والے مال و متاع کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں کہ یہ
عارضی چیزیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں اللہ نے جو چیز آپ کو عطا کی ہے
اس کے مقابلے کی کوئی چیز نہیں۔ بعض مفسرین نے ازواجاً سے مختلف
لوگوں کی بجائے مختلف اشیاء مراد لی ہیں یعنی جتنی بھی چیزیں ہم نے دنیا
میں لوگوں کو دی ہیں وہ سب قرآن پاک کے مقابلے میں حقیر اور فانی ہیں
جب کہ کلام الٰہی اور سورۃ فاتحہ ابدی چیز ہے۔ فرمایا وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ
آپ ان پر زیادہ غمگین بھی نہ ہوں کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ یہ
آپ کی ذمہ داری نہیں بلکہ آپ اپنا حق تبلیغ ادا کرتے رہیں اور نتیجہ اللہ
پر چھوڑ دیں کیونکہ "وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ"
(البقرہ) آپ سے اہل دوزخ کے متعلق باز پرس نہیں ہوگی کہ یہ وہاں کیوں
گئے بلکہ یہ تو خود ان سے پوچھا جائے گا "مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ"
(المدثر) کہ تم جہنم میں کس وجہ سے پہنچے آپ کا فرض یہ ہے "اِنَّمَا
عَلَیْکَ الْبَلٰغُ" (الرعد) کہ آپ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے
رہیں۔ کوئی ایمان قبول کرتا ہے یا نہیں، یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

اہل ایمان کے لیے شفقت

فرمایا وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ آپ اپنے بازو ایمان
والوں کے لیے جھکا دیں۔ جس نے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کر لیا ہے
آپ کی نبوت پر ایمان لایا ہے اور معاد پر یقین کیا ہے، آپ اس کے

ساتھ شفقت و محبت سے پیش آئیں تاکہ ان کو تسلی رہے۔ وَقُلْ آپ ان کو یہ بھی سمجھا دیں اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ میں تو کھول کر ڈر سنانے والا ہوں۔ میں تو تمہیں خطرناک انجام سے آگاہ کرنے والا ہوں۔ اگر کفر، شرک، معصیت اور ناشکر گزاری کا راستہ اختیار کرو گے تو میں تمہیں برے انجام سے خبردار کر رہا ہوں۔ جس طرح قرآن مبین ہے یعنی ہر چیز کو واضح کرتا ہے، اسی طرح اللہ کے نبی بھی نذیر مبین ہیں کہ کسی چیز کو تشنہ نہیں رہنے دیتے بلکہ ہر چیز کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں عربوں میں نذیر العریان کی اصطلاح پائی جاتی تھی یعنی سخت خطرے کے وقت کوئی شخص اپنا تہبند اتار کر جھنڈے کے طور پر لہراتا تھا اور خطرے سے آگاہ کرتا تھا، وہ نذیر عریان سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح اللہ کا نبی بھی لوگوں کو شدید خطرے سے آگاہ کرنے والا ہے کہ آنے والے وقت سے ڈر جاؤ اور اللہ کے احکام کو تسلیم کر لو۔

درس یازدہم ۱۱ — آیت ۹۰ تا ۹۹

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ
جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاصْدَعْ
بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا
كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ
مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾
وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا
يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ
السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ
الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾ ع ۶ ۲۰ ۶

ترجمہ:- جس طرح کہ ہم نے نازل کیا تقسیم کرنے والوں پر (۹۰) وہ جنہوں نے بنایا ہے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے (۹۱) پس تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب سے سوال کریں گے (۹۲) اس بارے میں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے (۹۳) پس آپ واضح طور پر وہ بات سنادیں، جو آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور آپ اعراض کریں شرک کرنے والوں سے (۹۴) بیشک ہم کفایت کرتے

ہیں آپ کے لیے ٹھٹا کرنے والوں کے شر سے ﴿۹۵﴾
وہ جو ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرا معبود، پس
عنقریب وہ جان لیں گے ﴿۹۶﴾ اور البتہ تحقیق ہم
جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے ان
باتوں سے جو وہ کرتے ہیں ﴿۹۷﴾ پس آپ تسبیح بیان
کریں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جائیں آپ
سجدہ کرنے والوں میں سے ﴿۹۸﴾ اور عبادت کریں اپنے
پروردگار کی یہاں تک کہ آجائے آپ کے پاس
یقینی بات ﴿۹۹﴾

پہلے اللہ تعالیٰ کی دونوں شانوں یعنی اُس کے غفور اور رحیم ہونے اور غضبناک ہونے کی شان کا ذکر ہوا پھر اللہ نے دونوں قسم کے لوگوں کی مثالیں بیان فرمائیں جن پر اللہ کا انعام ہوا اور جن پر غضب نازل ہوا، پھر آخر میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کے لیے تسلی کا مضمون نازل ہوا۔ مشرکین آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ نہایت غلط قسم کا سلوک کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ دِل برداشتہ ہوتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی بھی دی، اور ساتھ یہ بھی اشارہ کر دیا کہ نافرمان لوگ بالآخر ناکام ہوں گے۔ اس ضمن میں قوم لوط کی ناہنجاری کا ذکر فرمایا، اہل حجر کی بات کی کہ کس طرح انہوں نے اللہ کے سچے نبی اور سچے دین کی مخالفت کی، اہل ایمان کو اذیت پہنچائی تو اللہ نے اُن کو سزا میں مبتلا کیا۔ مطلب یہ کہ جس طرح سابقہ انبیاء کے مخالفین تباہ و برباد ہوئے، اسی طرح آپ کے مخالفین بھی اللہ کے غضب سے بچ نہیں سکیں گے۔

اب اللہ نے اس بات کو ایک مثال یا تشبیہ کے طور پر سمجھایا ہے

كَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَى الۡمُقۡتَسِمِيۡنَ جیسا کہ ہم نے اتارا (عذاب) تقسیم کرنے والوں پر مقتسم تقسیم کے مادے سے بھی ہو سکتا ہے اور قسم کے مادے سے بھی اور اس مقام پر یہ دونوں معنی درست ہیں، البتہ تقسیم والا معنی زیادہ معروف ہے۔ اَلَّذِيۡنَ جَعَلُوا الۡقُرۡاٰنَ عِضِيۡنَ وہ تقسیم کرنے والے جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اگر قرآن سے اللہ کی یہی کتاب مراد لی جائے جیسا کہ متبادر ہے تو تقسیم کرنے والے مشرکین مکہ ہیں جنہوں نے قرآن کو تقسیم کر دیا تھا یعنی وہ کتاب الٰہی کے ساتھ غلط باتیں منسوب کرتے تھے کوئی کہتا یہ شاعری ہے، کوئی اسے سحر بتاتا اور کوئی اسے "اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ" (الانفال) پرانے لوگوں کی قصے کہانیاں کہتا۔ بعض لوگوں نے قرآن کو تمسخر کے طور پر اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ ایک شخص دوسرے سے کہتا کہ سورۃ بقرہ کو میں سنبھال لوں گا تم ذرا سورۃ الفیل سے نپٹ لو۔ کوئی کہتا مائدہ میرے ذمے رہنے دو اور انعام فلاں کے ذمے لگا دو۔ علیٰ ہذا القیاس انہوں نے قرآن پاک کی سورتوں کو مذاق کے طور پر تقسیم کر دیا تھا۔ تقسیم کی ایک صورت یہ بھی اللہ نے سورۃ مائدہ میں ذکر کی ہے کہ بعض اوقات مشرکین اپنے مقدمات حضور علیہ السلام کی خدمت میں فیصلہ کے لیے بھیج دیتے اور ساتھ ہی فریق مقدمہ کو کہہ دیتے کہ اگر فیصلہ تمہاری مرضی کے مطابق ہوا تو قبول کر لینا ورنہ چھوڑ دینا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ نے فرمایا "لَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ ‌ۖۚ وَّلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ" (المائدہ) یعنی ایسا شخص دنیا میں بھی ذلیل ہوگا اور آخرت میں بھی اس کے لیے عذاب عظیم ہوگا۔ بڑے بڑے صنادید قریش تھے جنہیں اللہ نے اسی دنیا میں ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مشرکین نے آپس میں ڈیرے اور راستے

تقسیم کر رکھے تھے تاکہ حضور علیہ السلام کے پاس جانے والے لوگوں کو راستے میں ہی روک دیا جائے۔ آپ کے خلاف پراپیگنڈا کرتے، آپ کو نعوذ باللہ ساحر اور دیوانہ کہہ کر لوگوں کو آپ کی ملاقات سے روکتے۔ ایک دفعہ عربوں کا مشہور شاعر اعشیٰ حضور کی خدمت میں حاضری کے لیے مکہ آیا۔ یہ شخص صناجۃ العرب یعنی عربوں کا باجہ کہلاتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلی ہوئی بات ضرب المثل بن جاتی تھی۔ قریش مکہ کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر اس نے حضور کی شان میں کوئی قصیدہ کہہ دیا تو پھر آپ کا راستہ روکنا ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے تدبیر کی کہ کس طرح اعشیٰ حضور علیہ السلام سے ملاقات نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے اناج سے لدا ہوا ایک سو اونٹ اُسے رشوت میں اس لیے پیش کیا کہ وہ حضور علیہ السلام سے ملاقات نہ کرے۔ وہ شخص اونٹ لے کر اپنے وطن میں چلا گیا اور آپ سے ملاقات نہ کی۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے آئمۃ الکفر کو دنیا میں ہی سزا دی۔ چنانچہ بعض جنگ بدر میں مارے گئے۔ کوئی آنکھوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر جہنم واصل ہوا کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا جس کا زہر سارے جسم میں سرایت کر گیا اور وہ شخص ہلاک ہو گیا۔ بہر حال جن لوگوں نے قرآن پاک کو ٹکڑے ٹکڑے کیا، اللہ نے ان پر طرح طرح کا عذاب نازل فرمایا۔

بعض فرماتے ہیں کہ اس مقام پر قرآن سے مراد اللہ کی آخری کتاب نہیں بلکہ اس سے مراد پہلی کتابیں تورات، انجیل وغیرہ ہیں اور ان کو تقسیم کرنے والے ان کے حاملین یہود اور نصاریٰ ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی مذہبی کتابوں کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ اُن کے کسی حکم کو مان لیا اور کسی کا انکار کر دیا جیسا کہ سورۃ بقرہ میں موجود ہے "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" کیا تم کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔ ایسے لوگوں کے عذاب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن

میں بار بار ذکر کیا ہے۔ کہیں فرمایا کہ بندر اور خنزیر بنا دیے گئے، کہیں فرمایا کہ چالیس سال تک صحرا میں بھٹکتے رہے۔ کبھی یہ باہمی عداوت و پیکار میں مبتلا ہوئے اور کبھی ان کو دوسری اقوام نے پامال کیا۔

اگر مقتسم قسم کے مادے سے ہو تو اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے قسمیں اٹھانے والے لوگوں پر عذاب نازل فرمایا۔ ایسے لوگوں کا ذکر بھی اللہ نے مختلف سورتوں میں کیا ہے۔ اصحاب حجر یعنی قوم ثمود کے لوگ بھی قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ ہم صالح علیہ السلام کو زندہ نہیں چھوڑیں گے سورۃ النحل میں موجود ہے "قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ" شہر کے نو فسادی آدمیوں نے کہا کہ خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو صالح علیہ السلام اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے۔ یعنی ان سب کو ہلاک کر دیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے خود انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے قسمیں اٹھانے والوں پر عذاب نازل کیا۔ اسی طرح ان لوگوں پر نازل کریں گے جو خاتم النبیین علیہ السلام کی مخالفت کرتے ہیں۔

لازمی باز پرس

قرآن پاک کو مختلف طریقوں سے تقسیم کرنے والے ہوں یا دین حق کی قسمیں اٹھا کر مخالفت کرنے والے اللہ نے فرمایا فَوَرَبِّكَ تیرے پروردگار کی قسم لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اس بارے میں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔ اس مقام پر تو منکرین و مکذبین سے سوال جواب کا ذکر ہے مگر بعض مقامات پر بغیر باز پرس ہی جہنم رسیدگی کی وعید سنائی گئی ہے جیسے سورۃ الرحمٰن میں ہے "فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ" اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائیگا۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ۔ مجرم لوگ اپنے چہروں سے ہی پہچانے جائیں گے اور انہیں سر کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹ کر لے جایا جائے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے حشر کے میدان میں کئی واقعات پیش آئیں گے۔ بعض مواقع پر انسان سے شدید باز پرس ہوگی اور بعض مواقع پر بغیر پوچھے مجرمین کو پکڑ کر لے جایا جائیگا امام ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر سوال کرنے سے مراد محض باز پرس نہیں بلکہ سخت ڈانٹ ڈپٹ مراد ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی شخص کو قدم نہیں اٹھانے دیا جائے گا جب تک وہ ان سوالوں کا جواب نہ دے لے کہ اس نے عمر کے شباب کے حصے کو کہاں خرچ کیا دنیا میں مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا وغیرہ۔ اسی طرح یہاں پر بھی فرمایا ہے کہ ان سب سے ہم ضرور سوال کریں گے ان تمام کاموں کے متعلق جو وہ دنیا میں انجام دیتے رہے ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام سے خطاب فرمایا ہے۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ۔ پس آپ واضح طور پر سنا دیں جو کچھ آپکو حکم دیا گیا ہے۔ صدع دراصل اس برتن کو کہتے ہیں جو ٹوٹ جائے اور اس کے دوبارہ جڑنے کا امکان نہ ہو۔ تو یہاں پر مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کی توحید کا واضح طور پر دو ٹوک اعلان کر دیں اور اس میں کسی قسم کی رو رعایت نہ رکھیں وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ، اور مشرکوں سے اعراض کریں۔ آپ ان کی پروا نہ کریں کہ وہ کیا کرتے ہیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ہم آپ کو کفایت کریں گے ٹھٹھا کرنے والوں کے شر سے۔ یعنی ان کے شر کے اثرات آپ تک نہیں پہنچنے دیں گے

ورود علیہ السلام تسلی

سورۃ البقرہ میں بھی گزر چکا ہے "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" اللہ تعالیٰ ہی آپ کی کفایت کریگا کیونکہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ آپ ٹھٹھا کرنے والوں کی بالکل پرواہ نہ کریں۔

اور استہزاء کرنے والے کون لوگ ہیں؟ اَلَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود بنا رکھا ہے۔ کوئی ان کا سفارشی ہے۔ کوئی معبود، کوئی حاجت روا اور مشکل کشا۔ فرمایا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ وہ عنقریب جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ شریک اور نہ ہی اس کے سوا کوئی معبود ہے فرمایا وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ اُن باتوں سے تنگ ہوتا ہے جو یہ مشرکین کرتے ہیں۔ یہ لوگ کفر شرک کی باتیں کرتے ہیں، آپ پر طعن اور استہزاء کرتے ہیں، آپ کی شان میں بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کے قلب مبارک کو بہت اذیت پہنچتی ہے، آپ کو رنج ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی ہے کہ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ جب آپ لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے اور وہ اسے شدت سے رد کر دیتے تو پھر بھی آپ کی طبع پر بہت گراں گزرتا آپ بنی نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ خیر خواہ تھے اور لوگوں کو لیے لوث ایمان اور فلاح کی دعوت دیتے تھے يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا لوگو! کہہ دو، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فلاح پا جاؤ گے، یہ تو تمہارے ہی فائدے کی بات ہے مگر اتنی خیر خواہی کا جواب جب شر و فساد سے ملتا تو حضور علیہ السلام کا دل بڑا تنگ ہوتا۔ اسی لیے تو اللہ نے فرمایا "فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا"

(الکہف) اے پیغمبر! اگر یہ لوگ اس کلام الٰہی پہ ایمان نہ لائیں تو شائد آپ
گلا گھونٹ کر ہلاک ہو جائیں۔

فرمایا اس قدر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا فرض
یہ ہے "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" (المائدۃ)
جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، آپ اُسے
بلا کم و کاست آگے پہنچا دیں۔ کیونکہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا
الْحِسَابُ (الرعد) خدا کا پیغام پہنچا دینا اور لوگوں کو سمجھا دینا آپ کا کام
ہے، اور ان سے حساب لینا ہمارا ذمہ ہے۔ "وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ
اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ" (البقرہ) اہل دوزخ کے متعلق آپ سے نہیں
پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں دوزخ میں گئے، بلکہ اپنی کارکردگی کے وہ خود
ذمہ دار ہوں گے اور اس بارے میں انہی سے سوال ہوگا۔ آپ صرف
اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے چلے جائیں۔ بہر حال مشرکین کی بدسلوکی پر حضور
علیہ السلام کے دل کی تنگی قدرتی بات تھی۔ ہر نبی امت کا خیر خواہ ہوتا ہے
حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم عاد سے یہی کہا تھا اُبَلِّغُكُمْ
رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (الاعراف)
میں تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ اور
امانتدار بھی ہوں۔ اس میں میرا ذاتی کوئی مفاد نہیں بلکہ تمہاری خیر خواہی مقصود
ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی قوم کو اس طرح خطاب فرمایا
اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا ہے "وَنَصَحْتُ
لَكُمْ" اور تمہاری خیر خواہی کر دی ہے۔ "فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ
كٰفِرِيْنَ (الاعراف) اب میں تمہاری ہلاکت پر کیسے افسوس کا اظہار
کروں۔؟

تبلیغ و تجمید — آگے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو ان کے قلب و صدر کی تنگی

کا علاج بھی بتایا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بلکہ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید بیان کریں، اسکی پاکی اور حمد بیان کریں وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں یعنی آپ کثرت سے نماز پڑھیں۔ چنانچہ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں آتا ہے کہ جب کبھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت پریشانی لاحق ہوتی تو آپ فوراً نماز کی طرف رجوع کرتے۔ پریشانی کا علاج نماز ہے کیونکہ اس کے ذریعہ تعلق باللہ قائم ہوتا ہے اور جس قدر تعلق باللہ مضبوط ہوگا اسی قدر مصائب کم ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوگی اور دل میں تسکین پیدا ہوگی کہ دل کا سکون اللہ کے ذکر میں ہی ہے تو فرمایا آپ اللہ کی تسبیح یعنی پاکی بیان کریں، اس کی تعریف کریں اور نماز کی کثرت رکھیں۔

آخر دم تک عبادت

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے وَاعْبُدْ رَبَّكَ اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہیں، مسلسل بندگی میں لگے رہیں حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ یہاں تک کہ آپ کے پاس یقین آ جائے عربی زبان میں یقین کا اطلاق موت پر بھی ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ آپ آخر دم تک اللہ کی عبادت میں مشغول رہیں۔ موت ایک یقینی امر ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد بھی ہے "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (آل عمران) ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اس سے اللہ کا نبی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر جاندار کو اس کٹھن گھاٹی سے گزرنا ہے۔ متنبی شاعر کہتا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہوسکتا ہے مگر موت ایک ایسی چیز ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں، اس پر سب کو یقین ہے اَلْمَوْتُ اَصْدَقُ وَالْحَيٰوةُ غُرُوْرٌ۔ موت یقینی چیز ہے اور زندگی محض دھوکا ہے۔ انسان کے گلے

ہیں زندگی کا جو دھاگا لٹک رہا ہے، یہ بالکل کمزور ہے اور کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے، لہٰذا فرمایا کہ زندگی کے آخری سانس تک خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں یہ تسلی کا مضمون بھی ہو گیا۔

سورۃ کی ابتدا میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا مضمون تھا پھر توحید اور اس کے دلائل بیان ہوئے۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ کی شانِ رحمت اور شانِ غضب کا ذکر ہوا۔ پھر نافرمان قوموں کی سزا کی طرف اشارہ کیا اور آخر میں تسلی کے مضمون پر اس سورۃ کو ختم کیا ہے۔

سورة النحل

مكية

درس اول ۱ — آیت ۱ تا ۴

سُورَۃُ النَّحْلِ مَکِّیَّۃٌ وَّهِیَ مِائَۃٌ وَّثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْهَا سِتَّۃَ عَشَرَ رُکُوْعًا

سورۃ نحل مکی ہے اور یہ ایک سو اٹھائیس آیات اور اسمیں سولہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی
عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ① یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ
مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ③
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ
مُّبِیْنٌ ④

ترجمہ :- آ پہنچا ہے اللہ کا حکم ۔ پس نہ جلدی کرو اس کے لیے ۔ پاک ہے اُس کی ذات اور بلند و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اسکے ساتھ شریک بناتے ہیں ① اتارتا ہے وہ فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے (اور فرماتا ہے) کہ ڈرادو لوگوں کو بیشک نہیں کوئی معبود میرے

سوا، پس مجھ سے ڈرتے رہو (۲) پیدا کیا ہے اُس نے
آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ۔ بلند و برتر ہے اُن
چیزوں سے جن کو یہ اُس کے ساتھ شریک بناتے ہیں (۳)
پیدا کیا ہے اُس نے انسان کو پانی کے قطرے سے، پس
اچانک وہ انسان ہو گیا جھگڑا کرنے والا کھُلے طور پر (۴)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ النحل ہے۔ نحل شہد کی مکھیوں کو کہا جاتا ہے ان مکھیوں میں اللہ نے جو کمال رکھا ہے اُسے اپنی توحید کی دلیل کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورۃ کو نحل کا نام دیا گیا ہے۔ اس سورۃ کا زمانہ نزول بھی سابقہ سورۃ کی طرح مکی زندگی کا آخری دور ہے۔ جب کہ ہجرت کا وقت قریب آچکا تھا۔

اس سورۃ کی ۱۲۸ آیات، ۱۶ رکوع ۱۸۴۱ الفاظ اور ۷۰۷۶ حروف ہیں۔ یہ درمیانے درجے کی سورتوں میں سے ہے۔

مضامین سورۃ

گذشتہ سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "قُلْ إِنِّيٓ أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ" آپ کہہ دیں کہ میں کھول کر ڈر سنانے والا ہوں، تو اس سورۃ میں اللہ نے ڈر کی تفصیل بیان فرمائی ہے، اور مجرمین کو واضح طور پر خبردار کر دیا ہے کہ وہ اپنی فکر کر لیں، اُن کی گرفت آنے والی ہے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اور وحی الٰہی کی صداقت، توحید باری تعالیٰ، مسئلہ رسالت اور وقوع قیامت اور اس کے ساتھ مجرموں کی سزا کا ذکر کیا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں حلت و حرمت کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں۔ انسان کی طرف سے از خود حرام کردہ چیزوں کی تردید اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے کا حکم ہے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا اللہ تعالیٰ

کا کام اور اس کی صفت ہے اور یہ بات ایمان کی شرائط میں داخل ہے حضور علیہ السلام کے صحابی نعمان بن قوقلؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا، اگر میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کروں، نماز ادا کروں اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھوں، تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ مجبوری کی حالت میں بعض اوقات حرام چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں، تو اس سورۃ میں اللہ نے اضطرار کے مسائل بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس کے علاوہ سورۃ ابراہیم کی طرح اس سورۃ میں بھی ملت ابراہیمی کی تصریح کی گئی ہے۔ غلامی اور آزادی کا مسئلہ بھی بیان ہوا ہے تاہم زیادہ تر توحید کے دلائل اور شرک کی مختلف صورتوں کی تردید کی گئی ہے

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کا عالمی پروگرام پیش کیا ہے۔ جسے اہل اسلام فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ یہ وہی عالمی پروگرام ہے جس کی ایک آیت آپ ہر خطبہ جمعہ میں سنتے رہتے ہیں "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" اللہ تعالیٰ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ یہ اسی سورۃ مبارکہ کی آیت ہے، جسے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خطبہ جمعہ میں شامل کیا تھا۔ ہر جماعت اور حکومت کا ایک منشور ہوتا ہے جس کے مطابق کوئی نظام چلانا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے اگلی سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ نے منشور اسلام (MANIFESTO OF ISLAM یعنی فسٹو آف اسلام) بھی پیش کیا ہے اس سے اگلی دونوں سورتوں میں اللہ نے دور جدید کے فتنوں یعنی عیسائیت اور دجالیت کا رد فرمایا ہے۔ اس میں طریقہ تبلیغ بتایا ہے اور اقتصادی مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔ اللہ نے ایفائے عہد کی تلقین اور نقض عہد سے منع فرمایا ہے۔

ذاب الٰہی ی آمد

تمہید کے طور پر بعض سورتوں کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی تعریف سے ہوتی

ہے اور بعض کی ابتدا میں حروف مقطعات آتے ہیں۔ تاہم اس سورۃ مبارکہ میں چونکہ انذار کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جس سے مجرموں اور نافرمانوں کی تنبیہ مطلوب ہے، لہذا اس سورۃ کی ابتدا بلا تمہید براہ راست کی گئی ہے۔ اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ اللہ کا حکم آن پہنچا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب اللہ کے نبی لوگوں کو قیامت اور محاسبۂ اعمال سے ڈراتے تو وہ کہتے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو، اُسے لے آؤ۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ اُن کو سزا دینے والا حکم آپہنچا ہے

عذابِ الٰہی کی آمد

یہ عذابِ الٰہی کی آمد کی وعید ہے جو کہ مستقبل میں نازل ہونے والا ہے مگر اس آیت کریمہ میں اَتٰى ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا معنیٰ یہ ہونا چاہئے کہ اللہ کا حکم آچکا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کا یہ اسلوبِ بیان ہے کہ جو واقعہ مستقبل میں یقینی طور پر پیش آنے والا ہوتا ہے اسے مضارع کی بجائے ماضی کے صیغہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قیامت اور جنت، دوزخ کے اکثر واقعات ماضی کے صیغے کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ كُلُّ مَا اٰتٍ ہر چیز جو یقینی طور پر آنے والی ہے، وہ اتنی ہی اٹل ہوتی ہے جیسے وہ آچکی ہے چونکہ قیامت اور جزائے عمل لازمی طور پر واقع ہونے والے ہیں، اس لیے اللہ نے انہیں ماضی میں بیان کیا اور مطلب یہی ہے کہ اللہ کا حکم عنقریب آنے والا ہے فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ لہذا جلدی نہ کرو، وہ آیا ہی چاہتا ہے۔

غلبہ اسلام کی پیشگوئی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحؒ کی تفسیر کے مطابق امر اللہ سے مراد اسلام کی فتح، اس دنیا میں مخالفین کی تذلیل اور آگے چل کر سخت عذاب ہے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرما کر پیشگوئی کر دی ہے کہ اس وقت تو کافر لوگ اہل ایمان کو تنگ کر رہے ہیں، ان پر عرصہ حیات

تنگ کر رکھا ہے مگر ان کی فتح اور کفار کی شکست عنقریب واقع ہونے والی ہے۔ اسی غلبہ اسلام کے ساتھ اسلام کا عالمی پروگرام بھی منسلک ہے۔ یہ ایسا پروگرام ہے جو اسلام کے سوا کسی مذہب کے پاس نہیں ہے اور اسی پروگرام کے ذریعے پوری دنیا کی اصلاح مقصود ہے۔

نزولِ وحی

فرمایا سُبْحٰنَهٗ پاک ہے اس کی ذات وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ وہ اُن تمام چیزوں سے بلند و برتر ہے جن کو وہ اللہ کا شریک بناتے ہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور معبودِ برحق ہے اور اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں۔ اُس کی برتری اسی بات سے ظاہر ہے کہ اُس نے بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے اپنے فرشتوں کے ذریعے وحی نازل فرمائی، چونکہ انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست رابطہ قائم کر کے احکام حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ نے کفر، شرک اور معاصی سے بچنے کا پروگرام فرشتوں کے ذریعے ارسال کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ وہ ملائکہ کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اتارتا ہے۔ یہاں پر روح سے مراد وحی ہے جیسے قرآنِ پاک۔ خود قرآن کو بھی وحی کہا گیا ہے۔ اور ایک روح وہ بھی ہے جس پر انسانی زندگی کا مدار ہے۔ اسی کے ذریعے انسان میں عقل و شعور پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان کے جسم سے روح خارج ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس طرح انسان کو روح کے ذریعے ظاہری حیات نصیب ہوتی ہے، اسی طرح کلام پاک اور وحی الٰہی کے ذریعے انسانوں کے دل زندہ ہوتے ہیں، اُن کے دلوں میں ایمان، توحید اور نیکی پیدا ہوتی ہے گویا وحی الٰہی انسان کی روحانی حیات کا ذریعہ ہے۔ اس کی وساطت سے انسان کا اعتقاد درست ہوتا ہے اور ابدی حیات نصیب ہوتی ہے دل میں پاکیزہ اخلاق و جذبات اُبھرتے ہیں، انسان کا قلب اللہ کی

تجلیات کا مورد بنتا ہے، اور انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔

رسالت کا انتخاب

فرمایا اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اپنی وحی دے کر نازل فرماتا ہے حضرت جبریل امین اس اعلیٰ منصب پر فائز ہیں جن کے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یہ وحی کس پر نازل ہوتی ہے؟ عَلٰى مَنْ يَّشَاۤءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اپنے بندوں میں سے جس پر اللہ چاہتا ہے مطلب یہ ہے کہ نبوت ورسالت کا انتخاب کسی شخص کی کوشش محنت عبادت وریاضت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ یہ انتخاب خود اللہ جل جلالہ کا اپنا ہوتا ہے۔ سورۃ انعام میں گزر چکا ہے "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کی صلاحیتوں کو جانتا ہے اور پھر وہ حکمت اور مصلحت کے مطابق ان میں سے نبوت او رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ سورۃ حج میں بھی موجود ہے "اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۤئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ" فرشتوں اور انسانوں میں سے اللہ ہی اپنے رسول منتخب فرماتا ہے۔ گویا پیغام رسانی کے لیے فرشتوں کا انتخاب اور نبوت ورسالت کے لیے انسانوں کا انتخاب دونوں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہی ان کا فیصلہ کرتا ہے۔ پیغام رسانی کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کر کے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری اور ابدی پروگرام قرآن پاک کی صورت میں آچکا ہے۔ اب اگر اس کائنات کی مجموعی عمر دس لاکھ سال بھی ہو تو بھی کسی دوسرے پروگرام کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی نیا نبی آئے گا۔ اب تا قیام قیامت یہی دین باقی رہے گا۔

دعوت توحید

فرمایا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی نازل فرماتا ہے اور حکم دیتا ہے اَنْ اَنْذِرُوْۤا کہ لوگوں کو خبر کر دو، ڈرا دو اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ

اِلَّآ اَنَا کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، نہ کوئی میری عبادت میں شریک ہے اور نہ توحید میں۔ میں ہی خالق اور مالک ہوں۔ میں ہی قادرِ مطلق، مختارِ مطلق اور علیم کل ہوں۔ تمام بنی نوعِ انسان کی ضروریات کو جاننے والا میں ہوں۔ نفع نقصان کا مالک میں ہوں۔ میرے سوا نہ کوئی مشکل کشا ہے اور نہ حاجت روا اور نہ بگڑی بنانے والا۔ ہمہ دان، ہمہ بین اور ہمہ توان بھی میرے سوا کوئی نہیں لہٰذا فَاتَّقُوْنِ مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ اگر تم نے میرے ساتھ کسی کو شریک بنایا تو میری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

تخلیقِ انسانی بطورِ دلیل

فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اُس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کائنات کا پورا نظام کوئی کھیل تماشہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ نے انہیں مخلوق کی مصلحت کے لیے پیدا فرمایا ہے، اور پھر اس ساری تخلیق کا نتیجہ بھی سامنے آنے والا ہے۔ لہٰذا اُس ذات سے ڈر جاؤ، اور وہ ذات ایسی ہے تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ اُن تمام چیزوں سے بلند و برتر ہے، جن کو وہ اُس کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔ بار بار یاد دہانی کرائی جا رہی کہ وہی ذات اعلیٰ و ارفع ہے، اس کے مقابل کی کوئی چیز نہیں، لہٰذا اُس کے ساتھ کسی کو شریک اور شفیع نہ بناؤ، کسی کو مشکل کے وقت میں مت پکارو، حاجت روائی اور مشکل کشائی صرف اُسی سے چاہو۔ وہی ذات بلند و برتر ہے، باقی ہر چیز ہیچ ہے۔

آسمان و زمین کا ذکر کر کے اللہ نے اپنی وحدانیت کی بیرونی نشانیاں پیش کر دیں۔ اب انسان کو خود اس کے وجود کی اندرونی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اللہ نے انسان کو قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں ہے کہ ہم نے انسان کی نسل "مِنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ" یعنی حقیر پانی سے چلائی۔

ایسا حقیر پانی کہ اگر کپڑے یا جسم کو لگ جائے تو دھونا یا نہانا لازم ہو جاتا ہے
یہ ایسی نجاست ہے جسے انسانی مزاج برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں
مگر یہی حقیر مادہ انسانی تخلیق کا ذریعہ ہے۔

فرمایا کہ جب انسان اس حقیر مادہ سے پیدا ہو گیا فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ تو اچانک کھلے طور پر جھگڑنے والا بن گیا۔ اب یہ توحید الٰہی کا انکار کرتا ہے اور شیطان کی پیروی میں شرکیہ امور کی ترجمانی کرتا پھرتا ہے غیر اللہ کی نذر و نیاز کے حق میں باطل دلائل پیش کر کے جھگڑا کرتا ہے کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اپنی تخلیق سے اللہ کی وحدانیت کو سمجھنے کی بجائے شرک کے حق میں دلائل دیتا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی بغاوت پر اُتر آتا ہے۔

یہ انذار کا مسئلہ بھی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی بیرونی اور اندرونی دو دلیلیں بیان کی ہیں۔ آسمان و زمین کی پیدائش میں غور کر کے بھی انسان معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے اور خود اپنی تخلیق پر غور کرے تو پھر بھی اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ یہ تو عقلی دلائل ہیں، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرما کر اور کتب سماویہ نازل کر کے انسان کے لیے اپنی وحدانیت کے نقلی دلائل بھی مہیا کر دیے ہیں۔ اللہ نے دنیا کے ہر خطے میں اپنے نبی بھیجے ہیں اور ہر ایک نبی نے یہی تعلیم دی "لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُونِ" (الانبیاء) خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی لیے وہ فرماتا ہے کہ میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میری توحید میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ انسان کی اپنی عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ یہ بات سچی ہے، لہٰذا اسے قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ
وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝٥ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ
تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝٦ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ
اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ
اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝٧ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ
وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٨
وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَاۗىِٕرٌ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ
ع لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٩

ترجمہ :- اور مویشی ، اِن کو پیدا کیا ہے ۔ اِن میں تمہارے
لیے گرمی کا سامان ہے اور بہت سے فائدے ہیں ۔ اور ان
میں سے بعض کو تم کھاتے ہو (۵) اور تمہارے لیے ان
مویشیوں میں خوبصورتی ہے جس وقت تم انہیں چراگاہوں
سے چرا کر پچھلے پہر لاتے ہو ، اور جس وقت تم صبح اِن
کو چرنے کے لیے لے جاتے ہو (۶) اور اٹھاتے ہیں
وہ تمہارے بوجھ اُن شہروں تک کہ تم نہیں پہنچنے والے
تھے اُن تک مگر اپنے نفسوں کو مشقت میں ڈال کر ۔
بیشک تمہارا پروردگار البتہ بہت شفقت کرنے والا
اور بہت مہربان ہے (۷) اور گھوڑوں ، خچروں اور گدھوں

کو (اس نے پیدا کیا ہے) تاکہ اُن کی سواری کرو اور (تمہارے لیے) زینت ہو۔ اور وہ پیدا کرتا ہے وہ چیزیں جو تم نہیں جانتے ⑧ اور اللہ تک ہی پہنچتا ہے سیدھا راستہ، اور بعض راستے اِن پر ٹیڑھے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو البتہ تم سب کو ہدایت دے ⑨

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتدائی آیتوں میں انذار کا مضمون بیان ہوا ہے۔ اللہ سے ڈرنے اور اس کی گرفت سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے اپنے انبیاء پر وحی نازل فرما کر لوگوں کو ڈرانے اور خبردار کرنے کا حکم دیا کہ اللہ فرماتا ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو اور میری توحید کو مانو، خدا تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا ذکر کیا ہے اور اُن دلائل کو بیان کیا ہے جن میں غور کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھ سکتا ہے اور خدا کی اطاعت اور شکر گزاری بجا لا سکتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آسمانوں اور زمین کا ذکر بطور دلائلِ قدرت کے کیا۔ خدا تعالیٰ کی ذات کو ہر قسم کے شریکوں سے بلند و برتر قرار دیا۔ اس کے بعد اللہ نے انسان کی تخلیق کا ذکر کیا کہ اسے حقیر قطرۂ آب سے پیدا کر کے کتنا کمال عطا کیا، مگر افسوس کا مقام ہے کہ انسان اپنی اصلیت کو بھول کر اور خدا تعالیٰ کی قدرت کی طرف عدم توجہی کی بنا پر اس کی توحید میں جھگڑا کرنے لگتا ہے اور شرکیہ عقائد اور باطل رسوم کے حق میں دلائل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مویشیوں کے فوائد

اب اللہ نے مویشیوں کا ذکر کر کے اپنی قدرت کے بعض دلائل پیش کیے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا اور مویشیوں کو پیدا کیا۔ اِن مویشیوں سے کون سے مویشی مراد ہیں۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام اور بعض دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے

سورۃ الانعام میں ہے "ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ" یہ آٹھ جوڑے ہیں جو عام طور پر انسانوں کے قریب رہتے ہیں اور ان سے مانوس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانوں کی خدمت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور یہ ان کا دودھ، گوشت، کھال اور ہڈیاں استعمال میں لاتے ہیں اور یہ جانور اونٹ (نر اور مادہ) گائے بیل (نر اور مادہ) بھیڑ (نر اور مادہ) اور بکری (نر اور مادہ) ہیں۔ یہ مویشی طاقت میں انسان سے کہیں بڑھ کر ہیں مگر اللہ نے ان کے اذہان میں یہ بات ڈال دی ہے کہ وہ انسان کی خدمت پر مامور ہیں۔ ایک تین سال کا بچہ بھی اونٹ کی نکیل پکڑ کر چل دے تو سو اونٹ اس کے پیچھے چل پڑے گا۔ بعض اوقات یہی جانور خلافِ معمول جب بگڑ جاتے ہیں تو تباہی مچا دیتے ہیں۔ اونٹ کے متعلق تو خاص طور پر مشہور ہے کہ وہ اپنے دشمن کو ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ بہر حال اللہ نے ان آٹھ قسم کے مویشیوں کا ذکر کیا ہے اور انسان کو یاد دلایا ہے کہ ان جانوروں کو اس کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی اس کی وحدانیت کی ایک دلیل ہے۔

ان جانوروں کے علاوہ بعض دوسرے جانور بھی ہیں جو انسان سے مانوس نہیں ہیں۔ ان میں جنگلی جانور، نیل گائے، ہرن، جنگلی گدھے وغیرہ بھی ہیں جو اگرچہ مفید ہیں مگر انہیں آسانی سے قابو نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے ایسے جانوروں کی قربانی جائز قرار نہیں دی۔ بلکہ قربانی کے لیے وہی آٹھ جوڑے مقرر کیے ہیں جو ہمیشہ انسانوں کے قریب رہتے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں۔

ان اور
وشت

فرمایا اللہ نے مویشیوں کو پیدا کیا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ ان میں تمہارے لیے گرمی کا سامان ہے۔ اونٹ اور بھیڑ بکری کی اون سے گرم لباس تیار ہوتے ہیں جو موسم سرما میں انسان کے لیے کار آمد ہوتے ہیں۔ انسانی لباس میں دھسّہ، کوٹ، کمبل، سویٹر وغیرہ اون سے تیار کیے جاتے ہیں جو کہ ان جانوروں سے حاصل

ہوتی ہے۔ اسی طرح ان جانوروں کی کھال سے پوستین، موزے اور صدری وغیرہ بنتے ہیں، وہ انسانوں کے لیے گرمی پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں، اسی لیے فرمایا کہ ان جانوروں میں تمہارے لیے گرمی کا سامان ہے۔ وَمَنَافِعُ اور بہت سے فائدے ہیں۔ اس کے بعد ان جانوروں کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ مذکورہ آٹھ قسم کے جانوروں کا گوشت انسانی غذا کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس لیے شریعت میں انہی جانوروں کا گوشت حلال ہے، جن میں کسی قسم کا جسمانی یا روحانی ضرر نہ ہو۔ مردار، خنزیر، نذر لغیر اللہ، بلی کتے وغیرہ اور پنجہ مار کر شکار کرنے والے پرندوں کو اسی لیے حرام قرار دیا گیا ہے کہ ان میں جسمانی یا روحانی ضرر پایا جاتا ہے اور یہ انسان کے لیے غیر مفید ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے پاکیزہ اخلاق یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت پر غذا کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم کے جانور کا گوشت کھایا جائے گا۔ انسانی اخلاق پر اسی قسم کے اثرات مرتب ہوں گے۔ جن آٹھ جانوروں کا گوشت اللہ نے حلال قرار دیا ہے، وہ انسان کے پالتو جانور ہیں، اس لیے ان کا گوشت بھی انسانی مزاج کے مطابق ہے ان کی پیدائش کا بھی اللہ نے وسیع انتظام فرمایا اور ہر روز لاکھوں جانور ذبح ہو کر استعمال ہوتے ہیں ان کے علاوہ اگر کوئی شخص بھیڑیے کا گوشت کھائے گا تو اسی قسم کی چیر پھاڑ والی خصلت پیدا ہوگی۔ خنزیر، کتا، بلی وغیرہ کے گوشت سے اسی قسم کے اخلاق پیدا ہوں گے۔ بہرحال فرمایا کہ مویشیوں میں انسان کے لیے یہ دو بڑے فائدے ہیں کہ ان کے ذریعے گرمی کا سامان مہیا ہوتا ہے اور ان کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔

دودھ کی نعمت

ان دو بڑے فوائد کے درمیان اللہ نے ایک اور چیز کا ذکر کیا ہے

وَمَنَافِعُ یعنی اِن جانوروں میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ مثلاً سب سے اہم چیز ان جانوروں کا دودھ ہے جو بچپن سے لے کر آخر عمر تک انسانی غذا کا حصہ ہے۔ پھر دودھ سے حاصل ہونے والا دھی اور گھی بھی بہت بڑی مقدار میں انسانی استعمال میں آتا ہے۔ خاص طور پر یہ بچوں اور بیماروں کے لیے یہ چیزیں انتہائی مفید ہیں، جنہیں اللہ نے ان جانوروں کے ذریعے بہم پہنچایا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک ایسی چیز جو بیک وقت کھانے اور مشروب کا کام دے، وہ دودھ کے علاوہ کوئی نہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے امت کو سکھلایا ہے کہ جب بھی کوئی نعمت استعمال کرو تو اس کا شکریہ ادا کرو اور دعا کرو کہ اے اللہ! اس سے بہتر عطا فرما مگر جب دودھ جیسی عظیم نعمت استعمال کرو تو اَللّٰھُمَّ زِدْنَا مِنْهُ کی دعا کرو یعنی اے اللہ! ہمارے لیے اس میں اضافہ فرما۔ گویا دودھ سے بہتر چیز کی دعا نہیں کی گئی۔ دودھ کے علاوہ اِن جانوروں کی چربی اور ہڈیاں بھی انسانی فائدے کی مختلف چیزوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ تو فرمایا اِن جانوروں میں تمہارے لیے دیگر فوائد بھی ہیں۔

خوبصورتی کا ذریعہ

فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ ان میں تمہارے لیے خوبصورتی ہے حِينَ تُرِيحُونَ جب کہ وہ جنگلوں سے چر کر پچھلے پہر گھر واپس آتے ہیں وَحِينَ تَسْرَحُونَ اور جس وقت صبح کے وقت چرنے کے لیے باہر جاتے ہیں مطلب یہ کہ مویشیوں کی آمد و رفت بھی تمہارے لیے خوشنمائی کا باعث ہے یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے جانوروں کے چرنے کے لیے جانے اور پھر واپس آنے کا ذکر ہونا چاہیئے مگر اس آیت کریمہ میں پہلے واپس آنے اور بعد میں گھر سے جانے کا ذکر کیا ہے۔ ایسا کیوں؟

اس ضمن میں امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے زیادہ خوبصورت حالت کا پہلے ذکر کیا ہے اور نسبتاً کم خوشنمائی کا بعد میں۔ جس وقت جانور گھر سے چرنے کے لیے جنگل کی طرف نکلتے ہیں تو بسا اوقات گوبر سے لتھڑے ہوئے اور کسی قدر بھوکے بھی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ خوبصورت نظر نہیں آتے۔ البتہ جب جنگل سے چر چگ کر شام کو واپس آتے ہیں تو دن بھر پھرنے سے اُن کی غلاظت وغیرہ بھی دُور ہو چکی ہوتی ہے اور پیٹ بھی بھرے ہوتے ہیں، اس لیے زیادہ خوشنما نظر آتے ہیں۔ تو یہاں پر اللہ نے زیادہ خوشنمائی کی حالت کو پہلے ذکر کیا ہے۔

جانوروں کے حقوق

اپنے جانوروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر انسان کا جی خوش ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے بشرطیکہ اس میں تکبر کا پہلو نہ ہو۔ خوبصورت جانور دیکھ کر انسانوں کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور اگر وہ ان پر غرور کرنے لگے گا تو یہ اُس کے حق میں حرام ہوگا اور اسے اللہ تعالیٰ کی ناشکری پر محمول کیا جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر ان جانوروں کے بھی بعض حقوق رکھے ہیں۔ فرضی حق میں زکوٰۃ ہے جو سال بھر میں ایک دفعہ ادا کی جاتی ہے بشرطیکہ جانور نصاب کو پہنچ جائیں اس کے علاوہ انسان پر ایک اخلاقی حق بھی عائد ہوتا ہے کہ اگر جانور دودھ دینے والا ہے تو اس میں سے غریبوں اور محتاجوں کو بھی حصّہ دیا جائے۔ کوئی بیمار ہے بچہ ہے جسے دودھ کی ضرورت ہے تو اُسے مایوس نہ کیا جائے اس طرح اگر کسی کے پاس گھوڑا ہے تو اس کا حق بھی ادا کرے۔ کسی ضرورت مند پڑوسی یا عزیز کو سواری کے لیے ضرورت ہے، تو انکار نہ کرے۔ یہ حق محض گھوڑے کی سواری تک محدود نہیں سواری کی کوئی قسم کار، موٹر سائیکل یا سائیکل کی سواری موجود ہے تو حاجتمند

کو بوقت ضرورت بیش کرنا، اس سواری کا حق ادا کرنا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ اپنے جانوروں کا حق ادا کرو جس دن انہیں گھاٹ پر لے جاتے ہو۔

باربرداری کا کام

اللہ تعالیٰ نے جانوروں کا ایک یہ فائدہ بھی بیان فرمایا ہے وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ یہ جانور ایسے شہروں تک تمہارے بوجھ اٹھاتے ہیں، جہاں تم اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ باربرداری کا کام خالی سفر سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اللہ کے پیدا کردہ جانور نہ صرف انسانوں کے لیے سواری کا کام دیتے ہیں بلکہ ان کی باربرداری بھی کرتے ہیں۔ اگر باربرداری کے ذرائع نہ ہوں تو انسان سخت مشکل میں پڑ جائیں۔ اونٹ اور بیل وغیرہ باربرداری کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں اور انسان کی بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔ فرمایا اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ تمہارا پروردگار نہایت شفقت والا اور بڑا مہربان ہے جس نے تمہیں جانوروں کی خدمات مہیا کر کے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب تمہارا بھی فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، صرف اسی کی عبادت کرو، اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

ماکولی جانور

فرمایا وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں خچروں اور گدھوں کو بھی پیدا کیا ہے لِتَرْكَبُوْهَا تاکہ ان پر سواری کرو۔ وَزِيْنَةً اور یہ تمہارے لیے زینت کا سامان بھی ہیں۔ یہ جانوروں کا ایسا گروہ اللہ نے ذکر کیا ہے جن کا گوشت تو نہیں کھایا جاتا، البتہ یہ انسان کی دیگر خدمات ضرور انجام دیتے ہیں۔ خالص النسل گھوڑے کی حلت کے متعلق البتہ دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں اور اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ گھوڑے کے گوشت کو حرام بھی نہیں کہتے اور اسے بہتر بھی نہیں سمجھتے۔ گھوڑے کے متعلق

حلت و حرمت دونوں قسم کی روایات کی موجودگی میں اس پر مکروہ کا حکم لگایا جاتا ہے۔ البتہ گھوڑے کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف حضور کے ارشاد مبارک سے ملتا ہے کہ گھوڑوں کی پیشانیوں میں اللہ نے بہتری لکھی ہوئی ہے۔ یہ جانور قیامت تک کارآمد رہیں گے۔ چنانچہ گھوڑا سفر میں سواری کا کام دیتا ہے اور جنگ کے دوران بھی بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔ خچر بھی بڑا مفید جانور ہے۔ یہ گدھے اور گھوڑی کا مرکب ہوتا ہے مگر اس کی نسل آگے نہیں چلتی۔ یہ بڑا طاقتور جانور ہے اور بار برداری میں بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔ بار برداری اور سواری کے لیے گدھا بھی بڑا کارآمد جانور ہے، تاہم اس کی حماقت بڑی مشہور ہے۔ اس کا گوشت بھی حرام ہے کہ اس سے حماقت پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ البتہ سواری کے طور پر خود حضور علیہ السلام نے اسے استعمال کیا ہے۔ بہر حال یہ سارے جانور انسان کے خادم اور خدا کی قدرت کے نمونے ہیں۔

مستقبل کی سواریاں

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ایک بڑا بامعنی جملہ یہ فرمایا ہے وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ اور اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے یا پیدا کرے گا۔ وہ چیزیں بھی جو تم نہیں جانتے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس جملے سے وہ تمام سواریاں مراد ہیں جو نزول قرآن کے زمانے میں اس کے اولین مخاطبین کی نظروں سے اوجھل تھیں، یا آئندہ قیامت تک معرض وجود میں آتی رہیں گی۔ اس وقت جانوروں سے کھینچی جانے والی، بجلی، پٹرول اور بھاپ سے چلنے والی اتنی سواریاں ایجاد ہو چکی ہیں جن کا اس زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چھکڑا، ٹرک، موٹر کار، بس، ریل گاڑی، سائیکل، موٹر سائیکل، ہوائی جہاز اور بحری جہاز کی بے شمار قسمیں انسانوں اور ان کے سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی نظر آتی ہیں۔ تیز ترین سواریوں نے دنیا بھر کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے بلکہ اب تو کرۂ ارضی سے نکل کر انسان چاند پر پہنچ چکا ہے اور سر بخ پر پہنچنے کی کوشش

کہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام چیزیں پیدا فرما کر بنی نوع انسان پر بڑا احسان کیا ہے ورنہ انسانی زندگی میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہوتیں ۔ اگرچہ ان تمام مشینی ذرائع کو ایجاد کرنے کا سہرا بظاہر خود انسان کے سر ہے مگر اس کے علاوہ خام مال کی بہم رسانی اور انسانی اعضاء قویٰ کی عطائیگی اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے ۔ فضا میں پرواز کا شوق ایک اندلسی آدمی کے دل میں پیدا ہوا جس نے اپنے بازوؤں پر گدھ کے پر باندھ کر اڑنے کی کوشش کی مگر گر کر زخمی ہوگیا ۔ اس کا جذبہ زندہ رہا ۔ لوگ تجربات کرتے رہے حتیٰ کہ آٹھ سو سال کے تجربات کے بعد اس صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۴ء میں ہوائی جہاز کی پہلی پرواز کامیابی سے ہمکنار ہوئی ۔ بہرحال اس دور میں بجلی، ڈیزل اور پٹرول سے چلنے والی بے شمار گاڑیاں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور ایجادات کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا ۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ چیزیں بھی پیدا کرے گا جنہیں تم نہیں جانتے ۔

یہ تو مادی زندگی کی سواریوں کا تذکرہ تھا، حضور علیہ السلام نے اگلے جہان کی سواری کا تصور بھی دیا ہے ۔ ایک شخص نے عرض کیا، حضور! جنت میں ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے کیا انتظام ہوگا ۔ آپ نے فرمایا، وہاں تمہیں سرخ یاقوت کا گھوڑا ملے گا جس کی رفتار اتنی تیز ہوگی کہ اس دنیا کی جدید ترین گاڑی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی ۔ اور پھر یہ ہے کہ وہاں پر کسی حادثے کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہوگا ۔ جنتی آدمی کروڑوں میلوں کا سفر آسانی سے بلاخوف و خطر کر سکے گا ۔ فرمایا وہاں تمہیں ایسی سواری میسر ہوگی ۔

مستقیم اور منحنی راستے

آگے اللہ نے انسان کی روحانی زندگی کو خوشگوار بنانے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے روحانی راستوں کا ذکر بھی کیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ اور اللہ تک ہی پہنچتا ہے سیدھا راستہ ۔ اللہ تعالیٰ

کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلو گے تو یہ زندگی بھی خوشگوار گزرے گی اور آخرت کی کامیابی بھی یقینی ہو جائے گی۔ مگر یاد رکھو! وَمِنْهَا جَائِرٌ ان میں بعض راستے ٹیڑھے بھی ہیں۔ اگر ان پر چل نکلے۔ کفر، شرک، بدعت، معصیت اور گمراہی کے راستے اختیار کر لیے تو خدا تعالیٰ کی رضا کے مقام تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے راستے واضح کر دیے ہیں، اب یہ انسان کی اپنی صوابدید ہے "فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ" (الکہف) کہ وہ ایمان کا راستہ قبول کرتا ہے یا کفر کا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سمجھ، کتب سماویہ، نبی اور مبلغ جیسے سارے وسائل مہیا کر دیے ہیں اب مستقیم یا منحنی راستہ اختیار کرنا اُس کا اپنا کام ہے۔ وَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو زبردستی ہدایت کے راستے پر ڈال دیتا۔ مگر یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ وہ انسانوں کو آزمانا چاہتا ہے کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں یا ٹیڑھا اور پھر اس امتحان میں کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام اُس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ آخرت کی کامیابی صراطِ مستقیم کو اختیار کرنے پر منحصر ہے اور جو شخص دوسرا راستہ اختیار کرے گا، اس کے لیے آگے جہنم بھی تیار ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمۡ مِّنۡهُ
شَرَابٌ وَّمِنۡهُ شَجَرٌ فِیۡهِ تُسِیۡمُوۡنَ ⑩ یُنۡۢبِتُ
لَکُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ
وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً
لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ⑪ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ ۙ
وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِهٖ ؕ
اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ⑫ وَمَا
ذَرَاَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ ؕ اِنَّ
فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ⑬ وَهُوَ الَّذِیۡ
سَخَّرَ الۡبَحۡرَ لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡهُ لَحۡمًا طَرِیًّا
وَّتَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡهُ حِلۡیَةً تَلۡبَسُوۡنَهَا ۚ وَتَرَی
الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ
وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ⑭

ترجمہ :- وہ وہی ذات ہے جس نے اتارا آسمان
کی طرف سے پانی تمہارے لیے اسی میں تمہارے پینے
کا سامان ہے اور اسی سے درخت اگتے ہیں جس

میں جانوروں کو پالتے ہو ⑩ اُگاتا ہے وہ تمہارے لیے کھیتی
اسی (پانی) کے ذریعے ۔ اور زیتون (کے درخت) اور کھجوریں
اور انگور اور ہر قسم کے پھل ۔ بیشک اس میں نشانی ہے
ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں ⑪ اور مسخر کیا
اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو ، اور سورج اور
چاند کو ۔ اور ستارے بھی مسخر کیے ہوئے ہیں اُس کے حکم
سے بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے
لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ⑫ اور جو چیزیں پھیلائی
ہیں اُس نے تمہارے لیے زمین میں اُن کا رنگ مختلف
ہے ۔ بیشک اس میں بھی نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے
جو نصیحت پکڑتے ہیں ⑬ اور وہ وہی ذات ہے جس
نے مسخر کیا تمہارے لیے دریا کو تاکہ کھاؤ تم اس میں سے
تازہ گوشت ، اور نکالو اس میں سے زیور جس کو تم پہنتے
ہو ۔ اور تم دیکھو گے کشتیوں کو جو چلتی ہیں ۔ اس میں
پانی کو چیرتی پھاڑتی ، اور تاکہ تلاش کرو تم اُس کے فضل
سے ، اور تاکہ تم (اللہ کے احسانات کا) شکریہ ادا کرو ⑭

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے نزولِ وحی کا ذکر کر کے اپنے انبیاء کو حکم دیا اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ یعنی لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ، لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو پھر اللہ تعالیٰ نے نشاناتِ قدرت کا ذکر کیا جن میں ہر نشانی اس کی وحدانیت کی دلیل بنتی ہے ۔ ارض و سما کی تخلیق ، حقیر قطرۂ آب سے انسان کی پیدائش ، مویشیوں سے حاصل ہونے والے فوائد اور ان سے زینت کا سامان پیدا کرنے کا ذکر کر کے اللہ نے اپنی رأفت اور

شفقت کی طرف اشارہ کیا۔ پھر یہ پیش گوئی کر دی کہ سواری کے لیے ان جانوروں کے علاوہ اللہ تعالیٰ اور بھی بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے گا، جسے تم اس وقت نہیں جانتے ان مادی لوازمات کے ساتھ ساتھ اللہ نے انسان کی روحانی اور اخروی زندگی کا سامان بھی پیدا فرمایا۔ اس نے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی کہ جس پر چل کر انسان اللہ کی رحمت کے مقام تک پہنچ سکیں گے۔ فرمایا اگر انسان غور و فکر کرے تو یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل ہیں

انسان کی ضروریات

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی ضروریات سے متعلق بعض انعامات کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمْ اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان کی طرف سے پانی نازل فرمایا۔ یہ پانی بھی اللہ کی عظیم نعمت اور اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ سماء کا لفظ بادل پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ سورۃ الحجر میں گزر چکا ہے کہ ہم نے بوجھل ہوائیں بھیجیں "فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" اور بادلوں سے پانی برسایا۔ ہوائیں بوجھل بادلوں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور پھر جہاں مشیت ایزدی ہوتی ہے، وہاں بارش برستی ہے۔ بہرحال السماء سے محض بادل بھی مراد نہیں بلکہ اس لفظ میں عالمِ بالا کا حکم بھی شامل ہے۔ بادل زمین اور آسمان کے درمیان فضا میں چلتے ہیں۔ اور حکم الٰہی کے مطابق بارش برساتے ہیں۔

فرمایا، اس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی نازل فرمایا مِنْهُ شَرَابٌ جو تمہارے لیے بطور مشروب ہے انسانی زندگی کا انحصار بہت حد تک پانی پر ہے۔ میڈیکل سائنس والے کہتے ہیں کہ انسانی جسم میں چلنے والے خون میں اسی فیصدی پانی اور بیس فیصدی غذائیت ہوتی ہے۔ انسان جو بھی خوراک کھاتا ہے وہ جگر میں پہنچ کر خون میں تبدیل ہو جاتی ہے

انسانی جسم میں جگر اتنی بڑی فیکٹری ہے کہ اس مادی دنیا میں اتنا بڑا کوئی کارخانہ نہیں ہے۔ اس قدرتی فیکٹری میں اللہ کے لاکھوں کروڑوں فرشتے مصروف کار ہیں جو غذاؤں کو خون میں تبدیل کرتے ہیں۔ پھر اس خون کو قلب میں بھیج کر سارے جسم میں پھیلا دیتے ہیں اور اس طرح استعمال شدہ غذا جسم کے ہر حصہ میں پہنچتی ہے۔ جسم کا ہر عضو اس میں سے اپنی ضرورت کی غذا حاصل کر لیتا ہے اور غلیظ مادہ دوسرے راستے سے پھیپھڑے میں آجاتا ہے وہاں پر اسے تازہ ہوا (آکسیجن) میسر آتی ہے تو اس کا بعض حصہ صاف ہو جاتا ہے، اور گندہ دخان باہر نکل جاتا ہے بہرحال پانی اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا ہمارے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ حجاز میں سفر کے دوران بعض ایسے مواقع بھی آئے کہ ایک لوٹا پانی سے سات سات آدمیوں نے وضو کیا۔ پانی کی قدر ان خطوں میں ہے۔ جہاں اس کی قلت ہے۔ ہمارے ہاں تو پانی کی فراوانی ہے اور قدر نہیں ہے۔ وضو اور غسل پر گھڑوں پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ نلوں اور ٹیوب ویلوں نے پانی کی اتنی افراط کر دی ہے کہ ہر روز کثیر مقدار میں پانی ضائع ہوتا ہے لوگ پانی استعمال کرنے کے بعد ٹونٹی کو بند کرنے کی تکلیف نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے منوں اور ٹنوں وزنی پانی ضائع ہوتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ پانی کو ضائع ہونے سے بچاؤ اِنْ كُنْتَ عَلٰى شَطِّ النَّهْرِ یعنی اگرچہ تم نہر کے کنارے پر ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں بھی پانی کا اسراف درست نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق ہی استعمال کرنا چاہیئے۔ اسی لیے اعضائے وضو کو تین دفعہ سے زیادہ بلا ضرورت دھونا اسراف میں داخل ہے جو شخص ایسا کرتا ہے فَقَدْ اَسَاءَ وَتَعَدّٰی اس نے برائی اور تعدی کی۔ انسان کی سعادت مندی اسی میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہی ہر کام انجام دے۔ اگر کوئی حصہ عضو خشک

رہ گیا ہو یا وضو کی تکمیل کا تیقن نہ ہو تو تین سے زیادہ بار بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال پانی جیسی نعمت کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے، اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ تمہارے پینے کی چیز ہے۔

نباتات کے لیے پانی

اللہ تعالیٰ نے پانی کا پہلا فائدہ تو یہ بتایا ہے کہ یہ انسانوں کے لیے اور دیگر جانداروں کے لیے مشروب ہے، اور دوسرا فائدہ یہ کہ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ اسی پانی سے درخت، پودے، گھاس پھونس اور جڑی بوٹیاں بھی اگتی ہیں جن میں تم جانور چراتے ہو۔ جانور بھی انسانی غذا کا ایک اہم حصہ ہیں۔ جانوروں کا گوشت انسانی جسم کو لحمیات (پروٹین) مہیا کرتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت جلد جزو بدن بن جاتا ہے۔ تو جانوروں کا مدارِ حیات بھی اللہ نے پانی پر رکھا ہے پانی جانوروں کے لیے بطورِ مشروب بھی ضروری ہے اور ان کی خوراک کا دارومدار بھی پانی پر ہے۔

فرمایا يُنْبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ اللہ تعالیٰ اسی پانی کے ذریعے تمہارے لیے کھیتی اگاتا ہے۔ پہلے پانی کا ذکر بطور انسانی مشروب کے کیا گیا تھا۔ اب اسے انسانی خوراک کا ذریعہ بھی بتلایا گیا ہے۔ کہ پانی کے ذریعے ہی کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اناج اور غلہ پیدا ہوتا ہے، پھل پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی خوراک بنتے ہیں وَالزَّيْتُونَ اور زیتون بھی پانی کے ذریعے ہی پیدا ہوتا ہے اس درخت کا پھل بھی کارآمد ہے اور اس کا تیل تو کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے بھی زیتون کی تعریف فرمائی ہے[1] كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوا، زیتون کو کھاؤ بھی اور اس کی مالش بھی کرو۔ انسانی بدن کی جلدی بیماریوں کے لیے زیتون کا تیل بڑا مفید ہے۔ اس کے علاوہ یہ کھانا پکانے میں

[1] تفسیر مظہری ص ۵۲۴ ج ۶

گھی کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ نے اسے بڑا بابرکت درخت بنایا ہے جس کے لیے اللہ کے نبیوں نے برکت کی دعائیں کی ہیں۔

وَالنَّخِيْلَ کھجور کا درخت بھی پانی کا مرہونِ منت ہے یہ درخت بڑی لمبی عمر پاتا ہے اور پھل بھی بہت زیادہ دیتا ہے۔ اس کا پھل جلدی خراب نہیں ہوتا، اس لیے اگلا پھل آنے تک سارا سال استعمال ہوتا رہتا ہے۔ ریگستانی علاقوں میں کھجور کی بڑی افادیت ہے جہاں یہ پھل خوراک کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے کیونکہ اس میں بڑی غذائیت ہے اور بطور تفریح تو یہ پھل بہرحال استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وَالْاَعْنَابَ انگور کی پیداوار بھی پانی ہی پر منحصر ہے یہ بھی بڑا عمدہ پھل ہے۔ اس سے مشروب، مربّہ اور کئی قسم کی چیزیں تیار کر کے دیر تک محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ الغرض! فرمایا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اللہ نے اس پانی کے ذریعے ہر قسم کے پھل پیدا کیے ہیں جو انسان کھاتے ہیں۔ ان میں بڑی غذائیت اور توانائی ہوتی ہے بلکہ بعض پھل دیگر خوراک کو بھی ہضم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ تو اللہ نے یہ تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور ان سب کا دارومدار پانی پر ہے۔

فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے نشانی ہے۔ دیکھو! ایک ہی پانی سے اللہ تعالیٰ بے شمار اقسام کا اناج، پھل اور دوسری نباتات پیدا کرتا ہے۔ یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ دوسرے مقام پر آتا ہے کہ ایک ہی پانی سے پیدا ہونے والے پھلوں کے رنگ، شکلیں، خوشبو اور ذائقے کس قدر مختلف ہیں۔ کیا یہ کسی مادے کی طاقت ہے یا نیچر کے مطابق

خود بخود ہو رہا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ اور حکمت بالغہ سے چل رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جن میں غور و فکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سمجھ میں آتی ہے۔ مگر اکثر لوگ ان چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں کرتے۔ نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں، روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں مگر کبھی سوچا تک نہیں کہ آخر یہ سب کچھ کون کر رہا ہے۔

شمس و قمر کی ضیا پاشیاں

آگے بعض دوسرے انعامات کا ذکر ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اللہ نے تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا ہے یعنی تمہارے کام پر لگا دیا ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اور سورج اور چاند کو بھی۔ یہ چار چیزیں ایسی ہیں جن سے ہر انسان کو ہر وقت واسطہ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو انسانوں اور جانوروں کے لیے آرام کا ذریعہ بنایا ہے جب کہ دن کے وقت لوگ کام کرتے ہیں اور روزی کماتے ہیں۔ جانور، پرندے اور چرندے بھی دن بھر اپنی روزی کے لیے تگ و دو کرتے ہیں اور رات کو آرام کرتے ہیں۔ پورے نظام شمسی (SOLAR SYSTEM سولر سسٹم) میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے دن رات کا تغیر و تبدل اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ سورج تمام انسانوں اور جانوروں کے لیے روشنی بہم پہنچاتا ہے۔ ان کے لیے گرمی مہیا کرتا ہے جس سے فصلیں اور پھل پکتے ہیں اور جانداروں کی خوراک بنتے ہیں۔ اسی طرح چاند کی دھیمی روشنی رات کے اندھیروں میں بہت حد تک کام آتی ہے۔ یہی مدھم روشنی پھلوں میں رس پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے اور سمندروں میں مد و جزر پیدا ہوتے ہیں۔

فرمایا وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَٰتٌۢ بِأَمْرِهِۦٓ ستارے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں اور سیاروں کا وسیع نظام پیدا کر کے ان سب کو اپنے اپنے کام پر لگا دیا ہے سائنسدانوں نے

تجربات کے ذریعے بعض ستاروں اور سیاروں کی حرکات وسکنات کا پتہ چلایا ہے اور مزید تجربات ہو رہے ہیں۔ تاہم عام مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ ستارے ایک چال سے ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ سمندری اور صحرائی سفر کے دوران انہی ستاروں سے منزل کی طرف راہنمائی حاصل کرتے تھے۔

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ بیشک اس میں نشانات ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل و فہم سے کام لیتے ہیں جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، ان کے لیے تمام مذکورہ نشانات کچھ مفید نہیں ہو سکتے۔ لوگ ان پر سے صبح و شام گزر جاتے ہیں مگر ان سے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ سورۃ انفال میں موجود ہے کہ کافر لوگ اَلصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ایسے ہیں جو گونگے اور بہرے ہیں اور کچھ عقل نہیں رکھتے۔ اگر عقل کو صحیح طریقے پر استعمال کرتے تو کفر اور شرک میں کیوں مبتلا ہوتے۔ ان کی بے عقلی کا یہی ثبوت کافی ہے کہ اللہ کی قدرت کی کوئی نشانی انہیں نظر نہیں آتی۔

مزید ارشاد ہوتا ہے وَمَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین میں جو چیزیں پھیلائی ہیں، اُن کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ انسانوں کو دیکھ لیں مختلف خطوں کے لوگوں کے رنگ، وضع قطع اور قد کاٹھ مختلف ہیں۔ پھل ہر قسم کے پائے جاتے ہیں، مگر ان کی شکلیں، رنگ، ذائقہ اور بو مختلف ہے۔ اللہ نے پھولوں کی بے شمار قسمیں پیدا کی ہیں۔ ہر ایک کا رنگ اور بو جدا جدا ہے۔ اناج اور سبزیاں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ ساری چیزیں شاہکارِ قدرت ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ

لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ اِن سب چیزوں میں بھی نشانیاں ہیں۔ مگر ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پکڑتے ہیں۔ غافل انسان اِن چیزوں سے کچھ نصیحت حاصل نہیں کرتے، جب کہ صاحب عقل و دانش انہی نشانات قدرت سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

مچھلی بطور تازہ گوشت

فرمایا وَھُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ اور وہ وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے سمندروں اور دریاؤں کو مسخر کیا لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡہُ لَحۡمًا طَرِیًّا تاکہ تم اُس میں سے تازہ گوشت کھاؤ۔ دریاؤں اور سمندروں کے کنارے بعض خطوں کی معیشت کا انحصار مچھلی کے شکار پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی خاطر پانی میں تازہ گوشت پیدا کر دیا ہے جو انسانی خوراک کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس طرح گویا اللہ نے سمندروں کو بھی انسان کی خدمت پر مامور کر دیا ہے کہ وہ اُس کی خوراک کے لیے مچھلی پیدا کریں۔ مچھلی کا گوشت بھی اللہ نے عجیب نعمت پیدا کی ہے جس کا ذائقہ دوسرے گوشت سے مختلف ہے مگر اس میں بھی انسانی حیات کے لیے بہت سے پروٹین پائے جاتے ہیں۔ اس کا تیل بڑی مفید چیز ہے جو اکثر دوائیوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی چربی اور کانٹے بھی بڑی مفید چیزیں ہیں۔ بہرحال مچھلی انسان کی حرارت اور توانائی کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جسے اللہ نے اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر ذکر کیا ہے

فقہی مسائل متعلقہ مچھلی

چونکہ مچھلی کا گوشت عام جانوروں کے گوشت سے قدرے مختلف ہے، اس لیے اس سے متعلقہ مسائل میں بھی فقہائے کرام کا اختلاف رہا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص قسم اٹھاتا ہے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا اور پھر وہ مچھلی کا گوشت کھا لیتا ہے تو امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اُس شخص کی قسم ٹوٹ جائے گی کیونکہ مچھلی کا گوشت بھی گوشت ہی ہے جسے اللہ نے لَحۡمًا طَرِیًّا یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے

البتہ امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ عرفِ عام میں مچھلی کا اطلاق گوشت پر نہیں ہوتا اس لیے مچھلی کا گوشت کھانے سے اُس شخص کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ وہ مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے خادم کو گوشت لانے کا حکم دے اور وہ مچھلی لے آئے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ عرفِ عام کے مطابق گوشت سے مراد بھیڑ بکری یا گائے اونٹ کا گوشت مراد لیا جاتا ہے، اور مچھلی کا گوشت مطلوب ہو تو اُسے مچھلی کے ساتھ خاص کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں مزید تیقن پیدا کرنے کے لیے امام صاحبؒ نے ایک آدمی کو امام سفیان ثوری رح کے پاس بھیجا کہ وہ جا کر ان سے دریافت کرے کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں بساط پر نماز نہیں پڑھوں گا اور پھر وہ زمین پر نماز ادا کرے تو کیا اس کی قسم ٹوٹ جائے گی؟ انہوں نے جواب دیا کہ قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ اُس شخص نے بساط یعنی دری، قالین یا چٹائی وغیرہ پر نماز نہ پڑھنے کی قسم اٹھائی ہے، نہ کہ خالی زمین پر۔ اس پر امام ابوحنیفہ رح نے فرمایا کہ اللہ نے سورۃ نوح میں زمین کو بھی بساط فرمایا ہے وَجَعَلَ الْاَرْضَ بِسَاطًا اُس نے تمہارے لیے زمین کو بساط بنایا ہے۔ اگر عرفِ عام میں بساط کو زمین پر قیاس نہیں کیا جاتا تو مچھلی کو گوشت پر کیسے محمول کیا جائیگا؟ بہر حال اگرچہ مچھلی کا گوشت بھی گوشت ہی ہوتا ہے تاہم اسے جانور کے گوشت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی ایک مثال اس طرح بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے قسم اٹھائی کہ میں فلاں شخص سے بات چیت نہیں کروں گا۔ اب اُس شخص کے مرنے کے بعد اگر قسم اٹھانے والے شخص نے اس کو مخاطب کر لیا تو امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ عرفِ عام میں اس کلام کو کلام ہی نہیں کہا جاتا جو کسی کے ساتھ اُس کے مرنے کے بعد کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ اُس کی زندگی میں اس سے کلام کرتا،

تو قسم ٹوٹ جاتی۔ اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ مجھے بازار سے سری لا دے۔ تو اگر مامور مرغی یا چڑیا کی سری لے آئیگا تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔ بلکہ عرفِ عام کے مطابق بھیڑ بکری یا گائے بھینس کی سری کو ہی سری پر محمول کیا جاتا ہے۔

سمندروں کے کچھ فوائد

فرمایا دریاؤں اور سمندروں کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ وہ انسانوں کے لیے تازہ گوشت مہیا کرتے ہیں، اور دوسرا یہ ہے وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا تاکہ تم ان میں سے پہننے کے لیے زیورات نکالو۔ یہاں زیورات سے مراد مونگے اور موتی ہیں۔ جنہیں عورتوں کے علاوہ مرد بھی پہن سکتے ہیں۔ البتہ معدنیات کے طور پر زمین اور پہاڑوں سے نکلنے والا سونا اور چاندی مرد کے لیے حلال نہیں ہے۔ بہرحال سمندروں سے نکلنے والے زیورات پہنے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ اے مخاطب! تم ان کشتیوں کو بھی دیکھتے ہو جو پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں۔ آج کی دنیا میں چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیوں سے لے کر تیل سے چلنے والی کشتیاں، سٹیمر اور بڑے بڑے بحری جہاز سمندر کی سطح پر دوڑتے نظر آتے ہیں، جو انسان کی بڑی خدمت بجالاتے ہیں مسافروں کی نقل و حرکت کے علاوہ لاکھوں ٹن وزنی سامان ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک منتقل ہوتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے سمندروں اور دریاؤں کو انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ تاکہ تم اللہ کے فضل میں سے تلاش کرو۔ فضل سے مراد رزقِ حلال ہے جو بحری جہاز کے دور دراز کے سفر کے ذریعے تلاش کیا جاتا ہے۔ ایک مومن رزقِ حلال حاصل کرنے کا پابند ہے کیونکہ

رزقِ حرام سے تو عبادت بھی نامقبول ہوتی ہے۔ اللہ کے فضل میں عبادت بھی داخل ہے کہ حج وعمرہ کے لیے، دوست احباب اور عزیزوں سے ملاقات کے لیے بھی سفر اختیار کیا جاتا ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ اور تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ کہ اس نے تمہیں اتنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ یہ سب اللہ کی وحدانیت کے دلائل ہیں جو آگے بھی ذکر کئے جائیں گے۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا
وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ
هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا
يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تَعُدُّوْا
نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ
شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع

ترجمہ :- اور رکھ دیے اس نے زمین میں بوجھل
پہاڑ تاکہ زمین تمہارے ساتھ مضطرب نہ ہو۔ اور (اس نے
چلا دیں) نہریں ، اور (بنا دیے) راستے تاکہ تم راہ پاؤ ﴿۱۵﴾
اور کئی علامتیں (اس نے رکھ دیں) اور ستاروں کے
ذریعے بھی یہ لوگ راہ پاتے ہیں ﴿۱۶﴾ بھلا وہ ذات جو
پیدا کرتی ہے اس کی طرح ہو گی جو نہیں پیدا کر سکتا۔
کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ﴿۱۷﴾ اور اگر تم شمار کرو اللہ
کی نعمتوں کو تو نہیں شمار کر سکتے ان کو۔ بیشک اللہ تعالیٰ

البتہ بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (۱۸)
اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جس کو تم
ظاہر کرتے ہو (۱۹) اور وہ لوگ جو پکارتے ہیں اللہ
کے سوا دوسروں کو، وہ نہیں پیدا کر سکتے کوئی چیز بھی، اور
وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں (۲۰) وہ مردہ ہیں، زندہ رہنے
والے نہیں۔ اور وہ نہیں سمجھتے کہ وہ کب دوبارہ اٹھائے
جائیں گے (۲۱)

ربط آیات

سورۃ ہذا کی ابتداء میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل فرما کر انہیں انذار کا حکم دیا اور فرمایا "اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا" لوگوں کو ڈرا دو اور خبردار کر دو میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دلائل قدرت بیان فرمائے اور مخلوق کو عطا کردہ نعمتوں کا ذکر کیا جن میں ہر نعمت اللہ کی وحدانیت کی دلیل بنتی ہے۔ دلائل قدرت میں سے ارض و سما کی پیدائش، انسان کی قطرۂ آب سے تخلیق، جانوروں کی پیدائش اور ان کے فوائد بارش کا نزول، باغات اور نباتات کی تخلیق، لیل و نہار اور شمس و قمر کی تسخیر، ستاروں کی تسخیر، سمندروں سے حاصل ہونے والے موتی اور تازہ گوشت اور پھر ان میں ہونے والی جہاز رانی اور ان کے ذریعے انسانوں کو ملنے والی سہولتوں کا ذکر ہو چکا ہے۔

زمین کا توازن

دلائل قدرت اور انعامات الٰہی ہی کے سلسلے میں اب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کا ذکر فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَاَلۡقٰى فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں بوجھل پہاڑ رکھ دیے۔ عربی زبان میں عام طور پر پہاڑ کے لیے جبل کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور پختہ اور جمے ہوئے پہاڑ کے لیے راسیہ کا لفظ آتا ہے جس کی جمع یہاں پر رواسی آیا ہے۔ زمین کی تخلیق کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ بوجھل پہاڑ اس لیے رکھ دیے ہیں۔

اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ تاکہ زمین تمہارے ساتھ حرکت نہ کرے۔ اگر زمین مضطرب ہو جائے یعنی ڈولنے لگے تو انسانی زندگی کس قدر تلخ ہو جائے۔ جب کبھی چند سیکنڈ کے لیے زلزلے کے جھٹکے آتے ہیں تو انسان کس قدر پریشان ہو جاتے ہیں اور پوری زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو فرمایا اِن بوجھل پہاڑوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پوری زمین مضطرب رہتی تو پوری نوعِ انسانی کے لیے زندگی کتنی کٹھن ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر یہ احسان فرمایا ہے کہ اُس نے زمین میں بڑے بڑے بوجھل پہاڑ نصب کر دیے ہیں تاکہ زمین پر سکون رہے اور لوگوں کی زندگی میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

پہاڑوں کے اس بنیادی فائدے کے علاوہ اللہ نے ان میں اور بھی بہت سے فوائد رکھے ہیں۔ پہاڑوں میں موجود بے شمار قسم کی معدنیات نمک، لوہا، تانبہ، سونا، چاندی، تیل، چشمے، فلک بوس درخت اور لاتعداد جڑی بوٹیاں اور ایسی چیزیں جو انسان کی روزمرہ زندگی میں استعمال ہوتی ہیں۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو میدانی علاقوں کے باشندے ان چیزوں سے محروم رہتے اور خود انسانی زندگی مضطرب ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی خاطر ان پہاڑوں سے ہزاروں قسم کی چیزیں پیدا کر کے انسانی زندگی میں توازن پیدا فرما دیا ہے

...دری
...زمینی
...شتے

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک اور نعمت کا ذکر کیا ہے وَاَنْهٰرًا اس نے تمہارے لیے نہریں، دریا یا سمندر پیدا کر دیے۔ سمندروں اور اُن کے فوائد کا ذکر گذشتہ درس میں بھی ہو چکا ہے۔ وہاں پر سَخَّرَ الْبَحْرَ فرما کر اللہ نے اِن میں چلنے والی کشتیوں کا ذکر کیا تھا اور یہاں پر اَنْهٰرًا کا لفظ آیا ہے اور مطلب وہی نہریں، دریا یا سمندر ہیں جو انسانی خدمت پہ مامور ہیں۔ اس آیت کریمہ میں انہار کا ذکر آبی راستوں کی حیثیت سے کیا ہے کہ دریاؤں اور سمندروں میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں وَسُبُلًا

اور اللہ نے راستے بھی پیدا فرمائے ہیں۔ اس سے مراد زمینی راستے ہیں جن پر چل کر لوگ دور دراز کا سفر اختیار کرتے ہیں اور سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں۔ یہ راستے ہموار زمین میں بھی ہوتے ہیں اور پہاڑوں میں بھی جن کے ذریعے نقل و حمل ہوتی ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ اُس نے تمہارے لیے نہریں اور راستے بنا دیے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم راہ پاؤ یعنی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

اللہ نے فرمایا وَعَلٰمٰتٍ ان راستوں پر اللہ تعالیٰ نے کئی نشانیاں بھی رکھ دیں تاکہ مسافر اپنی منزل کا تعین کر سکیں۔ متمدن دنیا میں تو اب بڑی بڑی شاہراہیں ہیں اور ان پر جگہ جگہ میلوں کے نشانات ہیں جن سے مسافر راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ تاہم قدرتی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑوں اور خشک دریاؤں اور عام نشیب و فراز کی صورت میں ایسی نشانیاں رکھ دی ہیں جن کے ذریعے لوگ اپنی منزل کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ستاروں کے ذریعے بھی لوگ راہنمائی حاصل کرتے ہیں اندھیری راتوں میں جب لق و دق صحرا کا سفر ہو یا سمندر کا تو پرانے زمانے میں لوگ ستاروں کی مدد سے ہی سمت معلوم کر کے راستوں کا تعین کرتے تھے۔ اب تو سائنسی ترقی کی وجہ سے بہت سے آلات ایجاد ہو چکے ہیں اور سمندری یا ہوائی سفر میں منزل کے تعین میں کوئی دقت پیش نہیں آتی مگر پرانے زمانے میں ستارے ہی راستہ معلوم کرنے کا واحد ذریعہ تھے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے بطور اپنے احسان کے کیا ہے۔

انعامات الٰہیہ

ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے ان پر اپنی وحدانیت کی دلیل قائم کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کو پانے کے بعد ذرا یہ تو بتاؤ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ بھلا پیدا کرنے والی ذات اُس کی مانند ہو گی جو کچھ پیدا نہیں کرتا۔ ایک طرف خالق ہے

جس نے خود انسان کو قطرۂ آب سے پیدا فرمایا ہے اور پھر اس کی مصلحت کے لیے تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ اور دوسری طرف تم ایک ایسی ہستی کو معبود بنا رہے ہو جو ایک پتہ اور ایک قطرۂ آب پیدا نہیں کر سکتی، اس کا ایجاد وجود ذاتی نہیں، بلکہ وہ خود مخلوق ہے تو کیا خالق اور مخلوق برابر ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتے تو پھر تم خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو کیسے الٰہ مانتے ہو۔ کتنے افسوس کا مقام ہے اَفَلَا تَذَكَّرُونَ کیا تم ان تمام تر دلائل سے نصیحت نہیں پکڑتے، تم غور و فکر کر کے صحیح نتیجے تک نہیں پہنچتے کہ خالق اور مخلوق اور عابد اور معبود میں کتنا فرق ہے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے، کہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اگر تم انہیں شمار کرنا چاہو تو شمار بھی نہیں کر سکتے چہ جائیکہ اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کر سکو۔ فرمایا اس کے باوجود اللہ تعالیٰ تم پر گرفت نہیں کرتا، ان نعمتوں کو سلب نہیں کرتا کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ بہت ہی بخشش کرنے والا اور از حد مہربان ہے۔ یہ اس کی رأفت و رحمت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے اطاعت گزاروں کے علاوہ نافرمانوں، مشرکوں اور کافروں کو بھی روزی دے رہا ہے۔ اس کی لاتعداد نعمتوں سے وہ بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔

فرمایا، یاد رکھو! وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ وہ جانتا ہے جس چیز کو تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو اس کی نگاہوں سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہے۔ وہ ظاہری اور باطنی احوال سے واقف ہے بلکہ تمہاری نیت اور ارادے کو بھی جانتا ہے۔ اسے علم ہے کہ کون سا انسان اس کی عطا کردہ نعمتوں سے کس قدر مستفید ہو رہا ہے، کون شخص اپنے قلب اور اعضاء و جوارح سے اس کا شکریہ ادا

کرتا ہے اور کون ناشکر گزاروں میں شامل ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون شخص ایمان لاکر اُس کی وحدانیت کو تسلیم کرتا ہے اور کون ہے جو کفر اور شرک میں مبتلا رہتا ہے۔ اس دنیا میں تو وہ بلا لحاظ اطاعت و نافرمانی سب کو اپنی نعمتیں عطا کر رہا ہے مگر ایک وقت آنے والا ہے جب محاسبے کی منزل آئیگی اور پھر ہر ایک کو اُس کی کارگزاری کی بنا پر سزا یا جزا بھگتنا ہو گی۔

شرک کی تردید

دلائل توحید بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے شرک کا رد فرمایا ہے وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ جو لوگ اپنی حاجات میں اللہ کے سوا دوسروں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں یا اُن کی عبادت کرتے ہیں، فرمایا، لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وہ تو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے وَهُمْ يُخْلَقُونَ بلکہ وہ تو خود پیدا کیے جاتے ہیں مطلب یہ کہ جن کی زندگی خود مستعار ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، وہ اپنی ذات کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اُن کو معبود کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ مضمون سورۃ رعد میں بھی گزر چکا ہے۔ اللہ نے استفہامیہ انداز میں فرمایا ہے، کیا انہوں نے اس لیے اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں کہ انہوں نے بھی خدا تعالیٰ کی تخلیق کی طرح کوئی تخلیق کی ہے۔ پھر خود ہی اپنے پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" آپ کہہ دیں کہ ہر چیز کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اکیلا بھی ہے اور غالب بھی ہے۔ غرضیکہ ارض و سما کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ زمین، آسمان، شجر، حجر، جنت اور دوزخ سب مخلوق ہیں، اور معبود وہی ہو سکتا ہے جو ان سب کا خالق ہے مگر انسان کی پستی کی انتہا ہے کہ وہ انسانوں کے علاوہ گائے کے گوبر، بندر، بلی، پتھر، اعضائے تناسل تک کی پوجا کر رہا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کائنات،

کی ہر چیز مخلوق ہے اور جو خود مخلوق ہے، وہ معبود کیسے ہو سکتی ہے لہذا عبادت کے لائق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جو ہر چیز کی خالق ہے۔

فرمایا یہ لوگ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وہ تو مردہ ہیں، زندہ رہنے والے نہیں۔ امام بیضاویؒ۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر مفسرین نے اموات کی یہ توجیہہ بیان فرمائی ہے کہ مشرک لوگ اللہ کے سوا جن کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ تین لحاظ سے مردہ ہیں۔ یا تو وہ دواماً مردہ ہیں یعنی لکڑی، پتھر یا مٹی کے بت ہیں جو مستقلاً مردہ ہیں اور ان میں زندگی کے کبھی کوئی آثار نہیں پائے گئے۔ یا وہ فی الحال اموات ہیں یعنی وہ انسان ہیں جو وفات پا چکے ہیں اور لوگ ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں اور ان کے نام کا وظیفہ کرتے ہیں۔ اور یہ دو صورتیں نہ بھی ہوں تو تیسری صورت یہ ہے ہر چیز انجام کے لحاظ سے مردہ ہے کہ اُسے بہرحال موت کا مزہ چکھنا ہے۔ "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ" (الرحمٰن) یہاں کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور باقی رہنے والی صرف رب ذوالجلال کی ذات ہے بہرحال فرمایا کہ کائنات کی ہر چیز مردہ ہے۔ اور زندہ رہنے والی نہیں۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر مردہ چیزوں کی پوجا کرتے ہیں۔ بعض بدبخت تو ایسے ہیں جو جنوں اور شیطانوں کی عبادت کرتے ہیں۔ شیاطین تو کجا ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے بھی فنا ہونے والے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا تمام انبیاء بھی اس دنیا سے جا چکے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنے وقت پر اس منزل سے گزرنا ہے، تو فرمایا کہ ایسی ہستیوں کو معبود بنانا اور ان سے حاجات طلب کرنا کتنی پستی کی بات

ہے۔ انسان خود انسانوں کے آگے سربسجود ہو رہے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو الوہیت کے درجے پر پہنچا دیا ہے، اولیاء اللہ کو مشکل کشا سمجھا جا رہا ہے، مافوق الاسباب اُن کو پکارا جا رہا ہے، حالانکہ ان کی اپنی زندگی بھی مستعار ہے، ذاتی نہیں، وہ خدا کے عاجز بندے ہیں اور اُن پر موت طاری ہو چکی ہے۔ ایسی ہستیوں کو معبود بنانا کہاں کا انصاف ہے فرمایا جن کی یہ پوجا کر رہے ہیں اُن کی حالت یہ ہے وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ انہیں تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے یہ تو خدائے عزوجل ہی کے علم میں ہے بعث بعد الموت کب ہو گی۔ ان میں سے بعض ایسی ہستیاں ہیں جنھیں دوبارہ جی اٹھنے کا بالکل تصور اور شعور ہی نہیں ہے۔ ان میں سے بعض تو پتھر اور مٹی کے بت ہیں جو نہ کبھی زندہ تھے اور نہ وہ دوبارہ زندہ ہوں گے۔ البتہ دنیا میں بعض انسان ایسے بھی گزرے ہیں جو خدا تعالیٰ کی معرفت سے بیگانہ رہے، اُن کو دوبارہ زندگی کا کوئی تصور ہی نہ تھا مگر لوگ ان کی بھی پوجا کرتے رہے ہیں۔ البتہ اللہ کے برگزیدہ نبی اور اس کے اطاعت گزار بندوں کو قیامت اور دوبارہ بعث کا شعور ہے۔ فرشتوں کو بھی معلوم ہے مگر بعث کے وقت سے کوئی بھی باخبر نہیں ہے۔ یہ علم صرف اللہ کے پاس ہے کہ کب قیامت برپا ہو گی اور وہ کب سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ تو فرمایا اللہ کے سوا ہر چیز اموات ہے جنھیں بعث بعد الموت کا بھی شعور نہیں ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾
لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾
لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ
وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ
عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع

ترجمہ :- تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے پس وہ لوگ جو نہیں ایمان لاتے آخرت پر، ان کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں (۲۲) ضرور بر ضرور (یہ بات برحق ہے) بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو یہ چھپاتے ہیں اور جس چیز کو ظاہر کرتے ہیں۔ بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) نہیں پسند کرتا تکبر کرنے والوں کو (۲۳) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں (۲۴) (اس کا نتیجہ یہ ہو گا) تاکہ اٹھائیں یہ لوگ اپنے بوجھوں کو پورے پورے قیامت کے دن، اور

ان لوگوں کے بوجھ سے بھی جن کو یہ گمراہ کرتے ہیں بغیر علم کے۔ آگاہ رہو، بُری ہے وہ چیز جس (بوجھ) کو یہ اٹھا رہے ہیں (۲۵)

ربط آیات

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت اور وحی الٰہی کے نزول کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد اپنے انعامات اور نشانات قدرت کا ذکر کیا جو اس کی وحدانیت کی دلیل بنتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ مشرک لوگ جن ہستیوں کی عبادت کرتے ہیں وہ تو کوئی چیز پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ خود پیدا شدہ ہیں۔ اللہ نے ان کو اموات کے لفظ سے تعبیر کیا کہ یا تو وہ مٹی اور پتھر کے بے جان بُت ہیں، یا فی الحال وفات پا چکے ہیں، اور یا بہر حال مرنے والے ہیں، ان میں سے کوئی بھی باقی رہنے والا نہیں۔ ان کی اپنی زندگی بھی ذاتی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ تو جو ہستی خود اپنی ذات کی مالک نہیں وہ معبود کیسے بن سکتی ہے۔ انہیں تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے۔

مسئلہ الوہیت

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ الوہیت بیان فرمایا ہے اور ضمناً تکبر کرنے والوں کا انجام ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تمہارا معبودِ برحق ایک ہی معبود ہے۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک بنانا انتہائی درجے کی بے ادبی اور گستاخی ہے۔ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے سمجھایا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا "بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد اور بیوی کیسے ہو سکتی ہے "وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ" اُس نے تو خود ہر چیز پیدا کی ہے "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" اور وہی ہر چیز کو جاننے والا ہے یہ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ"

یہی اللہ تمہارا رب ہے جس کی یہ صفات ہیں "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" اُس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں "خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْہُ" وہی ہر چیز کا خالق ہے، لہذا اسی کی عبادت کرو "وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ" اور ہر چیز کا کارساز بھی وہی ہے۔

غرضیکہ سمجھانا یہ مقصود ہے کہ اللہ وہی ہو سکتا ہے جو رب ہو، خالق ہو، علیم کل اور مختارِ مطلق ہو۔ اگر یہ صفات اللہ کے سوا کسی دوسری ذات میں ناپید ہیں تو عبادت کے لائق بھی اُس کے سوا کوئی نہیں مخلوق میں سے کوئی بھی کسی کا کام نہیں بنا سکتا، نہ کسی کی فریادرسی کرسکے اُس کی حاجت روائی کرسکتا ہے کیونکہ نافع اور ضار صرف وحدہٗ لاشریک ذات ہی ہے۔ اس کے باوجود ایسی ہستیوں کو پکارنا اور ان سے دادرسی چاہنا جن کا کچھ اختیار ہی نہیں ہے کتنی حماقت کی بات ہے۔ غرضیکہ ہر قسم کی عبادت قولی، فعلی یا اعتقادی سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کوئی کسی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک بنائے گا وہ مشرک ٹھہرے گا اور خدا تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔

لفظ "الٰہ" کی تحقیق

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ لفظ "الٰہ" لفظ "اللہ" کی اصل ہے فرماتے ہیں کہ لغوی اعتبار سے الٰہ کا اطلاق ہر معبود پر کیا جاسکتا ہے مگر شرائع الٰہیہ، کتبِ سماویہ اور انبیاء کی تعلیمات میں یہ لفظ صرف معبودِ برحق کے ساتھ مختص کیا گیا ہے۔ لہذا اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی ذات پر نہیں ہو سکتا۔

بعض فرماتے ہیں کہ الٰہ کا اشتقاق (ROOT روٹ) الوہیت سے ہے جس کا معنیٰ عبادت ہے۔ تو اس لحاظ سے الٰہ وہی ذات ہوگی جس کی عبادت کی جاسکے اور وہ ذات صرف خدا تعالیٰ ہی کی ہے۔ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ الٰہ کا مادہ اشتقاق اَلِہَ ہے جس کا معنیٰ

حیرانگی ہے۔ چونکہ تمام عقول اللہ تعالیٰ کی معرفت میں حیران ہو جاتی ہیں اس لیے اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر کیا گیا ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا مادہ وَلِہَ ہے جس کا معنیٰ سکون پکڑنا ہوتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں اَلِهْتُ اِلٰی فُلَانٍ یعنی میں نے فلاں کی طرف سکون پکڑا۔ چونکہ انسانی ارواح قلوب اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ سکون پکڑتے ہیں اور مطمئن ہوتے ہیں، اس لیے اِلٰہ کا اطلاق خدا تعالیٰ کی ذات پر کیا گیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اَلِہَ کا معنیٰ گھبرا جانا اور اَلَہَ کا معنیٰ پناہ دینا ہوتا ہے۔ انسان گھبرا کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہی اِن کو پناہ دیتا ہے، لہٰذا اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اطلاق کیا گیا ہے۔ جب اونٹ کا بچہ اپنی ماں پر بہت زیادہ فریفتہ ہوتا ہے تو عربی محاورہ میں کہتے ہیں اَلِهَ الْفَصِيْلُ بِاُمِّهٖ۔ چونکہ بندے اپنی مشکلات اور شدائد میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُسی پر فریفتہ ہوتے ہیں، اس لیے الٰہ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ لَہَا کا لفظ حجاب کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ ہر چیز سے بلند و برتر ہے اس کے سامنے پردے پڑے ہوتے ہیں اور کوئی شخص اس کو دیکھ نہیں سکتا، اس لحاظ سے بھی یہ لفظ اللہ تعالیٰ پر صادق آتا ہے۔

فکرِ آخرت

فرمایا تمہارا معبودِ برحق ایک ہی ہے فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ ان کے دل انکار کرنے والے ہیں وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ اور وہ تکبر کرنے والے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی الوہیت کو ماننا اور اُس کی وحدانیت کو تسلیم کر کے صرف اُسی کی عبادت کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو فکرِ آخرت رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ فکرِ آخرت ہی کے منکر ہیں، وقوعِ قیامت اور جزائے عمل پر اُن کا یقین ہی

نہیں ہے، وہ خدا تعالیٰ کو الٰہ کیسے مانیں گے اور اس کی عبادت کیونکر کریں گے۔ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کی عبادت سے تکبر کرنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔

تکبر کی بیماری

تو یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک فکر آخرت کا انکار اور دوسری تکبر کی بیماری۔ فرمایا جب خدا کا نبی یا اس کا ماننے والا اللہ تعالیٰ کی الوہیت بیان کرتا ہے تو یہ لوگ اللہ کی وحدانیت کو تکبر اور خود پسندی کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے۔ اکثر لوگ تکبر ہی کی وجہ سے ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ایک موقع پر تکبر کی مذمت بیان فرمائی تو ایک شخص نے عرض کیا، حضور! اگر کوئی شخص اچھا لباس پہنتا ہے اور اچھی سواری استعمال کرتا ہے تو کیا یہ تکبر میں شامل ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ یہ تو جمال ہے اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ یعنی اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے البتہ تکبر کی تعریف یہ ہے بطر الحق وغمط الناس کہ حق بات کو ٹھکرا دیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔ کسی کو اس کی غربت کی وجہ سے یا اس کے خاندان کی وجہ سے یا جسمانی کمزوری کی بنا پر حقیر جاننا تکبر میں شامل ہے کسی معمولی آدمی کی سچی بات کو ٹھکرا دینا بھی تکبر کی نشانی ہے دنیا میں اکثر مشرکین نے اللہ کے نبیوں کی معمولی حیثیت کے پیش نظر ہی ان کا انکار کیا۔ کہتے تھے کہ تو تو ہمارے جیسا کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا انسان ہے، تیرے پاس نوکر چاکر اور کوٹھی اور باغات نہیں ہیں، تو ہمیں کیسے تبلیغ کرتا ہے۔ کوئی بڑا آدمی ہم سے بات کرتا تو ہم توجہ بھی دیتے مگر تجھ جیسے معمولی حیثیت کے آدمی کی بات کو کیسے تسلیم کرلیں۔ وہ لوگ اسی تکبر کی بیماری میں مبتلا تھے، اور یہ بیماری اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ آج بھی کوئی جاگیردار کسی مزارع کی بات سننے کے

لیے تیار نہیں، کوئی کارخانے دار کسی مزدور کی رائے کو اہمیت نہیں دیتا اور کوئی افسر اپنے ماتحت کی رائے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا یہ سارا تکبر ہی کا شاخسانہ ہے

تکبر ابلیسی بیماری ہے اور ہدایت سے اکثر حرمان اسی بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین جب لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں تو ان کو عبادت اور ریاضت کراتے ہیں، اُن کو اذکار سکھاتے ہیں اور اُن کو رذائل سے پاک کرتے ہیں۔ تکبر ایک ایسی قبیح چیز ہے کہ انسان کی تمام بداخلاقیوں میں سے سب سے آخر میں اس سے خلاصی ہوتی ہے بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ ایک سوئی کے ذریعے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا آسان ہے مگر اس کے مقابلے میں دِل سے تکبر کو نکالنا مشکل کام ہے۔

فرمایا لَا جَرَمَ یہ لازمی امر ہے اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِن کے ظاہر و باطن کو خوب جانتا ہے۔ وہ ہر شخص کے غرور و نیاز مندی اور اس کے اخلاص کو جانتا ہے اور یہ بھی کہ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ کوئی متکبر آدمی خدا کا محبوب نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو عاجزی پسند ہے اور وہ اپنے عاجز بندے ہی کو پسند کرتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے لَا يَبْغِيْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ تم ایک دوسرے پر سرکشی اختیار نہ کرو بلکہ تَوَاضَعُوْا ایک دوسرے سے تواضع، ہمدردی اور غمگساری کے ساتھ پیش آؤ۔ تکبر بجائے خود مبغوض چیز ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مبغوض بناتا ہے لہٰذا اس سے بچنا چاہیئے کہ یہ بہت بڑی بیماری ہے۔

وحی الٰہی کا انکار

اِن متکبرین کی ایک یہ خصلت بھی بیان کی گئی ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا چیز نازل فرمائی ہے یعنی جب اُن سے قرآنِ کریم، وحی الٰہی اور شرائع الٰہیہ کے

متعلق دریافت کیا جاتا ہے۔ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ تو کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ مشرک اور جاہل لوگ ہمیشہ یہی بات کرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے تعلیمیافتہ اور سائنسدان یہودی اور عیسائی بھی قرآن حکیم کے متعلق یہی کچھ کہتے ہیں۔ ان کی طبیعتوں میں تکبر بھرا ہوا ہے اور وہ اسلام کو ایک رسمی مذہب خیال کرتے ہیں۔ دنیا کی ناپائیدار اور حقیر تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو بڑا صاحب کمال سمجھتے ہیں اور قرآن پاک اور نبی آخر الزمان کو اللہ کا کلام اور اس کا آخری نبی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بھی اللہ کے پاک کلام کو قصے کہانیوں پر محمول کرتے ہیں۔ بعض مشرک کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں عاد اور ثمود کی کہانیاں سناتے ہیں، آؤ ہم تمہیں رستم و اسفندیار کے کارنامے سناتے ہیں۔ جو محمد کی کہانیوں سے بڑھ کر دلچسپ ہیں۔ بہرحال وہ لوگ قرآن پاک اور وحی الٰہی کا انکار کرتے تھے اور اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے یہاں پر بیان فرمایا ہے۔

بوجھ

فرمایا اس انکار کا نتیجہ یہ ہوگا لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ تاکہ اٹھائیں یہ لوگ اپنا بوجھ پورا پورا قیامت کے دن جب محاسبے کا وقت آئے گا تو منکرین پر ان کے گناہوں کا پورا پورا بوجھ لادا جائے گا۔ وہ نہ صرف اپنی کارستانی کا بوجھ اٹھائیں گے، بلکہ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ بلکہ ان لوگوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جن کو انہوں نے گمراہ کیا بلا تحقیق۔ اس طرح گویا ان پر دوہرا بوجھ یعنی عذاب ڈالا جائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو امام یا پیشوا برائی کا کوئی راستہ مقرر کرتا ہے، اس کو اپنے گناہ کا بدلہ بھی ملے گا اور ان تمام لوگوں کے گناہ میں سے بھی حصہ ملے گا جو اس باطل راستے پر چل نکلے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اس دنیا میں، ہونے والے ہر قتل ناحق کا ایک گناہ آدم علیہ السلام

کے اُس بیٹے کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاتا ہے، جس نے سب سے پہلے قتلِ ناحق کی بنیاد رکھی۔ نیکی کے متعلق بھی یہی اصول ہے۔ ہر نیکی والے کی نیکی کا ایک اجر نیکی کا راستہ بتلانے والے کو بھی ملے گا۔ چونکہ دنیا میں نیکی کا راستہ انبیاء کرام نے ایجاد کیا، لہٰذا یہاں پر ہونے والی ہر نیکی کا ایک ایک اجر امت کے نبی کو بھی حاصل ہوتا ہے لہٰذا انبیاء علیہم السلام کے اجر و ثواب کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس آخری امت میں نیکی کے موجد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور وہ قیامت تک ہونے والے کارِ خیر میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

فرمایا، اِن لوگوں نے بلا سوچے سمجھے قرآن پاک کا انکار کر دیا ہے حالانکہ خود قرآن انہیں غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا" (محمد) یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر قفل پڑ گئے ہیں سورۃ صٓ میں ہے کہ ہم نے یہ مبارک کتاب آپ کی طرف نازل کی ہے "لِیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ" تاکہ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں جن لوگوں نے اس کلام کو سمجھنے کی کوشش کی انہیں پتہ چل گیا کہ پوری دنیا کی تاریکیوں میں روشنی کا یہی ایک مینار ہے مگر انہوں نے انکار کر کے دوہرا بوجھ اٹھا لیا ہے۔ فرمایا اَلَا خبردار سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ بہت برا بوجھ ہے جس کو یہ لوگ اٹھا رہے ہیں۔ اس کا احساس جزائے عمل کی منزل کے وقت ہوگا کہ انہوں نے کتنا برا بوجھ اٹھایا۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْھَا اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ
بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ
السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ
وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ
فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ
الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ
تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا
السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾
فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ
مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ:- تحقیق چالبازی کی اُن لوگوں نے جو تم
سے پہلے گزرے ہیں پس اللہ نے قصد کیا ان کی
عمارت کا، پس اس کو بنیادوں سے اکھاڑ دیا۔ پس گر پڑی
اُن پر چھت اُوپر سے۔ اور لایا اللہ تعالیٰ اُن کے پاس
عذاب جہاں سے اُن کو خبر بھی نہ تھی ﴿۲۶﴾ پھر قیامت

والے دن اللہ ان کو رسوا کریگا اور کہے گا ، کہاں ہیں میرے
وہ شریک جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے ۔ کہیں
گے وہ لوگ جن کو علم دیا گیا ہے کہ بیشک رسوائی آج
کے دن اور برائی کفر کرنے والوں پر ہے (۲۷) وہ کہ جن
کو وفات دیتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ لوگ اپنی
جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں ۔ پس وہ ظاہر کرتے ہیں
اُس وقت اطاعت کو ، اور کہتے ہیں کہ نہیں تھے ہم
برائی کرتے ۔ کیوں نہیں ، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ
تم کام کرتے تھے (۲۸) پس داخل ہو جاؤ جہنم کے
دروازوں میں ، ہمیشہ رہنے والے ہو گے تم ان میں ۔ پس
بہت بُرا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا (۲۹)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے پہلے توحید کے دلائل بیان فرمائے اور پھر غیروں کو الٰہ ماننے والوں کی تردید فرمائی ۔ اللہ نے واضح فرمایا کہ خالق ، رب ، علیم کل ، قادرِ مطلق ، نافع اور ضار اُس کے سوا کوئی نہیں ، لہٰذا عبادت کے لائق بھی کوئی نہیں ہو سکتا ۔ معبودِ برحق وہی اکیلا ہے اور اس بات میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ اس کے بعد اللہ نے منکرینِ توحید کے باطل عقیدے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ ایک تو انہیں آخرت کے محاسبے کا یقین نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ تکبر کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کفر ، شرک اور نافرمانی پر مصر ہیں ۔ جب ان کے سامنے اللہ کا کلام یا رسولوں کی بات پیش کی جاتی ہے تو کہتے ہیں یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ۔ وہ اپنے تکبر کی بنا پر اللہ کے نبیوں کی بات کو معمولی سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں ۔ اللہ نے فرمایا کہ قیامت والے دن وہ دوہرا بوجھ اٹھائیں گے ۔ انہیں اپنے گناہوں کا بار بھی اٹھانا ہوگا اور ان لوگوں کے گناہوں کا بھی جن کو انہوں

نے گمراہ کیا، فرمایا، یہ بہت برا بوجھ ہوگا جو وہ اٹھائیں گے۔

یقین
چال
بیان

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے زمانے کے منکرین قرآن اور نبی اور اسلام کے مخالفین خصوصاً مشرکین مکہ کو تنبیہ فرمائی ہے۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی سمجھایا ہے کہ جس طرح آج تم مخالفت کر رہے ہو اسی طرح پہلے لوگوں نے بھی اللہ کے نبیوں کی مخالفت کی تو وہ دُنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہو کر جہنم رسید ہوئے، اسی طرح اگر تم بھی اُنہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اللہ کے دین اور پیغمبر خدا کی مخالفت ترک نہیں کرو گے تو تمہارا انجام بھی پہلے لوگوں سے مختلف نہیں ہوگا۔

مشرکین مکہ نے دینِ اسلام کے خلاف بڑی سازشیں کیں اور نبی آخر الزمان کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے بڑی بڑی تدبیریں کیں جن کا ذکر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر ہوا ہے۔ حضور علیہ السلام کے خلاف باطل پراپیگنڈا مشرکین مکہ کا ایک اہم ہتھیار تھا، کبھی شاعر کہتے، کبھی کاہن کا لقب دیتے، کبھی آپ کو ساحر کا خطاب دیتے اور کبھی نعوذ باللہ مجنون قرار دیتے تاکہ لوگ آپ کی طرف راغب نہ ہوں۔ اس کے علاوہ مٹھی بھر مسلمانوں پر تشدد بھی کیا جاتا۔ طرح طرح کی تکالیف پہنچائی جاتیں، ذہنی طور پر پریشان کیا جاتا تاکہ وہ اسلام کا دامن چھوڑ دیں۔ باہر سے آنے والوں کو راستے میں ہی روک دیتے اور انہیں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر نہ ہونے دیتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں بھی آتا ہے کہ آپ کی قوم کے لوگ راستوں میں بیٹھ کر لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے اور شعیب علیہ السلام کے پاس جانے سے روکتے تھے۔ اسی طرح مشرکین مکہ نے اس قسم کا انتظام کر رکھا تھا کہ لوگ حضور علیہ السلام کی بات نہ سن سکیں۔ وہ جانتے تھے کہ جسے ایک دفعہ آپ کی صحبت حاصل ہوگئی، وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ گذشتہ سورۃ الحجر کے آخری حصے

ہیں لفظ عضین کی تشریح میں عرض کیا گیا تھا کہ اِن بدبختوں نے علاقے تقسیم کر رکھے تھے کہ فلاں راستے سے تم روکو اور فلاں درّے پر ہم بیٹھیں گے۔ تاکہ لوگ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکیں۔ چنانچہ دو صحابیوں کا ذکر آتا ہے کہ انہوں نے نبی علیہ السلام سے ملنے کی کوشش کی تو انہیں سخت تکلیف اٹھانا پڑی۔ مکے پہنچ کر انہوں نے کسی معمولی حیثیت کے آدمی سے حضور علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا تو وہیں پٹائی شروع ہو گئی۔ حضرت عمرو ابن عبسہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جس زمانے میں وہ مکہ پہنچے تو اس وقت جُرَآءُ عَلَیۡہِ قَوۡمُہٗ آپ کی قوم آپ کے سخت مخالف تھی۔ لہذا حضور علیہ السلام نے اُن سے فرمایا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ تم اپنے اسلام کا برملا اظہار نہ کرو اور اپنے علاقے میں واپس چلے جاؤ۔ پھر جب تمہیں خبر پہنچے کہ اللہ نے اہلِ ایمان کو غلبہ عطا فرما دیا ہے تو ہمارے پاس آجانا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنے علاقے میں واپس چلے گئے۔ پھر جب اہل اسلام حضور علیہ السلام کی معیت میں مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ وہاں آپ کے قدم جم گئے اور کفار مکہ کو بدر کے میدان میں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا، تو وہ لوگ مدینے پہنچ کر اپنے مسلمان بھائیوں میں شامل ہو گئے۔ بہر حال یہاں پر اسی بات کو بیان کیا جا رہا ہے کہ پرانے مشرکوں نے بھی بڑی بڑی تدابیر اختیار کیں اور آج کے مشرک بھی اُنہی کے نقش قدم پر چل کر دین اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں، اللہ کی توحید کو مٹانا چاہتے ہیں اور نبی کے مشن کو ناکام بنانے پر کمربستہ ہیں مگر تم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر قائم رہو، اُن کی رسوائی کا وقت آنے والا ہے۔

نمرود اور فرعون کی کارگزاری

ارشاد ہوتا ہے قَدۡ مَکَرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ بلاشک چالبازی کی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ انہوں نے خدا کے دین کے خلاف بڑی سازشیں کی، غلط پراپیگنڈا کیا، راستوں

میں بیٹھے حتیٰ کہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچی ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نمرود اور فرعون کی مثالیں بیان فرمائیں کہ انہوں نے اللہ کے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کے خلاف کیسی کیسی تدبیریں کیں ۔ جب ابراہیم علیہ السلام خدا کا نام لیتے تو نمرود کہتا کہ تمہارے خدا کا مقابلہ میں کروں گا، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ایک بہت بڑا مینار تیار کیا جائے جس پر چڑھ کر میں ابراہیم علیہ السلام کے خدا کا مقابلہ کروں گا ۔ چنانچہ بائبل کی تفسیری روایات، عبداللہ بن عباس رضؓ اور وہب رضؓ کی روایات میں آتا ہے کہ نمرود نے اس مقصد کے لیے ۵۰۰ فٹ بلند مینار تعمیر کرایا تھا مگر اس کے اوپر چڑھ کر مقابلہ کرنے کا موقعہ نہ ملا ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی تیز آندھی بھیجی کہ مینار کی چوٹی تو ٹوٹ کر دور پانی میں جا گری اور باقی حصہ منہدم ہونے پر ہزاروں آدمی اس کے نیچے آ کر کچلے گئے ۔ بعض کے دماغ خراب ہو گئے اور بعض کی زبان ہی بدل گئی، وہ زبان سے کہنا کچھ چاہتے مگر ادا کچھ اور ہی ہوتا تھا ۔ فرعون نے بھی اپنے وزیر سے کہا تھا کہ میرے لیے ایک بہت بلند و بالا مینار تعمیر کراؤ تاکہ میں اوپر چڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھ سکوں ۔ یہ سب پہلے لوگوں کی چالیں تھیں جو انہوں نے اللہ کے سچے دین کے خلاف اختیار کیں ۔

ادھر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ بھی کام کر رہی تھی ۔ جب منکرین خدا اور رسول نے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرائیں تو فرمایا فَاَتَی اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ کہ اللہ نے ان کی عمارتوں کو بنیادوں سے اکھاڑ دیا فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ اور اوپر سے ان پر ان کی چھتیں ہی گر پڑیں، اور ان کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں ۔ یہ دراصل مکے والوں کو تمثیل کے طور پر یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ پرانی اقوام میں سے بھی جس کسی نے سرکشی کی اور خدا تعالیٰ کا مقابلہ کرنا چاہا ۔ اللہ نے ان کی جڑ بنیاد کو ہی اکھاڑ کر ان کو نیست و نابود کر دیا ۔ اور پھر وَاَتٰهُمُ

الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ان پر ایسی جگہ سے خدا کا عذاب آیا جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ لہذا اگر تم بھی پرانے مشرکین کی روش پر چلو گے تو تمہارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے چند سالوں میں مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایا، مکہ فتح ہو گیا اور وہاں سے مشرکین کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

مسلسل سازشیں

خدا کے دین کے خلاف سازشیں ابتداء سے ہی ہوتی رہی ہیں پہلے زمانے کے لوگ بھی تدبیریں اختیار کرتے رہے اور پھر نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخالفین نے بھی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور اس کے بعد بھی ہر دور میں اسلام کے خلاف بڑے بڑے منصوبے بنتے چلے آئے ہیں۔ آج بھی یہودی، عیسائی، ہندو اور اشتراکی اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہزاروں سکیمیں بنا رہے ہیں، کہیں سکولوں اور کالجوں کے ذریعے لوگوں کو دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کہیں ہسپتالوں کی آڑ میں اسلام مخالف پراپیگنڈا کیا جاتا ہے انسانیت کے نام نہاد خیر خواہ یہ لوگ دراصل دینِ اسلام پر شب خون مارتے ہیں، مفت لٹریچر تقسیم کر کے لوگوں کے دین پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ امیر شکیب ارسلان (متوفی ۱۹۴۰ء) بڑے مجاہد آدمی تھے ترکی کے ہسپتالوں کے انچارج اور دین کے شیدائی تھے، وہ لکھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے یہودیوں اور عیسائیوں نے قرآن پاک اور پیغمبر اسلام کے خلاف چھ لاکھ کتابیں شائع کی ہیں کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بیگانہ ہو جائیں۔ کہیں یہ سازش مستشرقین کے ذریعے پروان چڑھائی جا رہی ہے۔ مشرقی علوم کے نام نہاد مغربی لوگ قرآنِ پاک اور دینِ اسلام پر مختلف قسم کے اعتراضات جاری کر کے لوگوں کو دین سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرضیکہ کبھی مخالفت کر کے اور کبھی موافق بن کر ہر طریقے سے دین کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر انگریز تو اس حد تک منصوبہ بندی کر چکے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کا تعلق قرآن پاک سے منقطع نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے قابو میں نہیں آسکتے۔ یہودیوں نے بھی برملا کہہ دیا کہ جب تک مسلمانوں کی عقیدت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پختہ ہے، ہم کامیاب نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ ہر دو گروہ اپنے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے بھرپور کوششیں کر رہے ہیں۔ اُدھر مسلمان ہیں جو ان سازشوں سے بے خبر سوئے ہوئے ہیں، انہیں اس وقت پتہ چلتا ہے جب یہود و نصاریٰ کی کوئی تدبیر کامیابی کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اور وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے مارے جاتے ہیں۔

باطل فرقوں میں مرزائیوں اور رافضیوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی دینِ حقہ کے خلاف مسلسل سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ مرزائیوں کی زد میں ہم ایک صدی سے آئے ہوئے ہیں۔ اب تو قانونی طور پر ان کی حیثیت کمزور ہو چکی ہے۔ وگرنہ اقتدار پر قابض اکثر لوگ انہی کی طرفداری کرتے آئے ہیں۔ ان کا لٹریچر اب تک پھیلایا جا رہا ہے اور وہ دنیا بھر میں اپنے باطل دین کے لیے سرگرم ہیں۔ اُدھر رافضیوں نے بھی اپنی پراپیگنڈا مہم تیز کر رکھی ہے گویا رافضیت ہی اصل اسلام ہے۔ ایرانی انقلاب کے بعد خمینیوں کی حمایت میں بڑا لٹریچر تقسیم ہو رہا ہے وہ اپنے آپ کو اسلام کے نمائندہ کے طور پر دنیا میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ رافضی ہیں۔

بہرحال اللہ نے فرمایا کہ دشمنانِ دین کو پہلے بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اُن کی عمارتوں کو جڑ و بنیاد سے اکھاڑ دیا گیا۔ اور وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ مخالفینِ خدا و رسول کی طرف سے تھوڑے عرصہ کے لیے شور و شر ہوتا ہے، بعض لوگ اُن سے متاثر بھی ہوئے ہیں، مگر اُن کی سازش جلد ہی منظرِ عام پر آجاتی ہے اور ان کی تمام سکیمیں جھاگ کی طرح ختم ہو جاتی ہیں۔ اسلام اپنی ذاتی خصوصیت اور حقانیت کی بناء پر قائم ہے اور تا قیامِ قیامت

قائم رہے گا۔

ظالموں کی رسوائی

فرمایا دشمنانِ دین کا دنیا میں تو یہ حال ہوا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ پھر قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کریگا اِس دنیا میں مشرکین شرک کی حمایت میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں مگر قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اُن سے فرمائے گا۔ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ بتاؤ آج میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کے بارے میں تم دنیا میں جھگڑا کیا کرتے تھے۔ میرے نبیوں کی بات نہیں مانتے تھے اور شریکوں کی حمایت کیا کرتے تھے۔ اب اُن کو بلاؤ تاکہ تمہاری مدد کریں۔

اُس وقت قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اہلِ علم کہیں گے۔ جن کو اللہ نے دنیا میں علم کی روشنی عطا فرمائی اور وہ کفر شرک سے بیزار رہے، وہ کہیں گے اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ بیشک آج کے دن کی رسوائی اور برائی یعنی عذاب کفر کرنے والوں پر ہے۔ انہوں نے دنیا میں اللہ کی توحید کا انکار کیا، خدا کے شریک ٹھہرائے، اللہ کے نبیوں کی مخالفت کی، وہ دنیا میں بھی ناکام ہوئے اور آج قیامت کے دِن بھی اُن کے مقدر میں رسوائی اور ذلت ہے۔

فرمایا ان کافروں کی حالت یہ ہے الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کہ اللہ کے فرشتوں نے اُن کو اِس حالت میں موت دی کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں جس کا ارتکاب کر کے وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے۔ حضور علیہ السلام دُعا میں کہتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ الْحَيٰوةِ وَمِنْ شَرِّ الْمَمَاةِ

اے اللہ! میں بری زندگی اور بری موت سے پناہ مانگتا ہوں۔ بری زندگی یہ ہے کہ انسان عمر بھر بدعقیدگی میں مبتلا رہے اور بری موت یہ ہے کہ اسی بدعقیدگی پر خاتمہ ہو۔ ایسا شخص توحید خداوندی سے خالی گیا۔ لہذا اس سے بری موت کون سی ہو سکتی ہے؟

فرمایا، یہ لوگ دنیا میں اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے۔ انہوں نے کفر اور شرک کا راستہ پکڑا، حالانکہ اللہ کا فرمان ہے "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (لقمان) یعنی شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ نیز فرمایا "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (البقرہ) اور کافر وہی ہیں ظلم کرنے والے۔ تو فرمایا کہ دنیا میں تو یہ کفر و شرک میں مبتلا رہے مگر قیامت کے دن اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کریں گے فَاَلْقَوُا السَّلَمَ اس وقت اپنی اطاعت اور کفر شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور کہیں گے مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ہم تو دنیا میں برائی کا ارتکاب نہیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر اللہ فرمائیگا، تم جھوٹ بولتے ہو بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔ وہ علیم کل ہے اور تمہاری ایک ایک حرکت اور ایک ایک عمل سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ تم دنیا میں کفر اور شرک پر بضد رہے، لہذا آج تمہارا انکار کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ جب وہ زبان سے انکار کریگا تو زمین، انسان کے جوارح اور دوسری چیزیں اس کے خلاف گواہی دیں گی۔ خطہ ارضی، پہاڑ، درخت بول کر کہیں گے کہ اس شخص نے فلاں مقام پر فلاں گناہ کیا۔ ہاتھ اور پاؤں گواہ بن جائیں گے اور اس کی کوئی بات نہیں چل سکیگی۔

جہنم میں داخلہ

پھر ارشاد ہوگا فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ اب تمہارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں خٰلِدِيْنَ فِيْهَا تمہیں اس جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہوگا۔ پچھلی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر گیٹ سے منقسم جرائم کے مطابق داخلے ہوں گے۔ فرمایا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ تکبر کرنے والوں کا یہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ انہوں نے غرور و تکبر کی وجہ سے انبیاء کی بات کو تسلیم نہ کیا، خدا کی وحدانیت کو معمولی چیز سمجھ کر ٹھکرا دیا، تو فرمایا کہ تمہارے تکبر کی سزا یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس جہنم کا ایندھن بن جاؤ۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَآ أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ
قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ
الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ
دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا
تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا
مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾
الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ
سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ
تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ
الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ
وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٣﴾ فَأَصَابَهُمْ
سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا
ع بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٣٤﴾

ترجمہ :- اور کہا گیا ان لوگوں سے جو بچتے ہیں
کہ کیا چیز اتاری ہے تمہارے پروردگار نے، تو انہوں نے

کہا کہ (جو کچھ بھی اُس نے اُتارا ہے) وہ سراسر خیر ہی ہے۔
اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے بھلائی کی اس دُنیا میں، بھلائی
ہی ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے اور بہت اچھا گھر ہے
اُن لوگوں کا جو متقی ہیں (۳۰) وہ باغات ہیں رہنے کے لیے
داخل ہوں گے وہ اِن میں۔ بہتی ہیں اِن کے سامنے نہریں
اُن کے لیے ہو گا ان (باغوں) میں جو وہ چاہیں گے۔ اسی
طریقے سے اللہ تعالیٰ بدلہ دیتا ہے متقیوں کو (۳۱) وہ کہ جب
وفات دیتے ہیں اُن کو فرشتے (اس حال میں کہ وہ) پاک ہوتے
ہیں، اور (فرشتے) کہتے ہیں۔ سلام ہو تم پر، داخل ہو جاؤ
جنت میں اس کے بدلے میں جو کام تم کیا کرتے تھے (۳۲)
یہ (نافرمان لوگ) نہیں انتظار کرتے مگر اس بات کا کہ
آجائیں اُن کے پاس فرشتے یا پہنچ آئے ان کے پاس تیرے
پروردگار کا خاص حکم۔ اسی طریقے سے کیا ان لوگوں نے
جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ اور اللہ نے اُن پر ظلم
نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (۳۳)
پس پہنچیں اُن کو وہ برائیاں جو انہوں نے کی تھیں،
اور گھیر لیا اُن کو اُس چیز نے جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا
کیا کرتے تھے (۳۴)

ربطِ آیات

پہلے اللہ نے کافروں اور مشرکوں کا حال بیان کیا کہ جب اُن سے قرآن پاک سے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر کیا چیز اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو قصے کہانیاں ہیں وہ نہ صرف وحی الٰہی کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں اور اس کی تردید کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کا انجام بیان فرمایا کہ قیامت

کے دن یہ لوگ نہ صرف اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ ان لوگوں کے گناہوں کا بار بھی ان پر ہوگا جن کو انہوں نے دنیا میں گمراہ کیا۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے دنیا میں اسلام کے خلاف بڑی منصوبہ بندی کی، بڑی سکیمیں بنائیں، چال بازیاں کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا میں بھی سزا دی اور آخرت میں تو ان کے لیے عذاب لازمی ہے فرمایا یہ لوگ مرتے دم تک کفر شرک پر اڑے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب ان کی موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے اسی حالت میں ان کی جان قبض کرتے ہیں۔ پھر اس وقت یہ توحید کا اقرار کرتے ہیں، مگر اس وقت کا اقرار کچھ مفید نہیں ہوتا اور فرشتے انہیں جہنم کی وعید سنا دیتے ہیں۔ فرمایا تکبر کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

متقین سے سوال و جواب

نافرمانوں کا حال اور انجام بیان کرنے کے بعد اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کا حال بھی بیان فرمایا ہے۔ قرآن پاک کا اسلوب ہے کہ جہاں مشرکین کا ذکر آتا ہے تو ساتھ متقین کا بیان بھی ہوتا ہے، اور جہاں فجار کا حال بیان کیا جاتا ہے تو ساتھ ابرار کا ذکر بھی ہوتا ہے، اور اس طرح ترہیب اور ترغیب ساتھ ساتھ چلتے ہیں اب یہاں پر بوقتِ موت اہل ایمان کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا اور کہا جاتا ہے ان لوگوں سے جو ڈرتے ہیں۔ اتقی کی تفسیر میں رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انسان سب سے پہلے کفر، شرک اور نفاق سے بچے۔ پھر ہر باطل عقیدے سے پرہیز کرے۔ پھر کبائر سے اور پھر بتدریج صغائر سے بھی بچ جائے۔ متقین کی یہی نشانیاں ہیں۔ گویا تقویٰ کی پہلی سیڑھی کفر اور شرک سے پرہیز ہے۔ جو شخص ان سے نہیں بچتا، وہ متقی نہیں ہو سکتا۔ تو فرمایا کہ جب بچنے اور ڈرنے والوں سے کہا گیا مَاذَا

اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ کہ تمہارے پروردگار نے کیا چیز اتاری ہے قَالُوۡا خَیۡرًا تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کا نازل کردہ کلام تو سراسر خیر اور باعث برکت ہے، اور یہ بے پایاں رحمت کا حامل ہے۔

حضرت اسامہؓ کی والدہ ام ایمنؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو گود لیا تھا پھر وہ آپ پر ایمان بھی لے آئیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے وقت تک وہ کافی عمر رسیدہ ہو چکی تھیں حضور کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ ملاقات کے لیے ام ایمنؓ کے پاس گئے تو وہ رونے لگیں۔ انہوں نے سمجھا کہ ام ایمنؓ حضور علیہ السلام کی جدائی کی وجہ سے رو رہی ہیں یا شاید آپ کے بعد انہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے۔ پھر جب انہوں نے رونے کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگیں کہ میں جانتی ہوں کہ اللہ کے نبی اس وقت بڑے آرام و راحت میں ہیں مجھے آپ کی طرف سے کوئی تشویش نہیں، بلکہ رونے کی وجہ یہ ہے کہ جب نبی علیہ السلام ہم میں موجود تھے تو وحی الٰہی کا سلسلہ بھی جاری تھا جو کہ اب منقطع ہو چکا ہے اور ہم اس کی برکات سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بھی آبدیدہ ہو گئے کہ واقعی اللہ کی جانب سے جو چیز اپنے نبی پر نازل ہوتی تھی وہ سراسر خیر و برکت تھی۔ اور اب ہم اس خیر و برکت سے محروم ہو چکے ہیں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی جو سراسر خیر ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس سے ہدایت کی روشنی حاصل کریں اور اچھی اچھی باتیں سیکھیں۔ انسان وحی الٰہی کے ہر وقت محتاج ہیں، اسی لیے تو ہر نماز کی ہر رکعت میں "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ" کی درخواست کرتے ہیں۔ یہ ایسی چیز ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی راہنمائی کرتی ہے اور اُن کی بہتری کے سامان پیدا کرتی ہے۔

متقین کے لیے بہتر گھر

فرمایا، یاد رکھو! لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا

حَسَنَةٌ جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھا کام کیا، یقیناً ان کے لیے بھلائی ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں اچھے کام کا نتیجہ اچھا ہی ہوگا۔ جو دنیا میں نیک کام کرتے ہیں، انہیں نیکی کی مزید توفیق ملتی ہے اور انہیں روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ فرمایا دنیا میں بھی انہیں نیکی کا بدلہ نیکی کی صورت میں ملتا ہے وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ اور آخرت کا گھر تو بہت بہتر ہے وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ اور متقیوں کے لیے آخرت کا گھر تو بہت ہی خوب ہے" وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ" وہاں ان کے نفسوں کی پسندیدہ ہر چیز ہوگی۔

اور وہ گھر کونسا ہے؟ فرمایا جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وہ رہائش کے باغات ہیں جن میں متقی لوگ داخل ہوں گے۔ عام باغات تو محض جنگل کی طرح ہوتے ہیں جن میں پھول بوٹے اور درخت ہوں اور تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے کی سہولت موجود ہو مگر رہائشی باغات میں رہائش کی تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں اور انہیں زیادہ قرینے سے سجایا جاتا ہے تاکہ وہاں رہنے والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ تو فرمایا متقیوں کے لیے بہتر گھر رہائشی باغات میں ہوں گے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ آسائش کی ہر چیز موجود ہوگی، بلکہ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ وہاں پر جسمانی اور روحانی راحت کی ہر وہ چیز ہوگی، جو وہ چاہیں گے۔ ان کا ہر پسندیدہ سامان وہاں موجود ہوگا، اور یہ چیز ان کے ساتھ ہی خاص نہیں ہوگی۔ بلکہ فرمایا كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ اللہ تعالیٰ عام تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ جو بھی کفر، شرک اور نفاق سے بچ جائیگا۔ اللہ تعالیٰ اُسے ایسے ہی انعامات عطا فرمائے گا۔

پاکیزہ موت

فرمایا یہ اُن لوگوں کے لیے انعامات ہیں اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ کہ جب فرشتے ان کی جانیں قبض کرتے ہیں تو اس وقت

وہ طَیِّبِیْنَ پاک صاف ہوتے ہیں۔ یعنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ کفر، شرک، نفاق اور بدعقیدگی سے پاک ہوتے ہیں نجاست تو شرک میں ہے، اللہ نے خود فرمایا ہے "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" (التوبۃ) مشرک تو ناپاک ہیں اور یہ ناپاکی باطن کی ناپاکی ہے ان بدبختوں کی روح، دل اور دماغ پلید ہے۔ سورۃ حج میں فرمایا ہے "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" بت پرستی کی گندگی سے بچو۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے دین کے طہارت کے اصول میں عقیدے کی طہارت کو اولیت حاصل ہے۔ اگر روح پاک نہیں تو جسم ہزار بار دھونے اور خوشبو لگانے سے بھی پاک نہیں ہوگا۔ بات واضح ہے کہ کتا اور خنزیر ناپاک ہیں، ان کو کتنی بار بھی صابن کے ساتھ نہلاؤ، یہ پاک نہیں ہوں گے۔ مشرک کی نجاست بھی ایسی ہی ہے تو متقی بننے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے دل و دماغ ہر قسم کی نجاست سے پاک ہو، اور جسے باطنی طہارت حاصل ہوگئی، اس کے متعلق فرمایا "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" (الاعلیٰ) جس نے تزکیہ حاصل کرلیا، وہ کامیاب ہوگیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا تزکیہ کفر، شرک اور بدعقیدگی کا تزکیہ ہے اسی پلیدی کی بناء پر اللہ نے فرمایا ہے کہ مشرک نجس ہیں "فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا" (التوبۃ) وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب بھی نہ آئیں ۹ھ کے بعد کسی مشرک کو حج بیت اللہ کی اجازت نہ تھی۔ بہرحال شرک ایک گندگی ہے۔ جس سے انسان کا باطن پلید ہوتا ہے۔

جنت میں داخلہ

تو فرمایا کہ جب متقی لوگوں کی موت کا وقت آتا ہے يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ فرشتے انہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو اور ساتھ یہ خوشخبری بھی دیتے ہیں اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

جنت میں داخل ہو جاؤ، اُن اعمال کی وجہ سے جو تم انجام دیتے رہے۔ اعمال سے اگر اعمالِ قلوب مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایمان کا وہ راستہ ہے جو متقیوں نے اختیار کیا۔ دوسرے مقام پر ہے یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ (یونس) اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو انکے ایمان کی وجہ سے جنت کے گھر تک پہنچائیگا۔ اور اگر اعمال سے مراد اعضاء و جوارح کے اعمال ہیں تو یہ جنت میں داخلے کا ظاہری سبب ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ انسان کے ظاہری اعمال اس کی کامیابی کا حقیقی سبب نہیں ہیں بلکہ حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمت ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اعمال انجام دینے کے بعد اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرے۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا[1] اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ حضرت! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، ظاہر ہے کہ یہ قلب کا عمل ہے۔ اور تصدیق قلب کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا جنت میں داخلے کا اولین ذریعہ نورِ ایمان ہے۔

عذاب کا انتظار

آگے پھر نافرمانوں کے متعلق فرمایا ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ کہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اس بات کا کہ آجائیں اُن کے پاس فرشتے۔ مطلب یہ ہے کہ نافرمان لوگ اپنے کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور مخالفتِ قرآن و رسول کا اظہار کر کے فرشتوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ اور فرشتوں کی آمد کا مطلب یہ ہے کہ غیب کے پردے اٹھ جائیں اور فرشتے اللہ کا عذاب لے کر پہنچ جائیں۔ ظاہر ہے کہ جب یہ وقت آجائے گا تو پھر ان نافرمانوں کو مزید مہلت نہیں ملیگی اور وہ عذابِ الٰہی کا شکار ہو جائیں گے فرمایا ان کو یا تو فرشتوں کا انتظار ہے اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّکَ یا اس بات کا انتظار ہے کہ تیرے رب کا مخصوص حکم آجائے اور اس سے عذاب ہی

[1] مسلم صفحہ ۶۲ ج ۱

مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت لطیف پیرائے میں منکرین خدا و رسول کو وعید سنائی ہے کہ اللہ کے پیغمبر آچکے ہیں، کتابیں آچکی ہیں۔ ہدایت کے سارے سامان آچکے ہیں۔ اور اگر اب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو پھر اس کے سوا باقی کیا رہ گیا ہے کہ ان پہ عذاب الٰہی نازل ہو اور وہ ہلاک ہو جائیں۔

فرمایا كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ وہ بھی کفر اور شرک پر اصرار کرتے تھے رسولوں سے ٹھٹھا کرتے تھے، کتاب الٰہی کو قصے کہانیاں بتاتے تھے اور آج کے یہ مشرک بھی انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ فرمایا وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ ان لوگوں پر اللہ نے زیادتی نہیں کی تھی۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پہ ظلم کیا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہے۔ اُن لوگوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا یعنی اپنے آپ کو مستحق عذاب بنالیا۔

فرمایا فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا پس پہنچیں اُن کو وہ برائیاں جو انہوں نے کی تھیں یعنی اُن کو اپنے اعمال ہی کی سزا ملی۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ اور گھیر لیا اُن کو اس چیز نے جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ عذاب الٰہی کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ اپنے نبیوں سے کہتے تھے کہ لے آؤ وہ عذاب جس سے ہمیں ڈراتے ہو، ہم جنت اور دوزخ کو کچھ نہیں جانتے۔ یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ تو فرمایا جس عذاب الٰہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، وہ لوگ اسی عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اس دنیا میں بھی سزا کے مستحق ٹھہرے، اور آگے آخرت کا عذاب بھی ان

کے لیے تیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے لوگوں میں سے منکرین اور متقین کے حالات بیان کرکے ان کے انجام سے آگاہ کیا ہے، اور مشرکین مکہ اور بعد میں آنے والوں کو بات سمجھائی ہے کہ کہیں تم بھی منکرین کے نقشِ قدم پر نہ چل نکلنا، ورنہ تمہارا بھی حشر وہی ہوگا، جو اُن کا ہوا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا
مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا
وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ
فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى
الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ
اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا
الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ
مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾

ترجمہ :- اور کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے شرک کیا ، اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ عبادت کرتے ہم اُس کے سوا کسی چیز کی اور نہ ہمارے باپ دادا ۔ اور نہ ہم حرام ٹھہراتے کسی چیز کو اس کے حکم کے سوا ۔ اسی طرح کیا اُن لوگوں نے جو اُن سے پہلے گزرے ہیں ۔ پس نہیں ہے رسولوں کے ذمے مگر کھول کر پہنچا دینا ﴿۳۵﴾ اور البتہ تحقیق بھیجا ہم نے ہر امت میں رسول (اور حکم دیا) کہ عبادت کرو اللہ کی ، اور بچو طاغوت سے پس بعض اُن لوگوں میں سے وہ تھے جن کو

اللہ نے ہدایت دی اور بعض اُن میں سے وہ تھے جن پر گمراہی ثابت ہوئی۔ پس چلو زمین میں اور دیکھو کیسے انجام ہوا اُن لوگوں کا جو جھٹلانے والے تھے (۳۶)

ربطِ آیات

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کا ذکر کیا، پھر اپنی وحدانیت کا تذکرہ کیا "اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" اور اس کے دلائل بیان فرمائے۔ اس کے بعد اُن لوگوں کی دو بڑی بیماریوں کا ذکر کیا جو اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہیں لاتے۔ ایک تو وہ آخرت کے منکر ہیں اور دوسرے تکبر کرتے ہیں۔ پھر اللہ نے مشرکوں اور متقیوں کے انجام سے آگاہ فرمایا۔ شرک کی تردید اس سورۃ کا خاص موضوع ہے جو گذشتہ آیات میں بھی بیان ہوا ہے، اِس درس میں بھی آرہا ہے اور آگے مثالوں کے ذریعے بھی اس مسئلہ کی وضاحت کی جائے گی۔ بہر حال آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے شرک کے حق میں مشرکین کی ایک نہایت ہی بھونڈی دلیل کا رد فرمایا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر بھی کیا ہے۔

شرک پرانی بیماری ہے

شرک ایک ایسی بیماری ہے جو تمام پرانی قوموں میں راسخ رہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اللہ کے ہر نبی کی قوم میں شرک پایا گیا اور ہر نبی نے سب سے پہلے اسی بیماری کی طرف توجہ فرمائی۔ اور قوم سے یہی فرمایا "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ" (ہود) اے میری قوم کے لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تم نے مٹی اور پتھر کے جتنے معبود بنا رکھے ہیں، اِن کی کوئی حیثیت نہیں۔ نہ یہ کچھ دے سکتے ہیں اور نہ چھین سکتے ہیں، اِن کی پوجا کر کے تم اپنے لیے تباہی کا سامان پیدا کر رہے ہو۔ یہ تو خدا تعالیٰ کی کھلی بغاوت اور سرکشی ہے۔ مختلف اقوام میں اور بھی مختلف بیماریاں تھیں، کسی میں تکبر کی بیماری تھی، کوئی ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے، کسی قوم میں معاملات کی خرابی تھی، کسی میں ظلم حد سے بڑھا ہوا تھا اور کوئی قوم حد درجے کی بداخلاقی میں مبتلا تھی تاہم

تمام اقوام میں شرک ایک ایسی بیماری تھی جو سب کی قدر مشترک تھی۔ اس لیے اللہ کے نبیوں نے سب سے پہلے اسی بیماری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

مشرکین کی دلیل

اِس بیماری کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی اللہ کے نبیوں نے اس بیماری کا قلع قمع کرنا چاہا تو مشرکین نے اس کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیے اور برحق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ آج کے درس میں اللہ نے یہی مضمون بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اور کہا شرک کرنے والوں نے۔ یعنی جب اللہ کے نبیوں نے شرک سے منع کیا تو کہنے لگے لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ اگر اللہ چاہتا تو ہم نہ عبادت کرتے اللہ کے سوا کسی کی وَلَآ اٰبَآؤُنَا اور نہ ہی ہمارے باپ دادا ایسا کام کرتے۔ وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، اس کے حکم کے سوا۔ یہ ہے وہ دلیل جو مشرکین شرک کے حق میں پیش کرتے تھے۔ گویا اپنے شرکیہ افعال کو خدا تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کر کے خود بری الذمہ ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے یہ شرکیہ کام پسند نہ ہوتے تو وہ فوراً ہمیں روک دیتا، ہماری زبانوں کو بند کر دیتا یا ہمارے ہاتھ پاؤں کی طاقت کو ہی سلب کر لیتا تاکہ ہم ایسا کام نہ کر سکتے۔ اگر اس نے ہمیں ان کاموں سے نہیں روکا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان امور پر راضی ہے، لہٰذا ہم انہیں انجام دینے میں حق بجانب ہیں۔ یہ تو بالکل ویسی بات ہے کہ کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اس کا اعتراف کرنے اور توبہ کرنے کی بجائے اسے تقدیر پہ ڈال دیتا ہے کہ تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا، لہٰذا ہو گیا، اس میں میرا کیا قصور ہے؟

حلت و حرمت کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ مشرکین نے بعض چیزیں

از خود اپنے آپ حرام ٹھہرا رکھی تھیں حالانکہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ انہوں نے بعض جانوروں کو بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا نام دے کر عام لوگوں کے لیے ان کا گوشت حرام قرار دے لیا تھا۔ چنانچہ جس مادہ کا دودھ نذر کے طور پر وقف کر دیتے اسے کوئی عام مرد و زن نہیں پی سکتا تھا بلکہ وہ صرف گدی نشینوں کے لیے حلال ہوتا تھا۔ اس طرح جس اونٹ یا بیل کو معبودانِ باطلہ کی نذر کر دیتے تھے، نہ اس پر سواری کرتے تھے اور نہ کسی دیگر کام میں لاتے تھے۔ اسی طرح جو جانور مقررہ تعداد میں بچے دے دیتا تھا اسے کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ نہ اس کا دودھ پیتے نہ گوشت کھاتے اور نہ سواری کے لیے استعمال کرتے۔ انہوں نے بعض چیزیں عورتوں پر اور بعض مردوں پر حرام کر رکھی تھیں۔ اس کا جواز بھی وہ یہی پیش کرتے تھے کہ اگر اللہ کی مشیّت نہ ہوتی تو ہم کوئی چیز حرام نہ کرتے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کرنے سے نہیں روکا، لہٰذا ہم ٹھیک کر رہے ہیں۔

سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی تمام اقسام پر بحث کی ہے اور ان کی تردید فرمائی ہے۔ یہ مضمون اسی قسم کی آیت میں وہاں بھی بیان ہو چکا ہے سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ فرمایا مشرک لوگ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد شرک کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ پہلے لوگوں نے بھی اسی قسم کی بیہودہ دلیل پیش کی حتیٰ کہ انہیں ہماری سزا کا مزا چکھنا پڑا۔ فرمایا، اس حرمت کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ تو محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور اٹکل پچو باتیں کر رہے ہیں۔ یہ تو حرمت کی بات تھی، ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے

جب مشرکین بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کرتے تھے اور اس کے لیے بھی انہوں نے خدا کی مشیت کو بہانہ بنا رکھا تھا، مگر اللہ نے فرمایا کہ وہ کبھی بے حیائی اور برائی کا حکم نہیں دیتا۔ تم تو شیطان کا اتباع کر کے اس فعل کو خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو۔

بہر حال شرک کے ارتکاب اور حلت و حرمت کے معاملہ میں مشرکوں نے نہایت ہی بیہودہ دلیل پیش کی جس کا اللہ نے رد فرمایا ہے۔ یہاں پر اللہ نے اجمالی طور پر ذکر کیا ہے، آگے عام قانون کی صورت میں بھی حلت و حرمت کا مسئلہ آئے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی اس باطل دلیل کے جواب میں فرمایا کَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا، گویا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے حضور علیہ السلام کو تسلی دلانا مقصود ہے کہ آپ مشرکین کے قبیح افعال سے گھبرائیں نہیں۔ اس قسم کے واقعات آپ کے ساتھ ہی پیش نہیں آ رہے ہیں بلکہ پہلی اقوام بھی اسی طرح کرتی اور کہتی رہی ہیں، وہ بھی کہتے تھے کہ اگر یہ برا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ روک دیتا، لہٰذا ہم جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ یہ کتنی نادانی کی بات ہے۔ بھلا یہ تو سوچو کہ ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں جن سے وہ انکار نہیں کر سکتے، مگر لوگ انہیں انجام دے رہے ہیں۔ اگر مشرکین کے فلسفے کو تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھی برائی نہیں رہتی کیونکہ ہر برائی انجام دی جا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہاتھ پکڑ کر روکتا نہیں۔ لہٰذا ہر برے سے برے کام میں بھی مشیت الٰہی شامل ہے معلوم ہوا کہ برا کام بہر حال برا ہے اور خدا تعالیٰ کے جبراً نہ روکنے سے کوئی برائی اچھائی میں تبدیل نہیں ہو جاتی۔

انسان کی فعل مختاری

حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی سے جبراً کوئی کام نہیں کراتا

کیونکہ یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ اسی سورۃ کے پہلے رکوع
میں گزر چکا ہے کہ اللہ تک تو سیدھا راستہ ہی پہنچتا ہے۔ مگر کچھ ٹیڑھے
راستے بھی موجود ہیں "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ"
اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھی راہ پر لگا دیتا، مگر وہ کسی کو مجبور نہیں
کرتا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا، عقل، شعور اور قویٰ عطا کر کے کچھ اختیارات
بھی دیے ہیں جن کو بروئے کار لا کر انسان اچھے یا برے اعمال انجام دیتا
ہے۔ اگرچہ خالق سب کا خدا تعالیٰ ہے مگر کاسب خود انسان ہے
اُسے اپنے دائرہ اختیار میں رہ کر اچھے یا برے کام کرنے کی اجازت
ہے۔ سورۃ الکہف میں ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ آپ
کہہ دیں، حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے "فَمَنْ شَآءَ
فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" اب یہ تمہاری مرضی ہے
جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے۔ یہ اُس
کی اپنی صوابدید پر ہے، اُس پر جبر نہیں ہے۔ ہاں یہ ہے کہ کوئی جونسا
راستہ اختیار کرے گا، اُسی کے مطابق جزا یا سزا کا مستحق ہوگا۔ اللہ نے
صاف بتلا دیا اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ہم نے ظالموں کے لیے
جہنم بھی تیار کر رکھا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کسی کو اچھائی یا برائی پر مجبور نہیں
کرتا، نہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر غلط راستے پر جانے سے روکتا ہے۔ فِطْرَتَ
اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم) اللہ نے ہر انسان
کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اِنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ
جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ اللہ تعالیٰ نے امانت یعنی صلاحیت
اور استعداد ہر شخص کے دل میں رکھ دی ہے، کسی کو اس سے محروم
نہیں رکھا۔ اس امانت کی تفصیل دنیا میں آ کر کتاب و سنت سے
معلوم کی جا سکتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس صلاحیت سے فائدہ

اٹھانے کی بجائے اسے خراب کر لیتا ہے تو اس کا نتیجہ اس کے حق میں سخت بُرا نکلے گا۔ غرضیکہ فرمایا کہ مشرکین کی یہ دلیل ناقابلِ قبول ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے شرک کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اور نہ ہی انہیں جبراً اس سے روکا ہے، انہوں نے اللہ کے عطا کردہ اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے جو راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ جہنم کا راستہ ہے اور اپنے شرک کی پاداش میں مشرک لوگ وہیں پہنچیں گے۔

رسولوں کی ذمہ داری

جہاں تک اللہ کے رسولوں کی ذمہ داری ہے، فرمایا فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ان کا کام کھول کر بیان کر دینا ہے۔ رسولوں کا کام کسی کو جبراً منوانا نہیں۔ اگر لوگ رسول کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں یا اُس کی مخالفت پر اُتر آئیں تو یہ اُن کا عناد ہوگا اور مشرکین اسی بیماری میں مبتلا رہے ہیں۔ اللہ نے اپنے رسول بھیجکر اور کتابیں نازل فرما کر برائی سے روکنے کے سامان بہم پہنچا دیے ہیں۔ اگر اب بھی کوئی کفر اور شرک سے باز نہیں آتا بلکہ اس بات کا انتظار کر رکھا ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دے، تو یہ اُس کی خام خیالی ہے۔ اُسے اس کارکردگی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

اللہ نے فرمایا وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا ہم نے ہر امت اور قوم میں اپنا رسول بھیجا جس نے ہمارا پیغام اپنی امت تک پہنچایا۔ اور وہ پیغام یہ تھا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو اور طاغوت سے بچ جاؤ۔ اللہ نے کفر و شرک سے روکنے کا یہی تو سامان پیدا کیا کہ اللہ کے ہر نبی نے اِسی بات کی دعوت دی کہ عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے، کفر اور شرک مہلک بیماری ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ اگر

اب بھی کوئی شخص اس سے اجتناب نہیں کرتا تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے، اللہ کے نبی کا کام پہنچا دینا ہے۔ کسی کو مجبور کرنا نہیں۔ تو گویا اللہ نے قانون اور شریعت کے ذریعے لوگوں کو شرک سے منع کیا ہے کسی کی قوت سلب کر کے اُسے مجبور نہیں کیا۔

غوت [illegible] ہے؟

طاغوت طغیان کے مادے سے ہے جس کا معنی سرکش اور بغاوت ہوتا ہے۔ یہ لفظ شیطان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بت کیلیے بھی۔ عام مفسرین فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا جن باطل قوتوں کی پرستش کی جائے وہ طاغوت ہیں۔ مشہور مؤرخ ابن ہشام نے اپنی "سیرت" میں طاغوت کی تعریف یہ کی ہے کُلُّ مَا اَضَلَّ عَنِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوْتٌ جو چیز بھی حق کے راستے سے گمراہ کرے وہ طاغوت ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی طاغوت کا ترجمہ "ہڑ بھنگا" کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہڑ بھنگا اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بلا سند سرداری کا ناحق دعویٰ کرے۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ جنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو حقیر لفظوں سے یاد کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو مہین کہا۔ حق کو ٹھکرانے والے طاغوت کی فہرست میں آتے ہیں، ہر ظالم خواہ وہ فرعون ہو، نمرود ہو، چنگیز ہو یا ہلاکو سب طاغوت ہیں۔ اکثر و بیشتر ملوک طاغوت ہیں مارشل لاء کا قانون بھی طاغوتی قانون ہے۔ غرضیکہ حق سے گمراہ کرنے والا کوئی انسان ہو، بت ہو یا شیطان ہو، طاغوت کی تعریف میں آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے قانون کو پس پشت ڈال کر من مانی کرنے والی ہر شخصیت طاغوت ہے

تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ طاغوتوں سے بھری پڑی ہے۔ اکثر ملوک آج تک من مانی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے حق و باطل میں تمیز کرنے کی بجائے اپنی مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ قوم اور ملک کی دولت لہو و لعب اور عیاشی و فحاشی پر خرچ کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے خدا کے قانون کے

اجرا اور مخلوقِ خدا کے فائدے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ لوگ بھوک کے مر رہے ہیں اور یہ فلک بوس عمارتیں بنانے میں مصروف ہیں۔ قوم کو تعلیم اور خوراک کی ضرورت ہے مگر یہ قوم کا پیسہ اپنی عیاشیوں پر خرچ کر رہے ہیں۔ گمراہی عام ہے، برہنگی کی وبا پھیل رہی ہے، لہو ولعب سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ سب طاغوتی کام ہیں جو انجام دیے جا رہے ہیں۔ ہاں ہماری تاریخ میں بعض اچھے لوگوں کا نام بھی محفوظ ہے مگر یہ خال خال لوگ ہیں جن کے دِل میں خدا کا خوف اور مخلوق کی بھلائی کا جذبہ موجزن تھا۔ خلفائے راشدین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا نام ہمیشہ سر فہرست رہے گا۔ یہاں برصغیر میں اورنگ زیب عالمگیرؒ، سلطان محمودؒ، ناصر الدین التمشؒ اور ٹیپو شہیدؒ جیسی ہستیاں ہوئی ہیں۔ جن کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاہم باقی کلہم طاغوتی کی فہرست میں ہی آتے ہیں۔ کوئی بڑا طاغوت ہے اور کوئی چھوٹا

هدایت
اور
گمراہی

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا جس نے لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ پس ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی۔ جن میں انصاف اور حق طلبی تھی اور جو ضد اور عناد سے پاک تھے، ان کو ہدایت نصیب ہو گئی وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ اور ان میں سے بعض وہ تھے جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ حق طلبی اور انصاف سے عاری، ضدی اور عنادی لوگ گمراہی میں غرق رہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے "خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ" (البقرہ) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ ان پر کفر کے زنگ چڑھ چکے ہیں۔ جیسے سورۃ المطففین میں موجود ہے "كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ" ان پر گمراہی ثابت ہو گئی اور وہ جہنم کا شکار بنے۔

فرمایا فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ یں زمین پر چل پھر کر دیکھو تمہیں بہت سی چیزیں نظر آئیں گی۔ تاریخ کے اوراق اور اجڑی بستیوں کے کھنڈرات عبرت کا سامان پیش کر رہے ہیں آپ کو جگہ جگہ ایسے کتبے نظر آئیں گے کہ یہاں فلاں قوم آباد تھی مگر خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے اس کے غضب کا شکار ہوگئی۔ عادیوں اور ثمودیوں کی بستیاں، الٹی بستی والوں کے نشانات آشوری، مصری، کلدانی اور بابلی تہذیبوں کے نشانات آپ کو دعوت دے رہے ہیں کہ آکر دیکھو فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ ان کی بستیاں تباہ و برباد ہوئیں اور یہ سب لقمۂ اجل بن گئے۔

إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ
يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقْسَمُوا
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ
يَّمُوْتُ ط بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ
فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّهُمْ كَانُوْا
كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ
اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾ ع ۵ / ۱۱

ترجمہ :۔ اگر آپ بہت خواہش کریں اِن کی ہدایت کی، پس بیشک اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا اُن کو جن کو گمراہ کرتا ہے۔ اور نہیں اُن کے لیے کوئی مددگار ﴿۳۷﴾ اور قسمیں اٹھائیں انہوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کہ نہیں اٹھائے گا اللہ اُن کو جو مرچکے ہیں۔ کیوں نہیں ؟ وعدہ ہے اُس کا سچا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۳۸﴾ (اٹھائے گا اُن کو) تاکہ ظاہر کردے اُن کے لیے وہ بات جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ بیشک وہ جھوٹے تھے ﴿۳۹﴾ بیشک ہماری بات کسی چیز کے بارے میں، جب

ہم ارادہ کرتے ہیں اس کا تو کہتے ہیں اس کو ہو جاؤ، پس وہ ہو جاتی ہے (۴۰)

ربطِ آیات

مشرکین نے اپنے کفر اور شرک کے جواز میں یہ دلیل قائم کی تھی کہ اگر یہ بُرے افعال ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ہمیں اِن سے روکتا کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس بیہودہ خیال کا ردّ فرمایا کہ اللہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو بُرائی سے نہیں روکتا نہ اس سے برائی کرنے کی طاقت ہی سلب کر لیتا ہے بلکہ اس نے برائی کی رکاوٹ کے لیے ایک نظام قائم کر رکھا ہے۔ اس نے ہر امت میں اپنے رسول بھیجے جنہوں نے لوگوں کو حکم دیا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ عبادت صرف اللہ کی کرو، اور طاغوت کی پرستش سے بچ جاؤ، گویا اللہ تعالیٰ نے قانون کے ذریعے لوگوں کو شرک سے روک دیا اس کے بعد لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض کو تو ہدایت نصیب ہو گئی، انہوں نے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کر لیا اور طاغوت کی پرستش سے بچ گئے۔ البتہ جس گروہ نے ہٹ دھرمی کا ثبوت دیا اور کفر و شرک پر اڑے رہے، اُن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ ذرا زمین میں چل پھر کر مشاہدہ کرو، جگہ جگہ اجڑی بستیوں کے کھنڈرات اور تاریخ کے اوراق بتائیں گے کہ جن لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کفر و شرک کو ترک نہ کیا۔ اُن کا کیا حشر ہوا۔ اِن لوگوں پر اللہ کا سخت عذاب آیا، ان کی بستیاں تباہ و برباد ہو گئیں اور اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ وہ اس دنیا میں بھی ناکام ہوئے اور آخرت میں بھی وہ نامراد ہی رہیں گے۔

بیت سے ہجرت

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور اس کے ماننے والوں کو تسلی دی ہے کہ اگر آج آپ کے مخالفین بھی عناد اور عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں، آپ کو تکالیف پہنچا رہے ہیں، حق بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں تو آپ گھبرائیں نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ اگر آپ بہت طمع کریں اس بات کا کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں، اللہ کے دین کو قبول کر لیں، تو یاد رکھیں فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ تو بیشک اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا جس کو گمراہ کرتا ہے۔ آپ کتنی بھی تمنا کریں کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں، مگر جنہیں اللہ نے اُن کی ضد عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر گمراہ کر دیا ہے۔ وہ راہ راست پر نہیں آ سکتے تو لہٰذا آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ حرص کا عام فہم معنیٰ طمع اور لالچ ہوتا ہے جو کہ اخلاقی بیماری ہے اور یہ چیز ایک مومن آدمی میں پیدا نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ یہ چیز اللہ کے نبی کی طرف منسوب کی جائے تو یہاں یہ حرص کا لغوی معنیٰ مراد نہیں بلکہ اس مقام پر حرص سے مراد خواہش اور تمنا ہے جو اپنی قوم کی ہدایت کے لیے نبی کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔

اللہ کے تمام نبیوں کا یہی حال رہا ہے۔ اپنی قوم کو کفر اور شرک میں غرق دیکھ کر انہیں سخت کوفت ہوتی تھی اور وہ ہر طریقے سے لوگوں کو اس بیماری سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ پھر پوری کوشش کے باوجود جب قوم نہیں مانتی تھی تو خود ان سے علیحدگی کا اعلان فرما دیتے تھے۔ سورۃ الممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پڑھ لیں جب آپ اور آپ کے مٹھی بھر ماننے والے قوم سے بالکل مایوس ہو گئے "اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ تو اپنی قوم سے کہنے لگے" اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ہم تم سے اور تمہارے معبودانِ باطلہ سے متنفر ہیں" كَفَرْنَا بِكُمْ ہم تمہارے منکر ہیں۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کی دیوار حائل ہو چکی ہے حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ" یہاں تک کہ تم اللہ وحدہ

لاشریک پر ایمان لے آئے۔ انبیاء علیہم السلام کی تمام تر خواہش اور تمنا کے باوجود کہ سارے لوگ ایمان لے آئیں، اللہ نے سورۃ یوسف میں فرمایا ہے "وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ" آپ کتنی بھی خواہش کریں مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور وہ ہدایت سے محروم ہی رہیں گے۔ آگے اللہ نے اس محرومی کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے "فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ" بیشک اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا ان کو جن کو گمراہ کر دیتا ہے، اور گمراہ اُسی کو کرتا ہے جو ضدی اور عنادی ہوتا۔ اس بات کو اللہ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر بیان فرمایا کہ جو شخص ظلم اور فسق پر اڑا رہتا ہے۔ اُس کے دل میں تعصب اور عناد راسخ ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہدایت حاصل کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی خراب کر بیٹھتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کو ایمان قبول کرنے کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوتی۔ البتہ جس کے دل میں ہدایت کے لیے طلب پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ضرور راہِ راست واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا "وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ" (النحل) بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بلا وجہ گمراہ نہیں کرتا بلکہ اُن کی اپنی نفرت، ہٹ دھرمی، تعصب اور تکبر انہیں ہدایت سے محروم رکھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی مثال دیکھ لیں اِن بدبختوں کو آج تک پتہ نہیں چلا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں وہ اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہیں اور حضور علیہ السلام کی رسالت سے شدید ترین عداوت رکھتے ہیں۔ کفر اور شرک میں مبتلا ہیں مگر اپنے آپ پر حق پرستی کا لیبل لگا رکھا ہے، کہتے ہیں کہ ہم آسمانی کتابوں اور اللہ کے رسولوں کو ماننے والے ہیں مگر نہ اللہ کی آخری کتاب قرآنِ حکیم

کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ پیغمبر آخر الزمان پر ایمان ہے بلکہ آپ سے شدید دشمنی ہے۔ دُنیا کی اڑھائی بلین ارب کی آبادی عیسائیوں کی ہے۔ یہ اپنی ضد سے اُس وقت تک باز نہیں آئیں گے۔ جب تک عیسٰی علیہ السلام زمین پر نازل ہو کر ان کو ختم نہیں کر دیتے۔

فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ ضد اور عناد کی بناء پر گمراہ کر دے، آپ کتنی بھی خواہش کر یں، وہ راہِ راست پر نہیں آئے گا۔ آپ ان کے متعلق زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہوں گے وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ اور پھر ان کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا، محاسبے کی منزل اور جزائے عمل کے وقت یہ لوگ بالکل اکیلے ہوں گے اور انہیں کسی طرح سے کوئی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔

تسلی کا مضمون

اِس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے تسلی کا مضمون بھی ہے۔ اللہ نے یہ مضمون قرآن پاک میں مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ جب بھی پیغمبر علیہ السلام قوم کی طرف سے دل برداشتہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام آجاتا۔ سورۃ الکہف میں جہاں اللہ نے کفار کے اس دعوے کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) اولاد رکھتا ہے۔ وہاں فرمایا "فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ" کیا آپ اپنا گلا گھونٹ کر ہلاک ہو جائیں گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے فرمایا، آپ اِن کو چھوڑ دیں کہ اِن کی ہٹ دھرمی میں قصور اِنہی کا ہے، آپ کا نہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے "وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (الشوریٰ) آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ ان کے سامنے راہ راست پیش کر دیں۔ اور گذشتہ درس میں یہ بھی گزر چکا ہے۔ "فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ" رسولوں کا کام تو یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کھول کر بیان کر دیں، لوگوں کو آگاہ کر دیں اور انہیں اُن کے بُرے انجام سے ڈرا دیں۔ لیکن کسی کو منزل

مقصود تک پہنچا دینا نبی کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ اختیار صرف اللہ تعالےٰ کے پاس ہے۔ حضرت علیؓ کا باپ ابوطالب جب بستر مرگ پر پڑا تھا تو حضور علیہ السلام کو بڑا صدمہ ہو رہا تھا کہ آپ کا چچا ایمان سے خالی جا رہا ہے آپ نے ہر چند کوشش کی کہ وہ مرنے سے قبل کلمہ توحید پڑھ لے مگر اس وقت بھی اس کا تکبر اس کے اڑے آیا اور کہنے لگا کہ اگر اس وقت میں نے کلمہ پڑھ لیا تو لوگ کیا کہیں گے کہ مرتے وقت اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ گیا۔ لہٰذا میں اپنے بڑوں کے دین پر ہی مروں گا حضور علیہ السلام کی اس انتہائی خواہش کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی
اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ "اے نبی! آپ کسی کو اپنی خواہش پر ہدایت نہیں دے سکتے، ہدایت تو اُسے ملتی ہے جسے اللہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔" وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ" (القصص) اور یہ اُسی کے علم میں ہے کہ ہدایت کی استعداد رکھنے والے کون ہیں تو آیت زیر درس میں حضور علیہ السلام کے لیے تسلی کا مضمون ہے کہ نبی، مومن، یا مبلغ کا کام تو پیغام کو پہنچا دینا ہے۔ وہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کی حتی الامکان کوشش کریں اور پھر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں کیونکہ کسی کے انجام کے متعلق اُن سے نہیں پوچھا جائے گا، بلکہ اللہ خود ان سے نپٹ لے گا اور خود پوچھ لے گا کہ اس نے صحیح راستہ کیوں نہ اختیار کیا۔ ہاں اگر اللہ کا نبی یا دوسرا مبلغ دین کو پہنچانے میں کوشش نہیں کرے گا تو پھر ذمہ دار ہوگا اور ماخوذ ہوگا۔

اچھی اور بری حرص

اس آیت کریمہ میں آمدہ لفظ حرص قابل توجہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا۔ حرص کا عام فہم معنیٰ طمع اور لالچ ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز ہمارے پاس آجائے اور ہم زیادہ صاحب مال و آسائش بن جائیں، خواہ دوسرے حقدار اس سے محروم ہی رہ جائیں۔ اِن معانی میں بخل

کی طرح حرص بھی نہایت ہی قبیح چیز ہے، تاہم اس مقام پر حرص کا لفظ ان معانی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے مراد خواہش اور تمنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی چیز کی خواہش معیوب نہیں اور اگر یہ نیکی کے کام کے لیے ہو تو اچھی چیز ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مسجد نبوی میں نماز با جماعت ادا ہو رہی تھی۔ جب حضور علیہ السلام رکوع میں تھے تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور وہ جماعت میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع میں چلا گیا اور پھر اسی حالت میں گھسٹتا ہوا جماعت کے ساتھ مل گیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا رکوع جماعت سے نہ رہ جائے۔ جب نماز ختم ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اس شخص سے فرمایا زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ اللہ تیری اس حرص کو زیادہ کرے، مگر دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا، پہلے صف میں شریک ہو جاؤ، پھر تکبیر کہو اور پھر رکوع میں جاؤ۔ جماعت کے ساتھ جتنا حصہ مل جائے شامل ہو جاؤ اور باقی نماز بعد میں ادا کر لو۔ شریعت نے دوڑ کر نماز میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی طبعی چال سے چل کر آؤ، اور جتنا حصہ ملے حاصل کر لو۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ لوگوں کی ہدایت کے لیے کتنی بھی تمنا کریں، مگر اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے والوں کو ہدایت سے نہیں نوازتا۔

بعث بعد الموت کا انکار

آگے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے تعصب کی ایک مثال بھی بیان فرمائی ہے۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ یہ اللہ کے نام کی سخت قسمیں اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ کہ جو مر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ کہتے ہیں یہ مسلمانوں کے ڈھکوسلے ہیں کہ مرنے کے بعد لوگ دوبارہ زندہ ہوں گے اور حساب کتاب ہوگا، یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کی شان نزول میں امام ابن جریرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ایک مسلمان نے کسی مشرک سے قرض لینا تھا، وہ اس کے ہاں

پہنچا تو باتوں باتوں میں قیامت کا ذکر بھی آگیا، اس پر مشرک قسمیں اٹھا کر کہنے لگا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان مر کر مٹی ہو جائے اور پھر دوبارہ زندہ ہو جائے، یہ ناممکن ہے اور مسلمانوں کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی تردید میں فرمایا بَلٰی کیوں نہیں۔ یہ حرفِ ایجاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ ضرور مرنے کے بعد اٹھائے گا وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وعدہ ہے اسکا سچا مگر بات یہ ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ کہ اکثر لوگ بے علم اور بے سمجھ ہیں جسکی وجہ سے بعث بعد الموت کا انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ عقل بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جب تک انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ ہو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ دنیا کی ہر حکومت مجرموں کو سزا دیتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو ملک میں اندھیر نگری مچ جائے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہو جائے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں بعض لوگ جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود کسی نہ کسی طرح سزا سے بچ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تو کسی انفرادی ملک یا حکومت کی بات ہو سکتی ہے۔ مگر پوری کائنات پر تمام عارضی حکومتوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ایک حکومت بھی ہے۔ دنیا کی کسی حکومت کا مجرم لامحالہ اللہ تعالیٰ کی حکومت کا مجرم ہوتا ہے۔ کوئی شخص اس دنیا کی کسی حکومت یا کسی عدالت کی آنکھوں میں دھول ڈال کر یا سفارش اور رشوت کی بنا پر سزا سے بچ سکتا ہے مگر اللہ احکم الحاکمین کی عدالت کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ایک دن آنے والا ہے جس دن اس کا بھی میزانِ عدل قائم ہوگا، اور اس عدالت میں کسی جرم کی پردہ پوشی نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے تو اللہ نے اس دن کا نام یوم الدین رکھا ہے اس دن ہر ایک کو اسکے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا۔ نہ کوئی نیکی کرنے والا محروم رہے گا اور نہ کوئی مجرم بچ سکے گا اس دن ہر ایک کی پوری پوری دادرسی ہوگی اور ہر ایک کو اسکا حق دلایا جائیگا، لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک

ایسا دن مقرر کرے جب سب کو اپنے دربار میں حاضر کر کے ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے۔ تو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بعث بعد الموت ضروری ہے، جس کا اللہ نے وعدہ بھی کر رکھا ہے۔

قیامت کی ضرورت

فرمایا وقوع قیامت اور بعث بعد الموت اس لیے بھی ضروری ہے لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے وہ بات ظاہر کر دے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ وہ لوگ اسی بات میں اختلاف کرتے تھے اور قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ کوئی قیامت نہیں آئے گی، اللہ کا نبی سچ نہیں کہتا اور ہمارے معبود بالکل برحق ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ ایسے متنازعہ مسائل کو حل کرنے اور ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے کے لیے وقوع قیامت ضروری ہے۔ پھر فرمایا قیامت کا آنا اس لیے بھی ضروری ہے وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا تاکہ کافر جان لیں، ان پر واضح ہو جائے أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ کہ وہ جھوٹے تھے۔ قیامت برپا کر کے اللہ تعالیٰ عملی طور پر ثابت کر دیگا کہ کافر جھوٹے ہیں جو قیامت کا انکار کر رہے ہیں۔ اس مضمون کو سورۃ التغابن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ کافر لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو فرمایا "قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي" آپ کہہ دیں میرے رب کی قسم "لَتُبْعَثُنَّ" تم ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے "ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ" پھر تمہیں بتلا دیا جائے گا جو عمل تم کرتے تھے۔ اُس وقت ان کا جھوٹ ظاہر ہو جائیگا ورنہ عقل کی بات یہ ہے کہ انصاف کا ایک دن ہونا چاہیئے جب ہر ایک کو پورا پورا انصاف ملے۔

بخاری شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ انسان مجھے جھٹلاتا ہے اور گالی دیتا ہے حالانکہ اس کے لیے یہ بات ہرگز

مناسب نہیں۔ فرمایا خدا تعالیٰ کو گالی دینا یوں ہے کہ وہ کہتا ہے "قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا" (الکہف) یعنی اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، حالانکہ خدا تعالیٰ کا نہ کوئی حقیقی بیٹا ہے اور نہ مجازی، وہ تو کہتا ہے اَنَا الْاَحَدُ الصَّمَدُ کہ میں یگانہ اور بے نیاز ہوں، میری نہ بیوی ہے اور نہ بچے۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے، یہ بھی دوبارہ اٹھائے جانے کو تسلیم کرتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان کو پہلی دفعہ پیدا کرنا تو آسان ہو مگر دوسری دفعہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے۔ عقلی انداز سے دیکھا جائے تو پہلی پیدائش زیادہ مشکل تھی جب کہ نہ کوئی مادہ تھا، نہ نمونہ اور نہ آلہ۔ جب ایک دفعہ تخلیق معرض وجود میں آگئی تو اب اس کا اعادہ کرنا کیسے مشکل ہو سکتا ہے۔ اور دوسری بات اللہ تعالیٰ کو جھٹلانا اس طرح ہے کہ وہ کہتا ہے، اللہ دوبارہ نہیں اٹھائیگا حالانکہ میرا یہ پکا وعدہ ہے کہ سب کو دوبارہ اٹھاؤں گا اور پھر حساب کتاب کی منزل بھی آئے گی۔

خدا کا اٹل فیصلہ

فرمایا اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ بیشک کسی چیز کے متعلق ہماری بات بالکل فیصلہ کن اور اٹل ہوتی ہے۔ اِذَآ اَرَدْنٰہُ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو وہاں نہ کسی وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مادے اور آلے کی، بلکہ جب بھی ہماری مشیت ہوتی ہے اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ تو ہم اس چیز کو کہتے ہیں، ہو جا فَیَکُوْنُ پس وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ ہم کسی بھی کام کو کر گزرنے پر قادر ہیں اور ایسا کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جس طرح ہم ہر چیز کو کر گزرنے پر قادر ہیں، اسی طرح قیامت برپا کرنے اور لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہیں، ہمیں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے قیامت بھی برپا کرے گا اور لوگوں کو زندہ کر کے اپنے سامنے کھڑا بھی

کرے گا۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان پر ہر چیز ظاہر کرے گا، اور پھر ان کا جھوٹ کھل جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا
لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ
اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا
وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔـلُوْٓا اَهْلَ
الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾
بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ:- اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اللہ کے واسطے بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، البتہ ہم ضرور اُن کو ٹھکانا دیں گے دنیا میں اچھا۔ اور البتہ آخرت کا اجر بہت بڑا ہے اگر یہ لوگ جانیں (۴۱) وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں (۴۲) اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے مگر مردوں کو، ہم وحی بھیجتے تھے اُن کی طرف۔ پس پوچھو یاد رکھنے والے لوگوں سے اگر تم نہیں جانتے (۴۳) (ہم نے بھیجا اُن کو) کھلی نشانیوں اور صحیفوں کے ساتھ۔ اور اتارا آپ کی طرف ذکر تاکہ آپ بیان کر دیں لوگوں کے لیے وہ

چیز جو اتاری گئی ہے ان کی طرف ، اور تاکہ وہ لوگ غور وفکر کریں (۴۴)

ربطِ آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس باطل عقیدے کا رد فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے یعنی وہ ہمیں زبردستی شرک سے روک دیتا، اور اگر نہیں روکا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی پسند کا کام کر رہے ہیں۔ پھر اللہ نے ہر امت میں رسول بھیجنے کا ذکر کیا جنہوں نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور طاغوت کی پرستش سے اجتناب کریں۔ اس کے بعد اللہ نے نافرمانوں کے انجام کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کتنا عبرتناک انجام ہوا۔

پھر گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے لیے تسلی کا مضمون بیان فرمایا اور آپ کو خطاب کیا کہ آپ کی شدید خواہش کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ ضدی لوگ ہیں جو قسمیں اٹھا کر کہتے ہیں کہ نہ قیامت آئے گی اور نہ مُردے دوبارہ زندہ ہوں گے، حالانکہ وقوعِ قیامت اور جزائے عمل برحق ہے۔ قیامت والے دن کافر جان لیں گے کہ وہ اپنے دعوے میں جھوٹے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر بھی کیا کہ وہ جب چاہے کسی چیز کو ہو جانے کا حکم دے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کا ذکر کر کے اُن کے اجرِ عظیم کی بات کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جن اہلِ ایمان نے ابتدائی دور میں تکالیف اٹھائی تھیں اور پھر ہجرت کی تھی، اللہ نے اُن کی تعریف فرمائی ہے۔ دنیا میں اُن کو اچھا ٹھکانا اور آخرت میں بہتر اجر و ثواب عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

مہاجرین کی حوصلہ افزائی

ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی خوشنودی کے لیے ہجرت کی، یعنی انہوں نے اپنا گھر بار اور

ہر چیز کسی مالی مفاد یا دیگر مقاصد کے حصول کے لیے نہیں بلکہ دین پر عملدرآمد کے راستے میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے چھوڑی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ہجرت کرنا مسلمانوں پر فرض تھا۔ اس دور میں مکہ کے اندر اہل ایمان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ اپنے دینی شعائر پر کھلے عام عمل درآمد کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، لہٰذا ان حالات میں ان کا مکے کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ مکی زندگی میں مسلمانوں نے دو مرتبہ ہجرت کی۔ ایک حبشہ کی طرف اور دوسری مدینہ طیبہ کی طرف۔ حبشہ کی طرف یکے بعد دیگرے دو جماعتیں گئیں، ایک چھوٹی تھی اور ایک بڑی۔ پھر جب خود حضور علیہ السلام مدینہ شریف پہنچ گئے تو حبشہ جانے والے لوگ بھی مدینہ آ گئے۔ بعض لوگ کم و بیش چودہ سال تک حبشہ میں مقیم رہے اور جب مدینہ میں مسلمانوں کے پاؤں جم گئے، بدر، احد اور احزاب کے واقعات ہو چکے بلکہ بعض تو خیبر کی لڑائی کے موقع پر حبشہ سے مدینہ طیبہ آئے۔

ہجرت کے وسیع معانی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ دیکھو! ظاہری ہجرت تو یہ ہے کہ انسان اپنا وطن، گھر بار، کاروبار چھوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے مگر ہجرت کا ایک باطنی پہلو بھی ہے۔ فرمایا[1] اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایمان کی تعریف بھی فرمائی۔ فرمایا ایمان کا ظاہری معنی تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی وحدانیت، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن اور تقدیر کی تصدیق کرے۔ اور حقیقی مومن وہ ہے مَنْ اَمِنَ بَوَائِقَهٗ جَارُهٗ جو اپنے پڑوسی کو امن و امان میں رکھتا ہے

[1] بخاری ص ۱۶ ج ۱

اور اُسے تکلیف نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح جہاد کا باطنی معنیٰ یہ بیان کیا[1] وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ یعنی مجاہد حقیقت میں وہ ہے جس نے اپنے نفس سے جہاد کیا۔ وہ اپنے نفس پر اس طرح کنٹرول کرتا ہے کہ اُس پر شیطان کے وساوس اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ بہرحال حضور نے مہاجر کی ایک تعریف یہ بھی بیان کی کہ جو شخص اللہ کی ممنوعہ چیزوں کے قریب نہیں جاتا، وہی حقیقی مہاجر ہے۔

ہجرت کی اقسام اور مسائل

مفسرین کرام نے ہجرت کی بہت سی اقسام بتائی ہیں۔ پہلی قسم اپنے ایمان اور جان و مال کی حفاظت سے متعلق ہے اور اس کی آگے چھ قسمیں ہیں، مثلاً انسان کسی ایسے دار الکفر میں رہتا ہے۔ جہاں دینی فرائض ادا کرنے پر پابندی ہو تو ایسی صورت میں ہجرت کرنا فرض ہو جاتا ہے تاکہ وہ دار الاسلام میں پہنچ کر اپنے دینی فرائض کی کماحقہ ادائیگی کر سکے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ دار البدعت سے ہجرت کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی جگہ مقیم ہے جہاں اہل بدعت کا غلبہ ہے یا صحابہ کو سب و شتم کیا جاتا ہے تو ایک سچے مومن کے لیے وہاں رہنا درست نہیں بلکہ وہاں سے نکلنا فرض ہو جاتا ہے

طلب رزق حلال بھی فرائض میں داخل ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی مقام پر رزق حلال میسر آنے کی کوئی صورت نہیں تو اُس کا بھی فرض ہے کہ وہ اس جگہ سے ہجرت کر کے دوسری جگہ چلا جائے۔ جہاں سے حلال رزق میسر آ سکتا ہو۔

بعض اوقات جسمانی اذیت سے بچاؤ کے لیے بھی ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں موجود ہے کفار ان کے جانی دشمن بن چکے تھے، لہٰذا انہیں کہنا پڑا "اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ" (العنکبوت) کہ میں تو اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ اسی طرح جب موسیٰ علیہ السلام کو علم ہوا کہ فرعونی انہیں قتل کرنا چاہتے ہیں "فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ" (القصص) تو آپ

---

[1] ترمذی ص۲۵۲

وحشت کی حالت میں وہاں سے نکل گئے۔

بعض اوقات آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے امراض لاحق ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو ایسی صورت میں بھی ترکِ وطن جائز ہوتا ہے۔ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو بعض لوگوں کو وہاں کی آب وہوا موافق نہ آئی تو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہونے لگے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو فلاں دیہات میں چلے جانا چاہیئے، جہاں کی آب وہوا ان کے لیے نسبتاً بہتر ہے اور وہاں انہیں اونٹوں کا دودھ بھی میسّر ہوگا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر کسی مقام پر چوری، ڈاکے وغیرہ کا مستقل خطرہ ہو اور حفاظتِ مال کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو۔ تو ایسی جگہ سے دارالامن کی طرف ہجرت کر جانا جائز ہے۔

یہ تو حفاظتی نقطہ نظر سے ہجرت کی اقسام تھیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بعض اوقات طلب اور جستجو کے لیے بھی ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے "فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ" (النحل) زمین میں چل پھر کر آثارِ قدیمہ کو دیکھو اور غور کرو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ تو اس حکم کی تعمیل میں عبرت حاصل کرنے کے لیے نکلنا بھی ہجرت ہی کی ایک قسم ہے۔ اسی طرح انسان حج اور عمرے کے لیے نکلتا ہے، یہ فرض اور واجب میں داخل ہے۔ جہاد کے لیے ترکِ وطن فرض ہے۔ بعض اوقات یہ واجب ہوتا ہے اور بعض اوقات مستحب۔ تبلیغ بھی جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے۔ یہ سفر بھی حالات کے مطابق کبھی فرضِ عین، کبھی فرضِ کفایہ، کبھی واجب اور کبھی مستحب ہوتا ہے۔ اسی طرح تجارت کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بھی ہجرت میں داخل ہے۔ سورۃ بقرہ میں "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ" تم پر کوئی

گناہ نہیں کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔ بعض اوقات حصولِ علم کے لیے ہجرت کرنا فرضِ عین ہوتا ہے اور بعض اوقات فرضِ کفایہ۔ علاوہ ازیں متبرک مقامات منجملہ بیت اللہ شریف، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی کی زیارت کے لیے جانا کہ وہاں پر عبادت کرنے کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، یہ بھی ہجرت میں داخل ہے پھر سرحدوں کی حفاظت یعنی رباط کے لیے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ یہ بھی بعض اوقات فرضِ عین اور بعض اوقات فرضِ کفایہ ہوتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ دوست احباب یا عزیز و اقارب کی ملاقات کے لیے وطن چھوڑ کر جانا بھی ہجرت ہی کی ایک قسم ہے۔

مہاجرین کے لیے اجر

فرمایا جنہوں نے اللہ کی خاطر ہجرت کی مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا بعد اس کے ان پر ظلم کیا گیا۔ تو ایسے لوگوں کا صلہ یہ ہوگا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کہ انہیں ہم دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے۔ چنانچہ جب مسلمان بے حد تکالیف برداشت کرنے کے بعد مدینہ طیبہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت اچھا ٹھکانا عطا کیا۔ اور قلیل عرصہ میں انہیں ہر چیز عطا کر دی، حکومت بھی دی، مال و دولت سے بھی نوازا، مکانات اور کاروبار عطا کیے، عزت بخشی، حتیٰ کہ مدینہ منورہ مرکزِ اسلام بن گیا اور اس طرح مہاجرین کے نقصان اور ان کی جسمانی اور ذہنی تکالیف کا ازالہ ہوگیا۔

فرمایا، یہ تو دنیا میں عطا کیا، وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ اور آخرت کا اجر و ثواب تو بہت بڑا ہے جو آگے چل کر حاصل ہوگا اور جس کے مقابلے میں پوری دنیا کا ساز و سامان بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بہرحال فرمایا کہ ہجرت کی تکالیف برداشت کرنے والوں کو اللہ اچھا بدلہ عطا فرمائیگا مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو اس کی تکالیف و مصائب کا ازالہ اس دنیا میں ضرور ہی کر دیا جائے۔ اس بات میں شک نہیں کہ ہجرت کے بعد

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مجموعی حیثیت سے بہت کچھ دیا۔ مگر ایسے مسلمان بھی تھے جو ہجرت کے بعد بے سروسامانی کی حالت میں ہی اس دُنیا سے جلدی رخصت ہو گئے اور انہوں نے خوشحالی کا دور نہ دیکھا حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو لوگ لمبی مدت تک زندہ رہے انہوں نے بڑے فائدے اٹھائے مگر بعض ایسے بھی تھے جو اسلام کے غلبے کا پورا پھل نہ کھا سکے اور جلدی ہی اللہ کے پیارے ہو گئے۔ بعض ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کا پھل دنیا میں بھی پک چکا تھا اور انہوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اسی لیے مہاجرین کے متعلق حضور علیہ السلام کا حکم تھا کہ جب وہ مکہ مکرمہ آئیں تو وہاں تین دن سے زیادہ قیام نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی موت کا وقت وہیں آ جائے اور ان کی ہجرت نامکمل رہ جائے۔ ایک صحابی قیامِ مکہ کے دوران اونٹنی سے گر کر ہلاک ہو گیا، تو حضور علیہ السلام نے بڑے افسوس کا اظہار کیا، اور دُعا کی کہ اے اللہ! میرے جن صحابہ نے ہجرت کی ہے، ان کی ہجرت کو نافذ فرما یعنی ان کی ہجرت باطل نہ ہو جائے۔ مکے کی سرزمین میں فوت ہو کر دفن ہونا اگرچہ نیت کے اعتبار سے نہ بھی ہو، مگر پھر بھی اُن کے اجر و ثواب میں کمی کا امکان تو ہے۔ حضور علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ اِنَّ شَانَ الْهِجْرَةِ كَبِيْرٌ ہجرت کا معاملہ بہت بڑا ہے۔ جس کسی نے جتنی زیادہ تکالیف برداشت کیں، اس کے لیے اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب ہے۔ آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ہجرت کے بعد کسی مہاجر کی موت مدینے کی بجائے مکہ میں ہو۔ فرمایا آخرت کا اجر تو بہت زیادہ ہے لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اگر لوگوں کو اس کا علم ہو۔

فرمایا، یہ اجر مہاجرین کے لیے ہے اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا

جنہوں نے صبر کا دامن تھامے رکھا۔ ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور زبان پر حرفِ شکایت نہ لائے۔ حضرت صہیب رض ہجرت کر کے مدینہ جانا چاہتے تھے مگر کافر اُن کے راستہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور انہیں مکہ سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ پھر آپ نے کافروں سے سودے بازی کی اور اپنا سارے کا سارا اثاثہ ان کے سپرد کر کے بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت عمر رض نے دیکھا تو فرمایا کہ صہیب رض نے سب کچھ لٹا کر بھی بڑا نفع کمایا ہے۔ حضرت عمر رض اور حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ صہیب رض وہ شخص ہے لَوْ لَمْ یَخَفِ اللّٰہَ لَمْ یَعْصِہٖ یعنی اگر اسے اللہ کا خوف نہ بھی ہوتا، تب بھی وہ نافرمانی نہ کرتا، حضرت صہیب رض اتنے پاکیزہ دل انسان تھے۔ بہرحال مہاجرین نے کفار کے ہاتھوں بڑے دکھ سہے بعض کے بچے رکھ لیے گئے اور بعض کی بیویوں کو روک لیا گیا، مگر اسلام کے ان شیدائیوں نے ہر قسم کی مالی، جسمانی اور ذہنی تکالیف برداشت کیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ہجرت کی اور پھر ان تکالیف پر صبر کیا۔ فرمایا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ انہوں نے بھروسا بھی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی کیا۔ اگر اللہ پر بھروسا نہ ہوتا تو اتنی تکالیف کیسے برداشت کر سکتے۔ انہوں نے صبر کیا اور اللہ پر بھروسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی قدردانی کی اور انعامات سے نوازا۔

رسول مرد ہوتے ہیں

گذشتہ رکوع میں گزر چکا ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا یعنی ہم نے ہر امت میں ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ وہ لوگوں کو ہماری توحید کی دعوت دے۔ اب آج کی اگلی آیت میں رسول کی ایک خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ رسول صرف مرد ہوتے ہیں۔ اور اللہ نے کسی عورت کو کبھی رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَآ

اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجا مگر مردوں کو یعنی منصب رسالت کے لیے اللہ نے ہمیشہ مردوں ہی کا انتخاب کیا ہے۔ اگرچہ بعض عورتوں کو بھی اللہ نے بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے اور اُن کا ذکر قرآن پاک میں بھی کیا ہے جیسے حضرت مریم علیہا السلام اور فرعون کی بیوی مگر اللہ نے منصب رسالت ونبوت کسی عورت کو عطا نہیں فرمایا۔ تو مردوں کو رسول بنایا اور ساتھ نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ان کی طرف وحی بھی کی۔ اور وحی کا تذکرہ بھی گذشتہ رکوع میں ہو چکا ہے کہ ہر نبی اور رسول نے اپنی امت کو یہی دعوت دی "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" لوگو! عبادت اللہ کی کرو اور طاغوت سے بچ جاؤ۔ نبی ہمیشہ توحید کی دعوت اور شرک سے منع کرتے رہے ہیں اور اسی بات کا تذکرہ اللہ نے یہاں اجمالاً کیا ہے آیت کے اگلے حصے میں اللہ نے فرمایا کہ بعثت رسل میں اگر تمہیں کچھ شک وتردد ہے یا ان کی تعلیمات کے متعلق تسلی کرنا چاہو۔ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ تو پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اگر تم خود نہیں جانتے۔ مطلب یہ اگر انبیاء کی تاریخ تم نہیں جانتے تو ان صاحب علم لوگوں سے دریافت کر لو جن کو انبیاء کے واقعات یاد ہیں۔ اہل کتاب اور بعض دوسرے لوگوں میں بھی بعض اہل علم ہمیشہ رہے ہیں جو اخبارِ ماضیہ کا علم رکھتے تھے وہ سابقہ امتوں اور ان کے انبیاء کے حالات و واقعات سے واقف ہوتے تھے، لہذا فرمایا کہ ہماری بات کی تصدیق تم ایسے لوگوں سے کر سکتے ہو، جو تمہیں بتائیں گے کہ واقعی اللہ نے ہر امت، گروہ اور قوم میں انبیاء مبعوث فرمائے جنہوں نے اپنی اپنی اقوام کو اللہ کی طرف دعوت دی اور کفر و شرک سے منع کیا۔

تقلید کی ضرورت

اس حصۂ آیت سے مفسرین نے یہ بات بھی اخذ کی ہے کہ اس آخری امت میں مسائلِ دینیہ سے ناواقف لوگوں کو اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ان سے مسئلہ پوچھ کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ تقلید اسی بات کا نام ہے کہ نہ جاننے والے جاننے والوں سے دریافت کر کے عمل پیرا ہوں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ اہلِ علم پر مکمل اعتماد کر کے ان کی بات کو بلا دلیل تسلیم کر لیا جائے۔ جو چیزیں قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور ہیں ان پر تو من و عن عمل کرنا ہی ضروری ہے اور وہاں کسی تقلید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ جن مسائل کے متعلق قرآن و حدیث میں صراحت موجود نہ ہو، ان کو معلوم کرنا ہر آدمی کا کام نہیں بلکہ وہ تو مجتہد حضرات ہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ نے غیر معمولی استعداد اور صلاحیت عطا فرمائی ہے اسی طرح بعض چیزوں میں تعارض پایا جاتا ہے اور اس کو دور کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے بلکہ یہ بھی مجتہد ہی کر سکتا ہے۔ غرضیکہ ایسے مسائل میں کسی مجتہد کی طرف رجوع کرنا ہی تقلید کہلاتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ عوام کے لیے اس قسم کی تقلید وجوب کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ وہ خود ایسے مسائل کے حل کی استعداد نہیں رکھتے، اور بعض اوقات بڑے بڑے صاحب علم لوگ بھی بعض مسائل کے حل کرنے میں عاجز آجاتے ہیں۔ وہ کسی تعارض کو دور نہیں کر سکتے یا کسی مسئلے میں استنباط سے عاجز آجاتے ہیں۔ مثلاً امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام شاہ ولی اللہ وغیرہم قرآن و سنت کو بخوبی جاننے کے باوجود فروعات میں آئمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کے مقلد تھے۔ کہتے تھے کہ ہم بھی قرآن و سنت کو جانتے ہیں مگر جو کچھ ائمہ سلف جانتے تھے، ہماری رسائی وہاں تک نہیں ہے۔ اور جس طرح وہ اجتہاد کر سکتے تھے، ہماری وہ طاقت نہیں۔ چنانچہ یہ بزرگ بھی ائمہ سلف پر اعتماد کرتے تھے۔ امام شاہ ولی اللہؒ

حنفی مسلک رکھتے تھے۔ جب کہ امام رازیؒ اور امام غزالیؒ شافعی تھے اسی طرح امام ابن تیمیہؒ حافظ الحدیث ہونے کے باوجود امام احمد کے مقلد تھے۔ غرضیکہ یہ تقلید بری نہیں ہے بلکہ جس اندھی تقلید کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے، وہ مشرکانہ تقلید ہے جو اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے خلاف ہو اور مقلدین محض آباؤ اجداد کی رسم کے طور پر اسے سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور اس کے مقابلے میں صریح حکم بھی ٹھکرا دیں۔ ایسی تقلید حرام ہے۔

فقہی اختلاف کی حیثیت

اس وقت جو فقہی اختلاف حنفی، مالکی، شافعی، ظاہری وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ فرقہ واریت کی زد میں آتے ہیں۔ یہ تو محض فہم و دلیل کی بات ہوتی ہے جسے مناظر قسم کے لوگ خواہ مخواہ طول دے کر ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں۔ فروعی اختلاف کی مثال حرمتِ سود کے متعلق دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سود کی حرمت قرآنِ پاک سے ثابت ہے مگر حضور علیہ السلام نے اس ضمن میں صرف چھ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے، کہ ان چھ چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز سود میں آتی ہے یا نہیں۔ پھر آئمہ کرام اس بات پر بھی بحث کرتے ہیں کہ سود کی حرمت مذکورہ چھ چیزوں کی ذات تک محدود ہے یا یہ حرمت ان میں موجود کسی علت کی وجہ سے پائی جاتی ہے اب اگر وجہ حرمت علت ہے تو اس کی تلاش کی جائیگی۔ اب علت کی جستجو میں چاروں آئمہ کا آپس میں اختلاف ہے، کسی نے کسی چیز کو علت قرار دیا ہے اور کسی نے کسی چیز کو، مگر سود کی حرمت کے متعلق سارے متفق ہیں اور اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ سود کیوں حرام ہے اور ایسا اختلاف ہرگز معیوب نہیں۔ اس معاملہ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا بیج نہیں بونا چاہیئے۔ کوئی

شخص اپنے مسلک کو بلاشبہ ترجیح دے مگر دوسرے کو غلط نہ کہے اور نہ ہمارے دور کی طرح پہلے مناظرہ بازی اور پھر فتویٰ بازی کرے۔ جب کسی معاملہ میں اجتہاد کیا جائے گا تو وہاں اختلاف کا پیدا ہونا فطری بات ہے، تاہم عوام کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک امام کا اتباع کر لیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بیماری کی حالت میں کوئی مریض شہر کے مختلف ڈاکٹروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتا ہے کہ وہ اس کا بہتر طور پر علاج کر سکتا ہے۔ اگرچہ شفا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے مگر اسباب کی دنیا میں طبیب کی طرف رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔ اب اگر کوئی مریض ایک ڈاکٹر پر قناعت کرنے کی بجائے وقفہ وقفہ سے مختلف ڈاکٹروں سے علاج کرائے گا۔ تو اس سے مرض پر منفی اثرات پڑنے کا بھی خطرہ ہو گا، لہٰذا مریض کو کسی ایک ڈاکٹر پر ہی اکتفا کرنا بہتر ہو گا۔ بالکل یہی حال تقلید کا ہے کہ کسی ایک امام کے انتخاب پر قانع ہو جائے اور پھر فروعات میں اس کے فتویٰ کے مطابق عمل کرے۔

فرمایا، ہم نے آپ سے پہلے بھی مردوں کو رسول بنا کر بھیجا بِالْبَیِّنٰتِ کھلی نشانیوں کے ساتھ یعنی ہم نے اُن رسولوں کو احکام اور معجزات عطا فرمائے وَالزُّبُرِ اور صحیفے یعنی چھوٹی کتابیں بھی عطا فرمائیں۔ صحیفہ چھوٹی کتاب کو کہا جاتا ہے تاہم اللہ نے چار بڑی کتابیں بھی اپنے منتخب رسولوں کو عطا کیں اور پھر سب سے آخر میں وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ اے نبی آخر الزمان! آپ کی طرف ذکر نازل فرمایا۔ ذکر کا معنی نصیحت ہے اور یہ قرآنِ پاک کا ایک نام بھی ہے۔ ظاہر ہے قرآن پاک سے بڑھ کر کون سی نصیحت ہو سکتی ہے تو فرمایا ہم نے آپ کی طرف قرآن پاک کو نازل فرمایا لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ چیز بیان کر دیں جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ نبی کی زبان سے قرآنِ پاک کی

تبیین و تشریح بھی ضروری ہے۔

اس امتِ آخر الزمان کے لیے قرآنِ کریم کو اساسی قانون کی حیثیت حاصل ہے جب کہ سنت اس کی تبیین ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کی زبان اور اس کے عمل سے جس چیز کو ظاہر کیا ہے، وہ سنت ہے بعض گمراہ فرقے نبی کو محض ڈاکیے سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے کہ نبی اللہ کا پیغام پہنچا کر پھر لاتعلق ہو جاتا ہے۔ نہیں بلکہ قرآن کی تشریح و تبیین بھی نبی کا کام ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ لکھتے ہیں "پس صحیح حدیث شرح ہے قرآن کی" امام شافعیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ صحیح حدیث قرآن کی شرح ہیں، البتہ غلط اور موضوع احادیث ناقابلِ عمل ہیں جنہیں محدثین عظام نے چھانٹ کر علیحدہ کر دیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میرا مسلک یہ ہے کہ قرآن پاک کی تشریح کے لیے میں سب سے پہلے قرآن کو دیکھتا ہوں کیونکہ بعض چیزوں کی تشریح خود قرآن پاک کرتا ہے۔ اگر ایک مقام پر کسی بات میں اجمال ہے تو دوسرے مقام پر تفصیل مل جاتی ہے۔ اگر کوئی چیز قرآن پاک سے نہ ملے تو پھر میں سنتِ ثابتہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، وہاں سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہاں بھی کوئی چیز ثابت نہ ہو تو پھر صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھتا ہوں کیونکہ قرآن کے اولین متعلمین اور عاملین علیہ یہی لوگ ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی معاملہ میں صحابہ کرامؓ کا اتفاق ہو، تو میں اس کو اختیار کر لیتا ہوں اور اگر ان میں اختلاف ہو تو پھر میں از خود ترجیح دیتا ہوں، اور زیادہ راجح چیز کو اپنا لیتا ہوں۔ یہ تین چیزیں مسلم الاصول ہیں۔ صحابہؓ کے بعد ہم کسی کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ خود اجتہاد کرتے ہیں کہ اسی میں خیریت ہے۔

امام ابن تیمیہؒ بھی اپنے فتویٰ میں لکھتے ہیں فَالسُّنَّةُ تُفَسِّرُ الْقُرْآنَ وَتُبَيِّنُهُ یعنی سنت ہی قرآن کی تفسیر کرتی ہے اور اس کو

بیان کرتی ہے۔ جو لوگ سنت کا انکار کرتے ہیں، وہ قرآن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ ان کا انکارِ سنت محض اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ قرآنِ پاک کی من مانی تفسیر کر سکیں۔ چنانچہ پرویز کہتا ہے کہ جو نماز ہم ادا کرتے ہیں، یہ درست نہیں ہے جب تک اسلامی حکومت قائم نہ ہو۔ اس کے مطابق جب پرویزیوں کی حکومت قائم ہوگی اور پھر وہ نماز کا طریقہ وضع کریں گے تو اس کے مطابق نماز درست ہوگی۔ ہماری موجودہ نماز بیکار محض ہے (نعوذ باللہ) حالانکہ تمام سلف صالحین آئمہ کرام، بزرگانِ دین، محدثین، مفسرین وغیرہم اسی نماز پر اتفاق کرتے اور پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں۔ نماز اسلام کے فرائض اربعہ میں سے اہم فرض ہے جس کے ارکان میں کسی کو اختلاف نہیں مگر منکرین سنت کے نزدیک یہ نماز ایک رسم سے زیادہ کچھ نہیں۔

فرمایا ہم نے آپ کی طرف قرآن پاک نازل فرما کر آپ کو تشریح کا حکم بھی دے دیا ہے۔ اب یہ لوگوں کا فرض ہے وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ کہ اس کلامِ الٰہی میں غور و فکر کریں کہ جن احکامِ الٰہی کی اللہ کے نبی نے تفصیل بیان کر دی ہے، اس پر کس طریقے سے عمل کرنا ہے قرآن میں غور و فکر کی دعوت خود قرآنِ پاک نے متعدد مقامات پر دی ہے، اب یہ اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پر کس حد تک عمل درآمد کرتے ہیں۔

درس یازدہم ۱۱ آیت ۴۵ تا ۵۰

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ أَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ
بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ
لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ
فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى
تَخَوُّفٍ ط فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا
ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ
وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ
لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ
وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٥٠﴾ السجدة ع ۱۰

ترجمہ:- کیا نڈر ہو گئے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کمائی ہیں برائیاں
کہ اللہ تعالیٰ دھنسا دے ان کو زمین میں۔ یا آئے ان کے پاس
عذاب جہاں سے ان کو پتہ بھی نہ ہو (۴۵) یا پکڑ لے ان کو
چلتے پھرتے ہیں۔ پس نہیں وہ عاجز کرنے والے (۴٦) یا پکڑ لے
ان کو خوف کے بعد پس بیشک تمہارا پروردگار البتہ بہت
نرمی کرنے والا اور مہربان ہے (۴۷) کیا ان لوگوں نے نہیں

دیکھا کہ اللہ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں اُن کا سایہ ڈھلتا ہے (مائل ہوتا ہے) دائیں طرف اور بائیں طرف سجدہ کرتے ہوئے اللہ کے سامنے، اور وہ عاجز ہوتے ہیں (۴۸) اور اللہ ہی کے سامنے سجدہ کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں جاندار اور فرشتے، اور وہ تکبر نہیں کرتے (۴۹) خوف کھاتے ہیں اپنے پروردگار کا اوپر سے، اور کرتے ہیں وہ جو کچھ اِن کو حکم دیا جاتا ہے (۵۰)

ربط آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے شرک کا رد فرمایا اور پھر گذشتہ درس میں اُن مومن مہاجرین کی حوصلہ افزائی فرمائی جن پر بڑے مظالم ڈھائے گئے مگر انہوں نے خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے صبر کے دامن کو نہ چھوڑا۔ اللہ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانا میسر آئے گا اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسالت کے سابقہ بیان کے تسلسل میں فرمایا کہ ہر قوم میں مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اگر منکرین توحید و رسالت کو اس بارے میں کوئی شک و تردد ہے تو وہ "تاریخی واقعات کو یاد رکھنے والوں سے تصدیق کرلیں۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل اللہ نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں یعنی معجزات اور صحیفے دے کر بھیجا، اور پھر آخر میں حضور علیہ السلام پر ذکر یعنی قرآن نازل فرمایا۔ آپ کو اس بات کا پابند کیا کہ آپ اس قرآن پاک کی تشریح وتبیین کا کام بھی انجام دیں۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دیا۔ اور یہی "سنت" ہے۔ پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کو بھی حکم دیا کہ وہ اس قرآن پاک میں غور وفکر کریں تاکہ صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔

منکرین کے لیے سخت وعید

اب آج کے درس کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے منکرین قرآن و ورسالت کو اُن کی ریشہ دوانیوں پر سخت تنبیہ فرمائی ہے اور بعض سزاؤں کا ذکر

کر کے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر مختلف قسم کے عذاب نازل فرمائے۔ ارشاد ہوتا ہے اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ کیا یہ لوگ بے خوف ہو گئے ہیں۔ اَمِنَ کا معنی امن میں ہو جانا، نڈر یا بے خوف ہو جانا ہے۔ فرمایا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ انبیاء کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، اللہ کے پروگرام کو ناکام بنانا چاہتے ہیں، اُس کی توحید کی مخالفت کرتے ہیں، انبیاء کی ہلاکت کے درپے ہیں۔ اور اہلِ ایمان کو اُن کے دین سے روکنا چاہتے ہیں، تو کیا یہ اللہ کے عذاب سے بالکل بے خوف ہو چکے ہیں؟ پھر آگے اللہ تعالیٰ نے عذاب کی وہ مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں یہ لوگ گرفتار ہو سکتے ہیں۔

فرمایا اللہ کے عذاب کی پہلی صورت یہ ہے اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰہُ بِھِمُ الْاَرْضَ کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے۔ اِن لوگوں کو کچھ احساس نہیں کہ خدا کی پیدا کردہ جس زمین پر یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں اللہ چاہے تو اسی زمین میں اُن کو غرق کر دے، اس قسم کی مثال دنیا میں پہلے ہی قائم ہو چکی ہے جب اللہ تعالیٰ نے قارون کو مع اس کے مال و دولت اور خزانوں کے زمین میں دھنسا دیا۔ اس قسم کے واقعات ہر زمانے میں پیش آتے رہے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نہایت غرور و تکبر کی حالت میں پُل پر سے گزر رہا تھا، اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور وہ متکبرانہ چال سے چل رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی حالت میں اُسے زمین کے اندر دھنسا دیا۔ یہ شخص تب سے زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے اور اس کا قدم اس وقت کہیں ٹکے گا جب قیامت برپا ہو جائے گی۔ اللہ نے اس کے تکبر کی اتنی سخت سزا دی۔ ۱۹۴۹ء میں اخبارات میں پڑھا تھا کہ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی ایک بستی میں بچے سکول میں پڑھ رہے تھے کہ اس دوران سارا سکول زمین کے اندر دھنس گیا۔

۱۹۲۳ء میں جاپان میں زبردست زلزلہ آیا تھا، زمین میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اس حادثے میں تین لاکھ افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔ ابھی پندرہ بیس سال کا عرصہ گزرا ساحلی کنارے پر آباد بارہ ہزار کی آبادی بررتہ کا یہ پرفضا شہر پورے کا پورا تباہ ہو گیا تھا۔ ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ کوئی چیز باقی نہ بچی۔

(۲) بیرونی ذرائع سے عذاب

اللہ نے عذاب کی دوسری صورت یہ بیان فرمائی ہے اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ یا اُن پر ایسی جگہ سے عذاب آئے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہو۔ بعض اقوام کو ایسے ذرائع سے بھی سزا ملتی رہی ہے جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں مکے والوں پر میدانِ بدر میں جو آفت آئی، وہ اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ مکے سے سامان ضرب و حرب سے لیس ایک ہزار فوج لے کر نکلے تھے، کھانے پینے اور رنگ و سرور کے تمام سامان موجود تھے، وہ ایک ہی جست میں مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مٹھی بھر بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا۔ ستر مارے گئے جن میں بڑے بڑے ائمہ کفر تھے اور اتنے ہی قیدی بنے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان کے پاس ایسی جگہ سے عذاب آئے جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہو۔

(۳) چلتے پھرتے گرفت

سزا کی تیسری شکل اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے اَوْ یَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ یا ان کو چلتے پھرتے کے وقت ہی پکڑ لے۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، وہ جب چاہے اپنی مخلوق کی گرفت کر لے۔ کوئی آسمانی آفت نازل ہو جائے، حادثہ پیش آ جائے یا کوئی طوفانِ باد و باراں آ جائے اور یہ چشم زدن میں ماخوذ ہو جائیں ایسے لوگوں کو اپنی فکر کرنی چاہیے کہ

خدا تعالیٰ ان کی گرفت اُن کے بستر پر بھی کر سکتا ہے اور چلتے پھرتے، کاروبار کرتے، جشن مناتے یا لہو و لعب میں مصروف ہونے کی صورت میں بھی وہ گرفت کرنے پر قادر ہے، لہٰذا انہیں اللہ کی پکڑ سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ وہ اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں وہ اللہ کی گرفت کو ٹال نہیں سکیں گے۔

۴) عذاب بعد خوف

چوتھی صورت عذاب کی یہ بیان فرمائی أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ یا انہیں خوف دلانے کے بعد پکڑ لے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسری قوم یا فرد کو مبتلائے بلا دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر آخر میں خود خوف زدگان کی باری بھی آجاتی ہے اور وہ بھی عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اکثر مفسرین "تخوف" کا معنی خوف دلانا ہی کرتے ہیں مگر حضرت عمرؓ کو اس لفظ کے صحیح معانی کے تعین میں تردد تھا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا، لوگو! مجھے بتلاؤ کہ تخوف کا کیا معنی ہے۔ بعض نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل ہیں فرمایا کہ اس کا معنی تنقص یعنی کسی چیز کو کم کر دینا یا گھٹا دینا ہے۔ آپ نے فرمایا، کیا تم اس کا ثبوت عربوں کے کسی کلام سے پیش کر سکتے ہو۔ تو اُن میں سے ایک شخص نے کہا، ہاں قبیلہ ہذیل کے عمر رسیدہ شاعر ابو کبیر ہذلی نے یہ شعر کہا ہے۔

تَخَوَّفَ رَحْلُ مِنْهَا تَامِكًا قَرِدًا
كَمَا تَخَوَّفَ عُودَ النَّبْعَةِ السَّفَنُ

کجاوے نے اس اونٹنی کے مضبوط کوہان کو اس طرح گھٹا دیا ہے جس طرح کمان کی لکڑی کو ریتی گھٹا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوران سفر بھوک پیاس کی وجہ سے باربرداری کا جانور کمزور ہو جاتا ہے۔ اونٹ

کی یہ خاصیت ہے کہ وہ دس دس بیس بیس دن تک بھوک پیاس کی شدت برداشت کر سکتا ہے۔ جب اونٹ کی خوردہ غذا ختم ہو جاتی ہے تو اس کے جسم کی چربی پگھل پگھل کر غذا بنتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس کی کوہان کمزور ہو کر کم ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس شعر میں تخوف کو گھٹانے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

زمانہ جاہلیت کے اشعار

اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا عَلَیْکُمْ بِدِیْوَانِکُمْ تم اپنے دیوان کو لازم پکڑو۔ لوگوں نے دریافت کیا، حضرت! ہمارا دیوان کونسا ہے تو آپ نے فرمایا کہ یہ زمانہ جاہلیت کے اشعار ہیں، ان کو سیکھا کرو، اور پڑھا کرو فَاِنَّ فِیْہِ تَفْسِیْرَ کِتَابِکُمْ وَمَعَانِیَ کَلَامِکُمْ کہ اس سے تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ عربی شعرا کا قدیم کلام اب بھی درسوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب تفسیر معارف القرآن لکھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار پڑھنا جائز ہے اگرچہ ان میں بداخلاقی، جنگ و جدال اور فتنہ و فساد کا ذکر ہی کیوں نہ ہو۔ ان کا فائدہ یہ ہے کہ کلام الٰہی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ قرآن پاک اس وقت کی ترقی یافتہ عربی زبان میں نازل ہوا تھا بعض عربی الفاظ کے معانی سمجھنے میں بھی دقت آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی لفظ کا مادہ کیا ہے اور عربی محاورے میں یہ کس طرح استعمال ہوتا ہے اور پھر اس کا معنیٰ کیا بنتا ہے، چنانچہ اس پر علمائے کرام اور مفسرین نے کتابیں لکھی ہیں۔

فرمایا، یاد رکھو اِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ بیشک تمہارا پروردگار بڑا نرم اور مہربان ہے۔ اس کی شفقت کا تقاضا ہے کہ وہ بعض اوقات مجرموں کو مہلت دیتا رہتا ہے اور امہال و تدریج سے کام لیتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ

(البروج) بیشک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے ۔ جب وہ کسی کو پکڑنے پر آتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ۔ یہ اللہ نے مخالفین کو تنبیہ فرمائی ہے کہ انہیں اس بات سے خوف لگنا چاہیئے کہ کسی نہ کسی صورت میں ان پر اللہ تعالےٰ کی گرفت نہ آجائے ۔

سائے کا سجدہ

آگے پھر اللہ نے اپنی وحدانیت اور معبودیت کی طرف توجہ دلائی ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی چیزیں پیدا کی ہیں يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ ان کے سائے ڈھل جاتے ہیں دائیں اور بائیں طرف اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے ۔ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ اور وہ عاجز ہوتے ہیں ۔

ہم روزمرہ زندگی میں پہاڑوں ، درختوں ، ٹیلوں اور عمارات کے سایوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں ۔ دن کے پہلے حصے میں تمام چیزوں کے سائے گھٹتے رہتے ہیں ۔ دوپہر کو ایک خاص نہج پہ پہنچکر رک جاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ بڑھنے لگتے ہیں ۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ دوپہر کے وقت جب سورج سر پر آتا ہے تو ہر چیز کا سایہ ٹھہر جاتا ہے ۔ اور جب دن ڈھلتا ہے تو سایہ جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ جاتا ہے ۔ ان سایوں کی سجدہ ریزی بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی آدمی پہلے قیام کرتا ہے ، پھر رکوع میں جاتا ہے اور پھر سجدہ میں گر پڑتا ہے اسی طرح ہر ایک مادہ چیز پہاڑ ، درخت عمارات وغیرہ اپنے سایوں کے ذریعے سجدہ ریز ہوتے ہیں ۔ اور پھر یہ ہے کہ جغرافیائی لحاظ سے یہ سایہ کسی ملک میں کسی موسم میں دائیں طرف جھکتا ہے اور کہیں بائیں طرف ۔

ہماری آخری شریعت میں اللہ کے سوا کسی کے سامنے سجدہ روا نہیں خواہ وہ سجدۂ عبادت ہو یا سجدہ تعظیمی ۔ عبادت کا سجدہ تو قطعی حرام

اور کفر ہے خواہ وہ کسی کے سامنے بھی کیا جائے۔ البتہ سجدہ تعظیمی جو بادشاہوں یا دیگر بڑے لوگوں کے سامنے کیا جائے، وہ حرام ہے مگر کفر نہیں ہوتا۔

ہر چیز سجدہ ریز ہے

اس کے بعد اختیاری اور غیر اختیاری دونوں قسم کے سجدے کے متعلق فرمایا وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ زمین میں مِنْ دَآبَّةٍ چلنے پھرنے والے جاندار ہیں، اور آسمان پر وَالْمَلٰٓئِكَةُ فرشتے ہیں۔ البتہ انسانوں کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ اپنے اختیار اور رضا و رغبت سے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے جب کہ دوسرا نافرمانوں اور کافروں کا گروہ ہے جو تکبر کرتا ہے اور سجدہ نہیں کرتا۔ باقی تمام چیزیں خدا تعالیٰ کے سامنے منقاد ہیں۔ وہ سب عاجزی کرنے والی ہیں۔ جانور، چرند، پہاڑ وغیرہ سب اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ اور وہ تکبر نہیں کرتے بلکہ عاجزی کرتے ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ مغرور لوگوں کے لیے زمین پر سر رکھنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اور انہیں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ حالانکہ انسان کی بڑائی اپنے پروردگار کے سامنے تواضع، اخبات اور خشوع و خضوع کے اظہار میں ہی ہے۔ ملائکہ کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ کہ فرشتوں کی وجہ سے اَطَّتِ السَّمَآءُ آسمان چرچراتا ہے۔ جس طرح نیا کجاوہ جانور پر رکھا جائے تو وہ چرچراتا ہے، اسی طرح آسمان بھی چرچراتا ہے کیونکہ آسمان پر ایک بالشت بھی جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ ریز نہ ہو یا کسی دوسری عبادت میں مصروف نہ ہو۔ تو فرمایا کہ نہ تو جانور تکبر کرتے ہیں اور نہ ہی فرشتے بلکہ وہ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

فرشتوں کا تعمیلِ حکم

فرشتوں کے متعلق خاص طور پر فرمایا یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ وہ اپنے پروردگار سے خوف کھاتے ہیں، ڈرتے ہیں مِّنْ فَوْقِهِمْ اپنے اوپر سے کہ کہیں خدا تعالیٰ کی گرفت نہ آجائے وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ اور کرتے ہیں جو کچھ انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ فرشتے اللہ کے حکم سے سرِ مو سرتابی نہیں کرتے۔ اسی طرح جانور اور دوسری چیزیں بھی اپنے طبعی فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ صرف انسان اور جنات ہیں جو مکلف مخلوق ہیں، انہی میں سے بعض لوگ تکبر کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل سے گریز کرتے ہیں۔

سجدہ کی مختلف قسمیں ہیں جیسے سجدہ عبادت (نماز) سجدہ شکر اور سجدہ تلاوت ہے۔ سجدہ تلاوت وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ اس آیت کے اختتام پر بھی پڑھنے اور سننے والوں پہ سجدہ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن پاک کے کل چودہ مقامات میں سے ایک ہے۔ جہاں پہنچ کر سجدہ کرنا لازم آتا ہے۔ اگر کوئی آیت سجدہ پڑھتے یا سنتے وقت سجدہ کرنے کی حالت میں ہے یعنی باوضو ہے تو فوراً سجدہ کرے، وگرنہ طہارت حاصل کرنے کے بعد سجدہ کرے کیونکہ طہارت سجدہ کے لیے شرط ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا
هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ
اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔــرُوْنَ ﴿۵۳﴾
ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ
بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ
فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا
لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ
عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ :- اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے نہ بناؤ دو معبود ۔ بیشک
وہ ایک ہی معبود ہے ۔ پس خاص مجھ سے ہی ڈرو ﴿۵۱﴾
اور اُسی کے لیے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین
میں ، اور اُسی کے لیے ہے اطاعت دائمی ۔ کیا تم اللہ
کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو ﴿۵۲﴾ اور جو کچھ تمہارے
پاس نعمت ہے ۔ پس وہ اللہ کی طرف سے ہے ۔ پھر
جب تم کو پہنچتی ہے تکلیف تو اُسی کے سامنے چلّاتے

ہو (۵۳) پھر جب وہ دُور کر دیتا ہے تم سے تکلیف کو
تو اچانک ایک گروہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک
کرنے والا ہوتا ہے (۵۴) تاکہ (نتیجہ یہ ہو) یہ ناشکری کریں
اس چیز کے ساتھ جو ہم نے اُن کو دی ہے۔ پس فائدہ
اٹھالو، پس عنقریب تم جان لو گے (۵۵) اور ٹھہراتے ہیں یہ
لوگ اس کے لیے کہ جس کو نہیں جانتے، حصہ، اُس میں سے
جو ہم نے اُن کو روزی دی ہے۔ اللہ کی قسم تم سے ضرور
سوال کیا جائے گا اِن باتوں کے بارے میں جو تم افترار کیا
کرتے تھے (۵۶)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعثتِ انبیاء کا ذکر فرما کر مشرکین کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا۔ ہر نبی نے اپنی امت کو یہی تعلیم دی "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" یعنی صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش سے بچ جاؤ۔ پھر اللہ نے مختلف طریقوں سے توحید کے دلائل سمجھائے۔ اور آخر میں فرمایا کہ کائنات میں خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں جو جسم رکھتی ہیں۔ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں جس کی صورت یہ ہے کہ ہر ایستادہ چیز کے سائے زمین پر سجدہ کرتے ہیں۔ فرمایا آسمانوں کی ہر مخلوق خواہ وہ فرشتے ہوں یا جانور سب اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف صرف انسانوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو اکڑ دکھاتا ہے اور اللہ کے سامنے سجدہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اب آج کی آیات میں بھی اللہ نے توحید پر مضبوطی سے جمے رہنے کی تلقین کی ہے۔ اور شرک کی بعض صورتوں کا ردّ فرمایا ہے۔

عقیدہ اثنینیت

ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ
اللہ نے فرمایا دو معبود مت بناؤ۔ جملہ مشرکین میں سے مجوسیوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے

جو دو معبودوں کا قائل ہے۔ اس باطل عقیدہ کا ذکر سورۃ انعام کی ابتداء میں بھی ہو چکا ہے کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ یہ لوگ کہتے ہیں کہ روشنی یا نیکی کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے جبکہ تاریکی یا برائی کا پیدا کنندہ دوسرا خدا ہے۔ خدا تعالیٰ نے وہاں پر اس باطل عقیدے کا رد فرمایا تھا کہ اندھیروں اور روشنی کا خالق خدائے واحد ہے۔ نہ کوئی یزداں ہے اور نہ اہرمن بلکہ اللہ ہی وحدہٗ لاشریک ہے جو ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ اب آج کے درس میں بھی اسی قسم کے شرک کی تردید فرمائی ہے کہ دو معبود نہ بناؤ۔ یہاں پر اِلٰهَيْنِ کا معنیٰ دو معبود ہیں اور آگے پھر اِثْنَيْنِ کی تاکید بھی فرما دی ہے کہ اللہ کی وحدانیت کے مقابلے میں اثنینیت کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وہ تو ایک ہی معبودِ برحق ہے اور اسی نے فرمایا فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کہ صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔ میرے علاوہ نہ کوئی نفع نقصان کا مالک ہے اور نہ کوئی کسی کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کر سکتا ہے۔ خدا تو ایک ہی ہے اور باقی ساری اس کی مخلوق ہے۔ اور مخلوق میں سے کسی کو اللہ کے درجے پر پہنچا دینا تو بغاوت اور سخت ظلم ہے۔ غرضیکہ اس آیت کریمہ میں اللہ نے دو خداؤں والے عقیدہ کی تردید فرمائی ہے۔

عقیدہ تثلیث

عقیدہ اثنینیت کے علاوہ عقیدہ تثلیث والے اس وقت اربوں کی تعداد میں دنیا میں موجود ہیں۔ عیسائی تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ جس کی تردید سورۃ مائدہ میں آچکی ہے " لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ " تحقیق ان لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ جنہوں نے کہا کہ اللہ تینوں میں تیسرا ہے۔ یہ لوگ باپ، بیٹا اور روح القدس تین خدا مانتے ہیں۔ باپ سے مراد اللہ تعالیٰ، بیٹے سے مراد مسیح علیہ السلام اور روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ ایک عقیدے کے لحاظ سے باپ، بیٹا اور

مریم تین خدا بنتے ہیں مگر اللہ نے وہاں پر اس عقیدے کی سختی سے نفی فرمائی ہندوؤں میں آریہ سماجی مسلمانوں کے عقیدہ توحید سے کسی قدر متاثر ہوئے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سناتن دھرمی تو غلط ہیں جو کروڑوں معبودوں کو مانتے ہیں کیونکہ یہ عقیدہ عقل کے خلاف ہے، مگر وہ خود بھی تثلیث میں آکر پھنس گئے عیسائیوں کی طرح انہوں نے بھی تین خدا بنا لیے ایک پرماتما (خدا) دوسرا روح اور تیسرا مادہ۔ انہوں نے ان تینوں کو قدیم تسلیم کیا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَّعَهٗ شَيْءٌ یعنی ابتدا میں صرف خدا تعالیٰ کی ذات تھی اور اس کے ساتھ دوسری کوئی چیز نہیں تھی، نہ روح تھی اور نہ مادہ۔ یہ مخلوق ہے جسے خدا نے اپنی صفت اور تجلی سے ظاہر کیا۔ اس وقت نہ کوئی فرشتہ تھا، نہ جن اور نہ انسان۔ صرف اللہ کی ذات اور اس کے ساتھ اس کی صفات تھیں، اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی، تو آریہ سماجیوں نے روح اور مادہ کو قدیم کیسے تسلیم کر لیا۔ ہندوؤں کے لاکھوں کروڑوں معبودوں کا انکار کرنے کے باوجود بھی یہ لوگ عقیدۂ تثلیث کی بنا پر مشرک کے مشرک ہی رہے۔

کروڑوں معبود

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہندوؤں کی ایک کثیر آبادی لاکھوں اور کروڑوں دیوتاؤں کو مانتی ہے۔ پرانے مصریوں میں بھی شرک کی بیشمار قسمیں رائج تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی حقیر سے حقیر چیز بھی ایسی نہیں جس کی مشرکوں نے پوجا نہ کی ہو۔ گوبر کے پجاری آج بھی موجود ہیں جو اسے پوتر سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ناگ پھنی والے سانپ کی پرستش کرتے ہیں۔ بلی کو معبود ماننے والے مشرک بھی دنیا میں موجود ہیں۔ سورج، چاند اور ستارے تو بڑی بڑی چیزیں ہیں جن کے پجاری بابلی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے کلدانی بھی تھے۔ پھر پتھر کے دیوتاؤں کو ماننے والوں کی بھی کمی نہیں۔ حتیٰ کہ شیولنگ کے پجاری بھی ہیں جو آلہ تناسل کو پوجتے ہیں۔

یہ شرک کی مختلف قسمیں ہیں، جبکہ اللہ نے فرمایا کہ معبود تو صرف ایک اللہ ہے۔ خالق صرف وہ ہے، باقی سب مخلوق ہے۔ وہی قادرِ مطلق، علیمِ کل، ہمہ داں، ہمہ بین اور ہمہ تواں ہے۔ فرمایا جب وہ ایک ہی خدا ہے تو پھر اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور خالص اسی سے ڈرو۔

دائمی اطاعت

ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اسی اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ ہر چیز خلقاً (پیدائش کے لحاظ سے) ملکاً (ملکیت کے لحاظ سے) اور تصرفاً (تصرف کے لحاظ سے) اسی مالک الملک کی ہے۔ ہر شے کا خالق، مالک اور مدبر وہی ہے۔ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں ہے "يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ" حظیرۃ القدس کی بلندیوں سے لے کر زمین تک اور تحت الثریٰ تک تدبیر کرنے والا وہی ہے۔ وہ کلی اختیارات کا مالک ہے، اس کا کوئی نائب نہیں جو کسی کی حاجت روائی کرتا ہو وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اور اسی کے لیے ہے دائمی اطاعت واصب کا معنی دائم اور لازم ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں شیاطین کے متعلق فرمایا وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ" یعنی ان کے لیے دائمی عذاب ہو گا۔ غرضیکہ فرمایا کہ دائمی اطاعت بھی اسی وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ ملائکہ ہوں یا ارض و سما کی تمام چیزیں، تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کرتے ہیں۔ عقل کے دائرے میں رہ کر انسانوں میں سے بہت سے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ "وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ" (الحج) اور بہت سے ایسے ہیں جن پر سزا ثابت ہو چکی ہے۔ کیونکہ وہ توحید کو تسلیم کرنے کے باوجود شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا "اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ" کیا تم اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو؟ جن کو تم نے خدا کا شریک

بنا رکھا ہے۔ اُن سے خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ حالانکہ نہ انہوں نے کوئی چیز پیدا کی ہے۔ نہ اُن کے پاس تصرف ہے اور نہ وہ سب چیزوں کا علم ہی رکھتے ہیں۔ بھلا اُن سے تم کیوں خوف کھاتے ہو؟

فرمایا وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے فَمِنَ اللّٰهِ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ نعمت حسی ہو یا معنوی، مادی ہو یا روحانی، ظاہری ہو یا باطنی، سب اُسی کی طرف سے ہے سورۃ لقمان میں ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے آسمان و زمین کی ہر چیز مسخر کر دی ہے "وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً" اور اپنی تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں کو تم پر کامل بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کے اندر لاتعداد نعمتیں رکھی ہیں مگر انسان کسی ایک نعمت کا بھی شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بیرونی انعامات کا بھی کوئی شمار نہیں اللہ نے انسان کو وجود دیا، صحت، تندرستی اور عمر دی، اولاد، زمین و مکان، تجارت، سرمایہ، عزت، اقتدار اور سوسائٹی میں اعلیٰ مقام عطا کیا۔ یہ سب کچھ منجانب اللہ ہے اور اس میں کسی دوسری ذات کا کوئی حصہ نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہارے پاس موجود ہر نعمت اللہ ہی کی عطا کردہ ہے۔

فرمایا ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ تو تم اُسی کے سامنے چلاتے ہو، اور رو کر دعائیں کرتے ہو۔ جب مریض کے سرہانے کھڑے سارے ڈاکٹر عاجز آجاتے ہیں۔ کسی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو پھر لامحالہ انسان خدا تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ مولا کریم! ظاہری اسباب تو ختم ہو چکے ہیں اب تو ہی شفا دے سکتا ہے۔ مگر دیکھو! ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ جس وقت خدا تعالیٰ تم سے وہ تکلیف دور کر دیتا ہے اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ تو اچانک تم میں سے ایک

گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ جب تکلیف دور ہو جاتی ہے تو پھر وہی غیر اللہ کی نذر و نیاز شروع ہو جاتی ہے اور انسان انہی خیالات میں گم ہو جاتا ہے جن میں تکلیف آنے سے پہلے ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے کوئی تکلیف آئی ہی نہیں، اس نے خدا تعالیٰ کو پکارا ہی نہیں اور نہ اسے خدا نے کسی مصیبت سے رہائی دی ہے۔ مطلب یہ کہ مطلب نکل جانے کے بعد لوگ پھر وہی شرکیہ رسوم ادا کرنے لگتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے احسانات کو بھول جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ کہ جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اس کی ناقدردانی ہوگی۔ اللہ نے عقل، صحت، علم، مال و دولت سب کچھ دیا مگر اس کا نتیجہ ناقدری کی صورت میں تو نہیں نکلنا چاہیئے تھا۔ انسان کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اللہ نے تمام نعمتیں عطا کیں۔ پھر تکلیف کو دُور کیا مگر انسان نے پھر اسی کے ساتھ شریک ٹھہرا کر اس کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ فرمایا فَتَمَتَّعُوا ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا لو مگر کب تک؟ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تمہیں بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے۔

شرکاء کا حصہ

آگے اللہ تعالیٰ نے شرک کی ایک اور قسم کا ذکر فرمایا ہے۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ہماری دی ہوئی روزی میں سے ایسی چیزوں کے لیے حصہ ٹھہراتے ہیں جن کے متعلق انہیں کچھ علم نہیں نہ کوئی تحقیق ہے، نہ سند ہے اور نہ دلیل مگر مختلف اشیاء میں سے اُن کے نام کا حصہ ضرور نکالتے ہیں۔ یہ مضمون سورۃ انعام میں بھی بیان ہو چکا ہے "وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا" کہ انہوں نے کھیتی کی پیداوار اور مویشیوں میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کر رکھا ہے "فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا" اور پھر بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ حصہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے

شرکا دکا ہے۔ اس طرح وہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے اُن کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ گائے بھینس کا دودھ تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے مگر مشرک لوگ بڑے شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی گیارھویں کے نام پر دیتے ہیں۔ بکرا یا دنبہ بھی خدا تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔ وہ داتا صاحب کی نیاز کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے یہی تو اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے غیر اللہ کا حصہ نکالنے والی بات ہے اللہ تعالیٰ نے ایسے مشرکانہ عقیدے کی سخت تردید فرمائی ہے۔

نذر لغیر اللہ

نذر لغیر اللہ کی کئی مثالیں روزمرہ مشاہدے میں آتی ہیں۔ ایک دفعہ ہوائی اڈے سے تانگے پر سوار ہوئے۔ ایک پہلوان صاحب نے ایک موٹا تازہ دنبہ بھی تانگے میں سوار کرا یا۔ گوجرانوالہ کی طرف آتے ہوئے میں نے پوچھا کہ قربانی کا موسم تو نہیں ہے، پھر یہ دنبہ کہاں لیے جا رہے ہو، کہنے لگے یہ داتا صاحب کی نیاز ہے۔ میں نے کہا، اللہ کے بندے! اللہ کی نیاز کہو۔ کہنے لگے، اللہ کیا اور داتا کیا ایک ہی بات ہے۔ بعض لوگ شرک میں اتنے پختہ ہوتے ہیں۔ مسعود سالار غازی کے نام کی گائے تو ہندوستان میں مشہور ہے۔ شیخ سدھو کا بکرا بھی دیا جاتا ہے۔ دہلی والے بی بی کی صحنک دیتے ہیں۔ ایک بڑے کھلے برتن میں کھانا رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے صرف عورتیں ہی کھائیں گی، مرد نہیں کھا سکتے، اور عورتوں میں بھی دوخصمی عورت (دوسرے نکاح والی) نہیں کھا سکتی۔ امام جعفر کے کونڈے بھی نیاز کیے جاتے ہیں جنہیں صرف چھت کے نیچے ہی کھایا جاتا ہے اس قسم کی نذور لغیر اللہ مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے دی جاتی ہے اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے خود ہی اسے مشکل بنا دیا جاتا ہے

حیدر آباد دکن کے ایک بزرگ نے جہاد میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اُن کی قبر پر لوگ درخواستیں پیش کرتے ہیں۔ میں نے خود وہاں درخواستوں کا اتنا انبار دیکھا کہ جس سے پورا ٹرک بھر جائے۔ شاید لوگ

سمجھتے ہیں کہ اس بزرگ نے وہاں کلرک مقرر کر رکھے ہیں جو لوگوں کی درخواستیں ان کے پاس پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ قبر پر قرآن خوانی کرتے ہیں کہ بزرگ خوش ہو کر ہمارا مقصد پورا کر دے گا۔ قبروں کو غسل دیا جاتا ہے، ان پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ وہاں کی خاک کو منہ اور آنکھوں پر ملا جاتا ہے۔ کوئی قبر کو چوم رہا ہے۔ کوئی وہاں ناک رگڑ رہا ہے اور کوئی اس پر سر رکھے ہوئے ہے۔ بعض لوگ قبروں سے پتھر، کنکر وغیرہ اٹھا کر لے جاتے ہیں کہ ان سے شفا یابی ہوتی ہے۔ صوبہ سرحد میں قبروں پر جھنڈے لہرانے کا عام رواج ہے جن پر بڑی مقدار میں کپڑا لگایا جاتا ہے حالانکہ یہی کپڑا کسی غریب کے تن ڈھانپنے کے کام آسکتا ہے۔ یہ سب خدا کی عطا کردہ چیزوں میں سے غیروں کا حصہ مقرر کرنے کی مثالیں ہیں۔

لازمی بار پریس

اللہ نے فرمایا کہ مشرک لوگ یہ سب شرکیہ باتیں کرتے ہیں۔ مگر انہیں یہ بھی علم نہیں کہ یہ رسم کیوں ادا کی جاتی ہے اور اس کا موجد کون ہے۔ مگر یاد رکھو! تاللہ اللہ کی قسم۔ اللہ نے خود اپنی قسم اٹھا کر فرمایا ہے لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ کہ جو کچھ تم افتراء کرتے ہو، اس کے متعلق ضرور سوال کیا جائے گا۔ قیامت والے دن تمہیں جواب دینا ہوگا کہ یہ شرکیہ رسم تم نے کہاں سے نکالی اور تمہارے پاس اس کی کیا دلیل تھی۔ کیا کسی امام نے یا بزرگ نے کہا تھا کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کی نیاز دیا کرو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ساری کاروائیاں افتراء کے زمرے میں آتی ہیں اور انہیں ایصالِ ثواب یا صدقہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو غیروں کی نیاز ہے جنہیں نافع اور ضار سمجھ کر دی جاتی ہے فوت شدگان کے لیے صدقہ خیرات اور استغفار کرنا تو جائز ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا ثواب مرنے والوں کو پہنچائے اور یہ ملتِ ابراہیمی کا مسلمہ اصول ہے۔ مگر نذر و نیاز کی مروجہ شکلیں شرک ہیں

یا بدعت۔ ایسی چیزوں کے حق میں شریعت کا حکم موجود نہیں۔ فرمایا اس بارے میں قیامت کے دن تم سے ضرور باز پرس ہوگی۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا
يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ
وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ
مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾
لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ
الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ ع
۱۴ ۷

ترجمہ :- اور ٹھہراتے ہیں یہ لوگ اللہ کے لیے بیٹیاں، پاک ہے اس کی ذات، اور اپنے لیے وہ کچھ جو وہ چاہتے ہیں ﴿۵۷﴾ اور جب خوشخبری دی جائے اُن میں سے کسی کو بیٹی کی تو ہو جاتا ہے اُس کا چہرہ سیاہ اور وہ غم میں بھرا ہوا ہوتا ہے ﴿۵۸﴾ چھپتا ہے قوم سے اِس بری خبر کی وجہ سے (اور خیال کرتا ہے کہ) روک رکھے اِس کو ذلت پر، یا داب دے اس کو مٹی میں سنو! بُرا ہے وہ جو یہ فیصلہ کرتے ہیں ﴿۵۹﴾ اُن لوگوں کے لیے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، یہ بری مثال ہے اور اللہ کی مثال بلند ہے، اور وہ زبردست اور حکمت کا مالک ہے ﴿۶۰﴾

ربط آیات گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے دو خدا ماننے والے مجوسیوں یا ثنوی فرقے

والے مشرکوں کا رد فرمایا۔ پھر مطلق شرک کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی کہ وہ اپنی کمائی میں سے غیر اللہ کے تقرب کے لیے ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ فرمایا نعمتیں تو ساری کی ساری خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں تو اس میں سے دوسروں کا حصہ نکالنے کا کیا مطلب؟ تکلیف تو اللہ تعالیٰ دور کرتا ہے مگر نذر و نیاز اغیار کی دی جاتی ہے۔ فرمایا یہ لوگ اس چند روزہ زندگی سے فائدہ اٹھا لیں، آگے چل کر انہیں پتہ چل جائے گا۔ جو یہ افتراء کیا کرتے تھے

خدا کے لیے بیٹیاں

اب اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی ایک اور قسم کا رد فرمایا ہے فرمایا وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ اور ٹھہراتے ہیں یہ لوگ اللہ کے لیے بیٹیاں۔ پھر ان کو دیویاں مان کر ان کی پوجا کرتے ہیں اور حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں۔ دیویوں کا تصور عربوں کے علاوہ دیگر اقوام میں بھی پایا جاتا تھا۔ مثلاً ہندوؤں میں "کلکتے" والی کالی دیوی مشہور ہے جس کے نام پر کلکتہ میں مندر بھی بنا ہوا ہے۔ یہاں پر انسانوں، خاص طور پر چھوٹے بچوں کو کالی دیوی کی بھینٹ (قربانی) چڑھایا جاتا ہے تاکہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ لوگوں پر قہر کا باعث نہ بنے۔ اسی طرح یونانی زہرہ ستارے کو دیوی مانتے تھے، اور اس کے نام پر مندر بھی بنا رکھا تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا۔

بِعَتَابِ زُهَرَةٍ قَارُوْرَتَانِ
فِي الْخَيْرِ وَّ ذِيْ لِشَّرِّ الْهَوَانِ

یعنی زہرہ دیوی کی دہلیز پر قسمت کی دو شیشیاں رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک بوتل میں خیر ہے اور دوسری میں شر ہے۔ گویا یہ دیوی خیر و شر کی مالکہ ہے۔ پرانے آشوریوں میں بھی اس قسم کا تصور پایا جاتا تھا۔ عرب کے بعض قبائل بنو خزاعہ وغیرہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے اور کہتے تھے، کہ جنیاں (مادہ جن) ان کی مائیں ہیں۔ اسی باطل عقیدے کے متعلق اللہ نے سورۃ الصّٰفّٰت میں فرمایا ہے "وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ

نسباً" اِن بدبختوں نے اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری قائم کر رکھی ہے۔ گویا جنات خدا تعالیٰ کے سسرال ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں فرشتے پیدا ہوتے ہیں۔ جو خدا کی بیٹیاں ہیں۔

فرمایا، دیکھو! یہ کتنا باطل عقیدہ ہے۔ حقیقت میں سُبْحٰنَهٗ خدا تعالیٰ کی ذات ان چیزوں سے پاک ہے۔ خدا کی طرف اولاد کی نسبت کرنا نہایت ہی گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان رفیع کے بالکل خلاف ہے کہ اس کی کوئی بیوی اور اولاد ہو۔ تو فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے تو بیٹیوں کا تصور رکھتے ہیں وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ اور اپنے لیے وہ کچھ چاہتے ہیں جو انہیں پسند ہے۔ یعنی خدا کی بیٹیوں کے مقابلے میں اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں جو کہ ویسے بھی عقل کے خلاف ہے۔ فارسی کا مقولہ ہے "آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگر نہ پسندی" یعنی جو چیز خود پسند نہیں کرتے، وہ دوسروں کے لیے کیسے گوارا کرتے ہو؟

بیٹی کی ولادت پر روسیاہی

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے بعض عرب قبائل کے اُس غم و غصہ کا ذکر کیا ہے جس کا اظہار وہ اپنی بیٹی کی پیدائش پر کیا کرتے تھے۔ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ اور جب انہیں بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ یعنی کسی شخص کے گھر بیٹی پیدا ہوتی اور اس بات کی اطلاع اُسے دورانِ مجلس دی جاتی، تو پھر اُس کی حالت یہ ہوتی ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا اُس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گرتی کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن گیا ہے وَهُوَ كَظِيمٌ اور وہ غم سے نڈھال ہو جاتا۔ اللہ نے فرمایا کہ بیٹی کی پیدائش پر ان مشرکین کی یہ حالت ہو جاتی ہے مگر اپنی بیٹیوں کی نسبت اللہ کی طرف کرنے میں ذرا شرم نہیں کھاتے۔ اور پھر وہ اپنی اس بدنامی کے مزعومہ داغ کو دھونے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے کرتے ہیں۔ فرمایا يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ پھر وہ اس بُری خبر کی وجہ سے

قوم سے چھپتا پھرتا ہے، کسی کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا کہ لوگ کہیں گے اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے اس شرم کے بارے میں وہ اپنی بستی اور گھر بار بھی چھوڑ بیٹھتے۔ چنانچہ امام جاحظ نے "البیان والتبیین" میں ایک عورت کے چند اشعار لکھے ہیں۔ جن میں اسی قبیح صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ بچی کی پیدائش پر جب اس کا خاوند گھر بار ہی چھوڑ بیٹھتا ہے، تو وہ اسے اس طرح خطاب کرتی ہے۔

مَالِاَبِیْ حَمْزَۃَ لَا یَأْتِیْنَا
یَبِیْتُ فِیْ بَیْتِ الَّتِیْ تَلِیْنَا

اے ابوحمزہ! تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو ہمارے پاس نہیں
آتا بلکہ پڑوسیوں کے گھر میں رہتا ہے۔

غَضْبَانَ اَلَّا نَلِدَ الْبَنِیْنَا
تَاللّٰہِ مَا ذَاكَ بِاَیْدِیْنَا

تو اس بات سے ناراض ہے کہ ہم بچے نہیں جنتیں
حالانکہ خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے

نَحْنُ كَزَرْعٍ لِّمَا
قَدْ زَرَعُوْا فِیْنَا

ہم عورتیں تو کھیتی کی مثال ہیں کہ جیسا بیج پڑتا
ہے ویسی ہی پیداوار ہوتی ہے۔

بیٹی سے گلو خلاصی

وہ بدنصیب جو بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہو جاتا ہے، اس سے گلو خلاصی کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے۔ اپنے دل میں سوچتا ہے اَیُمْسِکُهٗ عَلٰی هُوْنٍ کیا میں ذلت برداشت کرتے ہوئے بیٹی کو روک رکھوں اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ یا اسے مٹی میں داب دوں۔ وہ نے وقوف لوگ بیٹی کو اس لیے باعث ذلت

سمجھتے تھے کہ بڑی ہوگی تو اس کی شادی ہوگی اور پھر لوگ کہیں گے کہ یہ فلاں کا داماد ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ بھی تو کسی عورت ہی کا جنا ہوا ہے اگر عورت نہ ہوتی تو اس کی اپنی پیدائش کب ممکن ہوتی۔ وہ لوگ محض خود ساختہ جاہلانہ غیرت کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے فرمایا اَلَا سَاءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۔ دیکھو یہ کتنا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔ بہرحال سارے عرب بچیوں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک نہیں کرتے تھے بلکہ چند قبائل بنو خزاعہ، بنی کنانہ، مُضر اور بنو تمیم تھے جو عام طور پر بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔

زندہ درگور اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب بچی چھٹے سال میں پہنچتی تو اس کو خوب نہلا دھلا کر اور نئے کپڑے پہنا کر باہر جنگل میں لے جاتے اور پھر اس مقصد کے لیے پہلے سے کھودے گئے گڑھے میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دیتے بعض بدبخت پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیتے یا کسی پہاڑی سے نیچے گرا دیتے بہرحال نومولود بچیوں کا یہ قتل عربوں میں رائج تھا۔ اس کی سنگینی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ التکویر میں کیا ہے "وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ" قیامت والے دن زندہ درگور ہونے والی بچی سے پوچھا جائے گا بتا، تجھے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ ان بے نصیبوں کو اس وقت پتہ چلے گا جب انہیں اس ظلم کا ازالہ کرنا پڑے گا۔

حضور علیہ السلام کے صحابی حضرت قیسؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ جب سے مَیں اسلام لایا ہوں، بہت پریشان رہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں جاہلیت کے دور میں آٹھ بچیوں کو زندہ درگور کر چکا ہوں مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ میں کتنے بڑے ظلم کا مرتکب ہوا ہوں۔ آپ علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اسلام پہلے سے کئے گئے گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے۔ آپ تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ

سے سابقہ گناہوں کی معافی طلب کرو ۔ نیز ہر زندہ درگور کردہ بچی کے عوض ایک غلام آزاد کرو ۔ اُس شخص نے عرض کیا حضور! میرے پاس غلام نہیں ہیں جو آزاد کر سکوں ، البتہ میرے پاس جانور ہیں ۔ آپ نے فرمایا ہر بچی کے بدلے ایک اونٹ ہدی کر دو ، شاید کہ بارگاہِ رب العزت میں کچھ کفارہ بن جائے ۔ تاہم عام قانون یہ ہے کہ اسلام لانے سے پہلے کردہ گناہوں پر گرفت نہیں ہو گی ۔

امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ جب سے اسلام لایا ہوں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں حتیٰ کہ راتوں کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی ہے ۔ زمانہ جاہلیت میں میرے ہاں بچی پیدا ہوئی جس کا میں نے بہت بُرا منایا ، تاہم میں نے اُس کو زندہ رہنے دیا ۔ پھر جب وہ چھٹے سال میں داخل ہوئی تو میں نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے نہلاؤ ، اچھے کپڑے پہناؤ ، سرمہ لگاؤ اور خوب زینت کا سامان کرو ۔ پھر جب وہ تیار ہو گئی تو میں لے کر جنگل کی طرف چل دیا ۔ میں اسے ایک گہرے گڑھے پر لے گیا جو میں نے اس مقصد کے لیے پہلے ہی کھود رکھا تھا ۔ میں نے بچی سے کہا کہ ذرا اس کنوئیں میں جھانک کر تو دیکھو ۔ جونہی اُس نے اُدھر توجہ کی میں نے پیچھے سے دھکا دے کر اُسے کنوئیں میں گرا دیا وہ بڑی چیخی چلائی اور ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی ، مگر میں نے اُوپر سے مٹی ڈال کر اُسے زندہ گاڑھ دیا ۔ مجھے یہ حرکت بہت پریشان کر رہی ہے ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اسلام لانے سے پہلے کے گناہوں کے متعلق اب سوائے استغفار کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ، یا پھر صدقہ خیرات کرو ۔ غلام آزاد کرو یا جانوروں کی ہدی پیش کرو تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دور ہو ۔

عدلی مثال

حضرت علیؓ کے زمانہ میں عرب کے دو مشہور شاعر فرزدق اور جریر

ہوئے۔ دونوں مسلمان تھے مگر خاندانی عصبیت کی وجہ سے ایک دوسرے کے مدمقابل تھے اور ایک دوسرے کی ہجو بیان کیا کرتے تھے۔ ان میں سے فرزدق کے متعلق آتا ہے کہ اُس کا دادا صعصعہؓ جو صحابی تھا۔ زمانہ جاہلیت میں اُس میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ جہاں کہیں اُسے پتہ چلتا کہ فلاں شخص کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے اور وہ اسے زندہ درگور کرنا چاہتا ہے تو وہ اُس شخص کے پاس جاتا، اُسے بچی کے عوض دو اونٹ اور کچھ مال دے کر بچی کو حاصل کر کے اُس کی جان بچا لیتا۔ کہتے ہیں کہ اُس زمانہ میں اُس نے تین سو ساٹھ بچیوں کی جان بچائی۔ اللہ نے اُس زمانہ جاہلیت میں بھی اُس شخص کے دل میں ایسی شفقت پیدا کر دی تھی مگر بچیوں کو قتل کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی جو بچی کی پیدائش کو بدنامی کا باعث سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی واقعات کے متعلق — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

اشارہ فرمایا ہے کہ جب انہیں بچی کی پیدائش کی خبر ملتی تو اُن کا چہرہ سیاہ ہو جاتا اور سوچنے لگتے کہ ایسی بچیوں کو زندہ رکھ کر بدنامی مول لی جائے یا اُسے زندہ درگور کر دیا جائے۔

جہیز کی لعنت

مفسرین کرام اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ کے دو مطلب بیان کرتے ہیں۔ ایک مطلب تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ لوگ اپنی نام نہاد غیرت کی بنا پر بچیوں کو قتل کر دیتے تھے، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ معاشی بدحالی کی وجہ سے اپنی اولادوں کو قتل کر دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ ان کو کما کر کون کھلائے گا۔ اللہ نے ایسے ہی باطل خیال کا رد کرتے ہوئے فرمایا "وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ" (سورۃ انعام) یعنی اپنی اولاد کو فقر کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ جو خدا تعالیٰ تمہیں روزی دے رہا ہے، وہ اِن کے لیے بھی بندوبست کرے گا۔ اسی طرح پنجاب میں

بچیوں کے نکاح میں جہیز کا مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔ والدین جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بچیوں کا نکاح نہیں کر سکتے اور اسی انتظار میں بچیوں کو روک لیا جاتا ہے۔ بعض والدین بچیوں کو خالی ہاتھ رخصت کرتے ہیں اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اب بعض لڑکے والے لمبے چوڑے جہیز کا مطالبہ کرنے لگے ہیں جس کی وجہ سے کتنی ہی لڑکیوں کی عمر برباد ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالٰی سب کو ہدایت دے تاکہ بچے بچیوں کے نکاح سنت کے مطابق سادگی سے انجام پائیں اور لوگوں کو جہیز کی لعنت سے نجات حاصل ہو جائے۔

عورت نصف انسانیت ہے

عورت کو ذلیل اور حقیر سمجھنا سخت جہالت کی بات ہے اللہ تعالٰی نے اپنی حکمت بالغہ سے جنسی تفریق پیدا کر دی ہے، کسی کو مرد بنایا ہے اور کسی کو عورت۔ کسی مرد کے لیے جائز نہیں کہ عورت کو محض عورت ہونے کی بنا پر حقیر سمجھے۔ کسی کو لڑکا دے یا لڑکی، یہ بھی اللہ تعالٰی کے اختیار میں ہے کسی مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ یہ اللہ کی مصلحت کے مطابق ہوتا ہے جسے اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تاہم عورت نصف انسانیت ہے۔ متمدن دنیا میں عورت کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مرد کی۔ اگر مرد کو اللہ نے عورت پر فوقیت عطا فرمائی ہے تو اُسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، نہ کہ عورت کو ذلیل سمجھے۔ اللہ نے عورت کے لیے بھی خاص احکام مقرر فرمائے ہیں اور اُس کو خاص فرائض سونپے ہیں۔ قانون کی نظر میں وہ بھی مرد کی طرح باعزت ہے۔ اس کو بھی آرام و راحت کی ضرورت ہے جس طرح مرد کو۔ نسل انسانی کی بقا کے لیے عورت اور مرد دونوں کی ضرورت ہے، لہٰذا بچی کی پیدائش پر بھی اسی طرح خوش ہونا چاہیے جس طرح بچے کی ولادت پر۔

فرمایا، لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ
جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اُن کی بری مثال ہے جبھی تو وہ حقیر و ذلیل

کام کرتے ہیں وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اور اللہ ہی کی مثال بلند و برتر ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، نہ اُس کی بیوی ہے نہ بچے، وہ غنی، صمد اور بے نیاز ہے وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وہ کمال قدرت اور حکمت کا مالک ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنانا چاہیئے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں ٹھہرانا باطل عقیدہ ہے۔ ان آیات میں اللہ نے مشرکوں کا ذہنی پس منظر بیان فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا
مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ج فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا
يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ
لَهُمُ الْحُسْنٰى ط لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ
وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى
اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ
الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ ع ۸ / ۱۴

ترجمہ :- اور اگر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرتا لوگوں سے اُن کے
ظلم کی وجہ سے تو نہ چھوڑتا اس (زمین) پر کوئی چلنے پھرنے

والا - لیکن اللہ مہلت دیتا ہے ان کو مقررہ وقت تک۔
پس جب آجائیگا اُن کا مقررہ وقت تو نہیں پیچھے ہوں گے
ایک گھڑی بھر (اس سے) اور نہ آگے ⑥١ اور ٹھہراتے ہیں
یہ لوگ اللہ کے لیے وہ چیز جس کو یہ خود ناپسند کرتے
ہیں۔ اور بیان کرتی ہیں اِن کی زبانیں جھوٹ کہ اِن کے
لیے بھلائی ہے - ضرور بر ضرور بیشک ان کے لیے (دوزخ
کی) آگ ہے - اور وہ آگے بڑھائے گئے ہیں ⑥٢ اللہ کی
قسم بیشک ہم نے بھیجا امتوں کی طرف آپ سے پہلے
رسولوں کو - پس مزّین کیا اُن کے لیے شیطان نے اُن
کے (غلط) اعمال کو - پس وہی آج کے دِن اُن کا رفیق
ہے - اور ایسے لوگوں کے لیے عذاب الیم ہے ⑥٣
اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر کتاب مگر اس لیے
تاکہ آپ بیان کریں اِن کے لیے وہ چیز جس میں وہ
اختلاف کرتے ہیں - اور یہ ہدایت اور رحمت ہے
اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ⑥٤ اور اللہ
کی ذات وہ ہے جس نے اتارا آسمان کی طرف سے
پانی - پس زندہ کیا اُس کے ساتھ زمین کو اِس کے خشک
ہونے کے بعد - بیشک اس میں البتہ نشانی ہے
اُن لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں ⑥۵

ربطِ آیات

گذشتہ رکوع کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے دلائلِ توحید بیان فرمائے اور دو ٹوک الفاظ میں فرمایا کہ دو خدا نہ بناؤ بلکہ معبود برحق تو صرف ایک ہی ہے پھر اللہ نے مشرکوں کی مختلف کارگزاریوں کا ذکر فرمایا۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ

خدا تعالیٰ کی بیٹیوں کا تصور رکھتے تھے جو کہ اُس کی شان میں گستاخی اور سخت بے ادبی ہے۔ فرمایا کہ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو مگر خدا تعالیٰ کی نسبت اپنی ناپسندیدہ مخلوق بیٹیوں کی طرف کرتے ہو۔ ان کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی شخص کو اُس کی بیٹی کی ولادت کی خبر دی جاتی تو غم و غصہ اور ندامت کی وجہ سے اُس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا اور پھر وہ سوچنے لگتا کہ اس بیٹی کو ذلّت برداشت کرتے ہوئے زندہ رہنے دوں یا پھر فوراً ہی زندہ درگور کر دوں۔

المول
ا گرفت

اب آج کی آیات میں بھی اللہ نے مشرکین ہی کا رد فرمایا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی قدرتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ کی مہربانی کی وجہ سے اکثر و بیشتر مجرمین کو اس دنیا میں مہلت دی جاتی ہے۔ ورنہ اس کی گرفت تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بھی آسکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اُن کا مؤاخذہ کرتا مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ تو روئے زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑتا۔ اس حصہ آیت میں النَّاس کا لفظ عام ہے جیسا کہ اگلے لفظ دآبہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ گرفت کرنے پر آئے تو انسانوں کے گناہوں کا اثر جانوروں پر بھی پڑے اور وہ انسانوں کے ساتھ ہی ہلاک ہو جائیں۔ باقی رہا ظلم کہ اُس کی حدود و قیود کیا ہیں، تو یہ لفظ بھی عام ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی خطا سے لے کر بڑے سے بڑے گناہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے مسجد میں داخل ہوتے وقت دائیں کی بجائے بایاں پاؤں پہلے رکھ لیا تو یہ بھی ظلم میں شمار ہوتا ہے۔ البتہ بعض مفسرین نے خاص کیا ہے۔ جیسے "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (لقمان) شرک بہت بڑا ظلم ہے

اور کفر کے متعلق بھی فرمایا "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (البقرہ) کافر ہی ظلم کرنے والے ہیں۔ تو گویا اگر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرنا چاہے تو ادنیٰ سے ادنیٰ یا بڑے سے بڑے گناہ پر کر سکتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روئے زمین پر نہ کوئی انسان نظر آئے اور نہ چرند، پرند اور کیڑے مکوڑے، اللہ سب کو ہی ملیامیٹ کر دے مگر یہ چیز اس کے قانونِ امہال وتدریج کے خلاف ہے وہ لیا اوقات دنیا میں مہلت دیتا رہتا ہے۔ "سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ" (القلم) وہ ایسے ذرائع سے مہلت دیتا ہے جو لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے اور پھر جب وہ مہلت ختم ہو جاتی ہے تو اللہ کا فیصلہ آجاتا ہے۔ جسے کوئی روک نہیں سکتا۔

ظلم کا اثر

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آپ کے سامنے کسی شخص نے اس بات کا ذکر کیا کہ ظالم آدمی صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا، نہیں بلکہ ظلم کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ فرمایا "اِنَّ الْحُبَارَةَ يَمُوْتُ هُزَالًا مِنَ الظُّلْمِ" یعنی جنگلی مرغ (سرخاب) ظلم کی وجہ سے اپنے گھونسلے میں لاغر ہو کر مر جاتا ہے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی منقول ہے کہ کیڑا اپنی بل میں ظلم کی وجہ سے مر جاتا ہے، گویا ظلم کا اثر دوسری چیزوں پر بھی پڑتا ہے۔ بخاری، مسلم اور مؤطا امام مالکؒ کی روایت میں آتا ہے کہ جب کوئی ظالم، فاسق اور مجرم آدمی مر جاتا ہے تو جانور، درخت حتیٰ کہ ہر چیز خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہے کہ وہ ظالم کی نحوست سے چھوٹ گئی۔ ظلم بہرحال برا ہے خواہ وہ عقیدے میں کفر وشرک کی شکل میں ہو یا اعمال میں جور وجفا کی صورت میں۔

مقررہ وقت تک مہلت

فرمایا اگر اللہ تعالیٰ ظالموں کا مؤاخذہ کرتا تو فوراً پکڑ لیتا مگر اس کا قانون یہ ہے "وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى"

بلکہ وہ لوگوں کو مقررہ وقت تک مہلت دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فرد، ہر قوم، ہر بستی اور ہر ملک کے لیے اپنی حکمت کے مطابق ایک وقت مقرر کر رکھا ہے ۔ فَإِذَا جَاۤءَ أَجَلُهُمْ پھر جب مہلت گزرنے کے بعد مقررہ وقت آجاتا ہے لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ تو پھر وہ ایک گھڑی بھر بھی نہ اس وقت سے پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے بلکہ عین وقت پر اللہ تعالیٰ کا حکم آجاتا ہے اور وہ لوگ خدا تعالیٰ کی گرفت میں آجاتے ہیں ۔ یہ تو اللہ کا عام قانون ہے کہ وہ مہلت دیتا رہتا ہے مگر بعض اوقات وہ اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق جلدی بھی گرفت کر لیتا ہے ۔ کیونکہ اس کی مشا میں کسی کو دخل کی مجال نہیں ۔

برائی سے بھلائی کی توقع

فرمایا، دیکھو! اِن لوگوں کی حالت یہ ہے ۔ وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُونَ اور ٹھہراتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے وہ چیز جس کو خود ناپسند کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اپنے لیے تو بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں ۔ خود تو اپنی ملکیت میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے شریک ٹھہراتے ہیں اپنے حق میں ذرا بھر بھی کوتاہی یا استخفاف کو پسند نہیں کرتے مگر اللہ کے فرشتوں اور نبیوں کی گستاخی کرتے ہیں اور خود رب العزت کی بارگاہ میں بے ادبی کا ارتکاب کرتے ہیں ۔ فرمایا ان تمام زیادتیوں کے باوجود وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ ان کی زبانیں جھوٹ بولتی ہیں ۔ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى کہ بھلا انہی کا ہو گا ۔ اپنی تمام نزخرابیوں، نافرمانیوں اور کفر و شرک کے باوجود اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ بھلائی انہی کا حق ہے جو ضرور انہیں حاصل ہو گا ۔ مشرک لوگ تو صاف کہتے تھے کہ اوّل تو قیامت کا کوئی تصوّر ہی نہیں ہے اور اگر بالفرض قیامت واقع ہو گئی تو وہاں پر

بھی ہمیں ہی کامیابی حاصل ہو گی، ہماری کسی سہولت میں کمی نہیں آئے گی۔ فرمایا یہ لوگ کیسی جھوٹی بات کر رہے ہیں۔ عقیدے کی ہر نجاست میں ملوث ہیں اور اعمال میں ہر بدکرداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں مگر توقع اچھائی کی کر رہے ہیں۔

دوزخ کی آگ

فرمایا حقیقت یہ ہے لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ ان کے لیے تو ضرور بالضرور دوزخ کی آگ ہے۔ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ اور بیشک وہ آگے بڑھائے گئے ہیں۔ یعنی دوزخ کی آگ پر پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں پر مفرطون را کی زبر کے ساتھ مفعول کا صیغہ ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ لوگ آگے بڑھائے گئے ہیں۔ اور اگر مفرطون را کی زیر کے ساتھ ہو تو یہ فاعل کا صیغہ بنتا ہے اور معنی یہ ہو گا کہ یہ لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔ یہ معنی بھی درست ہے کہ یہ لوگ کفر، شرک اور معاصی کا ارتکاب کر کے زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ فرط کا معنی فراموش کر دینا بھی ہوتا ہے۔ اگر ان معانی پر محمول کیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ ایسے نابکاروں کو دوزخ میں ڈال کر فراموش کر دیا جائے گا۔ فرط کا معنی پیش رو بھی آتا ہے جیسے حضور کا فرمان ہے اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ میں حوض کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں گا، یعنی میں تم سے پہلے وہاں موجود ہوں گا۔ قبرستان میں جا کر کی جانے والی دعا جو حضور علیہ السلام نے سکھائی ہے، اس میں یہ الفاظ آتے ہیں اَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ تم ہمارے پیش رو ہو وَاِنَّا بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ اور ہم بھی تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری غلطیاں معاف فرمائے۔ بہرحال فرمایا کہ یہ لوگ بھلائی کی توقع رکھتے ہیں جب کہ یہ دوزخیوں کے پیش رو ہوں گے یا انہیں دوزخ کی طرف آگے بڑھایا جائے گا۔

تزئین اعمال

آگے اللہ تعالیٰ نے تاکیداً فرمایا ہے تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا

اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ اللہ کی قسم، بیشک ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو مختلف قوموں کی طرف بھیجا۔ انہوں نے لوگوں کو انذار کیا مگر فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھایا۔ تمام انبیاء کے دور میں یہی کچھ ہوا کہ شیطان نے کفر، شرک، بدعت اور معاصی والے اعمال خوبصورت کر کے دکھائے۔ اُن کی خوبیاں بیان کیں اور کہا کہ ایسا کرنے میں ہی عزت اور اجر و ثواب ہے، تو لوگ شیطان کے پیچھے لگ گئے اور خدا کے احکام کی نافرمانی کرتے رہے اللہ نے فرمایا فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ اور آج بھی شیطان ہی اُن کا دوست، رفیق اور ساتھی ہے اور وہ انہیں ہر بُری چیز مزین کر کے دکھا رہا ہے۔ آج بھی لوگ اُسی کے جال میں پھنس کر رسولوں کی بات کا انکار کر رہے ہیں اور رسومات باطلہ پر کاربند ہیں۔

فرمایا اس کا نتیجہ یہ ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کہ آخرت میں اُن کے لیے دردناک عذاب تیار کیا گیا ہے۔ اللہ نے ہدایت کے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں اور اب انہیں عذر پیش کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سب کچھ سمجھا دیا ہے مگر یہ خود عذاب کے مستحق بن رہے ہیں۔

تبیین کتاب کا فریضہ

ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر کتاب مگر اس لیے تاکہ آپ کھول کر بیان کر دیں وہ چیز جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید، رسالت اور معاد میں اختلاف کرتے ہیں، آپ کی بات کو تسلیم نہیں کرتے لہذا آپ انہیں اچھی طرح سمجھا دیں نبی کے یہ فرائض میں داخل ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی مراد کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کر دے تاکہ کسی کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہے مختلف

قسم کے حوادثات، ماجریات اور حالات انسان کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اللہ نے بعض کا مدار انسانی عقل پر رکھا ہے اور بعض چیزوں کو اہل علم کے سپرد کیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اچھی طرح وضاحت کر دیں۔
چونکہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی سب سے زیادہ علم عطا کرتا ہے اس لیے یہ اُن کے فرض منصبی میں داخل ہے کہ وہ ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کر دیں۔ اللہ نے سورۃ ہود کی ابتداء میں فرمایا ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی آیات کو محکم کیا گیا ہے "ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ" پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے وضاحت ہے۔ قرآن پاک میں اساسی تعلیم ہے۔ اللہ نے تمام مظاہر اصول مہیا کر دیے ہیں جن کی توضیح اللہ کا نبی اپنے قول اور عمل کے ذریعے کرتا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ لوگ عقیدے میں اختلاف کرتے ہوں یا اعمال میں، ہم نے یہ کتاب آپ پر اس لیے اتاری ہے تاکہ آپ اس کو کھول کر بیان کر دیں۔
اسی وضاحت کے ضمن میں حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا تھا کہ لوگو! میری بات کو اچھی طرح سن لو اور سمجھ لو "ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً" (یونس) پھر تمہارے معاملے میں کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہنی چاہیے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو تو اُن کی قوم نے صاف صاف کہہ دیا "قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ" (ھود) اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، حالانکہ اللہ کے نبی نے ہر چیز کی وضاحت کر دی تھی اور وہ لوگ محض اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے اُن کی بات کو قبول نہیں کرتے تھے
قرآن پاک سے متعلق نبی آخر الزمان کی تمام تبیین و تشریح آپ کی سنت اور احادیث کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔ بعض گمراہ فرقے چکڑالوی اور پرویزی وغیرہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے قرآن میں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ان سے

کوئی پوچھے کہ جس تبیین کا ذکر اللہ نے بار بار کیا ہے، وہ کہاں ہے؟ حقیقت یہ ہے قرآن پاک کے الفاظ کی تشریح حضور علیہ السلام کی سنت میں ہے۔ تمام صحیح احادیث قرآن پاک کی شرح ہیں۔ پوری امت کے سلف سے لیکر خلف تک اس پر عمل کرتے آئے ہیں لوگوں میں کوتاہیاں ضرور پیدا ہوئی ہیں مگر وہ سنت تو محفوظ ہے جس پر اللہ کا نبی، خلفائے راشدین اور آپ کے متبعین چلتے آئے ہیں۔ یہی سنت ہے اور اس کے بغیر قرآن کی تبلیغ ممکن نہیں۔

ہدایت اور رحمت

فرمایا کہ آپ پر نازل کردہ کتاب وَهُدًى سراسر ہدایت ہے ہدایت سے مراد یہ ہے کہ انسان کو زندگی کے جس موڑ پر بھی راہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے، اللہ کی کتاب اس کے لیے راہنمائی بہم پہنچاتی ہے البتہ اس ہدایت اور راہنمائی کو تلاش کرنا خود انسان کا کام ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن پاک کی تعلیم ہی حاصل نہیں کریگا اور اس میں غور و فکر ہی نہیں کریگا تو اس کو ہدایت کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ اللہ نے سورۃ بقرہ میں فرمایا ہے "مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ" ہم نے بینات اور ہدایت دو چیزوں کو اتارا ہے بینات وہ چیزیں ہیں جو بالکل واضح ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور ہدایت ایسی چیز ہے جو استاد کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی سورۃ صف میں بھی ہے "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ" اللہ کی ذات وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا تو یہ ہدایت اللہ کے رسول یا اس کے متبعین اور مبلغین سے سیکھنا پڑتی ہے۔ اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور وقت کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ تب جا کر ہدایت نصیب ہوتی ہے۔

فرمایا ایک تو ہم نے ہدایت نازل فرمائی اور دوسری چیز وَرَحْمَةً رحمت ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کی نازل کردہ کتاب پر اس کی نازل

کردہ ہدایت کے مطابق عمل پیرا ہو جاتا ہے تو پھر اس کے نتیجہ میں اللہ کی رحمت اور مہربانی شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ انسان کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے اور اُسے نیکی کی مزید توفیق حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ البقرہ کی ابتداً میں بھی ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فرمایا یہ سارے انعامات اُن لوگوں کے حصے میں آتے ہیں لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ جو ایمان رکھتے ہیں۔ اور جن لوگوں کا ایمان ہی مکمل نہیں۔ وہ صدقِ قلب سے یقین ہی نہیں کرتے۔ اُن کے لیے نہ ہدایت ہے اور نہ رحمت، وہ محروم ہی رہیں گے۔

مادی حیات کا سامان

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور رحمت کا ذکر کر کے انسان کی روحانی زندگی کا سامان مہیا کیا اور اب آگے مادی زندگی کے لوازمات کا تذکرہ فرمایا وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی نازل فرمایا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کہ زمین کی موت یعنی اس کے خشک ہو جانے کے بعد پانی کے ذریعے اس کو دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔ ظاہر ہے کہ خشک زمین میں کوئی پیداوار نہیں ہوتی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برساتا ہے تو زمین میں ہریالی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں اناج اور پھل کاشت ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ نہ صرف انسان بلکہ تمام جانور، چرند اور پرند حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں کی زندگی کا انحصار بھی پانی پر ہے۔ پانی ہی کے ذریعے ان کے لیے چارہ، سبزیاں اور جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جو ان کی خوراک بنتی ہیں۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحانی زندگی کے لیے اپنی کتاب نازل فرمائی جس میں ہدایت اور رحمت ہے اور مادی زندگی کے لیے پانی اُتار کر یہ ضرورت بھی پوری فرما دی۔

زمین کے مختلف خطوں میں پانی کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں کوئی خطہ ارضی پانی کو اچھی طرح جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہاں خوب پیداوار ہو جاتی ہے اور کسی جگہ سے پانی گذر جاتا ہے۔ وہ زمین پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی لہذا پیداوار بھی نہیں دیتی، ہدایت کا سلسلہ بھی ایسا ہی ہے یہ انسان کے قلب پر پڑتی ہے۔ پھر جو قلوب اس کے طالب ہوتے ہیں اور اس کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ اس سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اور بعض سخت دلوں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لہذا وہ اسی طرح محروم رہتے ہیں جس طرح کوئی چٹان پانی کے اثرات کو قبول نہیں کرتی اور وہ اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔

فرمایا اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ بیشک اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔ جو لوگ بات کو سُن کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اُس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ اللہ اُن کی روحانی اور مادی دونوں ضروریات پوری فرماتا ہے۔ اور جو لوگ اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، انہیں نہ ہدایت نصیب ہوتی ہے اور نہ اللہ کی رحمت۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ
لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ
النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا
حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ :- اور بیشک تمہارے لیے مویشیوں میں البتہ عبرت ہے۔ پلاتے ہیں تم کو اس سے جو اُن کے پیٹ میں ہے۔ گوبر اور خون کے درمیان ہے دودھ خالص، خوشگوار پینے والوں کے لیے ﴿۶۶﴾ اور کھجوروں کے پھلوں اور انگور سے بناتے ہو تم نشہ اور اچھی روزی۔ بیشک اس میں البتہ نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ﴿۶۷﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے باطل عقائد کا ردّ فرمایا اور اُن کے بُرے انجام کا ذکر کیا۔ رسالت کے ضمن میں فرمایا کہ رسول کی امت کے بُرے اعمال کو شیطان نے انہیں مزّین کر کے دکھایا وہ اپنے شرکیہ عقائد اور باطل رسومات پر ہی جمے رہے اور رسولوں کی بات کو نہ مانا۔ پھر آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزمان پر کتاب یعنی قرآن نازل فرمایا تاکہ آپ اس کی اچھی طرح وضاحت کر دیں اور وہ تمام چیزیں واضح ہو جائیں جن میں لوگ اختلاف

کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہے مگر اہل ایمان کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر یہ کتاب نازل فرما کر انسان کی روحانی زندگی کا سامان کر دیا اور آسمان کی طرف سے بارش برسا کر ان کی مادی زندگی کا بندوبست کر دیا۔ فرمایا یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو کان لگا کر سنتے ہیں۔

مویشیوں میں سامانِ عبرت

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے مویشیوں اور بعض پھلوں کا ذکر کر کے ان کے فوائد کو بیان کیا ہے اور یہ بات سمجھائی ہے کہ اس میں دراصل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت تامہ کے دلائل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً اے لوگو! بیشک تمہارے لیے مویشیوں میں سامانِ عبرت ہے بہیمۃ الانعام کا ذکر سورۃ انعام میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ان سے مراد آٹھ قسم کے وہ نر اور مادہ جوڑے مراد ہیں جو انسانوں کے قریب رہتے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو انسان کی خدمت پر مامور کر رکھا ہے چنانچہ انسان انکی ہڈیاں گوشت دودھ، کھال اور اون استعمال کرتے ہیں۔ یہ آٹھ جوڑے، اونٹ (نر اور مادہ) گائے بھینس (نر اور مادہ) بھیڑ (نر اور مادہ) بکری (نر اور مادہ) ہیں۔ اگرچہ یہ طاقت میں انسان سے بہت زیادہ ہیں مگر اللہ نے ان کی سرشت میں یہ چیز ڈال دی ہے کہ وہ انسان کا حکم مانیں اور اس کی خدمت کریں۔ پھر بھی جب کسی جانور کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا انسان بلاوجہ تنگ کرتے ہیں تو وہ انہیں ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اس سلسلہ میں اونٹ کی دشمنی تو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے۔ بہرحال فرمایا ان مویشیوں میں تمہارے لیے عبرت کا سامان ہے۔ عبرت کا معنیٰ ہوتا ہے کسی معلوم چیز سے کسی نامعلوم چیز کو دریافت کرنا یعنی مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کو دیکھ کر مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں پر

یقین کرنا۔ مذکورہ مویشی جو نظر آرہے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ کی حکمت، قدرت اور اس کی توحید کو سمجھنا ہی عبرت ہے۔

دودھ کی نعمت

آگے اللہ تعالیٰ نے دودھ کا فلسفہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے نُسْقِيكُمْ مِّمَّا فِي بُطُونِهِ ہم پلاتے ہیں تم کو اُس چیز سے جو اِن مویشیوں کے پیٹ میں ہے۔ یہاں پر مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی بعض جانوروں میں سے پلاتے ہیں، سب کا ضروری نہیں۔ اور کیا پلاتے ہیں؟ لَبَنًا خَالِصًا خالص اور صاف ستھرا دودھ۔ جب یہ مویشی کے تھنوں سے برآمد ہوتا ہے تو بالکل خالص ہوتا ہے اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اور بالکل پاکیزہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی نجاست نہیں ہوتی۔ اللہ نے تو اس دودھ کو خالص اور پاکیزہ بنایا ہے جب یہ انسانوں کے ہاتھوں میں آتا ہے تو یہ خالص نہیں رہتا بلکہ اس میں پانی یا دوسری چیزوں کی ملاوٹ ہوجاتی ہے اور اس کی پاکیزگی میں بھی فرق آتا ہے کہ بعض اوقات اس میں ظاہری یا باطنی نجاست شامل ہوجاتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے دو ناپاک چیزوں مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ یعنی گوبر اور خون کے درمیان پیدا فرمایا ہے۔ جانور کے پیٹ میں ایک طرف گوبر کا ذخیرہ ہے جو خوراک کا فضلہ، بدبودار اور نجس ہے اور دوسری طرف خون ہے جو بجائے خود حرام اور ناپاک ہے۔ مگر انہی کے درمیان میں سے اللہ تعالیٰ نے دودھ جیسی نہایت ہی خالص اور صاف ستھری چیز کو پیدا فرمایا ہے تاکہ انسان اس کی لذت اور غذائیت سے مستفید ہوں۔

فرمایا یہ دودھ نہ صرف خالص اور پاکیزہ ہے بلکہ سَآئِغًا خوشگوار بھی ہے۔ اس کا ذائقہ بھی اچھا ہے اور یہ آسانی سے حلق میں بھی اتر جاتا ہے یعنی اس کے استعمال کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یہ لفظ

سورۃ ابراہیم میں آ چکا ہے۔ جہاں دوزخیوں کو پیپ ملا پانی دیئے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں فرمایا "وَلَا یَکَادُ یُسِیغُهٗ" وہ اسے حلق سے نیچے نہیں اتار سکیں گے، اس قدر بدبودار اور کڑوا ہوگا۔ مگر یہاں پر دودھ کے متعلق فرمایا کہ یہ خوشگوار ہے جو آسانی کے ساتھ حلق سے اتارا جاسکتا اور ایک بہت بڑی نعمت ہے لِلشّٰرِبِیْنَ پینے والوں کے لیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ، حکمتِ بالغہ، اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ فرمایا ان مویشیوں میں تمہارے لیے عبرت کا سامان ہے۔ تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنی ربوبیت کا کس طریقے سے اظہار فرمایا ہے۔

اس آیت کریمہ میں آمدہ لفظ بُطُوْنِهٖ غور طلب ہے اور اس میں مفسرین کرام نے بحث کی ہے۔ اس میں ہ کی ضمیر انعام یعنی جانوروں کی طرف لوٹتی ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے مگر یہاں پر ضمیر مفرد لائی گئی ہے۔ اس ضمن میں لغت کے امام کہتے ہیں کہ اگرچہ لفظ انعام جمع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر لفظ تو بہرحال مفرد ہی ہے، جیسے بعض حضرات لفظ اخلاق کو بھی مفرد شمار کرتے ہیں اگرچہ اس کا معنی جمع والا ہے۔ اسی طرح اخبار عام لفظ ہے۔ اگرچہ یہ خبر کی جمع ہے مگر یہ استعمال واحد ہوتا ہے اور اس کی جمع اخبارات آتی ہے۔ لہٰذا لفظ مفرد ہونے کی بناء پر انعام کی ضمیر بھی واحد ہی لائی گئی ہے۔ امام بیضاویؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ہ کی ضمیر انعام کی طرف نہیں بلکہ یہ محذوف لفظ مذکر کی طرف راجع ہے جو کہ واضح طور پر مفرد لفظ ہے۔ اس لحاظ سے بھی ضمیر کا مفرد آنا درست ہے۔ پہلے سے مذکور چیز بھی انعام ہی، اور وہ بھی مفرد لفظ ہے۔ ضمیر کے مفرد آنے میں کوئی اشکال نہیں۔ ویسے سورۃ مومن میں انعام ہی سے متعلق مؤنث اور مفرد ضمیر ھا بھی لائی گئی ہے۔ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔

دودھ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جس شخص کو اللہ دودھ عطا فرمائے[1] سے یوں دعا کرنی چاہیئے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْنَا مِنْہُ اے اللہ! اس نعمت میں مزید اضافہ فرما اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری نعمت حاصل ہو تو کہنا چاہیئے اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْنَا خَیْرًا مِّنْہُ اے اللہ! ہمیں اس سے بہتر نعمت عطا کر ہمگر دودھ چونکہ بہترین نعمت ہے، اس لیے اس میں اضافہ کی درخواست کی جاتی ہے حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد مبارک ہے کہ اکل وشرب کی تمام اشیاء میں سے دودھ ہی ایک ایسی چیز ہے جو کھانے اور پینے دونوں کے کام آتی ہے یہ ایک بہترین اور لذیذ مشروب بھی ہے اور غذائیت کے اعتبار سے بہترین غذا بھی ہے۔ اللہ نے دودھ میں غذائیت کے تمام اجزا نمکیات، لحمیات، پانی، چربی، روغن شامل کر دیے ہیں جو انسان کی جسمانی ساخت اور توانائی کے لیے ضروری ہیں۔ اسی لیے دو سال تک بچہ صرف دودھ پہ گزارا کرتا ہے۔ دودھ کے علاوہ اگر کوئی دوسری چیز نہ بھی ملے تو بھی اس کی نشوونما کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد موجود ہے کہ دودھ سے بہتر کوئی نعمت نہیں ہے لہذا اس میں اضافہ کی دعا کی گئی ہے۔ پھر یہ ہے کہ دودھ جنت کی نعمتوں میں بھی سرفہرست ہے۔ جہاں اللہ نے پانی شہد، شراب طہور کی نہروں کا ذکر کیا ہے، وہاں دودھ کی نہروں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

دودھ کی طہارت کے متعلق فقہائے کرام بحث کرتے ہیں۔ امام ابوبکر حصاصؒ نے بھی "احکام القرآن" میں لکھا ہے کہ اللہ نے دودھ کو اس قدر قوی طہارت عطا کی ہے کہ مردہ جانور کے تھنوں میں موجود دودھ بھی پاک ہی ہوگا اگرچہ مرنے کے بعد جانور خود ناپاک ہو چکا ہے بزرگان دین

[1] ترمذی صـ ۴۹۸

میں ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے اعمال کو بھی دودھ پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح دودھ میں گوبر یا خون کی ملاوٹ سے دودھ ناپاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسانی اعمال میں ریا اور ہوس کی ملاوٹ ہو گئی تو وہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ ریاکاری بھی اعمال کو ضائع کر دیتی ہے اور خواہشاتِ نفسانیہ اور بدعات بھی اعمال کے قاطع ہیں۔ لہٰذا انسان کے اعمال کو ان دو چیزوں سے پاک ہونا چاہیئے۔

دودھ کا کارخانہ

دودھ کی فراہمی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جانور کے جسم میں عجیب و غریب کارخانہ قائم کر رکھا ہے۔ جانور کی خوردہ غذا اُس کے معدے میں جاتی ہے۔ پھر اس غذا کے تمام لطیف اجزاء باریک باریک رگوں کے ذریعے کھینچ کر جگر میں آجاتے ہیں۔ جگر اِن کو خون میں تبدیل کرتا ہے جو کہ پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ چونکہ اس خون میں انسانی ساخت کے تمام اجزا شامل ہوتے ہیں اس لیئے یہ خون جس جس ساخت میں پہنچتا ہے وہ اپنی مطلوبہ غذا حاصل کر لیتا ہے اور باقی دوسری ساختوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق جب خون جانور کے تھنوں کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اس سے دودھ پیدا کرنے والے اجزا حاصل کر کے انہیں دودھ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کے جسم میں بہت بڑی فیکٹری لگا رکھی ہے۔ جہاں اللہ کے لاکھوں فرشتے کام کر رہے ہیں اور ہر جاندار کی ضروریات کی چیزیں تیار کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال اللہ نے دودھ کو اپنی قدرت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ یہ رنگت، ذائقے اور غذائیت کے لحاظ سے بہترین چیز ہے اور انسانوں کے لیے عبرت کا سامان بھی ہے۔

مشروب اور اچھی روزی

دودھ کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے کارآمد پھلوں کا ذکر فرمایا ہے اور انہیں اپنی قدرت تامہ اور وحدانیت کی دلیل

کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ کھجوروں کے پھل اور انگوروں سے تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا تم نشے والی چیز بناتے ہو وَرِزْقًا حَسَنًا اور اچھی روزی بھی تیار کرتے ہو۔ کھجور اور انگور ایسی چیزیں ہیں جن سے شراب بھی بن سکتی ہے اور اچار، مربّے، چٹنی اور غذائیت کی دوسری چیزیں بھی تیار ہوتی ہیں یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب جیسی حرام چیز کا ذکر کیسے فرمایا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی ہے۔ جب کہ ابھی شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر شراب کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ اس کو رِزْقًا حَسَنًا (حلال اور پاکیزہ روزی) سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمہارے لیے کھجور اور انگور پیدا فرما دیے ہیں۔ اب تم اپنی صوابدید کے مطابق خواہ ناپسندیدہ نشہ آور چیز شراب تیار کر لو یا اسے مشروب اور سرکے کی صورت میں حلال طور پر استعمال کر لو۔

اس بات میں کلام نہیں کہ حرمتِ شراب کے سلسلے میں جن مراحل سے گزرنے کے بعد قطعی حرمت کا حکم آیا، ان میں یہ آیت پہلا مرحلہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لطیف پیرایہ میں اس کی ناپسندیدگی کا ذکر کر دیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں سورۃ بقرہ کی آیت يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ نازل ہوئی۔ لوگ حضور علیہ السلام سے اس کی حرمت و علت کے متعلق دریافت کرتے تھے، تو اللہ نے فرمایا کہ شراب اور جوئے میں نقصانات بھی ہیں اور فوائد بھی مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ اس طرح گویا شراب کی قباحت سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ پھر تیسرا مرحلہ وہ آیا جب شراب کے نشے میں مخمور ایک صحابی نے امامت کرائی تو

قرآن پاک غلط پڑھ دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا حکم آیا "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى" (النساء) یعنی نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ لوگ پھر بھی گاہے بگاہے شراب استعمال کرتے رہے اور بالآخر چوتھے مرحلے میں جا کر حرمت کا قطعی حکم آ گیا "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" (المائدہ) بہرحال اُس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی اس لیے اللہ نے یہاں پر بطور احسان یاد دلایا ہے کہ اس نے تمہارے لیے کھجور اور انگور پیدا کیے جس سے تم شراب بھی کشید کرتے ہو اور طیب روزی کے طور پر بھی مستفید ہوتے ہو۔

غلط "سکر" کی تحقیق

امام ابو عبیدہؒ اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر "سکر" سے مراد نشے والی چیز نہیں بلکہ "خوراک" مراد ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ خوراک یا غذا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ اس کی مثال بیان کرتے ہیں کہ کسی نے کہا ہے جَعَلْتَ اَعْرَاضَ الْكِرَامِ سُكَرًا" تو نے شرفا کی عزتوں کو خوراک بنا لیا ہے کسی شاعر نے بھی کہا ہے لِعِزَّةَ مِنْ اَعْرَاضِنَا مَا اسْتَحَلَّتِ خوشگواری ہو عزی کے لیے کہ اُس نے تمہاری آبروؤں کو کھا لیا ہے یعنی ہماری غیبت کر کے ہماری عزتوں کو کھا لیا ہے۔ خدا کرے کہ اُس سے زیچ جائیں هَنِيْئًا مَرِيْئًا غَيْرَ دَاءٍ مُخَامِرٍ بالکل خوشگوار ہو اور بدہضمی نہ ہو۔ تو گویا سکر کا معنی خوراک بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام شعبیؒ جنہوں نے پانچ سو صحابہ کی زیارت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سکر سے مراد پینے کی چیز ہے نہ کہ نشہ آور چیز۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ حبشی زبان میں سرکے کو سکر کہا جاتا ہے جو کہ حلال چیز ہے۔ بہرحال مفسرین کرام نے سکر کا معنی خوراک بھی کیا ہے اور محض مشروب بھی اور سرکہ بھی۔ اگر معانی کو پیش نظر رکھا جائے

تو نشہ آور چیز والا اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ شراب ہماری شریعت میں ہر حال حرام ہے اور اس کا کشید کرنا۔ بیچنا، خریدنا اور پینا پلانا سب حرام ہے۔
فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ بیشک اس میں صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانی ہے۔ شراب کو خامر العقل اسی لیے کہا گیا ہے کہ یہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ شرابی آدمی تو اس کے نشے میں ہی مخمور رہیگا، البتہ جو اس کے قریب نہیں جاتا، اس کی عقل و خرد قائم رہے گی اور وہی اس نشانی سے مستفید ہو سکے گا۔ ایسا شخص اللہ کی قدرت تامہ کو خوب سمجھ جائے گا اور پھر اسے وحدانیت خداوندی اور معاد پر یقین آجائے گا۔ بہر حال مذکورہ اشیاء قدرت الٰہی کے نمونے ہیں جو روزمرہ ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں اور ہم ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ
مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ﴿۶۸﴾
ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ
سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِہَا شَرَابٌ
مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ
ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

ترجمہ :- اور وحی کی تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کی طرف کہ بناؤ پہاڑوں میں گھر اور درختوں پر اور اُن جگہوں پر جو چھپر باندھتے ہیں لوگ ﴿۶۸﴾ پھر کھاؤ ہر قسم کے پھل ، اور چلو اپنے راستوں پر ہموار کیے ہوئے نکلتا ہے اِن کے پیٹوں سے ایک مشروب جس کی رنگت مختلف ہوتی ہے ۔ اس میں شفا ہے لوگوں کے لیے ۔ بیشک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۶۹﴾

ربط آیات

شرک اور مشرکین کے ردّ کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید اور قیامت کے متعلق دلائل بیان فرمائے ۔ اِن میں سے پہلے آسمان سے پانی نازل کرنے کا ذکر ہوا ۔ پھر مویشیوں ، انگوروں اور کھجوروں کا تذکرہ ہوا ۔ اِن کے فوائد بیان کرکے اللہ نے انہیں بطور دلیل ذکر کیا کہ اِن چیزوں میں غور و فکر کرکے انسان اللہ تعالیٰ

کی وحدانیت، اُس کی قدرت اور حکمت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اب اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کیسا کمال رکھا ہے جو انسان کے لیے نہایت لذیذ اور مشفی مشروب مہیا کرتی ہیں اس سورۃ کا نام سورۃ النحل اسی مناسبت سے ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر ہے۔

مکھیوں کی طرف وحی

ارشاد ہوتا ہے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اور وحی کی آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کی طرف۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس وحی سے مراد رسالت اور نبوت والی وحی نہیں ہے کیونکہ وہ تو انبیاء اور رسولوں کے ساتھ مختص ہے البتہ اس وحی سے الہام مراد لیا جا سکتا ہے کیونکہ الہام عام ہے جو انبیاء اور غیر انبیاء سب کو ہو سکتا ہے۔ اس الہام کی نوعیت بالکل وہی ہے جس قسم کا الہام اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف کیا تھا۔ وہاں بھی یہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں "وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی" (القصص) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف الہام کیا یعنی اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس بچے کی جان کی خاطر اسے صندوق میں بند کر کے پانی میں بہا دیں۔ ظاہر ہے کہ اُم موسیٰ نبی تو نہیں تھیں، لہذا اُن کی وحی کی نوعیت بھی الہام والی تھی۔ الہام کے ذریعے بعض اوقات اللہ تعالیٰ کوئی چیز دل میں ڈال دیتا ہے اور بعض اوقات کوئی فرشتہ انسانی صورت میں متشکل ہو کر آتا ہے اور کوئی بات کہہ دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام کا الہام اسی نوعیت کا تھا فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا (مریم) ہم نے اس کی طرف فرشتہ بھیجا جو اُس کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا۔ الہام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی غیبی آواز (ہاتف) کے ذریعے کوئی اشارہ مل جائے۔

تاہم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ شہد کی مکھیوں یا ایسے ہی دوسرے جانوروں کے الہام کی صورت یہ ہے کہ اُن کے ہاں خارجی دنیا سے کوئی

فرشتہ نہیں آتا اور نہ ہی وہ اتنے عقل و شعور کے مالک ہوتے ہیں کہ بوقت ضرورت اُن کے ذہن میں کوئی چیز ڈال دی جائے بلکہ اُن کی طرف وحی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی فطرت میں کوئی چیز ڈال دی ہے جس کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اُن کو صورتِ نوعیہ کے اعتبار سے کوئی بات سمجھا دیتا ہے۔ تو گویا شہد کی مکھیوں کی طرف وحی کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے اُن کی طبیعت اور مزاج میں یہ بات ڈال دی ہے جس کا ذکر اگلے جملے میں آ رہا ہے۔

مکھیوں کا چھتہ

وہ بات یہ ہے اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا کہ تم پہاڑوں میں اپنا گھر یعنی چھتہ بنا لو۔ مِنْ سے مراد یہ ہے کہ ہر پہاڑ کی ہر غار میں نہیں بلکہ بعض پہاڑوں میں اپنا چھتہ قائم کر لو۔ یہی چھتہ شہد کی مکھیوں کا گھر ہے جہاں وہ شہد کا ذخیرہ جمع کرتی ہیں جس میں سے خود بھی کھاتی ہیں اور بچوں کو بھی کھلاتی ہیں۔ یہ گویا شہد کا ڈپو ہوتا ہے۔ پھر جب قرب و جوار کے لوگوں کو کسی ایسے چھتے کا علم ہو جاتا ہے تو پھر وہاں سے سیروں نہیں بلکہ منوں کے حساب سے شہد برآمد ہوتا ہے۔

فرمایا پہاڑوں میں اپنا گھر بنا لو وَمِنَ الشَّجَرِ یا مناسب درختوں پر چھتہ لگا لو۔ بعض بڑے بڑے درختوں پر مکھیاں چھتہ بنا کر شہد اکٹھا کرتی ہیں۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق جہاں مناسب سمجھتی ہیں، کسی اونچی یا نیچی شاخ پر گھر بنا لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ فرمایا وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ اور لوگوں کے تعمیر کردہ چھپروں میں چھتہ لگا لو۔ چھپر سے مراد لکڑی کا وہ فریم ہے جو انگور وغیرہ کی بیل چڑھانے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی دیگر ضرورت کے لیے بھی عارضی طور پر چھپر تعمیر کیا جاتا ہے اور شہد کی مکھیاں اِن جگہوں پر بھی اپنے چھتے بنا لیتی ہیں۔ الغرض! اللہ نے شہد کی مکھیوں کی فطرت میں یہ بات ڈال رکھی ہے کہ وہ پہاڑوں میں

درختوں پر یا چھپروں کے اندر اپنا چھتہ تعمیر کر لیں۔

پھلوں سے استفادہ

دوسری بات اللہ نے مکھیوں کی فطرت میں یہ ڈال دی ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے کھاؤ، اس سے مراد دنیا بھر کے تمام پھل نہیں بلکہ وہ پھل مراد ہیں جو شہد کی مکھیوں کے طبائع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی اخروٹ یا بادام وغیرہ کا پھل توڑ کر تو نہیں کھا سکتی، مگر وہ انگور، کھجور، ناشپاتی، آم وغیرہ تو آسانی سے کھا سکتی ہے اور كل الثمرات سے ایسے ہی پھل مراد ہیں یہ بالکل اسی طرح کا طرزِ کلام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ملکہ سبا کے متعلق فرمایا "وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ" کہ اس کو ہر چیز عطا کی گئی۔ یہاں بھی ہر چیز سے دنیا بھر کی چھوٹی بڑی چیزیں نہیں بلکہ وہ چیزیں مراد ہیں جن کا تعلق امورِ مملکت سے ہو سکتا ہے مثلاً فوج، اسلحہ، مال و دولت، امیر، وزیر، کارندے وغیرہ

یہاں پر اللہ نے شہد کی مکھیوں سے فرمایا کہ ہر قسم کے پھلوں میں سے کھاؤ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا اور اپنے پروردگار کے ہموار کردہ راستوں پر چلتی رہو۔ ذُلُل کا معنی آسان کرنا بھی آتا ہے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی میں یہ خوبی ڈال دی ہے کہ وہ اپنے چھتے سے کتنی بھی دور چلی جائے، یہ واپسی پر بھولتی نہیں کیونکہ اللہ نے اس کے لیے راستے ہموار اور آسان فرما دیے ہیں۔ یہ آسانی کے ساتھ بغیر بھولے اپنے چھتے پر پہنچ جاتی ہے۔

شہد میں شفا ہے

اب آگے اللہ نے مکھیوں کے ذریعے شہد کی پیداوار کی وضاحت فرمائی ہے يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ ان مکھیوں کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا مشروب نکلتا ہے۔ شہد سفیدی مائل بھی ہوتا ہے اور سرخی مائل بھی۔ کبھی یہ بھورے رنگ کا ہوتا ہے اور کبھی گلابی رنگ کا، جس قسم کا ماحول اور جس قسم کی خوراک مکھیوں کو میسر آتی ہے اسی

قسم کا شہد بھی ان کے پلیٹوں سے برآمد ہوتا ہے۔ اور پھر یہ شہد محض تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اللہ نے اس میں لوگوں کے لیے شفا بھی رکھی ہے۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "عَلَیْکُمْ بِالشِّفَآئَیْنِ الْعَسَلُ وَالْقُرْاٰنُ" یعنی شفا والی دو چیزوں کو لازم پکڑو، ایک شہد ہے اور دوسری قرآن پاک سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ" ہم نے قرآن پاک کو نازل فرمایا ہے جس میں مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم باطنی بیماریوں یعنی سینے کے تمام روگوں کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور بداخلاقی کی شفا ہے جب کہ شہد میں اللہ نے ظاہری امراض کی شفا رکھی ہے۔ شہد چونکہ گرم تاثیر رکھتا ہے اس لیے یہ امراض باردہ یعنی بلغمی بیماریوں میں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ زہر کا تریاق (ANTISEPTIC) اینٹی بائیڈیٹک بھی ہے یونانی طب میں معجونوں اور گولیوں کی افادیت کو تادیر قائم رکھنے کے لیے شہد میں تیار کیا جاتا ہے جب کہ نئی میڈیکل سائنس میں اس کام کے لیے سپرٹ کا استعمال ہوتا ہے۔ تاہم مفسرین فرماتے ہیں کہ شہد میں ہر بیماری کے لیے شفا نہیں بلکہ یہ شفا نکرہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کئی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں، عَلَیْکُمْ بِالسَّنَا وَالسَّنُّوْتِ یعنی سنا اور سنوت کو لازم پکڑو۔ سنا ایک قسم کی جڑی بوٹی ہے جس میں اللہ نے کئی بیماریوں کی شفا رکھی ہے اور سنوت سویا یا شہد کو کہتے ہیں فرمایا اس میں شفا ہے لیکن موت کی شفا کسی چیز میں نہیں، وہ اپنے وقت پر آکر رہے گی۔

ایک صحیح حدیث میں یہ واقعہ بھی آتا ہے کہ کسی شخص نے حضور علیہ السلام

کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بھائی کے اسہال کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا، اس کو شہد پلاؤ۔ اس شخص نے جا کر ایسا ہی کیا مگر مرض بڑھ گیا۔ وہ پھر حاضر ہوا تو آپ نے دوبارہ فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ۔ دوبارہ پلانے سے اسہال میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب حضور علیہ السلام کے پاس ذکر کیا گیا تو آپ نے تیسری مرتبہ شہد پلانے کے لیے کہا مگر پھر بھی افاقہ نہ ہوا۔ جب وہ شخص چوتھی مرتبہ حاضر خدمت ہوا۔ تو آپ نے فرمایا، اللہ کا فرمان سچا ہے کہ شہد میں شفا ہے، مگر تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ بہرحال جب مریض کو چوتھی مرتبہ شہد پلایا گیا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ جب تک گندہ مادہ پیٹ میں موجود رہا۔ وہ نکلتا رہا، اور جب ختم ہو گیا تو مریض کے اسہال بند ہو گئے۔ اللہ نے شہد میں اس قسم کے مادے رکھے ہیں۔

حضرت علیؓ کے قول میں یوں بھی آتا ہے کہ کسی شخص نے بیماری کی شکایت کی تو فرمایا کہ کسی برتن میں قرآنِ کریم کی کوئی آیت لکھو۔ پھر اس کو بارش کے پانی سے صاف کرو۔ اس کے بعد اپنی بیوی کے حق مہر میں سے ایک درہم لو۔ جب وہ اپنی خوشی خاطر سے دے دے تو اس درہم سے شہد خریدو پھر وہ شہد بارش کے مذکورہ پانی میں ملا کر پی لو، اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔ اللہ نے بارش کے پانی کو "مَآءً طَهُورًا" یعنی پاکیزہ پانی فرمایا ہے اور شہد کے متعلق کہا ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، تو حضرت علیؓ نے ان دونوں چیزوں کے مرکب کو استعمال کرنے کی ہدایت کی۔

شہد کی پیداوار

شہد کی پیداوار کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ یہ مکھیوں کے پیٹ سے مختلف رنگوں کے مشروب کی صورت میں نکلتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ شہد کی پیداوار کیسے ہوتی ہے۔ اس میں سائنسدانوں کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ لعاب کی شکل میں مکھی کے منہ سے نکلتا ہے۔ اس کی مثال ریشم کے کیڑے کی ہے۔ وہ بھی اپنے لعاب کے ذریعے ریشم پیدا کرتا ہے

وہ اپنے منہ سے نکلنے والا مادہ اپنے گرد لپیٹتا رہتا ہے اور اس طرح ریشم کے لمبے تار کی ایک ڈوری سی بن جاتی ہے جسے بعد میں الگ کر کے ریشم حاصل کر لیا جاتا ہے اور اس سے نفیس ترین لباس تیار کیا جاتا ہے اسی طرح مکھی کے منہ سے نکلنے والے لعاب سے شہد کی صورت میں بہترین مشروب حاصل ہوتا ہے۔ البتہ بعض فرماتے ہیں کہ شہد مکھی کے منہ کا لعاب نہیں بلکہ اس کا فضلہ ہوتا ہے۔ افلاطون کا شاگرد اور سکندر کا استاد ارسطو یونان کا بہت بڑا حکیم گزرا ہے اس کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو سال قبل کا ہے اس نے ایک دفعہ تحقیق کرنے کی کوشش کی کہ شہد مکھی کا لعاب ہے یا فضلہ۔ اس نے شیشے کا ایک بہت بڑا بکس بنوایا اور اس میں مکھیوں کا چھتہ لگا کر مکھیوں کو شیشے کے صندوق میں بند کر دیا تاکہ دیکھیں کہ شہد کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مکھیوں نے شہد پیدا کرنے سے پہلے شیشے کے اس صندوق کی ساری دیواروں پر موم لگا دی تاکہ باہر سے کچھ نظر نہ آسکے اور اس کے بعد انہوں نے شہد کی پیداوار شروع کی، اور اس طرح ارسطو اپنی تحقیق مکمل نہ کر سکا۔

شہد کی مکھی میں اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ یہ اپنے چھتے میں عجیب و غریب قسم کے چھوٹے چھوٹے شش گوشہ گھروندے یا خانے بناتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا انجینئر بھی ٹھیک ٹھیک شش گوشہ شکل جیومیٹری بکس کے بغیر نہیں بنا سکتا مگر مکھی کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ باریک باریک دیواروں پر چھپکونے والا ایسا گھروندا بناتی ہے کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بہرحال شہد ایک پاکیزہ اور مرغوب چیز ہے جو انسانوں کی غذا اور دوائی میں استعمال ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔

مکھیوں کی فضیلت

شہد کی مکھی اگرچہ ایک چھوٹا سا جانور ہے مگر اللہ نے اس میں بڑی افادیت رکھی ہے ۔ اللہ نے اسے زہریلا ڈنک عطا کیا ہے ۔جس کے ذریعے وہ دشمن سے اپنی حفاظت کرتی ہے ۔مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ شہد کی مکھی ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر اللہ نے انسانوں کے فائدے کے لیے اس کے ذریعے لذیذ ترین چیز پیدا فرمائی ہے ۔اس سے مولانا یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے ۔حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے رُبَّ اَغْبَرَ اشْعَثَ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ یعنی غبار آلود بالوں والے کتنے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ قسم اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں حانث نہیں ہونے دیتا یعنی اُن کی قسم پوری ہو جاتی ہے ۔بعض روایات میں آتا ہے کہ دوزخیوں کو سزا دینے کے لیے موذی جانور سانپ ، بچھو ، مکھی وغیرہ دوزخ میں جائیں گے سوائے شہد کی مکھی کے کہ یہ دوزخ میں نہیں جائیگی کیونکہ یہ لوگوں کے لیے نہایت ہی مفید شہد تیار کرتی ہے

مکھیوں کی تنظیم

اس چھوٹی سی مخلوق میں اللہ تعالیٰ نے تنظیم کا وہ مادہ رکھا ہے جو انسانوں کے لیے بھی درسِ عبرت ہے ۔شہد کی مکھیوں کے بادشاہ کو یعسوب کہا جاتا ہے جو عام مکھیوں سے قدو کاٹھ میں بڑا ہوتا ہے اِن مکھیوں میں اتنا نظم و ضبط (ڈسپلن DISCIPLINE) ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کے حکم کی ذرہ بھر بھی خلاف ورزی نہیں کرتیں ۔ یہ فوج کی طرح منظم ہوتی ہیں اور ان کا بادشاہ جہاں جانے کا حکم دے وہاں پہنچ کر خوراک حاصل کرتی ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے ۔ اللہ نے ان کے لیے راستوں کو آسان بنا دیا ہے ، یہ دور و نزدیک جہاں بھی جائیں اپنے ڈپو پر واپس آجاتی ہیں ۔ اس مکھی کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ یہ گندگی پہ نہیں بیٹھتی ۔ اگر کوئی مکھی کسی دوسری مکھی کو گندگی پر بیٹھی دیکھ لے تو فوراً بادشاہ کے پاس شکایت ہو جاتی ہے اُس کا باقاعدہ کیس پیش ہوتا ہے ، گواہی ہوتی ہے اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو مجرمہ کو سزائے موت تک ہو جاتی ہے ۔ بادشاہ

کی طرف سے اشارہ پاکر دوسری مکھیاں مجرمہ کو پکڑ کر دو ٹکڑے کر دیتی ہیں۔

غور و فکر کا مقام

آخر میں اللہ نے فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ بیشک اس میں البتہ نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک معمولی مکھی سے اللہ نے کتنی عمدہ چیز پیدا فرمائی ہے۔ اِن مکھیوں میں کتنی تنظیم اور فرمانبرداری کا کتنا جذبہ موجود ہے۔ وہ مقررہ اصولوں کی کس قدر پابندی کرتی ہیں۔ صرف پاک چیزیں کھاتی ہیں اور گندگی کے قریب بھی نہیں جاتیں۔ وہ اپنا گھر وندا کمال حکمت کے ساتھ بناتی ہیں جو صناعی کا بہترین شاہکار ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں بنی نوع انسان کو دعوت غور و فکر دیتی ہیں اور انہیں بھی قوانین کی پابندی کا درس دیتی ہیں۔ اگر انسان مکھیوں کی طرح اپنے اصولوں پر قائم ہو جائیں تو اُن کی معاشرتی زندگی میں کبھی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ اس وقت انسان جس ظلم، زیادتی، اسراف، حرام کاری، بدکاری، عیاشی اور فحاشی میں مبتلا ہیں، اُس سے نکل جائیں اور انہیں آرام و سکون کی زندگی میسّر آجائے۔ بہرحال شہد کی مکھیوں کے ہر فعل میں انسان کے لیے عبرت کا سامان ہے۔ جو شخص غور و فکر کریگا وہ اللہ کی قدرت کو سمجھ جائے گا اور اُس کی وحدانیت پر ایمان لے آئے گا۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۷۰ ع

ترجمہ :- اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا ہے تم کو ۔ پھر وہ وفات دیتا ہے تم کو ۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں کہ جن کو لوٹایا جاتا ہے رذیل عمر کی طرف تاکہ نہ جانے وہ علم کے بعد کچھ بھی ۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ، اور قدرتِ تامہ کا مالک ہے ۷۰

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے پہلے شرک اور مشرکین کا ردّ فرمایا ۔ اس کے بعد اپنی قدرت کی چند مثالیں بیان کیں جو اُس کی وحدانیت کی دلیل بنتی ہیں ۔ منجملہ اُن کے آسمان کی طرف سے پانی کا نزول اور اس کے ذریعے مختلف چیزوں کی پیدائش کا ذکر ہے پھر مویشیوں سے دودھ اور پھلوں سے پاکیزہ روزی کا ذکر ہوا ۔ شہد کی مکھیوں کے ذریعے نہایت مفید اور مرغوب شہد کا بیان ہوا جس میں اللہ نے بہت سی بیماریوں کے لیے شفا رکھی ہے ۔ فرمایا یہ اُس کی قدرت کے بیرونی دلائل ہیں ۔ اور یہ کن لوگوں کے لیے مفید ہیں ؟ فرمایا "لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ" غور وفکر کرنے والوں کے لیے ، "لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ" عقل سے کام لینے والوں کے لیے ، "لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ" یقین رکھنے والوں کے لیے ، اور "لِقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ" کان لگا کر سننے والوں کے لیے ۔

اب آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندرونی حالات کو موضوع

سخن بنایا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر انسان اپنی زندگی کے مختلف مراحل پر ہی غور کرے تو اُسے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت سمجھ میں آسکتی ہے سورۃ الذّریٰت میں موجود ہے "وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ" خود تمہارے نفسوں کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تخلیقِ انسانی کا ذکر کیا ہے وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ یعنی انسان کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اللہ نے اُسے تخلیق کی نعمت عطا کی ہے اور وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے انسان کو پیدا فرما کر یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ "قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا" (الطلاق) اُس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے کائنات کے لیے بحیثیت مجموعی فرمایا "مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی" (الاحقاف) آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کے لیے وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا۔ تو کائنات کا پورا نظام ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح قوموں کے لیے بھی اللہ نے مختلف اوقات مقرر فرمائے ہیں۔ ایک وقت میں انہیں عروج حاصل ہوتا ہے تو دوسرے وقت میں اُن پر زوال آجاتا ہے۔ اسی طرح ہر متنفس کے لیے وقت مقرر ہے۔ اُس کی زندگی ایک خاص مدت تک کارآمد رہتی ہے اور پھر انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا ہے ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمۡ پھر وہ تم پر موت طاری کر دیتا ہے۔ جب تک اُس کو منظور ہوتا ہے، انسان کو زندہ رکھتا ہے اُسے زندگی کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے اور پھر موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

انسانی زندگی میں کئی عروج و زوال آتے ہیں۔ انسان پیدا ہوتا ہے،

بچپن گزار کر جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے پھر اس پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بعض کو زیادہ موقع نہیں ملتا اور وہ ابتدائی عمر میں فوت ہو جاتے ہیں بعض جوانی میں اور بعض بڑھاپے کی عمر میں موت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور پھر بعض اس سے بھی آگے طبعی مدت پوری کر کے فوت ہوتے ہیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے انسان کی طبعی عمر ایک سو بیس سال ہے اللہ نے انسان کے جسم کی مشینری کو اتنے عرصہ کے لیے کارآمد بنایا ہے بشرطیکہ اس کے قویٰ میں کوئی خرابی واقع نہ ہو۔ حضرت حکیم بن حزام کو اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی عمر عطا فرمائی۔ پہلے زمانے میں لوگوں کی اوسط عمر زیادہ تھی مگر اب شاذ و نادر ہی کوئی لمبی عمر پاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے اَعْمَارُ اُمَّتِیْ مَا بَیْنَ سِتِّیْنَ اِلٰی سَبْعِیْنَ وَقَلَّ مَنْ یَّجُوْزُ ذٰلِكَ یعنی میری امت کے لوگوں کی عمریں عموماً ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوں گی اور بہت کم ہوں گے جو اس سے آگے جائیں گے۔ علماء اور محققین کہتے ہیں کہ ابتداء سے لے کر پینتیس ۳۵ برس تک کی عمر کا ایک مرحلہ ہوتا ہے اس عرصہ میں انسان کے قوائے ظاہرہ اور باطنہ مکمل ہوتے ہیں اور ان میں کوئی منفی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ پھر چالیس سال کی عمر سے ساٹھ سال کی عمر تک دوسرا دور ہوتا ہے۔ یہ درمیانہ عرصۂ حیات ہے جو کہ انسان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ بچپن میں قویٰ نامکمل ہوتے ہیں اور انسان میں ناپختگی ہوتی ہے، اسی لیے بچہ مکلف بھی نہیں ہوتا۔ البتہ یہ درمیانی عرصہ ہی بہترین عرصہ ہوتا ہے جس میں انسان دین اور دنیا کا کام صحیح طور پر انجام دے سکتا ہے۔ اگر اس عرصۂ زندگی کو انسان اچھے کاموں میں استعمال کرے تو وہ ترقی کرتا ہے اور بھرپور زندگی گزارتا ہے۔ انسان کی ابتدائی زندگی کو بھی اللہ نے ضعف پر محمول کیا ہے۔ جیسے فرمایا "اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً" (الروم) اللہ کی ذات وہی ہے جس نے انسان کو کمزور حالت میں پیدا کیا، پھر اس کے بعد قوت

عطا کی، پھر ضعف اور بڑھاپے کی حالت طاری کر دی - اسی لیے حضور علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر سے پناہ مانگی ہے جس کے الفاظ اس طرح آتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْکَسَلِ وَمِنْ سُوْٓءِ الْعُمُرِ وَمِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں بخل اور سستی سے، بڑی عمر اور رذیل عمر سے، مسیح دجال کے فتنہ سے، زندگی اور موت کے فتنہ سے اور قبر کے عذاب سے۔

ارذل العمر

فرمایا انسانی زندگی کا دوسرا اور بہترین دور چالیس سے ساٹھ تک کا ہے اور اس کے بعد تیسرا دور بڑھاپے کا ہوتا ہے جو کہ پچھتر سال کی عمر تک چلتا ہے پھر جو کوئی اس عمر کو پہنچ جائے اس کا ارذل العمر شروع ہو جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ دور اسی ۸۰ سال کی عمر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسی حصہ زندگی کے متعلق اللہ نے اس آیت میں فرمایا ہے وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جن کو رذیل عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اس عمر کو پہنچ کر انسان کے قویٰ اضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ کوئی کام ٹھیک طریقے سے نہیں کر سکتا۔ اس کے اعضاء میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی معدہ خراب اور کبھی پیشاب کی تکلیف، کبھی آنتوں میں تکلیف اور کبھی دانتوں میں خرابی۔ سماعت اور بینائی تو اکثر جواب دے دیتی ہے اور انسان بیکار محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے ارذل العمر سے خدا کی پناہ مانگی ہے۔ اصل کام کاج اور عبادت الٰہی کے لیے درمیانہ عرصہ حیات ہی بہترین ہے، حضور علیہ السلام نے سات آدمیوں کے متعلق بشارت سنائی کہ ان کو عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی ان میں وہ نوجوان بھی شامل ہے جس نے جوانی کی عمر عبادت میں گزاری۔

پیری شعراء کی نظر میں

پیرانہ سالی کے اس دور کو ہر آدمی محسوس کرتا ہے ، تاہم جب ایک شاعر اس مرحلے سے گزرتا ہے تو اس کے احساسات اشعار کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتے ہیں جگر مراد آبادی برصغیر کا معروف شاعر ہے جسے فوت ہوئے ابھی بیس سال کا عرصہ ہوا ہے۔ اس نے اپنے شعر میں کہا ہے۔

رندی و خراباتی در عہد شباب اولی

یعنی خواہ رندی ہو یا خراباتی ، یہ جوانی کی عمر میں ہی ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ بڑھاپے میں انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔

قدیم شعراء میں مومن خان مومن بھی صف اول کا شاعر تھا سُنی مسلمان ، سیّد احمد شہید بریلوی کا مرید اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا شاگرد تھا۔ وہ کہتا ہے

عہد شباب ہے زندگانی کا مزا
پیری میں کہاں ہے وہ نوجوانی کا مزا
یہ بھی کسی دن میں فسانہ ہو گا
باقی ہے جو باتوں میں کہانی کا مزا

جگر مراد آبادی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کریں۔

رخصت ہوئی شباب کے ہمراہ زندگی
کہنے کی بات ہے کہ جئے جا رہا ہوں میں

صوفی شعراء میں عراقی بڑے مشہور ہیں۔ انہوں نے بھی اس دور کا بڑے لطیف انداز میں ذکر کیا ہے۔

افسوس کہ ایام جوانی بگذشت
سرمایۂ عیش جاودانی بگذشت
خفتم بہ کنار جوئے چندان
کہ جوئے من آب زندگانی بگذشت

افسوس جوانی کا زمانہ گزر گیا حقیقت میں صحیح زمانہ عیش وہی تھا۔ میں ندی کے

کنارے اتنا سویا کہ میری اپنی زندگی کی ندی کا پانی بھی ختم ہوگیا۔
عربی شعراء میں سے ابوکبیر ہذلی اپنی بیٹی کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے

ازُهَیْرُ هَلْ مِنْ شَیْبَةٍ مِّنْ مَّعْدَلٍ
اَمْ لَا سَبِیْلَ اِلَی الشَّبَابِ الْاَوَّلِ

اے بیٹی زہیر! کیا بڑھاپے سے بدلنے کی بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟
کیا اس جوانی کے زمانے کی طرف پلٹنے والی کوئی بات ہو سکتی ہے؟

اَمْ لَا سَبِیْلَ اِلَی الشَّبَابِ وَذِكْرُهٗ
اَشْهٰی اِلَیَّ مِنَ الرَّحِیْقِ السَّلْسَلِ

یعنی مجھے تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک تو اس کا ذکر بھی شراب مصفا سے زیادہ پیارا ہے۔

سَئِمْتُ تَكَالِیْفَ الْحَیَاةِ وَمَنْ یَّعِشْ
ثَمَانِیْنَ حَوْلاً لَا اَبَالَكَ یَسْاَمِ

میں اسی زندگی سے دلگیر ہوگیا ہوں۔ تیرا باپ نہ رہے جو آدمی اسی سال کی عمر تک پہنچتا ہے، وہ یقیناً زندگی سے دلگیر ہوتا ہے۔

رَاَیْتُ الْمَنَایَا خَبْطَ عَشْوَاءَ مَنْ تُصِبْ
تُمِتْهُ وَمَنْ تُخْطِئْ یُعَمَّرْ فَیَهْرَمِ

میں نے موتوں کو ایسا دیکھا ہے جیسے اندھی اونٹنی ٹاک ٹوئیاں مارتی ہے جس کو مل گئی اس کو فنا کر دیا، اور جس سے خطا کر گئی اس کو عمر دے دی جاتی ہے وہ ہرم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ہرم ضعف اور انحطاط کی عمر کو کہا جاتا ہے۔
کسی نے یہ بھی کہا ہے۔

اِنَّ الثَّمَانِیْنَ وَبُلِّغْتَهَا
قَدْ اَحْوَجَتْ سَمْعِیَ اِلٰی تَرْجُمَانٍ

تحقیق خدا تجھے اسی سال کی عمر تک پہنچائے، اس نے مجھے تو ترجمان کی طرف

محتاج کر دیا ہے یعنی میرے قویٰ اسقدر مضمحل ہو چکے ہیں کہ اب میں ترجمان کے بغیر کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ نہ خود کسی کی بات سن سکتا ہوں اور نہ دوسرے کو اپنی بات سنا سکتا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ پچاس سال کے بعد انسان کی زندگی ایسی ہوتی ہے گویا کہ وہ غلط راستے WRONG SIDE (رانگ سائڈ) پر جا رہا ہو، وہ ہر وقت حادثات کے خطرہ سے دوچار رہتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔

گہے از دست و گہے از دل گہے ز پا مانم
بسرعت می روی اے عمر می ترسم کہ وا مانم

مطلب یہ کہ کبھی ہاتھ میں تکلیف ہو گئی، کبھی دل اور کبھی پاؤں میں خرابی پیدا ہو گئی۔ عمر تیزی سے گزر رہی ہے اور پھر ایسا ہوگا کہ ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکیں گے اور وہ نکل جائے گی۔

"البیان والتبیین" والے نے بشار ابن برد کا شعر نقل کیا ہے

وَالشَّيْبُ شَيْنٌ لِمَنْ أَرْسَى بِسَاحَتِهِ
لِلّٰهِ دَرُّ السَّوَادِ اللِّمَّةِ الْحَالِيْ

بڑھاپا تو ایک عیب ہے جس کے صحن میں اتر جائے۔ حقیقت میں زندگی کا بہترین دور وہی ہوتا ہے جب بال کالے ہوتے ہیں۔ سعدی صاحب نے کہا ہے، بلکہ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ شباب کو بچپن سے غنیمت سمجھو کہ یہ جلدی ختم ہو جائے گا۔ اور جو کچھ کرنا ہے شباب میں ہی کر لو۔ اس کو غنیمت سمجھو کہ یہ دور بھی ختم ہو جائے گا۔

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

نیکی کا کام کر لو اور زندگی کے ان لمحات کو غنیمت سمجھو۔ ایک دن آواز آئے گی کہ فلاں آدمی اس دنیا میں نہیں رہا۔

اسی طرح عمران ابن حطان کا شعر ہے

فَاعْمَلْ فَاِنَّکَ مَنْعِیٌّ بِوَاحِدَۃٍ
حَسْبُ اللَّبِیْبِ بِھٰذَا الشَّیْبِ مِنْ نَّاعِیْ

جو کچھ عمل کرنا ہے کر لو کیونکہ ایک دفعہ آواز اٹھے گی کہ فلاں آدمی مر گیا، اور اگر تم کسی ڈرانے والے کو تلاش کر رہے ہو۔ تو یہ بالوں کی سفیدی کافی ڈرانے والی ہے یہی موت کی خبر دیتی ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ قیامت کے دن چار چیزوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور جب تک کوئی ان کا جواب نہیں دے گا، اسے قدم نہیں اٹھانے دیا جائے گا۔ وہ چیزیں ہیں انسان کا عالمِ شباب، اس کی عمر، مال اور علم۔

فظہ کی زوری

بہرحال زندگی کا درمیانہ عرصہ ہی بہترین عرصہ ہے جس میں انسان کمال حاصل کر سکتا ہے۔ علم و ہنر سیکھ سکتا ہے اور عبادت و ریاضت کر سکتا ہے ملکی دفاع کے لیے اسی عمر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر محنت طلب کام اسی عمر کے حصہ میں کیا جا سکتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ذرا غور کرو کہ تمہیں پیدا کیا پھر موت طاری ہوتی ہے۔ اور درمیان میں ارذل العمر کا دور بھی آتا ہے جبکہ انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا کہ علم ہونے کے باوجود کچھ نہیں جانتا۔ حافظہ خراب ہو جاتا ہے۔ شباب کے عالم میں جو کچھ یاد تھا۔ وہ بھول چکا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ عالم ہونے کے باوجود بے علم ہو گیا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اس حصہ آیت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس امت میں کامل لوگ پیدا ہونے کے بعد پھر ناقص لوگ پیدا ہونے لگیں گے واللہ اعلم۔ بظاہر یہی حال نظر آتا ہے قرونِ اولیٰ کے لوگوں کے حالات پڑھیے اور پھر اس زمانے کے ساتھ مقابلہ کیجیے۔

انفرادیت اور اجتماعیت، اخلاقیات اور عبادات ہر لحاظ سے روبہ تنزل ہیں البتہ شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی کتاب کے

ساتھ تعلق رکھے گا، اس کی درس و تدریس میں مصروف رہیگا، اللہ تعالے اس نسیان کے مذکورہ عارضہ سے محفوظ رکھے گا۔ قرآن پاک کی برکت سے اُس کی یادداشت قائم رہے گی۔ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ عَلَیۡہِ قَدِیۡرٌ بیشک خدا تعالیٰ کی ذات سب کچھ جاننے والی اور قدرتِ تامہ کی مالک ہے تمام تغیرات اور تصرفات اُسی کے اختیار اور قدرت میں ہیں۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ
فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ
اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ
وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ
يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ
يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ
رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ:- اور اللہ نے فضیلت بخشی ہے تم میں سے
بعض کو بعض پر روزی کے معاملے میں۔ پس نہیں ہیں
وہ لوگ جن کو فضیلت بخشی گئی ہے، لوٹانے والے اپنی
روزی کو اُن پر جن کے مالک ہیں اُن کے دائیں ہاتھ
تاکہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا اللہ کی نعمت کا یہ
انکار کرتے ہیں ﴿۷۱﴾ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے بنائے ہیں

تمہارے لیے تمہاری جانوں میں سے تمہارے جوڑے ، اور بنائے ہیں تمہارے لیے تمہارے جوڑوں میں سے بیٹے اور پوتے ، اور روزی بخشی ہے تمہیں پاک چیزوں سے کیا یہ لوگ باطل پر یقین رکھتے اور اللہ کی نعمت کے ساتھ انکار کرتے ہیں (۷۲) اور یہ لوگ عبادت کرتے ہیں ، اللہ کے سوا ان چیزوں کی کہ نہیں مالک ان کے لیے روزی کے آسمانوں سے اور زمین سے کسی چیز کے بھی ، اور نہ وہ طاقت رکھتے ہیں (۷۳) پس نہ بیان کرو تم مثالیں اللہ کے لیے ۔ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۷۴)

ربط آیات

اللہ نے اپنی قدرت کی وہ نشانیاں بیان کیں جو اس نے انسان کے اندر اور بیرونی دنیا میں پیدا فرمائی ہیں ۔ پھر اسی مضمون کو شرک کی تردید میں بطور دلیل پیش کیا ۔ گذشتہ آیات میں بھی اللہ نے اپنے انعامات کا تذکرہ کیا تھا اور آج کی آیات بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں ۔ اللہ نے مشرکین کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اس کے انعامات کی ناقدری کرتے ہیں حالانکہ ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا ۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہوئے صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے ۔

رزق میں تفاوت

اب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان بھی یاد دلایا ہے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے فضیلت بخشی ہے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی کے معاملہ میں ۔ اللہ نے تمام مخلوق کے لیے روزی کے یکساں دروازے کشادہ نہیں کیے بلکہ بعض کو زیادہ روزی دی ہے اور بعض کو کم ۔ اس کمی بیشی کی حکمت اور مصلحت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو خود روزی رساں ہے اور یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ۔ دوسری جگہ تصریح

موجود ہے "وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ" (الشوریٰ) اگر اللہ تعالیٰ سب لوگوں کے لیے روزی کے یکساں دروازے کشادہ کر دیتا تو وہ زمین میں بغاوت کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق روزی نازل فرماتا ہے۔ کسی کو زیادہ مال دے دیا اور کسی کو کم۔ کسی کو افسر بنا دیا اور کسی کو ماتحت۔

حدیث شریف میں آدم علیہ السلام کا ذکر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اولاد کی تمام روحوں کو متمثل کر کے اُن کے سامنے پیش کیا تو ان میں تفاوت نظر آتا تھا۔ آدم علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا، پروردگار! لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ تو نے اپنے بندوں کے درمیان برابری کیوں نہیں رکھی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر میں سب کو یکساں کر دیتا تو کوئی شخص میرا شکریہ ادا نہ کرتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ذہنی قویٰ اور جسمانی، ظاہری اور باطنی طاقتیں ایک جیسی نہیں رکھیں، اس لیے اُن کے علم و عمل میں بھی فرق ہے اور پھر اُن کی روزی کا سلسلہ بھی کم و بیش رکھا ہے۔ کوئی امیر اور امیر تر ہے اور اسی طرح کوئی غریب اور غریب تر ہے حدیث میں آتا ہے کہ جب اپنے سے زیادہ نعمت والے کا خیال آئے تو اس کی طرف نہ دیکھو بلکہ اپنے سے کم تر کی طرف دیکھو "اَلَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ" تاکہ تم اللہ کی عطا کردہ نعمت کو حقیر نہ سمجھو۔ اللہ نے تمہیں بھی بہت سے لوگوں پر فضیلت دی، تم مال اور اولاد میں اُن سے بہتر ہو، گو یا تم سے کم تر لوگ بھی موجود ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور خدا کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو۔ اللہ نے انسانوں کے درمیان جو تفاوت رکھا ہے وہ بالکل فطری ہے جس طرح استعداد اور محنت میں فرق ہے، اسی طرح روزی بھی برابر نہیں

حقوق کی ادائیگی

یاد رکھنا چاہیئے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے روزی زیادہ بخشی ہے اس کے ذمے حقوق بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ ہم سورۃ الروم میں پڑھتے ہیں "فَاٰتِ

ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ" قرابتداروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو۔ اگر اللہ نے مال دیا ہے تو پھر یہ حقوق بھی پورے کرو، ورنہ ماخوذ ہوگے۔ مال میں مختلف قسم کے حقوق ہیں کوئی فرض، کوئی واجب اور کوئی نفل۔ اگر کسی مالدار کے اقربا محتاج ہیں تو اس کے ذمے واجب ہے کہ وہ اُن کی اعانت کرے، تاکہ وہ بھوکے ننگے نہ رہیں عام انسانی سوسائٹی کا بھی یہی قانون ہے۔ اگر دولت مند نادار کی مدد نہیں کرے گا تو اللہ کے ہاں جوابدہ ہوگا۔ بہرحال جو صاحبِ حیثیت ہے اُس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے اور اُسے اپنے مال کا حساب دینا ہوگا کہ اُس نے یہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟

مختلف نظام ہائے معیشت

آجکل غیر فطری مساوات کا نعرہ لگایا جا رہا ہے۔ کہ سب برابر ہیں۔ اس معاملہ میں اشتراکی ممالک پیش پیش ہیں۔ حالانکہ تفاوت کو مٹانا غیر فطری بات ہے۔ گذشتہ پچاس سال کے تجربہ نے اشتراکی نظام کو بھی ناکام ثابت کر دیا ہے وہاں بھی تشدد کے سوا کچھ نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت بھی ایک لعنت سے کم نہیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کی تعلیم سے دوری کی وجہ سے ہو رہا ہے اللہ نے مال کے حصول اور خرچ دونوں کے لیے قانون مقرر کیے ہیں۔ حلال و حرام کا امتیاز روا رکھا اور کسب اور خرچ پر بعض پابندیاں عاید کی ہیں۔ کسی کو من مانے طریقے سے کمائی کرنے کی اجازت نہیں بلکہ فرمایا[1] فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِى الطَّلَبِ اللہ سے ڈرو اور حلال روزی تلاش کرو۔ فرمایا۔ اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِىْ خَبَايَا الْاَرْضِ زمین کے کونے کونے میں جہاں بھی ممکن ہو روزی تلاش کرو۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندر میں رزقِ حلال کی تلاش کے لیے نکل جاؤ۔ زمین اور پہاڑوں سے معدنیات نکلتی ہیں دریاؤں اور سمندروں سے مچھلی کا شکار اور قیمتی موتی حاصل ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر بہ

---

[1] کنز العمال ص ۱۲، ۱۳، ۱۴ ج ۴

کھیلتی باڑی، صنعت و حرفت اور طرح طرح کے کاروبار ہوتے ہیں، یہ سب روزی کے ذریعے ہیں۔ حلال رزق میں حرام کی ملاوٹ نہ کرو، اور پیسہ عیاشی، فحاشی، اسراف، بلڈنگ سازی کی بجائے معاشرے کے کمزور لوگوں کا سہارا بنو۔ اللہ نے انسان کو مکلف بنایا ہے۔ اس پہ پابندیاں عاید کی ہیں۔ اگر اپنے تمام معاملات دائرہ قانون کے اندر رہ کر نپٹاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے، حظیرۃ القدس کے ممبر بن جاؤ گے۔

فطری اور غیر فطری ساوات

اللہ نے فرمایا، جن لوگوں کو ہم نے زیادہ روزی دی ہے۔ مال و زر کی فراوانی ہے۔ ان کا معاملہ ایسا ہے فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا پس وہ لوگ جن کو دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ وہ نہیں چاہتے کہ اپنا مال اپنے غلاموں میں تقسیم کر دیں تاکہ وہ بھی ان کے برابر ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی نہیں چاہتا کہ اس کے غریب خدام بھی اس کے برابر حیثیت کے مالدار ہو جائیں۔ کوئی کارخانہ دار اپنے مزدور کو اپنا ہم پلہ نہیں دیکھنا چاہتا، کوئی زمیندار اور جاگیردار اپنے مزارع کو اپنے برابر بیٹھا نہیں دیکھ سکتا اور نہ کوئی حاکم برداشت کرتا ہے کہ اس کے سارے ماتحت اس کی حیثیت میں برابر ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس ایک جیسے ہو جائیں تو ایک دوسرے کے کام کون کریگا اور دنیا کا نظام کیسے چل سکے گا۔؟ گویا اس طرح کی تقسیم غیر فطری ہوگی۔ اللہ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق ہر شخص کی استعداد، قوت اور علم میں تفاوت رکھا ہے تاکہ بنی نوع انسان ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے تفاوت قائم کر کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اس کی مہربانی سے اسے نعمت حاصل ہوگئی۔

ہے۔ پھر اگلی آیت میں اللہ نے اسی چیز کو شرک کے خلاف دلیل بنایا ہے کہ اگر تم تو اپنے ہم جنس انسانوں کو بھی اپنے برابر آتا نہیں دیکھ سکتے۔ چہ جائیکہ اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ کے برابر شریک ٹھہرایا جائے۔

فرمایا اللہ کی عطا کردہ نعمت کی قدر دانی کرو۔ اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم اپنا سارا مال تقسیم کر کے اپنے سے کم تر لوگوں کے برابر ہو جاؤ بلکہ فرمایا ہے کہ اپنے مال میں سے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حقوق ادا کرو اور بیشک اپنا تفاوت قائم رکھو، یہ تم پر اللہ کا انعام ہے نظام سرمایہ داری میں یہی قباحت ہے کہ وہ مالی حقوق ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے انسانی سوسائٹی مصائب کا شکار ہو رہی ہے غریب اور کمزور لوگ مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مذہب سے بیزاری اور اشتراکیت کی طرف رغبت اسی چیز کا نتیجہ ہے۔ اگر ہر شخص کو اس کا جائز حق مل جائے تو اسے بغاوت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آج حالت یہ ہے کہ غریب لوگ زمین اور مکان سے محروم ہیں، ان کے بچوں پر تعلیم کے دروازے بند ہیں، ان کے لیے حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں، انہیں روزگار کی ضرورت ہے وہ بھی عزتِ نفس چاہتے ہیں مگر جب وہ ان چیزوں سے محروم رہتے ہیں تو کبھی اشتراکیت کے سائے میں پناہ تلاش کرتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں دین کا اصول تو یہ ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر بھی دوسروں کو اپنے دین میں داخل کرنے کی کوشش کرو مگر یہاں اپنے بھی دوسروں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ساری مصیبت حقوق کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ہے تمام سوسائٹی بگڑ چکی ہے۔ کمزوروں کو سہارا دینے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ اشتراکی مساوات بالکل غیر فطری ہے جب کہ حقیقی مساوات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں ہے۔

نوعی اور شخصی بقاء

اللہ تعالیٰ نے انسان کی نوعی اور شخصی بقا کا انتظام کر کے انسان پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ جس نے تمہاری ہی

جنس سے تمہاری بیویاں بنائی ہیں وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً اور پھر ان بیویوں میں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی بقا کا یہ انتظام فرمایا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور پھر ان میں سے ان کی اولادوں کو پیدا کیا ہے۔ اس طرح نسلِ انسانی قیامت تک چلتی رہیگی۔ حفد کا معنیٰ خادم، غلام یا سسرال والے بھی ہوتا ہے۔ تاہم عام مفسرین نے اس کا معنیٰ پوتے کیا ہے کہ نسلِ انسانی کی بقا کی یہی صورت ہے۔ ہر فرد فانی ہے اور اپنی مقررہ عمر پوری کر کے مر جاتا ہے، تاہم اگر اس کی اولاد ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نہیں ہوں گا تو اس دنیا میں میری اولاد تو موجود ہوگی۔ اس کی تسلی کے لیے یہی بات کافی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے بعد بھی میرا ذکرِ خیر ہوتا رہیگا۔ نیک اولاد اپنے آباؤ اجداد کے لیے دعائیں بھی کرتی ہے اور یہ بھی اس کی بقا کی ایک صورت ہوتی ہے۔ اسی لیے اولاد کی خواہش کو برا نہیں کہا گیا، بلکہ انبیاء علیہم السلام بھی نیک اولاد کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا "رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ" (الصّٰفّٰت) یا اللہ! مجھے نیک اولاد عطا فرما۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا "رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ" (الانبیاء) بہرحال نیک اولاد باپ دادا کے نام کو زندہ رکھتی ہے۔

یہ تو نوعی بقا کا سلسلہ تھا۔ اب آگے فرمایا وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ اور تمہیں پاک چیزوں کی روزی عطا فرمائی۔ ہر انسان خوراک کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اناج اور پھل پیدا کر کے انسان کی شخصی بقا کا انتظام بھی کر دیا ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ خوراک ایک ایسی چیز ہے جس پر انسانی اور حیوانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کے پاک نبی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے "وَمَا جَعَلْنٰھُمْ

جَسَدًا لَّا يَاكُلُوْنَ الطَّعَامَ" (الانبیاء) ہم نے انبیاء کے جسم ایسے نہیں بنائے کہ انہیں کھانے پینے کی ضرورت نہ ہو۔ غرضیکہ ایک زمانے تک انسان کی شخصی بقا کا انحصار رزق پر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔ فرمایا جب اللہ نے انسان پر اتنے احسانات کیے ہیں اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ تو اس کے باوجود یہ لوگ باطل پر یقین رکھتے ہیں وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں؟ کتنے افسوس کا مقام ہے

شرک کی تردید

فرمایا نسل انسانی کی شخصی اور نوعی بقا کا انتظام تو میں نے فرمایا ہے مگر ان لوگوں کی حالت یہ ہے وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وہ اللہ کے سوا اُن کی پوجا کرتے ہیں جو اُن کے لیے زمین و آسمان سے کسی روزی کے مالک نہیں ہیں روزی رساں تو اللہ تعالیٰ ہے۔ مگر یہ لوگ لات، مناۃ، عزیٰ، جن، فرشتہ، حجر، شجر اور قبر کی پرستش کر رہے ہیں، حالانکہ ان کے پاس نہ کوئی روزی کا سامان ہے اور نہ یہ کسی کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کر سکتے ہیں اس کے باوجود یہ لوگ اپنی مشکلات اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں، مافوق الاسباب انہی کو پکارتے ہیں اور انہی کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ فرمایا وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ان کے پاس نہ اختیار ہے اور نہ طاقت، نہ یہ بارش برسا سکتے ہیں، نہ زمین میں روئیدگی پیدا کر سکتے ہیں کہ اناج، پھل اور سبزیاں پیدا ہوں۔ نہ ان کا زمین میں تصرف ہے اور فضا میں کوئی دخل ہے۔ یہ کسی چیز کے مالک بھی نہیں نافع اور ضار بھی نہیں تو پھر کتنے ظلم کی بات ہے کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہرا کر ان کی عبادت کی جائے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا تھا اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (العنکبوت) اے لوگو! تم اللہ کے سوا جن دوسروں کی عبادت کرتے ہو اُن کا رزق پر کوئی اختیار

نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ ہی کے پاس رزق تلاش کرو۔ تمام اسبابِ رزق اُس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، لہٰذا ہمیشہ اُسی کی طرف رجوع کیا کرو۔ اُس نے اپنے اختیارات کسی مخلوق کو تقسیم نہیں کیے جب کہ مشرکین عرب کا دعویٰ یہ تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے خود بعض ہستیوں کو اختیارات تفویض کر کے انہیں اپنا شریک بنا لیا ہے۔ چنانچہ وہ حج کے دوران تلبیہ میں لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ کے بعد یہ اضافہ کرتے تھے اِلَّا شَرِیْکًا ھُوَ لَکَ تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَ (صحیح مسلم) کہتے تھے اے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اُس کے کہ جسے تو نے خود اختیارات دے کر اپنا شریک بنا لیا ہے۔ بعض مشرک غیر اللہ کی عبادت کا یہ جواز پیش کرتے تھے کہ ہماری دُعا قبول نہیں ہوتی، چونکہ یہ اللہ کے مقبول بندے ہیں، اس لیے اُن کی عبادت کے ساتھ مل کر ہماری عبادت بھی قبول ہو جاتی ہے۔ بعض یہ بھی کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی ذات بڑی بلند و بالا ہے، ہماری وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی، لہٰذا ہم اِن کے واسطے سے خدا تک رسائی حاصل کرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام باطل عقائد کی تردید فرمائی ہے۔

اللہ اور بندوں کے درمیان براہِ راست تعلق کے متعلق شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت کا نام تدلّی ہے۔ جب ماں کے پیٹ میں انسانی ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے تو پھر اُس میں روحِ الٰہی داخل کی جاتی ہے اور اس طرح ہر انسان کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی تجلیٔ اعظم کا عکس پڑنے لگتا ہے اللہ اور بندے کے درمیان یہی براہِ راست تعلق ہے۔ زندگی میں تو انسان کو اس کا شعور نہیں ہوتا، مگر جب انسان مر جاتا ہے، اس کی روح اور نسمہ جسم سے باہر نکل آتا ہے تو اُس وقت تجلیٔ اعظم کی کشش انسان کو عالمِ بالا کی طرف کھینچتی ہے جب کہ اس کے بُرے اعمال اُسے نیچے کی طرف کھینچتے ہیں۔ اور پھر انسان کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اُس وقت انسان کو خدا تعالےٰ

سے کے ساتھ براہِ راست تعلق کا احساس ہوتا ہے۔
غرضیکہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مرضی اور ارادے سے جو چاہے کرتا ہے، وہاں کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے بعض اوقات اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ بعض کام فرشتوں کے ذریعے کراتا ہے، لہذا براہِ راست تعلق تو ثابت نہ ہُوا۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اختیار نہیں دیا بلکہ وہ تو اس کے حکم سے ہر کام کرتے ہیں کیونکہ وہ مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ پیچھے گزر چکا ہے "وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" وہ تو وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ انہیں از خود کسی کی حاجت روائی اور مشکل کشائی، بارش برسانے یا پھل اُگانے کا کوئی اختیار نہیں۔ لہذا جو کوئی اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو ما فوق الاسباب پکارے گا اور اس سے امید وابستہ کرے گا، وہ مشرک ٹھہرے گا۔
فرمایا، تم ایسی مثالیں بیان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے کسی حاکم پر قیاس کر کے کہتے ہو کہ جس طرح بادشاہ تک اس کے وزیر، مشیر یا مصاحب کے بغیر رسائی نہیں ہوتی، اسی طرح اللہ تک بھی اس کے مقرب کے بغیر پہنچ ممکن نہیں، تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اللہ کے لیے ایسی مثالیں مت بیان کرو۔ کیونکہ اُس کا فرمان تو ہے "اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ" (النمل) مصیبت زدہ کی پکار کو کون سنتا ہے اور اُس کی تکلیف کو کون رفع کرتا ہے؟ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ نہیں بلکہ وہی براہ راست پکار کو سنتا ہے۔ اور تکلیف کو رفع بھی وہی کرتا ہے، کوئی نبی، ولی، جن فرشتہ اللہ کے درمیان واسطہ نہیں ہے، نہ اُس نے کسی کو کوئی اختیار دے رکھا ہے۔ لہذا اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے لیے ایسی مشرکانہ مثالیں مت

بیان کرو۔ اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ لہٰذا اس کی حکمت میں دخل اندازی کی کوشش مت کرو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى
شَىۡءٍ وَّمَنۡ رَّزَقۡنٰهُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنۡفِقُ
مِنۡهُ سِرًّا وَّجَهۡرًا ؕ هَلۡ يَسۡتَوٗنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ
بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ
مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ
عَلٰى شَىۡءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ ۙ اَيۡنَمَا يُوَجِّههُّ
لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ ۙ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ
بِالۡعَدۡلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾ ع ۱۰ / ۱۶

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے مثال بیان کی ہے ، ایک غلام کی جو مملوک ہے اور نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر۔ اور وہ شخص جسے ہم نے روزی دی ہے اپنی طرف سے اچھی روزی ، پس وہ خرچ کرتا ہے اس میں سے پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی - کیا یہ دونوں برابر ہیں ؟ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں بلکہ اکثر اِن میں سے ایسے ہیں جو نہیں جانتے ﴿۷۵﴾ اور اللہ نے بیان کی مثال دو شخصوں کی ایک اِن میں سے گونگا ہے جو نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر اور وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر - جدھر بھی وہ اُس کو متوجہ کرتا

ہے، وہ نہیں لاتا بہتری کی بات۔ کیا برابر ہے وہ اور وہ
شخص جو حکم دیتا ہے عدل کا اور وہ سیدھے راستے
پر ہے (۷۶)

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں شرک اور مشرکین کا رد فرمایا گیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے غلط مثالیں بیان کرنے سے منع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کر کے مخلوق کی صفات اللہ میں ثابت کرنا نہایت ہی بری بات ہے۔ اللہ نے اس بات کی سختی سے تردید فرمائی کہ عام آدمی کی اس تک رسائی نہیں ہے اور اُسے کسی وسیلہ کی ضرورت ہے بلکہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق براہِ راست اس کے بندے سے ہے اللہ نے اپنے لیے اس قسم کی مثالیں بیان کرنے سے منع فرما دیا۔ اب آج کی آیات بھی شرک کی تردید میں ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود دو مثالیں بیان کر کے اپنی وحدانیت کا مسئلہ واضح فرمایا ہے۔ پہلی مثال ایک آزاد اور ایک غلام شخص کی ہے۔ جب کہ دوسری مثال دو ایسے شخصوں کی ہے کہ ان میں سے ایک بہرہ ہے جو بالکل نکما ہے جب کہ دوسرا آدمی عدل و انصاف کا دلدادہ ہے اور صراطِ مستقیم پر ہے۔ ان دو مثالوں کو اللہ نے مشرک اور موحد کے تقابل میں بیان کر کے توحید کا مسئلہ سمجھایا ہے۔

غلام اور آزاد کی مثال

ارشاد ہوتا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا اللہ تعالےٰ نے مثال بیان فرمائی ہے ایک غلام کی جو کسی دوسرے شخص کی ملکیت ہے۔ گزشتہ درس میں مشرکین کی غلط مثالوں کا ذکر ہوا تھا۔ اب اللہ نے خود اعلیٰ درجے کی مثال بیان کی ہے کہ ایک غلام اور آزاد شخص کی مثال مشرک اور موحد کی ہے۔ ضرب کے مختلف معانی آتے ہیں۔ یعنی مارنا، سفر کرنا اور بیان کرنا۔ تو یہاں پر یہ لفظ بیان کرنے کے معانی میں آیا ہے۔ عبد کا لفظ انبیاء، فرشتوں اور اچھے لوگوں پر بھی بولا جاتا ہے بلکہ سورۃ بنی اسرائیل میں

اس لفظ کا اطلاق نافرمان اور مغرور لوگوں پر بھی کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا کہ تمہاری نافرمانی کی وجہ سے "بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ" ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی لڑنے والے بندے مسلط کر دیے، تاہم عبد کا عام فہم معنی غلام ہوتا ہے۔ یہاں پر عبد کے ساتھ مملوک کا اضافہ کیا گیا ہے یعنی ایسا غلام جو کسی دوسرے شخص کی ملکیت ہو۔ آزاد آدمی کسی شخص کا مملوک نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اور صرف اللہ ہی کا مملوک ہوتا ہے جس نے اُسے پیدا کیا اور وہی اُس کا حقیقی مالک ہے۔ مملوک اپنے مجازی مالک کے تصرف میں ہوتا ہے اُس سے خدمت لے یا اُسے فروخت کر دے۔ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ ایسا شخص خود اپنا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ یہاں پر یَقْدِرُ کا معنی جسمانی طاقت نہیں کیونکہ یہ طاقت تو غلام اور آزاد میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے لہٰذا یہاں یَقْدِرُ سے مراد اختیار یا قدرت رکھنا ہے کہ غلام آدمی کا اپنا کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا ہر فعل اس کے آقا کی منشاء پر موقوف ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ غلام اپنی کمائی کا بھی مالک نہیں ہوتا بلکہ اُس کی آمدنی مالک کی آمدنی تصور ہوتی ہے اور وہی اس کا متصرف ہوتا ہے۔ ایک غلام آدمی اپنے آقا کی اجازت کے بغیر سفر بھی نہیں کر سکتا اور نہ وہ نکاح کر سکتا ہے اگر کوئی مالک اپنی لونڈی کو خود نکاح کی اجازت دے دے تو پھر اس کے اختیارات اس حد تک کم ہو جاتے ہیں کہ وہ اس سے خدمت تو لے سکتا ہے مگر قضائے شہوت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا حق وہ لونڈی کے خاوند کو دے چکا ہے۔ اگر کوئی غلام بھاگ جائے۔ تو حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اُس کی عبادت بھی مقبول نہیں جب تک وہ اپنے مالک کے پاس واپس نہ آجائے۔

بہر حال فرمایا کہ ایک شخص ہے جو کسی دوسرے کا غلام ہے اور وہ

کچھ اختیار نہیں رکھتا اور دوسری طرف ایسا شخص ہے وَمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھی روزی عطا کی ہے اچھی روزی سے مراد پاک اور حلال روزی ہے جو جائز طریقے سے کمائی گئی ہو اور جو حرام یا مشکوک نہ ہو۔ یہ شخص آزاد ہے اور اللہ نے اسے رزق بھی فر عطا فرمایا ہے۔ فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا جسے وہ پوشیدہ طور پر بھی خرچ کرتا ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی۔ فرمایا هَلْ يَسْتَوٗنَ کیا یہ دو آدمی یعنی غلام اور آزاد برابر ہو سکتے ہیں؟۔ فرمایا ہرگز نہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ بلکہ ان میں سے اکثر بے سمجھ ہیں جو ایک عام فہم مثال کو بھی نہیں سمجھ سکتے کہ جب غلام اور آزاد انسان ہونے کے باوجود برابر نہیں ہو سکتے تو اللہ کی ہمسری کون کر سکتا ہے جو ہر چیز کا مالک اور خالق ہے اور کائنات کی ہر چیز اسی کی مملوک اور مخلوق ہے۔ لہٰذا اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو اللہ کا ہم صفت بنا کر اس کا شریک ٹھہرانا کس قدر حماقت کی بات ہے۔ خاص طور پر بے جان شجر و حجر اور قبر کو اللہ کے ساتھ کیسے شریک ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

رزقِ حلال

اِس آیت کریمہ میں لفظ رزق توجہ طلب ہے۔ یہ لفظ عام ہے اور اس سے رزق حلال بھی ہو سکتا ہے اور حرام بھی۔ مگر ایک مومن آدمی ہمیشہ رزق حلال کی تلاش میں رہتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ کا ارشاد ہے اے لوگو! "كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ" حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو۔ اسی لیے رزق حلال کی تلاش کو فرائض کے بعد ایک فریضہ قرار دیا گیا ہے "رِزْقًا حَسَنًا" کے الفاظ گذشتہ رکوع میں بھی آ چکے ہیں۔ وہاں فرمایا تھا کہ تم کھجوروں اور انگور سے نشہ آور اشیاء اور رزقِ حسن یعنی

لذیذ اور خوشگوار چیز بناتے ہو۔ تاہم یہاں پر رزقِ حسن سے وہ پاک روزی مراد ہے جس کے استعمال سے اچھے اخلاق پیدا ہوں عبادت کی قبولیت بھی حلال روزی پر موقوف ہے۔ صدقہ و خیرات بھی وہی مقبول ہوگا جو حلال مال سے کیا جائے گا۔ خود اپنی ذات پر پاک روزی استعمال کریگا تو اس کا اچھا اثر ہوگا۔ تمام پاکیزہ اخلاق پاکیزہ روزی سے پیدا ہوتے ہیں اور حرام روزی سے خبیث اخلاق جنم لیتے ہیں جو انسان کے لیے باعثِ وبال ہوں گے اور اُسے خدا کے غضب کا نشانہ بننا پڑے گا۔

باطنی اور ظاہری خرچ

اس آیت کریمہ میں مذکور انفاق فی سبیل اللہ کا مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ خرچ کے ظاہری اور باطنی دونوں طریقے درست ہیں اور ان کا انحصار حالات و واقعات پر ہوتا ہے۔ اگر دوسرے کو ترغیب دلانا مقصود ہو تو ظاہری طور پر خرچ کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات پوشیدہ خرچ کرنا احسن ہوتا ہے کیونکہ اس میں ریاکاری کا شبہ نہیں رہتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ ایک مومن آدمی دائیں ہاتھ سے اس قدر پوشیدہ خرچ کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتہ نہیں ہوتا کہ کیا خرچ کیا ہے پوشیدہ خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ کا عنصر غالب ہوتا ہے اور ظاہراً خرچ کرنے میں انسانی سوسائٹی کا لحاظ ہوتا ہے۔ بہرحال اپنے اپنے مقام پر خرچ کے دونوں طریقے درست ہیں۔

گونگا غلام اور عادل آزاد

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک گونگے غلام اور ایک عادل آزاد شخص کی مثال بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اور اللہ نے مثال بیان کی دو آدمیوں کی۔ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ ان میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا حتیٰ کہ وہ اپنے دل کی بات بھی دوسرے سے نہیں کہہ سکتا۔ اس قدر ناکارہ اور بے سود ہونے کی بنا پر وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ وہ اپنے صاحب پر

بوجھ بن چکا ہے اسکا مالک اس سے کوئی خدمت نہیں لے سکتا بلکہ اس کی طرف سے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ اس کا آقا جس کام کی طرف بھی ایسے غلام کو متوجہ کرتا ہے، وہ کوئی بہتر چیز نہیں لاتا یعنی کچھ کام نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے خراب کر کے آتا ہے اور مالک کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے فرمایا اس کے مقابلے میں دوسرا شخص وہ ہے وَمَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ جو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ وہ آزاد ہے۔ با اختیار ہے خود بھی عامل بالعدل ہے اور دوسروں کو بھی عدل کی وصیت کرتا ہے فرمایا هَلْ یَسْتَوِیْ هُوَ کیا ایسا شخص اس کے برابر ہے جو غلام بھی ہے اور گونگا بھی، اور کوئی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ بعینہٖ کوئی بت یا استھان، جن یا فرشتہ، یا کوئی انسان جسے کچھ اختیار حاصل نہیں، وہ اللہ مالک الملک، با اختیار، نافع اور ضار، قادر مطلق اور متصرف کے برابر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اللہ کے برابر مخلوق میں سے کوئی بھی نہیں ہو سکتا تو پھر غیر اللہ کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اُن کے نام کی نذر و نیاز کیوں دیتے ہو؟ مافوق الاسباب اُن کو کیوں پکارتے ہو؟ اپنی حاجات اُن کے سامنے کیوں پیش کرتے ہو؟ اگر دو اشخاص کی مثال سمجھ آسکتی ہے تو پھر خالق اور مخلوق کا تفاوت بھی ذہن میں آنا چاہیئے اور ہر ایک کو اس کے مرتبے کے برابر حیثیت دینی چاہیئے نہ تو خدا تعالیٰ کی صفات مختصہ کو انسانوں یا دیگر مخلوق میں ثابت کرنا چاہیئے اور نہ انسانوں کی صفات اللہ کی طرف منسوب کرنی چاہئیں۔

غلامی کی تاریخ

غلامی کی تاریخ بہت پرانی ہے یہ انسانی سوسائٹی میں سزا کے طور پر رائج ہوئی۔ جنگ کے دوران دشمن کے جو لوگ گرفتار ہوتے تھے ان میں سے

مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈی بنا لیا جاتا۔ غلامی کی یہ لعنت انیسویں صدی میں آ کر دنیا سے ختم ہوئی ہے۔ مشینی دور سے پہلے ہر چھوٹا بڑا کام افرادی قوت سے لیا جاتا تھا اور اس کا سستا ترین ذریعہ غلام تھے جو مالک کی بلا معاوضہ خدمت کرتے تھے۔ مشینی دور میں اکثر کام مشینوں کے ذریعے ہونے لگے اور اس طرح افرادی خدمت کے کام میں کمی واقع ہو گئی۔ اور غلامی کا رواج بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں اگرچہ غلامی کو کلیتاً ختم نہیں کیا گیا، بلکہ اسے برداشت کیا گیا اور غلاموں کے حقوق بھی ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے غلامی کا رواج ختم کرنے کی ترغیب دی گئی۔ غلامی کو غیر فطری قرار دیا گیا۔ اور مختلف جرائم کے کفارے کے طور پر غلام کی آزادی کا حکم دیا گیا۔ ان کو مکاتب بنانے کی ترغیب دی گئی اور اس طرح غلامی کے خاتمے کی بنیاد دینِ اسلام نے رکھ دی۔ اس زمانے میں غلاموں سے سخت ترین کام لینے کے علاوہ ان سے سخت بدسلوکی بھی کی جاتی تھی، حتیٰ کہ بعض لوگ محض تفریحِ طبع کے لیے غلاموں کو سرِ عام قتل کر دیتے تھے اور اس طرح غلاموں کو انسانیت سے قریب بھی جگہ نہیں دیتے تھے۔

غلاموں سے حسنِ سلوک

اسلام میں غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایک موقع پر ابو مسعود انصاری رضؓ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا گزر ہوا تو فرمایا لَلّٰهُ اَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْ هٰذَا یعنی جو قدرت تم کو اس وقت اس غلام پر حاصل ہے، اس سے زیادہ اللہ کو تم پر قدرت حاصل ہے۔ آپ کی اس تنبیہ پر ابو مسعودؓ نے غلام کی پٹائی بند کر دی اور پھر اُسے بالکل آزاد کر دیا۔ ایک اور شخص نے اپنے غلام کو تھپڑ مار دیا، حضور علیہ السلام سخت ناراض ہوئے تو اس شخص نے فوراً اپنے غلام کو آزاد کر دیا۔ آپ علیہ ال

نے فرمایا کہ اگر تم انہیں آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ کی لپیٹ تم پر پڑتی۔ فرمایا اللہ نے کسی وجہ سے یہ غلام تمہارے ماتحت کر دیے ہیں، آخر یہ بھی انسان ہیں، تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو۔ جو خود کھاتے ہو۔ ان کو بھی کھلایا کرو، اور جو خود پہنتے ہو، ان کو بھی پہناؤ۔ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو اگر ان کے سپرد کوئی مشکل کام لگاؤ، تو پھر ان کے ساتھ تعاون بھی کرو۔ کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ بہر حال اسلام نے غلامی کو صرف برداشت کیا، کیونکہ یہ بین الاقوامی رواج تھا۔ انسان فطری طور پر آزاد ہے۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر غلاموں کو آزاد کر دیں تو اس میں اسلام کا کیا نقصان ہوگا، بلکہ اسلام تو اس لعنت کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی۔

قومی غلامی

شخصی غلامی تو اب پوری دنیا سے ختم ہو چکی ہے، البتہ قومی غلامی کا جوا اُترتے نظر نہیں آتا۔ معاشی اور فوجی لحاظ سے مضبوط اقوام کی طرف سے کمزور قوموں کو غلام بنائے رکھنے کی مثالیں آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ انگریزوں نے دو سو سال تک دنیا کی مختلف اقوام کو غلام بنائے رکھا، طاقتور ملک ہمیشہ کمزوروں کو غلام سمجھتے ہیں اور ان پر فوجی دباؤ کے ذریعے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی طور پر خوشحال ملک اپنے مالی وسائل کی بنا پر بدحال لوگوں کو اپنی غلامی میں جکڑ لیتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا امریکہ اور روس کی معاشی غلامی کا شکار ہے۔ غریب ممالک کی تمام اقتصادی پالیسیاں امیر ملکوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور وہ اس قدر بے بس ہوتے ہیں کہ امیر ملکوں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتے۔ ایسے ملک اپنی تہذیب بھی کھو بیٹھتے ہیں اور تہذیبی لحاظ سے بھی امیر ملکوں کے غلام ہو جاتے ہیں۔ ان کا لباس وضع قطع، طور و اطوار حتّٰی کہ ان کی سوچ بھی انہی غلامی کا شکار ہو جاتی ہے جو کسی قوم کے لیے انتہائی بدقسمتی کی بات ہے۔ اسی بات کو ڈاکٹر اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں کہا تھا۔

غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

انگریزنے ہم پر جس قسم کی غلامی مسلط کی، اس کے نتیجے میں ہمارے لوگوں کے خیالات بہت ہی گھٹیا ہو گئے ہیں۔ اُن کی اپنی کوئی پالیسی تہذیب اور عمل نہیں رہا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنے آقاؤں کی طرف ہی دیکھتے رہتے ہیں کہ اُن کی خوشنودی کیسے حاصل ہو۔

خلاصہ کلام

بہر حال اللہ تعالیٰ نے آزادی اور غلامی کا مسئلہ مثال کے ذریعے سمجھا دیا ہے۔ ایک طرف ایک غلام اور گونگا بہرہ آدمی ہے جو کچھ اختیار نہیں رکھتا ہر کام خراب کر کے آتا ہے اور اپنے آقا پر بوجھ ہے۔ دوسری طرف ایک آزاد ہے جو خود مختار ہے، خود بھی عدل و انصاف پر قائم ہے، اور اسی کا حکم بھی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کہ سیدھے راستے پر بھی یہی شخص ہے۔ پھر بھلا ایک غلام اور آزاد شخص کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ یہی حال ایک مشرک اور موحد کا ہے مشرک آدمی کسی قبر پر جائے گا، کوئی رسم اختیار کرے گا۔ اپنا دین خراب کرے گا۔ جہاں جائے گا، خرابی ہی لے کر آئے گا۔ اس کے برخلاف موحد آدمی اپنے ایمان پر مضبوط رہے گا۔ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت کا طلبگار ہو گا، اس کے بنائے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن ہو گا۔ تو فرمایا مشرک اور موحد کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اِن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ
اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ
اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔاۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ
السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾
اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىْ جَوِّ السَّمَآءِؕ
مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ :- اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں پوشیدہ چیزیں آسمانوں اور زمین کی ۔ اور نہیں ہے معاملہ قیامت کا مگر جیسا کہ ایک نگاہ کا پلٹنا یا اس سے بھی زیادہ قریب بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۷۷﴾ اور اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے تم نہیں جانتے تھے کچھ بھی ۔ اور بنائے اس نے تمہارے لیے کان ، آنکھیں اور دل ، تاکہ تم شکر ادا کرو ﴿۷۸﴾ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا پرندوں کی طرف جو مسخر کیے ہوئے ہیں آسمان کی فضا میں ۔ نہیں روکتا ان کو اللہ کے سوا

کوئی۔ بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے
جو ایمان لاتے ہیں (۷۹)

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں اللہ نے شرک کی تردید میں بعض دلائل اور مثالیں بیان فرمائیں۔ ایک مثال یہ بیان فرمائی کہ ایک شخص، غلام بھی ہے اور گونگا بھی۔ وہ بالکل نکما ہے، جو بھی کام اس کے سپرد کیا جائے وہ کوئی اچھا نتیجہ پیش نہیں کرتا اور اس طرح اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ دوسری طرف ایک آزاد اور مومن آدمی ہے اور خود بھی عدل و انصاف پر قائم ہے اور دوسرے دل کو بھی اسی کی تلقین کرتا ہے۔ یہ شخص اللہ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر ہے تو اللہ نے ان دو شخصوں کا حال بیان کر کے فرمایا کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یہی مثال ایک مشرک اور موحد کی ہے۔ جس طرح مذکورہ دو شخص برابر نہیں، اسی طرح مشرک اور توحید پرست برابر نہیں۔ ان دونوں میں فرق ہے

استعداد عمل اور جزا

مومن اور مشرک میں تفاوت دراصل ہر آدمی کی استعداد اور عمل میں تفاوت کی وجہ سے ہے۔ بظاہر تو سارے انسان برابر نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو اعضائے ظاہرہ اور باطنہ سے نوازا ہے، مگر ہر انسان کے ہر عضو کی استعداد مختلف ہے جس کے مطابق وہ عمل کرتا ہے اور اس کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انسان ظاہری آنکھ سے دوسرے کے ظاہر کو تو دیکھ سکتا ہے مگر اس کے دل کی کیفیت کو نہیں جان سکتا۔

ے نگاہ با نگاہ آمیزہ دادی دل را از دل جدا کردی

اللہ نے آنکھوں کو آنکھوں کے ساتھ تو مشابہت دیدی ہے مگر دل کو دل سے جدا کر دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا حال معلوم نہیں کر سکتے غرضیکہ ہر انسان کی استعداد، عمل اور پھر اس سے اخذ ہونے والے نتیجے کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہی اپنے علم کے مطابق ہر شخص کو بدلہ دے گا۔ مخلوق میں سے کوئی ذات ایسی نہیں جو کسی کے تفصیلی حالات سے

واقف ہو۔ آج کی پہلی آیت کریمہ میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے۔

عالم الغیب شہادۃ

ارشاد ہوتا ہے وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ ہی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں۔ جو چیزیں بھی انسانوں جنوں اور فرشتوں سے پوشیدہ ہیں، اُن کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ پوری مخلوق میں سے کوئی بھی ان کے علم کا دعویٰ نہیں کر سکتا دراصل ایسے مواقع پر غیب کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر انسانوں یا دوسری مخلوق کی نسبت سے کیا جاتا ہے یعنی جو چیزیں مخلوق سے پردۂ غیب میں ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، وگرنہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی غیب نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے، اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی نگاہ میں ہے۔ سورۃ یونس میں موجود ہے " وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ تیرے پروردگار سے تو کائنات کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ تو عالم الغیب والشہادۃ کا یہی مطلب ہے کہ مخلوق کی نسبت سے جو چیزیں بھی ظاہر ہیں۔ یا پوشیدہ، محسوسات میں سے ہیں غیر محسوسات میں سے، ہر چیز خدا تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ سورۃ الملک میں اس بات کو دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے " اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ " کیا کائنات کو وہی نہیں جانے گا جس نے اُسے پیدا کیا، حالانکہ وہ لطیف (باریک بین) بھی ہے اور ہر چیز کی خبر بھی رکھتا ہے۔

عالم الغیب والشہادۃ ہونا اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ میں سے ہے اگر کوئی شخص مخلوق میں سے کسی میں یہ صفت تسلیم کرے گا تو وہ مشرک بن جائے گا۔ جس طرح اللہ کے سوا قادر مطلق کوئی نہیں۔ اسی طرح اس کے سوا عالم الغیب بھی کوئی نہیں۔ ہر انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے اس

کی روح اور اُس کے لطائف ہیں، اُس کا نفسِ ناطقہ ہے۔ اِن ظاہری اور باطنی قویٰ کی استعداد کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ ہر شخص کے عمل سے بھی وہی واقف ہے۔ لہذا وہ اپنے اسی علم اور مخلوق کے عمل کی بنا پر ہر ایک کو بدلہ بھی جُدا جُدا دیگا۔

قیامت کی اچانک آمد

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ہی کے تسلسل میں یہ بھی فرمایا کہ وقوعِ قیامت کا علم بھی اسی کے پاس ہے وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اور قیامت کا معاملہ تو ایسا ہے کہ یہ آنکھ جھپکنے میں واقع ہو جائیگی بلکہ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ آنکھ کا پلٹنا تو دُور کی بات ہے، قیامت اس سے بھی پہلے برپا ہو جائیگی۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے حضور علیہ السّلام نے وقوعِ قیامت کے متعلق کئی ایک باتیں بتلائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے، کسی نے کھانے کا لقمہ اٹھایا ہوگا اور ابھی وہ منہ تک نہیں لے جائیگا کہ قیامت کا بگل بج جائے گا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے لَا تَاۡتِيۡكُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً یہ اچانک ہی تمہارے پاس آجائے گی۔ اس کے لیئے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کے الفاظ قرآن پاک میں بار بار آتے ہیں کہ وہ اپنے مقررہ وقت پر ضرور واقع ہو جائے گی اور پھر اس کے بعد جزائے عمل کا وقت آئے گا يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ (الطارق) اس دن پوشیدہ چیزیں ظاہر ہو جائیں گی اور محاسبے کا عمل شروع ہو جائے گا۔ ہر انسان کو اپنی استعداد اور عمل کے مطابق بدلہ ملے گا جو کہ ہر ایک کے لیے جدا جدا ہوگا۔ آج کوئی نبی، ولی، جن، فرشتہ یا کوئی اور مقرب اس کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

یہی حال انسان کی انفرادی زندگی کا بھی ہے۔ اس کے وقت کا علم بھی کسی کے پاس نہیں اور یہ بھی اچانک آجاتی ہے۔ حادثات بھی پیش آجاتے ہیں۔ بیماری میں بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے کہ جب وہ وقت مقررہ آجاتا ہے لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ

سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ" تو پھر ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا بلکہ عین وقت پر موت آجاتی ہے۔ ہر فرد کی موت قیامت صغریٰ کہلاتی ہے اور کائنات کی مجموعی موت کو قیامتِ کبریٰ کا نام دیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[1] "مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ" جو شخص مر گیا، اُس کی قیامت تو برپا ہو گئی کیونکہ وہ جزائے عمل کی منزل میں داخل ہو گیا۔ موت کے بعد قبر کی منزل ہے، عالم برزخ ہے۔ پھر وقوع قیامت اور محاسبے کا پورا عمل واقع ہونے والا ہے۔ یہ ساری منزلیں آخرت کی منزل کی کڑیاں ہیں۔

قبر کی منزل

انفرادی موت کے بعد انسان کو سب سے پہلے قبر کی منزل آتی ہے حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ عقبیٰ کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے اور اس کا معاملہ بہت خطرناک ہے۔ اگر قبر کی منزل آسان ہو گئی تو انشاء اللہ آگے کی منزلوں میں بھی آسانی ہو گی۔ اور یہیں مشکل پیش آگئی تو اگلی منزلیں مزید مشکل ہو جائیں گی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ قبرستان میں پہنچ کر بہت روتے حتیٰ کہ آپ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ دوستوں نے پوچھا، حضرت! آپ قبور کی زیارت پر بہت گریہ کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپ نے یہی بات فرمائی کہ آخرت کی منزلوں میں سے قبر پہلی منزل ہے اگر یہ آسان ہو گئی تو اگلی منزلیں بھی آسان ہوتی جائیں گی، وگرنہ معاملہ بڑا مشکل ہے۔

انسان کے ذرائع علم

آگے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش اور پھر اُس پر کیے گئے انعامات کا ذکر کر کے اُسے شکریہ ادا کرنے کی تلقین کی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّہٰتِکُمْ اللہ کی ذات وہ ہے کہ جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا یعنی تمہیں پیدا کیا۔ اور اسوقت تمہاری حالت یہ تھی لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا کہ تمہیں کسی چیز کا علم نہیں

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۲۳۴ ج ۱۰

تھا۔ تم اس دُنیا میں بالکل اجنبی تھے مگر اللہ نے تمہارے لیے ذرائع علم پیدا کیے اور وہ اس طرح وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ کہ تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دِل پیدا کیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو کان عطا کیے ہیں تاکہ اگر کسی ایک میں خرابی واقع ہو جائے تو دوسرے سے کام چلایا جا سکے۔ کان اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو انسان نہ کچھ سُن سکتا، نہ سیکھ سکتا اور نہ بول سکتا۔ ظاہر ہے کہ چھوٹا بچہ اپنے ماحول سے سُن کر ہی باتیں کرنا سیکھتا ہے۔ اگر وہ کوئی بات سنے گا نہیں تو اُسے بات کرنی کیسے آئے گی، اسی لیے جو بچے پیدائشی گونگے ہوتے ہیں وہ دراصل کانوں کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں حالانکہ اُن کی زبان بالکل ٹھیک ہوتی ہے، مگر وہ نہ سننے کی وجہ سے بات سیکھتے ہی نہیں، لہٰذا وہ گونگے بھی ہوتے ہیں بہرے بھی۔

اسی طرح آنکھیں بھی بہت بڑی نعمت ہیں۔ آنکھ کی قدر نابینا سے پوچھیے جس کے لیے سارا جہاں گھپ اندھیرا ہے، آنکھ نہیں تو کچھ بھی نہیں بیچارہ پڑھنے لکھنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کی حقیقت کو نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ جس کی بناء پر اُسے اشیاء کا مکمل علم حاصل نہیں ہو سکتا پھر انسان کا دل اس کے جسم کا مرکز ہے۔ اس کے ساتھ دماغ شامل ہو کر ہر کام میں غور و فکر کرتا ہے۔ غور و فکر دماغ کے ذریعے ہوتا ہے اور عملی اقدام دل کی وساطت سے ہوتا ہے۔ غور و فکر کے معاملہ میں اللہ کے آخری پیغام قرآن پاک کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے تو سورۃ محمد میں اللہ نے فرمایا ہے "أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا" یہ لوگ قرآن پاک میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔ غرضیکہ انسان کا دل بھی اُس کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اِن تین اہم ترین چیزوں یعنی کان، آنکھ اور دل کا ذکر کر کے انسان کو یاد دلایا ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے، ہم نے یہ نعمتیں عطا کر کے تمہیں علم کے ذرائع مہیا کر دیے کہ اِن کو بروئے کار لا کر علم جیسی عظیم نعمت حاصل کرو لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور میرا شکریہ ادا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کانوں سے قرآن پاک اور دین کی باتیں سنی جائیں، نہ کہ فحش گانے سماعت کیے جائیں آنکھوں سے قرآن پاک کی تلاوت کی جائے۔ اچھی کتابیں پڑھی جائیں۔ شعائر اللہ کی زیارت کی جائے، نہ کہ ٹیلیویژن پر فحش مناظر دیکھے جائیں۔ آنکھ کی حفاظت پر اللہ اور اس کے رسول نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ شرم و حیا کے تقاضے آنکھ کے ذریعے ہی پورے کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا دل ہے جو نیکی پر بھی مائل ہو سکتا ہے اور برائی پر بھی۔ یہ مظلوم کی مدد کے لیے بھی کھڑا کر سکتا ہے اور کسی کی حق تلفی کے لیے بھی آمادہ کر سکتا ہے۔ دل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کر کے اس کی وحدانیت کو سمجھنا چاہیئے۔ تو یہ تینوں نعمتیں اللہ نے عطا فرمائیں تاکہ اس کا شکریہ ادا کرو۔

فلسفہ معاش

بعض لوگ معاش کے مسئلہ کو بہانا بنا کر اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم روزگار کے مسئلہ میں ہی الجھے رہتے ہیں۔ اس لیے ہم کوئی نیکی کا کام نہیں کر سکتے، عبادت اور ریاضت کی طرف توجہ نہیں دے سکتے اور نہ ہماری علمی یا دماغی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اللہ نے معاش کا مسئلہ ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىْ جَوِّ السَّمَآءِ کیا ان لوگوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا۔ جن کو اللہ نے فضا میں مسخر کیا ہوا ہے۔ وہ جدھر چاہتے ہیں اڑتے پھرتے ہیں اور کشش ثقل انہیں گرا نہیں دیتی۔ البتہ جب وہ خود چاہتے ہیں تو زمین پر اُتر جاتے ہیں۔ فرمایا مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ فضا میں

اللہ کے سوا انہیں تھامنے والا کون ہے۔ سورۃ الملک میں اِلَّا الرَّحْمٰنُ کے الفاظ آتے ہیں، یعنی انہیں کھلی فضاؤں میں تھامنے والا صرف رحمان ہی ہے۔ پرندے اپنے پروں کو پھیلاتے اور سکیڑتے ہوئے دور دور تک چلے جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے اڑان کے راستے آسان کر دیے ہیں اور یہ سینکڑوں میل کا سفر بآسانی طے کر لیتے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ پرندے صبح سویرے خالی پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں، اگر تم پرندوں جتنا توکل بھی کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ویسے ہی روزی پہنچاتا جس طرح ان پرندوں کو پہنچاتا ہے، مگر افسوس کا مقام ہے کہ انسان پرندوں جیسا توکل بھی نہیں رکھتا۔ اگر انسان اللہ کے احکام کے مطابق اپنے فرائض کو بجا لائے اور روزی کے جائز ذرائع استعمال کرے تو اللہ اسے مایوس نہیں کریگا۔ اسباب رزق بھی اللہ تعالیٰ ہی پیدا فرماتا ہے، لہذا ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد اسباب کی بجائے بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی کرنا چاہیئے کیونکہ وہ چاہے گا تو اسباب میں اثر پیدا ہوگا، ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی یہ مثال بیان کر کے توحید خداوندی کا درس دیا ہے۔

فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ اس قسم کی مثالوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت کی نشانیاں ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور معاد پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان سے خالی ہیں ان کے لیے یہ مثالیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ نہ وہ اللہ کو صحیح طور پر پہچانتے ہیں اور نہ اسکی اطاعت گزاری کرتے ہیں، برخلاف اس کے جانور، پرندے، چرندے، کیڑے مکوڑے شجر و حجر سب اللہ کے اطاعت گزار ہیں اور اس کے حکم سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے، مگر انسانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ کا نافرمان ہے

بلکہ اکثریت ناشکرگزاروں کی ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا
يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا
وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ
تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ
يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾
يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع

ع ۱۱ / ۱۲

ترجمہ :۔ اور اللہ نے بنائی ہے تمہارے لیے تمہارے گھروں میں سے سکونت کی جگہ ۔ اور بنائے ہیں تمہارے لیے مویشیوں کی کھالوں سے گھر ، جن کو تم ہلکا خیال کرتے ہو کوچ والے دن اور قیام والے دن ۔ اور اُن کی اُون ، پشم اور بالوں سے طرح طرح کا سامان اور فائدہ اٹھانے کی چیز ایک وقت تک ﴿۸۰﴾ اور اللہ نے اپنی تخلیق میں سے تمہارے لیے سایہ

بنایا ہے اور تمہارے لیے پہاڑوں میں غار بنائے ہیں۔
اور اس نے تمہارے لیے قمیصیں بنائی ہیں جو بچاتی ہیں
تمہیں گرمی سے ، اور قمیصیں جو بچاتی ہیں تمہیں لڑائی سے
اسی طرح اللہ تعالیٰ پوری کرتا ہے اپنی نعمت تم پر ، تاکہ
تم فرمانبردار ہو جاؤ (۸۱) پس اگر روگردانی کی اِن لوگوں نے
پس بیشک آپ پر کھول کر بیان کر دینا ہے (۸۲) پہچانتے
ہیں یہ اللہ کی نعمت کو ، پھر انکار کرتے ہیں اس کا ، اور
اکثر ان میں کفر کرنے والے (نافرمان) ہیں (۸۳)

آیات

شرک اور مشرکین کے رد کے بعد اللہ تعالیٰ نے وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فرمایا کہ انسانوں کے تمام مخفی حالات سے صرف اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے جو کائنات کی تمام مخفی چیزوں کو جانتا ہے قیامت کو بھی اپنے وقت پر وہی برپا کرے گا۔ انسان قیامت کے وقت کے متعلق کچھ نہیں جانتے ، اور وہ اچانک ہی آئے گی۔ انسان کی انفرادی موت بھی اچانک ہی واقع ہو جاتی ہے کوئی شخص اُس کے وقت اور مقام کو نہیں جانتا۔ گویا قیامتِ صغریٰ اور قیامتِ کبریٰ میں اس لحاظ سے مناسبت ہے۔

پھر اللہ نے اپنی قدرت اور وحدانیت کے دلائل کا ذکر کیا۔ پہلے انسان کے جسم میں موجود بڑی بڑی نعمتوں کو یاد دلایا۔ پھر پرندوں کو ہوا میں تھامنے کا بیان ہوا کہ یہ بھی اللہ ہی کی قدرت کا شاہکار ہے۔ فرمایا یہ ایمان والوں کے لیے نشاناتِ قدرت ہیں جن میں غور کر کے وہ اللہ کی قدرت اور اس کی حکمتِ بالغہ کو سمجھ سکتے ہیں۔

ذریعہ
ن

اب آج کے درس میں بھی اللہ نے انسان پر کیے گئے بعض انعامات کا ذکر کر کے انہیں اپنی قدرت اور وحدانیت کی دلیل بنایا ہے ارشاد ہوتا ہے

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو سکونت کی جگہ بنایا ہے سَکَنًا کے سکون اور سکون دونوں مادے ہیں۔ اگر یہ سکون کے مادہ سے ہو تو مطلب ہے کہ ایسی جگہ جہاں تم سکونت یعنی رہائش اختیار کرتے ہو اور سکون کے مادہ سے ہو تو مطلب ہوگا سکون یعنی آرام پکڑنے کی جگہ۔ سورۃ الانعام میں رات کے متعلق بھی فرمایا جَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا اس نے تمہارے لیے رات کو آرام و سکون کا ذریعہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام جاندار دن بھر روزی کی تلاش میں مشقت کر کے تھک ہار جاتے ہیں تو پھر انہیں اپنی تحلیل شدہ قوتوں کو بحال کرنے کے لیے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو انہیں رات کے سناٹے میں حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اگلے دن کی مشقت کے لیے پھر تیار ہو جاتے ہیں۔

عربی زبان میں کہتے ہیں کُلَّمَا عَلَاکَ وَ اَظَلَّکَ جو چیز تمہارے اوپر سایہ افگن ہوتی ہے اُسے سماء کہتے ہیں اور اس کا اطلاق چھت پر بھی ہوتا ہے کہ یہ بھی انسان کے سروں سے اُوپر ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کُلَّمَا اَقَلَّکَ جو چیز تمہیں اٹھاتی ہے، وہ زمین ہے۔ اس پر قدم رکھ کر انسان چلتا پھرتا ہے اگویا زمین اُسے اٹھائے ہوئے ہے۔ اور جو چیز انسان کو اردگرد سے پردے کی صورت میں گھیرتی ہے وہ جدار یعنی دیوار ہے یہ تینوں چیزیں یعنی زمین چھت اور دیواریں مل جائیں تو مکان معرض وجود میں آجاتا ہے جس کا ذکر اللہ نے اس آیت کریمہ میں بطور احسان فرمایا ہے

انسان کی بنیادی ضروریات

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ خوراک، پانی، لباس اَوْ بَیْتًا یُکِنُّہٗ اور سکون پکڑنے کی جگہ مکان، انسان کی بنیادی ضروریات ہیں جو ہر انسان کو بلالحاظ مذہب و ملت اور رنگ و نسل حاصل ہونی چاہیئے۔ موجودہ زمانے میں ان میں دو مزید چیزیں شامل کر دی گئی ہیں یعنی تعلیم جس کے ذریعے انسان اپنے فرائض کو پہچان سکے اور صحت۔ ان چھ بنیادی ضروریات کو یونیسکو

(UNESCO) بھی تسلیم کرتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ یعنی ہر مرد وزن پر اتنا علم حاصل کرنا فرض ہے جس کے ذریعے وہ اپنے فرائض ادا کر سکے چونکہ فرائض کی ادائیگی صحت و تندرستی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ بھی بنیادی ضرورت شمار کی گئی ہے۔ چنانچہ آج کی دنیا میں بھی کامیاب حکومت وہی تصور ہوتی ہے جو اپنے باشندوں کو بنیادی ضروریات مہیا کرے۔ ملک میں کوئی بھوکا پیاسا نہ ہو۔ ہر نیک و بد کے لیے خوراک اور پانی لازمی ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مکان اور لباس بھی ضروری ہے اگرچہ وہ ادنیٰ قسم کا ہی ہو شادی شدہ جوڑے کے لیے تو مکان کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں اسکی تصریح ہے کہ اگر کوئی مکان کا بندوبست نہیں کر سکتا تو اس کی شادی بھی ممکن نہیں۔ کم از کم اتنا مکان تو ہونا چاہیئے جس میں وہ اپنے اہل وعیال سمیت گزارہ کر سکے۔ بہر حال اس مقام پر اللہ نے مکان جیسی بنیادی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ عام طور پر مکان مٹی گارے اور اینٹ پتھر کے ہوتے ہیں۔ تاہم یہ خیموں کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ قدیم زمانے میں ہوتے تھے۔ اور جس کا ذکر آگے آرہا ہے، بہر حال گرمی، سردی اور بارش وغیرہ سے بچاؤ کے لیے مکان ضروری ہے جسے اللہ نے یہاں پر انعام کے طور پر ذکر فرمایا ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ لفظ "سَکَنًا" سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ گھر کا مقصد آرام حاصل کرنا ہے اور گھر وہی اچھا ہوگا جس میں انسان کو آرام وراحت حاصل ہو۔ اگر انسان کو گھر میں داخل ہو کر سکون نصیب نہیں ہوتا تو اس کی عالیشان بلڈنگ بھی بیکار محض ہے جو کہ مکان کے مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ دنیاوی لحاظ سے سعادت مند شخص وہ ہے جسے اچھا گھر، اچھی بیوی ——— اور اچھی سواری میسر ہو۔ اگر یہ تینوں چیزیں ناموافق ہوں، یعنی مکان میں گرمی، سردی

اور بارش سے بچاؤ کا انتظام نہ ہو، بیوی مرضی کے خلاف ہو اور سواری بھی تنگ کرتی ہو، تو ایسا شخص دنیاوی لحاظ سے شقی ہوگا۔ بہر حال مکان سکونت اور آرام کے لیے ہے اور انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔

چمڑے کے خیمے

نزولِ قرآن کے زمانے میں گھر کے طور پر چمڑے کے خیمے عام استعمال ہوتے تھے۔ اکثر لوگ خانہ بدوش زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں خوراک اور پانی میسر آیا وہاں خیمے لگا کر رہائش اختیار کر لی، یہ ذخیرہ ختم ہوگیا تو آگے چل دیے عام مکان کا ذکر کرنے کے بعد آیت کے اگلے حصے میں اللہ نے خاص طور پر خیموں کے گھروں کا ذکر فرمایا کہ اس کا تم پر یہ بھی احسان ہے وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا اس نے تمہارے لیے مویشیوں کی کھالوں سے گھر بنائے۔ اور یہ ایسے گھر ہیں تَسْتَخِفُّونَهَا کہ تم انہیں ہلکا خیال کرتے ہو يَوْمَ ظَعْنِكُمْ سفر کے دن وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ اور اپنے قیام کے دن۔ ظاہر ہے کہ اینٹ پتھر کا مکان تو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا، البتہ کپڑے، پلاسٹک یا کھال کا خیمہ تو آسانی سے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ خیمے کا گھر تم دوران سفر بھی ہلکا خیال کرتے ہو کہ بآسانی جانور پر لادا جا سکتا ہے اور دوسری جگہ آسانی سے قائم بھی کیا جا سکتا ہے گویا اقامت بھی آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ ہم چالیس آدمی ایک موقع پر حضور علیہ السلام کے ساتھ چمڑے کے خیمے میں مقیم تھے اور آپ نے وہاں ایک خوشخبری بھی سنائی، ترمذی شریف کی روایت[1] میں آتا ہے کہ گرم موسم میں سفر کے دوران افضل صدقہ ظِلُّ فُسْطَاطٍ یعنی سایہ مہیا کرنا ہے اور کسی نے غازیوں اور مجاہدین کے لیے خیمہ کا بندوبست کر دیا تو یہ اس کے لیے بہترین صدقہ ہوگا۔ پرانے زمانے میں خیموں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، آج کے دور میں بھی فوجی نقل وحمل

[1] ترمذی ص۲۹۲ ج ۱

کے دوران خیموں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایامِ حج میں منیٰ اور عرفات کے میدانوں میں خیموں میں ہی قیام کیا جاتا ہے اور ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔ ہر سال دنیا بھر میں خیمہ بستی کا یہ سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ جہاں تک خیموں کی ساخت کا تعلق ہے، اللہ نے فرمایا کہ چمڑے کے علاوہ وَمِنْ اَصْوَافِهَا یہ جانوروں کی اون سے بھی تیار ہوتے ہیں۔ بھیڑوں کی اون اس مقصد کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ وَاَوْبَارِهَا یہ جانوروں کی پشم سے بھی تیار ہوتے ہیں۔ اونٹوں کا پشم خیمے بنانے کے کام آتا ہے وَاَشْعَارِهَا اور ان کے بالوں سے بھی۔ بکری کے بال بھی خیمہ بنانے کے کام آتے ہیں۔ فرمایا اَثَاثًا ان سے تم طرح طرح کے سامان تیار کرتے ہو۔ پہننے، اوڑھنے اور بچھانے کے لیے کپڑے جانوروں کے بالوں اور اون وغیرہ سے ہی تیار ہوتے تھے وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ۔ ان چیزوں میں اللہ نے مدتِ مقررہ تک تمہارے لیے فائدے کا سامان رکھا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت کی نشانیاں ہیں۔

سایہ کی نعمت

آگے اللہ نے ایک اور نعمت کا ذکر کیا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا اللہ نے اپنی تخلیق کردہ اشیاء میں سے تمہارے لیے سائے بھی بنائے۔ دھوپ اور گرمی میں سایہ بہت بڑی نعمت ہے کہیں درختوں کا سایہ، کہیں پہاڑوں کا اور کہیں عمارات کا سایہ مہیا فرمایا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان اور جانور بڑی مشقت میں مبتلا ہوتے۔ خاص طور پر بادلوں کا سایہ تو بہت ہی خوشگوار ہوتا ہے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ نے بادلوں کے سایہ کا خصوصی انتظام فرمایا تھا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دو لعنت والی چیزوں سے بچو ان میں سے ایک سایہ ہے اور دوسرا شارع عام۔ فرمایا ان دو جگہوں پر بول و براز کرنا باعثِ لعنت ہے کیونکہ سایہ لوگوں کے آرام کرنے کی جگہ ہے

اور اگر وہاں گندگی ہوگی تو ان کے آرام میں خلل واقع ہوگا۔ اسی طرح عام راستے پر بھی گندگی ہوگی تو مسافروں کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا ان دو جگہوں پر بول و براز کر کے لعنت کے مستحق نہ بنو۔ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں سے سایہ بھی ایک نعمت ہے۔

"وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا" اور تمہارے لیے پہاڑوں میں غار بنائے۔ غار بھی انسانوں کو بارش یا دھوپ سے محفوظ رکھتے ہیں۔ دشمن کا خوف ہو تو غاروں میں پناہ لی جاتی ہے۔ تو اللہ نے پہاڑوں کی غاروں کو بھی اپنی نشانی اور انسان کے لیے نعمت قرار دیا۔

بچاؤ کی قمیصیں

آگے ایک اور نعمت کا تذکرہ فرمایا۔ وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ اور تمہارے لیے قمیصیں بنائیں تَقِيكُمُ الْحَرَّ جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ قمیص انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتی ہے مگر یہاں پر سردی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ مفسرین یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن کے اولین مخاطبین صحرائے عرب کے لوگ تھے، جہاں گرمی ہی پڑتی ہے۔ وہ لوگ سردی سے چنداں مانوس نہیں تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف گرمی کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ نے ایسی قمیصیں بنائیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کے ابتدائی حصے میں مویشیوں کے تذکرہ میں دِفْءٌ کا ذکر کیا ہے کہ ان میں تمہارے لیے گرمائش کا سامان ہے۔ ظاہر ہے کہ سردی کے موسم میں کمبل، شال اونی لباس کی ضرورت ہوتی ہے جو جانوروں کے پشم اور بالوں سے تیار ہوتے ہیں۔ چونکہ وہاں پر سردی سے بچاؤ کا ذکر ہو چکا ہے، اس لیے یہاں پر صرف گرمی سے بچاؤ کا بیان آیا ہے۔

فرمایا، اس کے علاوہ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُم بَأْسَكُمْ ہم نے ایسی قمیصیں بھی بنائی ہیں جو تمہیں جنگ میں بچاتی ہیں۔ اس قمیص سے

مراد لوہے کی زرہ بکتر ہے جو لوگ دشمن کے وار سے محفوظ رہنے کے لیے پہنتے تھے۔ موجودہ زمانے میں بکتر بند گاڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں جو اپنے سواروں کو دشمن کی گولہ باری سے محفوظ رکھتی ہیں سر پر خود پہننے میں بھی یہی مصلحت ہے کہ انسان کسی ممکنہ چوٹ سے بچ سکے خود حضور علیہ السلام نے زرہ کا استعمال کیا ہے، چنانچہ احد کے روز آپ نے اوپر نیچے دو زرہیں پہن رکھی تھیں۔ اس قسم کے حفاظتی اقدام عالم اسباب کا لازمی حصہ ہیں اور انہیں اختیار کرنا چاہیے اس کے باوجود تکلیف اور راحت تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ جنگ احد میں ان تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔

انعامات الٰہی کا شکریہ

فرمایا كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ تاکہ تم فرمانبردار بن جاؤ۔ مکان، لباس، خوراک، سایہ وغیرہ اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں اسی طرح بارش بھی اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر بہت بڑا احسان ہے تو لوگوں کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کا شکریہ ادا کریں۔ اور اس کی فرمانبرداری کریں فَاِنْ تَوَلَّوْا اور پھر بھی اگر یہ لوگ روگردانی کریں پوری طرح سمجھانے کے باوجود راہِ راست پر نہ آئیں، تو اے پیغمبر علیہ السلام فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ آپ کے ذمے تو کھول کر بیان کر دینا ہے۔ حق و باطل کو واضح کر دینا ہے۔ اگر یہ آپ کی بات کو نہیں مانیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ خود ان سے نپٹ لیگا۔

فرمایا حقیقت یہ ہے يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو خوب پہچانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تمام نعمتیں عطا کرنے والا فقط وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کے باوجود ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ان نعمتوں کی ناقدری کرتے ہیں یعنی ان کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ اور یہ ایسے لوگ ہیں وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ کہ ان کی اکثریت کفر کرنے

والوں پر مشتمل ہے۔ اِن میں سے بعض تو حقیقی کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہی کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے طرح طرح کے شریک بنا رکھے ہیں اور رسوماتِ باطلہ پر ہی اڑے ہوئے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو حقیقی کافر تو نہیں مگر انعاماتِ الٰہیہ کی ناشکری کر کے کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور یہ چیز بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا
يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۸۴﴾
وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۸۵﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ
أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا
الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ
الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۸٦﴾ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ
يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ :۔ اور جس دن ہم کھڑا کریں گے ہر امت سے گواہ ۔پھر نہیں اجازت دی جائے گی اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ، اور نہ اُن کو منانے کا موقع دیا جائے گا (۸۴) اور جب دیکھیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے ،عذاب کو ،پس نہیں تخفیف کی جائیگی اُن سے اور نہ اُن کو ڈھیل دی جائے گی (۸۵) اور جب دیکھیں گے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا ہے اپنے شریکوں کو تو کہیں گے ، اے ہمارے پروردگار ! یہ ہیں ہمارے شریک جن کو ہم پکارتے

تھے تیرے سوا ۔ پس ڈالیں گے وہ اُن کی طرف بات
اور کہیں گے ، بیشک تم البتہ جھوٹے ہو (۸۶) اور
ڈالیں گے اس دن اللہ کے سامنے اطاعت اور گم ہو
جائیں گی اُن سے وہ باتیں جن کو وہ افترا کیا کرتے تھے (۸۷)

انسان کے خلاف گواہیاں

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور مشرکین کے ردّ میں بہت سے دلائل اور نشاناتِ قدرت بیان فرمائے اور مشرکوں کی ناشکری کا ذکر کیا۔ اب آج کے درس میں کفار و مشرکین کو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے کہ جب محاسبے کی منزل آئیگی تو انہیں سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، جس میں تخفیف بھی نہیں ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا اور جس دن ہم ہر امت سے گواہ کھڑا کریں گے۔ اس مقام پر گواہ سے مراد اللہ کے نبی ہیں اور گواہی سے مراد تبلیغ رسالت کی گواہی ہے۔ ہر نبی اپنی امت کے متعلق اللہ کے حضور گواہی دے گا۔ کہ اس نے اللہ کا پیغام اپنی امت کے لوگوں تک پہنچا دیا مگر انہوں نے اُسے تسلیم نہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کتنا خوفناک منظر ہو گا۔ اگلی آیات میں یہ بھی آرہا ہے "وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ" اور اے پیغمبر! آپ کو اس آخری امت پر بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔ ہر شخص کے حق میں یا خلاف گواہی نہ صرف انبیاء علیہم السلام کی ہوگی بلکہ بعض دیگر چیزیں بھی گواہ کے طور پر پیش ہوں گی۔ مثلاً کراماً کاتبین فرشتے گواہی دیں گے جو ہر شخص کا انفرادی ریکارڈ مرتب کر رہے ہیں۔ ہر شخص کی حفاظت پر مامور اللہ کے فرشتے بھی بندے کے حق میں یا اس کے خلاف شہادت دیں گے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے اپنے اعضاء و جوارح اس کے حق میں گواہ بن جائیں گے۔ سورہ یٰسین میں موجود ہے "اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ"

اس دن ہم ان کے موہنوں کو سر مہر کر دیں گے اور ان کی کارکردگی کے متعلق ان کے ہاتھ اور پاؤں بول کر گواہی دیں گے۔

حدیث شریف میں شجر و حجر کی گواہی کا ذکر بھی آتا ہے۔ جب کوئی شخص نماز کے لیے اذان یا اقامت کہتا ہے[1] تو شیطان چھتیس[36] میل تک دور بھاگ جاتا ہے اور اذان و اقامت کے اختتام پر پھر واپس آجاتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص محض اللہ کی رضا کے لیے اذان کہتا ہے، اس[2] کی آواز سننے والی ہر چیز قیامت کے روز اس کے حق میں اللہ کے حضور گواہی دیگی۔ اس میں شجر، حجر، عمارات، مینار غرضیکہ ہر چیز کی گواہی آجاتی ہے۔

غار کی بسی

بہر حال فرمایا کہ اللہ کے نبی تبلیغ رسالت کے متعلق قیامت کو گواہی دیں گے کہ ہم نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا۔ ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا پھر کفر کرنے والوں کو اجازت نہیں دی جائیگی کہ وہ کوئی حیل و حجت کر سکیں وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ اور نہ ہی ان سے منانے کا موقع دیا جائیگا۔ یعنی ان کو اس وقت توبہ کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنی سابقہ کارکردگی پر تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کو راضی کر سکیں۔ اس وقت عمل کا وقت ختم ہو کر جزائے عمل شروع ہو چکا ہوگا لہذا وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی بھی نہیں مانگ سکیں گے۔ اگر دنیا کی زندگی میں تائب ہو کر اللہ کو راضی کر لیتے، اس کو منا لیتے تو جزائے عمل کے وقت مفید ہو سکتا تھا، مگر اس وقت وہ موقع گزر چکا ہوگا، اور کفار کوئی حیلہ بہانہ نہیں کر سکیں گے۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر یہ ذکر ملتا ہے کہ قیامت کے دن کفار اللہ کے حضور عرض کریں گے کہ انہیں دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تو وہ اس کی اطاعت بجا لائیں گے مثلاً سورۃ انعام میں ہے کہ جب انہیں دوزخ پر پیش کیا جائے گا۔

"فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" اس وقت وہ کہیں گے کاش کہ ہمیں دنیا میں واپس

---

[1] مسلم ص۱۶۷ ج۱ [2] بخاری ص۸۶ ج۱

لوٹا دیا جائے تو ہم اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہیں جھٹلائیں گے اور مومن بن جائیں گے۔ سورۃ السجدہ میں ہے کہ مجرم لوگ کہیں گے "رَبَّنَآ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا" پروردگار! ہم نے اپنی آنکھوں سے تیرے عذاب کو دیکھ لیا، تیرے احکام کو سن لیا، اب ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے، ہم نیک اعمال انجام دیں گے۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اگر ان کو دوبارہ بھی موقع دے دیا جائے تو پھر بھی یہ غلط کام ہی کریں گے کیونکہ ان کی سرشت میں غلط بات ہی داخل ہو چکی ہے۔

فرمایا وَاِذَا رَاَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الۡعَذَابَ جب ظالم لوگ عذاب کو دیکھیں گے۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ تو اس میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ اور نہ اُن کو ڈھیل دی جائیگی۔ یہاں پر عذاب کے مشاہدے کے لیے ظالم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین، اس کی توحید، قیامت، رسل، کتب اور ملائکہ کا انکار کرتا ہے وہ بہت بڑے ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے "وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ" (البقرہ) کافر لوگ ہی ظالم ہیں۔ اور شرک کے متعلق فرمایا اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ" (لقمان) شرک بہت بڑا ظلم ہے اور مشرک بہت بڑا ظالم ہے، کفر و شرک کے بعد ظلم کی تعریف میں کبائر اور صغائر معاصی آتے ہیں۔ صغائر تو نیکی کرنے سے خود بخود معاف ہوتے رہتے ہیں مگر کبائر بغیر سچی توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ تو فرمایا کہ ظالم لوگوں کو جب عذاب میں مبتلا کیا جائے گا تو پھر نہ تو اس میں تخفیف ہو گی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ سورۃ البقرہ میں بھی موجود ہے کہ جو لوگ کفر کی حالت میں مر گئے، اُن پر اللہ تعالیٰ فرشتوں اور عام لوگوں کی لعنت ہو گی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے "لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ" اُن کے عذاب میں نہ تو تخفیف کی جائیگی اور

نہ انہیں ڈھیل دی جائیگی۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ لوگ خود تمنا کریں گے کہ ایک دن کے لیے ہم سے عذاب میں تخفیف کر دی جائے تاکہ ہم تھوڑی دیر کے لیے سکون حاصل کر سکیں مگر اس وقت اُن کی کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔

شرکاء کا انکار

فرمایا وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ اور جب مشرک لوگ اپنے شرکاء کو دیکھیں گے، قیامت کے دن اپنے باطل معبودوں سے ملاقات ہوگی قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا تو کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہ ہیں ہمارے وہ شریک الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِن دُونِكَ جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے۔ وہ شریک جن کو ہم مصیبت میں پکارتے تھے، جن کے نام کی نذر و نیاز دیتے تھے اور جن کی ہم عبادت کرتے تھے۔ یہ رہے ہمارے وہ معبود۔ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ تو اُدھر سے اُن پر بات ڈالی جائے گی یعنی وہ معبود ان جواب دیں گے إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ کہ بیشک تم جھوٹے ہو۔ معبودیت سے انکار کرنے والے ہر قسم کے معبود ہوں گے۔ جیسا کہ سورۃ ابراہیم میں گزر چکا ہے کہ خود شیطان بھی انکار کر دے گا۔ جب لوگ قیامت کے دن اُس کا گھیراؤ کریں گے کہ تو دنیا میں ہمیں بہکاتا رہا، لہٰذا آج ہم سے عذاب دور کرنے کا کوئی بندوبست کر تو وہ جواب دیگا " وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي" (ابراہیم) میرا تم پر کوئی غلبہ تو نہیں تھا یعنی میں نے تم سے کوئی بات زبردستی تو نہیں منوائی تھی۔ میں نے تمہیں کفر، شرک اور بُرائی کی محض دعوت دی تھی جسے تم نے بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا۔ لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ خود اپنے آپ کو ملامت کرو تم اپنے فعل کے خود ذمہ دار ہو۔

بعض فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں ماننے والے اور اُن کی پوجا کرنے والے

دیوی دیوتاؤں کو معبود ماننے والے، اُن کی نیاز دینے والے اور عبادت کرنے والے جب اللہ کے حضور فرشتوں کو بطور معبود پیش کریں گے تو وہ بھی جواب دیں گے سُبْحٰنَکَ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ ہم تو تجھے ہی کارساز سمجھتے رہے بھلا ہم انہیں کیسے کہہ سکتے تھے کہ اللہ کو چھوڑ کر ہمیں اپنا معبود بنالو۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ غرضیکہ تمام انبیاء، صلحا اور نیک لوگ انکار کر دیں گے کہ ہم نے تو انہیں نہیں کہا کہ ہمیں اپنا معبود بنالو۔ مسیح علیہ السلام کے متعلق سورۃ مائدہ میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو اللہ کے سوا معبود بنالو؟ تو مسیح علیہ السلام عرض کریں گے اے پروردگار! مجھے یہ کیسے حق پہنچتا ہے کہ میں کوئی ایسی بات کروں جس کا تو نے مجھے حکم نہیں دیا۔ میں نے تو ان سے یہی کہا "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ" صرف اللہ کی عبادت کرو جو تمہارا بھی رب ہے اور میرا بھی رب ہے جو لوگ قبروں کے ساتھ شرکیہ معاملات کرتے ہیں، وہ قبروں والے بھی بیزاری کا اعلان کر دیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ اے شرک کرنے والو! اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ "تم اپنے دعوے میں جھوٹے ہو۔ ہم نے تمہیں اپنی پرستش کے لیے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ غرضیکہ سب انکار کر دیں گے۔

جنتی اور دوزخی کا مکالمہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حساب کتاب کی منزل کے بعد جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائینگے تو آپس میں کروڑوں میل کے بُعد کے باوجود وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور آپس میں مکالمہ بھی کریں گے چنانچہ سورۃ الصّٰفّٰت میں موجود ہے کہ ایک مومن آدمی کسی کافر واقفکار کو دیکھنا چاہے گا "فَرَاٰہُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ" تو وہ اسے جہنم میں پڑا پائیگا۔ پھر مومن اس سے کہے گا کہ اگر میں بھی تیری بات پر چلتا تو آج تیرے ساتھ جہنم میں ہوتا۔ اللہ نے مجھ پر بڑا احسان فرمایا کہ مجھے کفر و شرک سے محفوظ

رکھا جس کی بنا پر میں آج راحت کے مقام میں ہوں اور تم تکلیف میں ہو۔ اسی طرح جب ملائکہ، حضرت عیسٰی علیہ السلام یا حضرت عزیر علیہ السلام کی پرستش کرنیوالے ان کو جنت میں دیکھیں گے تو کہیں گے، پروردگار! یہ ہیں ہمارے معبود، مگر آگے سے جواب آئیگا "اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ" تم جھوٹے ہو۔ ہم نے تو تمہیں اپنی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ تم نے خود شیطان کا اتباع کیا اور آج اس کا بھگتان کر رہے ہو۔

جب کفار و مشرکین ہر طرف سے مایوس ہو جائیں گے تو پھر خالص اللہ کی طرف رجوع کریں گے۔ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىِٕذِ ِالسَّلَمَ آج کے دن اللہ کے سامنے اطاعت کی بات ڈالیں گے یعنی اُس کی فرمانبرداری کا دم بھریں گے کہ اب ہم تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہیں، مگر اُس وقت اِس جذبے کا اظہار کسی کام نہ آسکے گا، عمل کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔ اور پھر اُس وقت وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ وہ سب باتیں اُن سے گم ہو جائیں گی جن کو وہ افترا کیا کرتے تھے۔ جو بھی شرکیہ یا کفریہ عقائد رکھتے تھے اور اُن پر عمل کرتے تھے یا جن شرکیہ رسومات کو عمر بھر سینے سے لگائے رکھا، وہ سب ختم ہو جائیں گی، کوئی چیز ان کی مدد کو نہیں پہنچے گی۔ اُس وقت اطاعت کا اظہار "بعد از مرگ واویلا" کے مترادف ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ
عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَ
يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ
اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً
ع ۱۲/۱۸ وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ:- وہ لوگ جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ہے اور روکا ہے اللہ کے راستے سے، ہم زیادہ کریں گے اُن کے لیے عذاب کے اُوپر عذاب، اس وجہ سے کہ وہ فساد کرتے تھے ﴿۸۸﴾ اور (اس وقت کو اپنے خیال میں لاؤ) جس دن ہم اٹھائیں گے ہر ایک امت سے گواہ اُن پر انہی میں سے، اور لائیں گے ہم آپ کو گواہ بنا کر ان لوگوں پر۔ اور اتاری ہے ہم نے آپ پر کتاب، جو کھول کر بیان کرتی ہے ہر چیز کو، اور ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے فرمانبرداروں کے لیے ﴿۸۹﴾

ربط آیات

شرک اور مشرکین کے رد کے بعد اللہ نے عذاب کی وعید سُنائی اور مشرکین و کفار کے متعلق فرمایا کہ جب وہ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے تو پھر نہ تو اس میں تخفیف ہو گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائیگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کر سکیں۔ مشرک لوگ

اپنے معبودوں کو دیکھ کر اقرار کریں گے کہ ہم اِن کی عبادت کرتے رہے مگر وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہم نے تو انہیں نہیں کہا تھا کہ ہمیں معبود مان کر ہماری عبادت کرنے لگو۔ یہ تو خود ہی من مانی کرتے رہے۔ فرمایا اس وقت اُن کی تمام خود ساختہ کاروائیاں گم ہو کر رہ جائینگی۔

اسلام کے راستے میں رکاوٹ

اِسی عذاب کی وعید کے تسلسل میں ہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وہ لوگ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ کفر، شرک، نفاق وغیرہ قرآن پاک کی اصطلاحات ہیں۔ کفر کا لغوی معنی چھپانا یا انکار کرنا ہے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی بات کو چھپایا اور اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا، اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اللہ کے راستے سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ اصل میں یہی فعل فساد کی بنیاد بنتا ہے خود بھی اللہ کی وحدانیت کو تسلیم نہ کیا اور پھر دوسروں کے راستے میں بھی رکاوٹ بنے سورۃ انعام میں اس بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "وَھُمْ یَنْھَوْنَ عَنْہُ وَیَنْئَوْنَ عَنْہُ" خود بھی ایمان سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ اسلام کے راستے سے روکنا صرف مشرکین مکہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہر دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ فرعون بھی روکتا تھا۔ قومِ نوح اور قوم شعیب بھی اسی ڈگر پہ چلتی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم سے اسی طرح خطاب کیا تھا "وَلَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِہٖ وَتَبْغُوْنَھَا عِوَجًا" (الاعراف) ہر راستے پر مت بیٹھا کرو کہ جو شخص ایمان لاتا ہے تم اُسے ڈراتے ہو اور راہِ خدا سے روکتے ہو اور اس میں کجی تلاش کرتے ہو۔

دنیا کی کافر قوتیں آج بھی لوگوں کو اسلام کے راستے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ عیسائی مشنریاں اسی کام پر لگی ہوئی ہیں نہایت گہری سازش کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس معاملہ میں برطانوی، روسی، فرانسیسی، جرمنی عیسائی سب اکٹھے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے عروج کے دو سو سالوں میں اس معاملہ میں بڑی پیش رفت کی انہوں نے پس ماندہ اقوام کو لالچ دے کر عیسائیت کی طرف راغب کیا۔ ان کے وزیر اعظم گلیڈسٹون نے اسمبلی میں قرآن کریم ہاتھ میں اٹھا کر کہا تھا کہ جب تک دنیا میں یہ کتاب موجود ہے، دنیا مہذب نہیں بن سکتی۔ ان کا اوّل و آخر مقصد قرآن پاک کو دنیا سے ختم کر کے دین اسلام سے لوگوں کا تعلق ختم کرنا ہے مگر اس عظیم کتاب کا محافظ خود اللہ تعالیٰ ہے، اسی لیے پوری کوشش کے باوجود دنیا کی کوئی طاقت قرآن کریم کا ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں کر سکی۔ چہ جائیکہ اسے نابود کر دیا جاتا۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی عیاشی، فحاشی، عریانی اور بے حیائی کی قاطع یہی کتاب ہے۔ جب تک یہ ختم نہ ہو ان کی قبیح تہذیب پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہ اتنے گندے لوگ ہیں کہ مرد و زن کی مرضی سے کیے گئے زنا کو زنا ہی نہیں سمجھتے ان کے نزدیک زنا صرف وہ ہے جو بالجبر کیا جائے۔ لواطت ان کے ہاں کوئی جرم نہیں اور دنیا کی ہر برائی ان کے ہاں جدید فیشن میں داخل ہے۔

غرضیکہ کبھی خوشنما تہذیب کی آڑ میں لوگوں کو دین سے روکا جاتا ہے۔ کبھی پیسے کے لالچ کے ذریعے کبھی سکول اور ہسپتال قائم کر کے اور کبھی قرآن اور دین کے ہمدرد بن کر اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روسی اور چینی تشدد کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ مسلمانوں کو سرِعام عبادت سے روکتے ہیں ایسا پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام کے ماننے والے شک میں پڑ جائیں اور آہستہ آہستہ دین سے بیزار ہو جائیں۔ اُدھر مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی تاریخ تک پڑھنے کے لیے تیار نہیں اگر وہ ایسا کرتے تو غیر مسلم یلغار کا جواب دے سکتے مگر انہیں تو اسلامی مشاہیر کی بجائے یہودی، عیسائی اور اشتراکی مشاہیر پر فخر ہے اور انہی کے گُن گاتے ہیں۔ یہ سارے جال مسلمانوں کو اپنے دین سے متنفر کرنے کے لیے پھیلائے جا رہے ہیں مگر مسلمان غفلت کی نیند سوئے

ہو گئے ہیں اور کوئی نوٹس ہی نہیں لے رہے ہیں۔

اس وقت دنیا میں پچاس سے زیادہ اسلامی ریاستیں ہیں، ان کے پاس وسائل کی کمی نہیں، وہ بھی سکول، کالج اور ہسپتال قائم کر کے عیسائی مشنریوں کا دروازہ بند کر سکتے ہیں، وہ بھی پس ماندہ طبقوں کی دستگیری کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے جذبۂ ایمانی کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کو اسلام کے خلاف سازش کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مجوسیوں، منافقوں اور یہودیوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں بڑی رخنہ اندازی کی۔ انہوں نے اسلام کے اندر داخل ہو کر اسلام کو کمزور کیا، فرقہ بندی کی اور مسلمانوں کو آپس میں لڑایا۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلق قرآنِ پاک سے جس قدر کمزور ہو گا، اُسی قدر مخالف قوتوں کو کامیابی حاصل ہو گی۔ بہرحال غیر مسلم اقوام نے ہمیشہ دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

مفسدین کیلئے سزا

فرمایا جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ ہم بڑھائیں گے ان کے لیے عذاب پر عذاب بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ اس وجہ سے کہ وہ فساد کرتے تھے۔ عذاب پر عذاب یعنی دوہرا عذاب اس لیے کہ انہوں نے خود بھی کفر کا راستہ اختیار کیا اور دوسروں کے راستے میں بھی رکاوٹ ڈالی، لہٰذا ایک عذاب تو ان کے اپنے کفر کا ہو گا اور دوسرا لوگوں کے بہکانے کا، اسلام کا بنیادی قانون تو یہی ہے کہ ہر مجرم کو اس کے گناہ کی ایک ہی سزا دی جائے مگر یہ لوگ چونکہ دوسروں کی گمراہی کے ذمہ دار بھی ہیں لہٰذا دوہری سزا کے مستحق ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[1] ہے کہ جو کوئی اچھا راستہ قائم کرتا ہے، اُس کو اپنے عمل کا ثواب بھی ملے گا۔ اور اس پر عمل کرنے والے لوگوں کے برابر ایک ایک مزید ثواب بھی اُسے حاصل ہو گا۔ اسی طرح بُرا راستہ قائم کرنے والا، معاصی

اور بدعات کی راہ نکالنے والا اس کردہ جرم کا مجرم بھی ہوگا اور پھر اس بری رسم پر چلنے والے ہر شخص کے بدلے ایک ایک گناہ اس ایجاد کنندہ کے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوتا رہیگا۔ آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کا اولین قتل ناحق کیا تھا۔ اب قیامت تک جتنے بھی قتل ناحق ہوں گے اُن میں ہر قتل کا ایک گناہ آدم علیہ السلام کے اس بیٹے کے رجسٹر میں بھی درج ہوتا رہے گا جو اولین قتل ناحق کا مرتکب ہوا۔

غرضیکہ کفر، شرک، معاصی اور خدا کی شریعت کی خلاف ورزی زمین میں فساد ہے۔ اِن امور سے زمین بگڑتی ہے، انسانی سوسائٹی میں خوف و ہراس اور بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ زمین کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے اور اس کا بگاڑ معاصی سے ہوتا ہے۔ تو فرمایا کہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو دگنا عذاب دیا جائے گا۔

انبیاء کی گواہی

قیامت کے دن ہر فسادی کے خلاف گواہ پیش کرنے کی بات گذشتہ درس میں بھی گزر چکی ہے۔ اگلی آیت میں اسے پھر دوہرایا جا رہا ہے وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ اور اُس وقت کو یاد کرو جب قیامت کے دن ہم ہر امت پر خود انہی میں سے گواہ پیش کریں گے۔ ہر امت کا نبی اپنی امت کے خلاف گواہی دیگا کہ اس امت نے کس طرح اُس کی بات کو ٹھکرایا اور تکالیف پہنچائیں۔ اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا، اغیار کی پوجا کرتے رہے شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ پھر اس گواہی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ ہر امت کے متعلق فیصلہ کریں گے۔ فرمایا یہ تو سابقہ امتوں کی بات ہے اے پیغمبر آخر الزمان! وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ہم آپ کو اس آخری امت کے لوگوں پر بطور گواہ لائیں گے۔ آپ بھی اپنی امت کے حق میں یا اُن کے خلاف گواہی دیں گے اور پھر اس کے مطابق فیصلہ کیا

جائیگا۔ اُس وقت کتنا خوفناک منظر ہوگا اور کتنی پریشانی کا عالم ہوگا جب محاسبے کی منزل آئے گی اور اللہ کی بارگاہ میں گواہیاں پیش ہوں گی۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نبی کا اتباع اختیار کرے تاکہ قیامت کے دن اس کی بہتر گواہی کا مستحق بن سکے۔

قرآن بطور تبیان

ارشاد ہوتا ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اور ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف کتاب تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرتی ہے یعنی ہر چیز کی بہت زیادہ وضاحت کرتی ہے۔ ایک سطحی نظر میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں ہر چھوٹی بڑی چیز کی وضاحت تو نہیں ہے، پھر تبیان سے کیا مراد ہے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کسی چیز کو کسی مقام پر اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے اور کہیں تفصیل موجود ہے۔ بعض مقامات پر نبی علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل سے کسی حکم کی جزئیات سے آگاہ کر دیں گے۔ لہٰذا نبی کی وضاحت بھی قرآن پاک کی طرف سے ہی وضاحت سمجھی جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مسئلہ قرآن وسنت میں بالوضاحت موجود نہیں مگر اس پر مسلمانوں کا اجماع ہو گیا ہے تو وہ بھی منجانب اللہ ہی سمجھا جائے گا اور قرآن پاک کے تبیان ہی میں شمار ہوگا۔ سورۃ النساء میں موجود ہے کہ جو شخص ہدایت کا راستہ واضح ہو جانے کے باوجود مومنوں کے راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اُسے اُدھر ہی پھیر دیں گے، جدھر وہ جانا چاہتا ہے اور اس کا ٹھکانا آخر جہنم ہوگا۔ یہاں غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ کا یہی مطلب ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں خصوصاً خیر القرون کے مسلمانوں کے متفقہ راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے، گویا اجماع امت کا فیصلہ بھی قرآنِ پاک کے تبیان ہی کا حصہ شمار ہوگا۔

زمانے کے ساتھ ساتھ نئے نئے پیدا ہونے والے مسائل کے حل و عقد

کے لیے اللہ نے اجتہاد و استنباط کا اصول بھی بیان کیا ہے۔ جگہ جگہ "فَاعْتَبِرُوا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ" کے الفاظ آتے ہیں یعنی اے صاحب عقل و بصیرت لوگو! قرآن پاک میں بیان کردہ اصولوں پر غور و فکر کر کے مسائل کا استنباط کرو۔ کہیں فرمایا "لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النساء) اگر کوئی مشکل پیش آئے گی تو اجتہاد و استنباط کرنے والے آپ کو بتائیں گے، لہذا اُن کی طرف رجوع کرو کہ یہ بھی تبیان میں داخل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا نظریہ یہ ہے کہ شریعت کے چار اصول ہیں یعنی کتاب اللہ سنتِ رسول اللہ، اجماعِ صحابہ اور قیاس۔ اگر پہلی تین چیزوں سے مسئلہ حل نہ ہو تو ائمہ مجتہدین کے قیاس کو دیکھ لو۔ ان میں پہلے دو اصول یعنی قرآن اور سنت مثبت ہیں اور یہ کسی چیز کو ثابت کرتے ہیں۔ البتہ دوسرے دو اصول یعنی اجماع اور قیاس مظہر ہیں۔ یہ کسی چیز کا قطعی ثبوت نہیں مگر یہ کسی چیز کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاصؒ، امام شافعیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا گنگوہیؒ امام ابن تیمیہؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ ہر مسئلہ کی اصل بنیاد تو قرآن پاک ہی ہے اور سنت بھی قرآن کی شرح ہی ہے۔ تاہم امام ابوبکر جصاصؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ کائنات کے ہر مسئلہ کے بارے میں اللہ کا حکم موجود ہے۔ اس حکم کو یا تو خود اللہ کی کتاب نے واضح کیا ہوگا، یا اس کا بیان اللہ کے نبی کی زبان سے ہوا ہوگا۔ یا مومنین کا اتفاق اس پر شاہد ہوگا، یا پھر ائمہ مجتہدین اُس دلیل کو واضح کریں گے جس پر اس مسئلہ کی بنیاد ہوگی۔ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک ہر مسئلہ کی جزئیات بیان نہیں کرتا بلکہ اس میں اصول و قوانین موجود ہیں جن کی روشنی میں ہر چیز کا حل پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہدایت، رحمت اور خوشخبری

فرمایا، اللہ کی یہ کتاب وَ ھُدًی ہدایت ہے اور ہر موڑ پر انسان کی راہنمائی کرتی ہے۔ پھر جب لوگ اس ہدایت پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں تو فرمایا یہی کتاب وَّرَحْمَةً باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی شاملِ حال

ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کا یہ کلام "وَبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ" بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔ سورۃ یونس میں بھی موجود ہے کہ ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے "اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ" تمہارے پروردگار کے پاس تمہارا سچائی کا قدم پڑ رہا ہے، لہذا گھبراؤ نہیں، تم اچھے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گے۔ اگر ایمان میں استقامت حاصل رہی قرآن پر عمل کرتے رہے اور معاصی سے بچتے رہے، کفر شرک اور بدعات سے پرہیز کیا تو تمہارے لیے خوشخبری ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہو جاؤ گے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کرنے کا احسان کرنے کا ، اور قرابت داروں کو دینے کا ۔ اور منع کرتا ہے بے حیائی سے ، نامعقول باتوں سے اور سرکشی سے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑ لو ﴿۹۰﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی گواہی کا ذکر کیا۔ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اللہ کی بارگاہ میں شہادت دیں گے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ اور پھر آخر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی آخری امت پر بطور گواہ پیش ہوں گے۔ گذشتہ آیت میں اللہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ نیز فرمایا کہ یہ کتاب فرمانبرداروں کے لیے ہدایت ، رحمت اور بشارت ہے

جامع ترین آیت

گذشتہ درس میں " تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ " کا ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کی اساسی تعلیم موجود ہے۔ چنانچہ آج کی آیت اس دعوے کی دلیل کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس مختصر سی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چھ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے تین مثبت ہیں اور تین منفی۔ کائنات میں کوئی اچھی یا بری چیز ایسی نہیں ہے جو ان چھ چیزوں سے باہر ہو۔ اسی لیے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں اَجْمَعُ اٰيَةٍ فِى الْقُرْاٰنِ یعنی یہ آیت قرآن کریم کی

جامع ترین آیت ہے۔ اگر انسان اسی ایک آیت پر عمل کرے تو اس کی فلاح
کے لیے یہی آیت کافی ہے

اس آیت کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کئی
حضرات صرف یہی آیت کریمہ سن کر ایمان لائے۔ حضرت عثمان ابن مظعونؓ
ابتدائی دور میں ہی اسلام لے آئے۔ یہ حضور علیہ السلام کے رضاعی بھائی بھی ہیں،
مدینہ طیبہ پہنچ کر صحابہ کرامؓ میں سے سب سے پہلے فوت ہونے والے بھی آپ
ہی ہیں۔ آپ خود بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں میں اسلام قبول کرنے سے ہچکچاتا
تھا۔ ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ آپ پہ خاص
کیفیت طاری ہوئی، آپ نے دو دفعہ اُوپر دیکھا، پھر نگاہِ مبارک نیچے کی
طرف کر لی۔ اس کے بعد آپ نے سلسلہ گفتگو پھر شروع کر دیا۔ کہتے ہیں
کہ میں نے اس کیفیت کے متعلق حضور علیہ السلام سے دریافت کیا تو آپ نے
یہی آیت پڑھ دی جو اس خاص کیفیت کے دوران نازل ہوئی تھی۔ اتنی جامع
کمالات آیت سن کر میں فوراً ایمان لے آیا۔

اکثم بن سیفیؓ اپنی قوم کے سردار تھے۔ حضور علیہ السلام کے دعویٰ نبوت
کے متعلق سنا تو دو آدمیوں کا ایک وفد حضور کی خدمت میں بھیجا تاکہ آپ
کے حالات معلوم کیے جا سکیں۔ یہ دونوں بڑے سمجھدار آدمی تھے۔ آپ
علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سوال کیا مَنْ اَنْتَ وَمَا اَنْتَ
یعنی آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ پہلے سوال (آپ کون ہیں) کے جواب
میں حضور علیہ السلام نے فرمایا اَنَا مُحَمَّدُ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ یعنی میں عبداللہ
کا بیٹا محمد ہوں۔ البتہ دوسرے سوال (آپ کیا ہیں) کے جواب میں فرمایا
کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اُس کا رسول ہوں۔ پھر آپ نے یہی آیت پڑھ
کر سنائی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ .... الآیۃ یہ سن کر وفد بڑا متاثر ہوا اور انہوں نے
واپس جا کر اکثم سے کہا کہ ہم نے اس شخص سے دو سوال کیے۔ پہلے سوال کا

مقصد آپ کا نسب نامہ معلوم کرنا تھا کیونکہ عرب لوگ نسب پر بڑا فخر کرتے تھے مگر آپ نے اس سوال پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ بلکہ مختصر جواب دیا کہ میں محمد ابن عبداللہ ہوں۔ البتہ دوسرے سوال کا جواب آپ نے تفصیل کے ساتھ دیا اور یہ آیت بھی پڑھی۔ وفد نے سفارش کی کہ آپ اپنے دعوی نبوت میں سچے ہیں لہذا آپ کی دعوت قبول کر لینی چاہیئے۔ چنانچہ آیت متذکرہ کا مضمون سن کر اکثم کہنے لگے کہ میں دیکھتا ہوں کہ پیغمبر اسلام تمام عمدہ باتوں اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور تمام رذیل اخلاق و اعمال سے روکتے ہیں۔ کہنے لگے، اے لوگو! میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ کے ماننے میں جلدی کرو فَکُوْنُوْا فِیْ هٰذَا الْاَمْرِ رُءُوْسًا وَلَا تَکُوْنُوْا اَذْنَابًا اس معاملے میں سر یعنی سردار بن کر پہل کرو اور پیچھے رہنے والے دم چھلے نہ بنو۔ دین کی قبولیت میں جلدی کرنا بڑی سعادت کی بات ہے ابوسفیان ؓ اپنے خاندان سمیت فتح مکہ کے دن اسلام لائے اور دین کے زبردست حامی بن گئے۔ آپ نے اسلام کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے مگر افسوس کیا کرتے تھے کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے میں بڑی دیر کر دی۔

اسلام کا عالمی پروگرام

درحقیقت یہ آیت کریمہ اسلام کے عالمی پروگرام پر مشتمل ہے۔ اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے زمانے سے یہ آیت جمعہ کے خطبہ میں پڑھی جاتی ہے مولانا عبیداللہ سندھی ؒ نے بھی قرآن پاک کی بہت زیادہ خدمت کی ہے آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ جلاوطنی میں گزارا مگر قرآن پاک کو سینے سے لگائے رکھا اور جہاں بھی گئے قرآن پاک پڑھاتے رہے۔ تو آپ نے پینتالیس ۴۵ برس تک قرآن کی تعلیم دی اور سات ہزار علماء نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ روس گئے تو وہاں پر دیگر لوگوں کے علاوہ موسیٰ جار اللہ جیسے بڑے عالم نے آپ سے قرآن پڑھا۔ چار سال تک ترکی میں رہے، تو ارباب حکومت کو خبردار کیا کہ تم الحاد کے سیلاب میں بہتے جا رہے ہو۔

آؤ میں تمہیں قرآن پاک کی چالیس سورتوں کا ایسا خلاصہ بتاتا ہوں کہ اس کو اپنے پروگرام میں شامل کر لو گے تو بے دینی سے بچ جاؤ گے۔ مگر مصطفٰی اکمال نے تو آپ کی دعوت کی طرف توجہ نہ دی ترکی سے آپ مکہ مکرمہ آ گئے اور بارہ برس تک لوگوں کو قرآن پاک کی تفسیر پڑھاتے رہے۔ جب وطن واپس آئے تو فرمایا کہ بڑھاپے کی اس عمر میں کوئی شخص حرم شریف کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا مگر میرے سینے میں قرآن کریم کا ایک پروگرام ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ پروگرام موت سے پہلے تمہیں بھی بتا دوں۔ آپ نے فرمایا کہ سورۃ النحل کی یہ آیت "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ .... الخ اسلام کا عالمی پروگرام ہے مسلمانوں کا یہ فخریہ پروگرام ہے جو کسی دیگر قوم کے پاس نہیں ہے۔ اس کو لے کر آگے بڑھو تو فلاح و کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ خود مسلمان اس پروگرام کو پس پشت ڈال چکے ہیں اور اس کی بجائے عیسائیوں، یہودیوں اور دہریوں کا پروگرام اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ مشرقی لوگ اب مغربی ممالک کے پروگرام کے مطالعہ کے لیے جاتے ہیں اُن کے مشیر یہاں آتے ہیں تو اپنے پروگرام کی روشنی میں یہاں کے لیے سکیمیں بناتے ہیں جنہیں ہم خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ ہم غیر مسلم اقوام کی شاگردی اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اغیار کے پروگرام پر عمل کر کے ہی ترقی یافتہ بن سکتے ہیں۔ ہم نے وہ عالمی پروگرام ترک کر دیا ہے جس پر عمل پیرا ہونے پر اللہ نے پہلے بھی اقوام عالم میں سر بلند کیا تھا اور آئندہ کے لیے بھی ہماری عزت و وقار کا دار و مدار اسی پروگرام پر ہے۔

اس پروگرام کے پہلے حصے میں تین مثبت چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تین مثبت چیزیں

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔ یہ پہلی چیز ہے عدل

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک بزرگ محمد ابن کعب قرظیؒ سے کہا کہ بھائی ذرا عدل و انصاف کی تعریف تو کرو کیونکہ اس آیت کریمہ میں اللہ نے سب

سے پہلا حکم عدل کا دیا ہے، کہنے لگے، آپ نے یہ بڑا مشکل سوال کیا ہے، تاہم سن لو! عدل کا مفہوم یہ ہے کُنْ لِصَغِیْرٍ اَبًا یعنی چھوٹے شخص کے لیے باپ کی طرح شفیق اور رحمدل بن جاؤ۔ اور بڑے شخص کے لیے بیٹے کی مانند مؤدب ہو جاؤ، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے مَنْ لَّمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَلَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی جو بڑے کا ادب اور چھوٹے پر رحم نہیں کرتا، وہ ہماری پارٹی کا آدمی نہیں ہے۔ فرمایا جو تمہارے برابر ہو، اُسے بھائی کی مانند سمجھو کیونکہ اَلْمَرْءُ اَکْثَرُ لِاَخِیْہِ۔ عربی لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو بھائیوں کے ساتھ اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ جس شخص کے جتنے بھائی ہوں گے، اتنے ہی اس کے بازو ہوں گے اور اُسے قوت حاصل ہوگی۔ روح المعانی والے کہتے ہیں وَکَذٰلِکَ لِلنِّسَآءِ اور عورتوں کے حق میں بھی ایسے ہی بن جاؤ۔ ان کو بھی نظر انداز نہ کرو۔ ان کے حق میں بھی شفقت و مہربانی کا اظہار کرو۔ محمد بن کعب قرظیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت! کسی مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا نہ دو حتیٰ کہ کسی کے حق میں ایک کوڑا بھی زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ فرمایا یہ سب چیزیں عدل و انصاف میں داخل ہیں۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[۱] کہ چار اصول ایسے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔ ہماری شریعت میں بھی یہ اصول رائج ہیں۔ غرضیکہ تمام آسمانی شرائع کا لب لباب یہ چار اصول ہیں۔ پہلا اصول طہارت یعنی پاکیزگی ہے۔ دوسرا اخبات یعنی عجز و انکساری ہے۔ تیسرا اصول سماحت یعنی رذیل اخلاق سے پرہیز، اور چوتھا اصول عدل ہے اجتماعی معاملات عدل کے بغیر درست نہیں ہو سکتے۔ عدل کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" (النساء) جب تمہیں لوگوں پر حاکم بنایا جائے تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ نیز فرمایا "وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا" (الانعام) جب بات کرو تو انصاف کی کرو۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" (المائدۃ) عدل کیا

[۱] ہمعات ص۸۹ و حجۃ اللہ البالغہ ص۵۳ ج ۱

کرو، کہ یہ تقویٰ سے قریب تر عمل ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ معاملہ اپنوں کا ہو یا بیگانوں کا عدل کو ہاتھ سے نہ چھوڑو چاہے تمہیں کتنا بھی نقصان اٹھانا پڑے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ عدل کرنے والوں کو قیامت کے دن کستوری کے ممبروں پر بٹھایا جائے گا۔ یہ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے انصاف کرتے وقت اپنے بیگانے کا لحاظ رکھا، نہ دوست اور دشمن میں فرق کیا، حقدار کو حق ادا کرنا، معاشرے میں عدل اور توازن قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے آج دنیا میں عدل ملتا نہیں بلکہ خریدنا پڑتا ہے۔ عدالتیں بڑی مہنگی ہیں۔ عدلیہ کی فیس اور وکیلوں کا معاوضہ ادا کرنا کمزور آدمی کے بس کی بات نہیں، مالدار لوگ سرمائے کے بل بوتے پر اپنا ہر جائز اور ناجائز مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ منصف اور وکیل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، اس لیے غریب آدمی کو انصاف نہیں ملتا۔ کہاں اسلام کا نظام عدل ہو جو حاکم اور محکوم، بڑے اور چھوٹے، آقا اور غلام، گورے اور کالے، اپنے اور بیگانے میں کوئی امتیاز روا نہ رکھے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات اور جذبات انصاف کے ترازو میں تلے ہوئے ہوں۔ افراط و تفریط کی وجہ سے کوئی پلڑا جھکنے یا اٹھنے نہ پائے، سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، انسان کے ظاہر و باطن یکساں ہوں، جو بات اپنے لیے ناپسند کرے، وہ بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے۔ امام بیضاویؒ لکھتے ہیں کہ عدل میں سب سے پہلے توحید کا درجہ ہے کیونکہ توحید تعطیل اور تشریک کے درمیان والا راستہ ہے۔ ایک طرف تعطیل ہے یعنی خدا تعالیٰ کو محض معطل تصور کر لیا جائے کہ وہ کوئی کام کاج نہیں کرتا، اس کی کوئی صفت نہیں، وہ کسی کا حاجت روا اور مشکل کشا نہیں، بس محض نام کا خدا ہے (نعوذ باللہ) اور دوسری طرف عبادت، ریاضت، اور صفات میں غیروں

کو شریک بنایا جائے۔ ان دونوں خرابیوں کے درمیان توحید ہی نقطہ عدل ہے اور اسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا بھی عین عدل ہے۔ اس کے برخلاف عبادت میں اس قدر غرق ہو کہ انسان راہب بن کر دنیا ہی ترک کر دے، یہ افراط ہوگا دوسری صورت یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت سے بالکل ہی منہ موڑ جائے اور بالکل بیکار ہو کر بیٹھ جائے، یہ تفریط ہوگی تو گویا صحیح طریقے سے عبادت کرنا بھی عدل کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسی طرح سخاوت یا جود ہے جو بخل اور اسراف کے درمیان عدل کی منزل ہے۔ انصاف کی بات یہی ہے کہ انسان بخل اور فضول خرچی سے بچتے ہوئے اعتدال کی راہ اختیار کرے جسے جود کا نام دیا گیا ہے۔

(۲) احسان

تین مثبت چیزوں میں سے دوسری چیز فرمایا وَالْإِحْسَانِ وہ احسان ہے۔ ایک حدیث کی اصطلاح میں اعلیٰ درجے کی عبادت کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ احسان اس چیز کا نام ہے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طریقے سے کر کہ گویا کہ تم اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ صورت حال پیدا نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو تصور کر لے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے یہ تو احسان کا ایک معنیٰ ہے۔ البتہ اس مقام میں احسان سے مراد نیکی، ہمدردی، فیاضی، اپنے آپ پہ دوسروں کو ترجیح، ان کے حقوق کی ادائیگی وغیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے پر احسان کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" (آل عمران) قارون سے بھی لوگوں نے کہا تھا "اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ" (القصص) تم بھی لوگوں پر احسان کرو جیسے اللہ نے تم پر احسان کیا ہے مگر وہ کہنے لگے "اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ"

میں نے یہ دولت اپنے علم و ہنر کی بنا پر جمع کی ہے، اس میں اللہ کے احسان کی کیا بات ہے؟ اس پر اللہ نے ایسے مال و دولت سمیت زمین میں دھنسا دیا

احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا کرے۔ اگر خود نیک عمل نہیں کرتا تو دوسروں کو تبلیغ کرنے کا کیا اثر ہوگا؟ اگرچہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنا بجائے خود اچھی بات ہے اور علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ بڑی کمزور بات ہے کہ خود تو فرائض کا تارک ہے مگر دوسروں کو حکم دیتا ہے، یا خود سنت پر عمل نہیں کرتا مگر دوسروں کو اس کی تلقین کرتا ہے۔ اچھا نتیجہ اسی وقت نکلے گا جب خود عامل بن کر دنیا کے سامنے آئے گا۔ اگر قول و فعل میں تضاد پایا گیا تو دنیا ایسی نیکی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ آج بھی یورپ، امریکہ اور جاپان وغیرہ کے لوگ مبلغ کے کردار کو دیکھتے ہیں۔ جس شخص کا کردار درست ہوتا ہے اس کی بات بھی آگے چلتی ہے۔

بہرحال نیکی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہنا بہت بڑی بات ہے سورۃ الرحمٰن میں موجود ہے "هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ" احسان کا بدلہ تو احسان ہی ہے، یعنی نیکی کا بدلہ نیکی ہے، اور یہ نیکی اپنے، بیگانے دوست اور دشمن سب کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ یہی احسان کی منزل ہے

(۲) قرابت داروں کا حق

فرمایا، تیسری مثبت چیز یہ ہے وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى قرابت داروں کا حق ادا کرنا، ہر شخص کے ساتھ اچھا سلوک کرنا احسان کی منزل ہے جب کہ قرابت داروں کا حق ڈبل ہوتا ہے۔ ایک دین کا رشتہ ہوتا ہے اور دوسرا قرابت کا۔ لہٰذا دوسرے لوگوں کی نسبت اُن کا حق فائق ہوتا ہے۔ اسی لیے اس آیت کریمہ میں احسان کے بعد حق قرابت کو علیحدہ عنوان کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قرابت داروں کے حقوق بھی ادا کرو۔

رشتہ دار خواہ مخالف ہوں یا موافق اُن کا خیال رکھو، اگر محتاج ہیں تو اُن کی اعانت کرو۔ شریعت میں صلہ رحمی کی بڑی تاکید آئی ہے۔ لہٰذا اپنے رشتہ داروں سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ بہت بڑا اصول ہے

تین منفی چیزیں

تین مثبت چیزیں بیان کرنے کے بعد اللہ نے تین منفی چیزوں سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ اللہ تعالیٰ تمہیں بے حیائی سے روکتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ تین قوتیں ایسی ہیں جو ساری خرابیوں کی جڑ ہیں۔ پہلی قوت بہیمیہ شہوانیہ ہے۔ دوسری قوت بہیمیہ شیطانیہ ہے اور تیسری غضبیہ سبعیہ ہے۔ یہ تینوں قوتیں فحاشی سے تعلق رکھتی ہیں جن کا منشا شہوت اور بہیمیت کی زیادتی ہوتا ہے۔ عریانی، زنا، لواطت، گالی گلوچ، رقص و سرود، بداخلاق ڈرامے وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی شہوانیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ فحاشی قول کے ذریعے بھی ہوتی ہے اور عمل کے ذریعے بھی۔ اگر انسان کا عقیدہ اور اخلاق خراب ہو جائے تو عرب لوگ اس کو بھی فحاشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ عربوں کے نزدیک بخل بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ مگر آج پوری دنیا عریانی کی لپیٹ میں ہے اور اس سے اجتناب کرنے کی بجائے اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ نیم برہنہ تصاویر، ناچ اور گانا وغیرہ بداخلاقی کی باتیں ہیں جن سے خدا نے منع کیا ہے۔ جو شخص فحاشی کی باتوں میں ملوث ہوگا۔ وہ فلاح نہیں پا سکتا۔

(۱) فحاشی

(۲) منکر

دوسری منفی بات وَالْمُنْكَرِ ہے۔ اس میں وہ تمام بُری چیزیں آجاتی ہیں۔ جن سے شریعت بھی منع کرتی ہے اور عقل بھی بُرا مانتی ہے ہر نامعقول بات جو فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیحہ کے خلاف ہو منکر کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کا منشا قوتِ بہیمیہ اور قوتِ شیطانیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اللہ نے ایسی تمام چیزوں سے منع فرمایا ہے۔

(۳) سرکشی

تیسری ممنوع چیز کے متعلق فرمایا وَالْبَغْيِ یہ بغاوت اور سرکشی ہے

جس سے اللہ نے منع فرما دیا ہے، ہر قسم کا ظلم، زیادتی، تعدی، مار پیٹ گالی گلوچ، چھینا جھپٹی، بے عزتی، قانون شکنی، چوری ڈاکہ وغیرہ بغی کی تعریف میں آتے ہیں ان سے بچنا چاہیئے۔

الغرض تین کام کرنے اور تین کام نہ کرنے کا بیان فرما کر اللہ نے اس آیت کریمہ میں اہل اسلام کا اجتماعی پروگرام واضح کر دیا اور آخر میں فرمایا یَعِظُکُمْ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ تاکہ تم نصیحت پکڑلو، اور اوامر و نواہی کو سمجھ جاؤ اور پھر اُن پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا
الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ
عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ
غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ
اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ
هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ
وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً
وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾
وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ
قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا
صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٥﴾

ترجمہ:۔ اور پورا کرو اللہ کے عہد کو جب کہ تم عہد کرو، اور نہ توڑو تم قسموں کو ان کے پختہ کرنے کے بعد اور تحقیق ٹھہرایا تم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر ضامن۔ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ﴿٩١﴾ اور نہ ہو اس عورت کی طرح کہ جس نے توڑ دیا اپنا کاتا ہوا مضبوطی کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کرکے۔ بناتے ہو تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد کا ذریعہ، اس لیے کہ ایک گروہ زیادہ بڑھا ہوا ہوتا ہے دوسرے سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم کو آزماتا ہے اس کے ساتھ، اور وہ کھول دیگا تمہارے سامنے ان باتوں کو جن میں تم اختلاف کرتے تھے ﴿٩٢﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو کر دیتا تم کو ایک ہی امت لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے، اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہے، اور تم سے سوال کیا جائے گا ان کاموں کے بارے میں جو تم کیا کرتے تھے ﴿٩٣﴾ اور نہ بناؤ تم اپنی قسموں کو فساد اور خرابی کا ذریعہ اپنے درمیان پس پھسل جائیں گے قدم پختہ ہونے کے بعد۔ اور چکھو گے تم سزا اس وجہ سے کہ تم نے روکا اللہ کے راستے سے۔ اور تمہارے لیے عذاب عظیم ہو گا ﴿٩٤﴾ اور نہ خریدو اللہ کے عہد کے ساتھ قیمت تھوڑی۔ بیشک جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانتے ہو ﴿٩٥﴾

ربط آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں قرآن کریم کی جامعیت کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" بنایا ہے، یعنی اس کتاب میں بنیادی طور پر ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔ اس کے بعد گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے جامع ترین آیت "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" الآیۃ میں تین مثبت اور تین منفی اشیاء کا ذکر فرمایا یعنی تین کام کرنے کا حکم دیا اور تین سے منع فرما دیا۔ کرنے والے امور میں عدل و احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی ہے اور روکنے والے کام بے حیائی، برائی اور سرکشی ہیں۔ یہ آیت کریمہ قرآن کے تبیان کی بہترین مثال ہے کہ کوئی اچھی یا بری چیز ایسی نہیں جو ان چھ باتوں سے باہر ہو۔ اس کی تشریح سابقہ درس میں عرض کر دی گئی تھی۔ یہ آیت خطبہ جمعہ میں بھی پڑھی جاتی ہے۔

تحریف معنوی کی جسارت

قرآن پاک کی اس عظیم آیت کے معانی بدلنے میں بعض فرقوں نے پوری پوری کوشش کی ہے۔ مثلاً روافض کی بدنصیبی ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے مثبت چیزوں کو تو اپنے اصلی معانی پر محمول کیا ہے۔ جب کہ منفی چیزوں میں اس طرح معنوی تحریف کی ہے کہ فحشاء سے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ، منکر سے مراد حضرت عمر فاروق اور بغی سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں (العیاذ باللہ) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں بزرگ ترین ہستیوں سے منع کیا ہے اور اس طرح لوگوں کو ان حضرات سے متنفر کرنے کی کوشش کی ہے۔

تحریف معنوی میں قادیانی بھی روافض سے پیچھے نہیں رہے انہوں نے از خود ایک بستی آباد کی جس کا نام ربوہ رکھا۔ پھر جاہلوں کو دھوکہ دینے کے لیے کہہ دیا کہ دیکھو اس بستی کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک انعام یاد دلایا ہے "وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ" ہم نے مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ کو اپنی نشانی بنایا اور انہیں

جائے قرار اور جاری پانی والی جگہ پر پناہ دی۔ قادیانی طبقہ کہتا ہے کہ یہاں پر ابن مریم سے مراد خود اُن کا گروہ ہے۔ کہتے ہیں کہ دیکھو قرآن پاک میں ہمارا ذکر ہے۔ ہم دریائے چناب کے کنارے پر ربوہ میں آباد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے عقیدے اور ایسی تحریف سے اپنی پناہ میں رکھے۔ کہاں ابن مریم اور آپ کی والدہ اور کہاں قادیانی فتنہ اور اُن کا خود ساختہ ربوہ۔

عہد کی پابندی

بہر حال اللہ تعالیٰ نے تین مثبت اور تین منفی چیزوں کا حکم دینے کے بعد عہد و پیمان پر قائم رہنے کا حکم بھی دیا ہے۔ عہد و پیمان ایک انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کرتا ہے اور اپنے ہم جنس بندوں کے ساتھ بھی۔ دونوں قسم کے عہد کا مطلب یہ ہے کہ جو عہد و پیمان اللہ کے نام پر، اس کو حاضر ناظر جان کر یا اس کے نام کی قسم اٹھا کر کیے جائیں، اُن کو پورا کیا جائے۔ پھر یہ ہے کہ عہد عمومی بھی ہوتے ہیں اور خصوصی بھی۔ عمومی عہد یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اور اللہ کی وحدانیت اور حضور علیہ السلام کی شریعت کی پابندی اپنے ذمے لازم قرار دیتا ہے، تو اب اس کا فرض ہے کہ اس عہد کو پورا کرے اور اس کے خلاف نہ چلے۔ خصوصی معاہدات وہ ہوتے ہیں جو ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے ورنہ انسان اخلاقی طور پر منافق ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو جب تم عہد کرو وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد مت توڑو۔ وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اور تم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر کفیل یا ضامن بنایا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کو گواہ بنا کر عہد کی پابندی کا وعدہ کیا ہے۔ تو پھر اپنے وعدے کی پوری پوری پاسداری کرنا اور عہد شکنی کے لیے کسی حیلے بہانے کا سہارا نہ لینا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری

کارگزاری کو جانتا ہے۔

عہد شکنی کی مثال اللہ نے اس طرح بیان فرمائی ہے وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا اور اس عورت کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے کاتے ہوئے سوت کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ مشہور ہے کہ مکے کی ایک صاحب مال عورت دن بھر سوت کاتتی اور شام کو ان کتی ہوئی اٹیوں کو توڑ ڈالتی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ عورت سال کا اکثر حصہ سوت کاتتی رہتی کہ جب کپڑا بنانے کا موسم آئیگا تو اس سے کپڑا بنوا کر کسی کو تحفہ میں دے دوں گی۔ جب وہ موسم آتا تو کپڑا بنوانے کی بجائے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیتی۔ یہ ایسی بیوقوف عورت تھی۔ تو اللہ نے فرمایا کہ عہد و پیمان کی مثال کتے ہوئے سوت جیسی ہے۔ پیمان کو پختہ کرنے کے بعد توڑ ڈالنا کتے ہوئے سوت کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔

عہد شکنی کی ممانعت

ارشاد ہوتا ہے تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد اور خرابی کا ذریعہ بناتے ہو أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ اس واسطے کہ ایک گروہ دوسرے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے پہلے تم ایک گروہ سے معاہدہ کرتے ہو، پھر دیکھتے ہو کہ دوسرا گروہ اس سے بڑھا ہوا ہے تو پہلے گروہ کا عہد و پیمان توڑ کر دوسرے گروہ کے ساتھ سمجھوتا کر لیتے ہو۔ فرمایا یہ بہت بری بات ہے۔ عہد و پیمان پر سختی سے قائم رہو۔ عہد شکنی منافق کی صفت ہے اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ جب وہ عہد کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس کے برخلاف مومن کے لیے حکم یہ ہے۔ "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (المائدہ) عہد کو پورا کرو۔ عہد شکنی کے نتائج بڑے خراب نکلتے ہیں، انسان سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

صاحب تفسیر حسینی لکھتے ہیں کہ مکی زندگی میں بھی بعض لوگوں نے حضور علیہ السلام کی حمایت کا عہد کیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت بڑی کمزور تھی۔

جب انہوں نے قریش کا پلہ بھاری دیکھا تو آپ سے کیے گئے معاہدہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور قریش کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے عہد شکنی کی سخت مذمت بیان فرمائی ہے۔ برخلاف اس کے اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے عہد و پیمان کی سختی سے پابندی کی، جس کی وجہ سے ان کا اعتماد بحال ہوا اور اسلام کو ترقی حاصل ہوئی۔

اغیار کی عہد شکنی

انگریزوں نے اپنے دورِ عروج میں مختلف اقوام سے جو معاہدے کیے، اُن کی پابندی نہیں کی۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا مگر جب انگریزوں کو فتح حاصل ہو گئی تو معاہدے کی تکمیل میں لیت و لعل کرنے لگے۔ جب اُن کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو برطانیہ کے وزیر جنگ لارڈ جارج نے برملا کہہ دیا کہ اس قسم کے معاہدے پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض وقت گزاری کے لیے کیے جاتے ہیں۔ امریکہ پاکستان کا شروع سے حلیف ہونے کا دعویٰ کرتا رہا ہے مگر جب بھی ضرورت پڑی اس نے وعدہ ایفا نہ کیا۔ پاک ہند ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں امریکہ نے اپنی ذمہ داری پوری نہ کی۔ ملک دولخت ہو گیا، مگر یہ جہاز ہی دوڑاتا رہا ہے اور عملی طور پر معاہدے کا حق ادا نہ کیا۔ یہ منافق قسم کے لوگ ہیں، جو بھی اِن پر اعتماد کرے گا، دھوکا کھا جائے گا۔ امریکہ اور برطانیہ عربوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہیں مگر دلی ہمدردی اسرائیل کے ساتھ ہے۔ اسرائیل کو ایٹمی طاقت بنانے والے یہی لوگ ہیں، ورنہ اس کی کیا حیثیت ہے؟ بہرحال غیر مسلم اقوام کے برخلاف اسلام ہر قسم کے عہد کو پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے، خواہ اس میں کتنا بھی نقصان کیوں نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا، اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک قوم کے ساتھ معاہدہ کرتے ہو اور پھر دوسری طرف پلہ بھاری دیکھ کر اُدھر ہو جاتے ہو۔ یہ ہرگز روا نہیں۔

فرمایا إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اس قسم کے واقعات سے آزماتا ہے کہ یہ عہد و پیمان میں کس قدر پختہ ہیں اور اپنی

بات پر کس حد تک ثابت قدم رہتے ہیں۔ فرمایا، یاد رکھو! وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ اور قیامت والے دن اللہ تعالیٰ وہ تمام چیزیں تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیگا۔ جن میں تم اختلاف کرتے ہو، اس وقت حقیقت حال پورے طریقے سے واضح ہو جائے گی۔

گمراہی اور ہدایت کا راستہ

یہ اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت ہے کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں، کوئی مومن ہے کوئی کافر اور کوئی نیک اور کوئی بد۔ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت یا گروہ بنا دیتا مگر یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے "وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى" اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا، مگر یہ جبری ہدایت ہوتی جو اس کے منشاء کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی خود انسان کی صوابدید پر رکھی ہے۔ ایمان وہی قابل قبول ہوگا جو وہ اپنی رضا و رغبت سے اختیار کرے گا، اور اگر کفر کا راستہ اختیار کرے گا، تو عند اللہ ماخوذ ہوگا۔

فرمایا اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی گروہ میں شامل کر دیتا مگر وَلَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ بلکہ وہ جسے چاہتا ہے گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اور گمراہ وہی ہوتا ہے جو ہٹ دھرمی اور ظلم و زیادتی کی بناء پر اپنی استعداد کو خراب کر لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے واضح طور پر اعلان فرما دیا ہے "وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ" (الصف) اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا " وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ" اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو راہ راست پر نہیں لاتا " وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ" اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نصیب نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے فرمایا "بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ"

(النساء) اللہ نے اُن کے کفر کی وجہ سے اُن پر ٹھپے مار دیے ہیں سورۃ مطففین میں ہے کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ان کی کارکردگی کی وجہ سے اُن کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے اللہ تعالیٰ بلاوجہ کسی کے دل پر مہر لگا کر اُسے ہدایت سے محروم نہیں کر دیتا اور نہ اسے ایمان سے محروم کرتا ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کے منافی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہدایت کی ساری باتیں واضح کرنے کے بعد گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو اُسی طرف ڈال دیتا ہے۔

فرمایا اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اور جسے چاہتا ہے ہدایت کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور اس کی اصل مشیت ہدایت کی طرف ہی ہوتی ہے۔ جو شخص ہدایت کا متلاشی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نصیب کر دیتا ہے۔ بلکہ اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد) جو ہدایت کے راستے کی طرف آنا چاہتے ہیں، اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔ اور رجوع کرنے والے کو زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ فرمایا وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اور تم سے سوال کیا جائے گا ان کاموں کے متعلق جو تم کرتے تھے۔ آگے منزل آنے والی ہے جب کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ لہٰذا کسی کے ساتھ بدعہدی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ ہر مومن اور کافر کے عہد کو پورا کرنا چاہیئے۔

بدعہدی ذریعہ فساد ہے

فرمایا وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد کا ذریعہ نہ بناؤ۔ پہلے قسم اٹھا کر پختہ عہد کر لیا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی، یہ اخلاقی طور پر بڑی معیوب بات ہے۔ اگر ایسا کرو گے فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا تو قدم مضبوط ہونے کے بعد پھر پھسل جاؤ گے۔ اس کا نتیجہ بداعتمادی کی صورت میں نکلے گا۔ کوئی تمہارا

حامی نہیں ہوگا۔ اگر تم عہد کی پابندی نہیں کرو گے تو لوگوں کو دین سے بیزار کرنے کا ذریعہ بنو گے۔ اور اس طرح تمہاری یہ بدعہدی گمراہی کا ذریعہ بنے گی۔ قرن اوّل کے مسلمانوں کی طرح اگر عہد پہ قائم رہو گے، ذاتی اور اجتماعی معاملات میں صلح و جنگ کے معاملات میں اگر بدعہدی نہیں کرو گے تو ساری دنیا اسلام کی برتری کی قائل ہوگی اور دین کو سچا مذہب تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیگی۔

فرمایا بدعہدی کا نتیجہ یہ بھی ہوگا وَتَذُوقُوا السُّوٓءَ بِمَا صَدَدتُّمْ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ اور تم اس وجہ سے سزا کا مزا چکھو گے کہ تم نے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا۔ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور تم بہت بڑے عذاب کے مستحق بن جاؤ گے۔ تمہیں دنیا میں بھی ناکامی ہوگی اور آخرت میں سخت سزا سے دوچار ہو گے۔ دُنیا کے حقیر مال کی خاطر کی گئی بدعہدی دُنیا میں بھی کام نہیں آئے گی۔

فرمایا وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا اور نہ خریدو اللہ کے عہد کے ساتھ تھوڑی قیمت۔ اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر عہد کیا مگر اُس عہد کو توڑ کر حقیر مال کو قبول کر لیا۔ یہ بڑا ہی خسارے کا سودا ہے۔ اگر تم اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے إِنَّمَا عِندَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو اللہ کے ہاں اس کا نتیجہ تمہارے لیے بہتر ہوتا۔ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ اگر تم جانتے ہو۔ عہد و پیمان کی پختگی کی صورت میں تم پر دنیا میں بھی لوگ اعتماد کرتے تمہیں یہاں بھی بھلائی حاصل ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی بہتر اجر پاتے۔ کاش کہ تمہیں اس بات کا علم ہوتا۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ
الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً
طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ
بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَيْسَ
لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ
مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

ترجمہ :۔ اور جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا۔ اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اور البتہ ہم ضرور بدلہ دیں گے اُن لوگوں کو جنہوں نے صبر کیا۔ اُن کا اجر بہتر ہو گا اُن کاموں کے بدلے میں جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۶﴾ جس شخص نے اچھا کام کیا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو۔

پس ہم زندگی بسر کرائیں گے پاکیزہ ۔ اور ہم ضرور بدلہ دیں گے اُن کو اُن کے بہتر کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے (۹۷) پس جب تو قرآنِ کریم پڑھے، تو پناہ مانگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شیطان مردود سے (۹۸) بلاشک وہ (شیطان) کہ نہیں ہے اُس کا تسلط اُن لوگوں پر جو ایمان لائے اور جو اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں (۹۹) بلاشک اس کا زور اُن لوگوں پر ہے جو کہ اس کے ساتھ دوستانہ رکھتے ہیں، اور جو اس کی وجہ سے شرک کرنے والے ہیں (۱۰۰)

فانی اور باقی مال

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کو پورا کرنے کی سخت تلقین فرمائی تھی۔ اپنی قسموں کے ذریعے حقیر مال حاصل کرنے کی مذمت بیان فرمائی۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اُس مال کی حقیقت بیان فرمائی ہے جو عہد شکنی کے ذریعے کمایا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ جو کچھ تمہارے پاس ہے، وہ تو ختم ہو جائے گا۔ جس مال کی خاطر تم نے جھوٹی قسمیں اٹھائیں اور پھر عہد کو توڑا، وہ تمہارے پاس نہیں رہے گا۔ مفسرین کرام فرماتے کہ لفظ مَا عام ہے اور اس سے صرف مال و دولت ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر چیز زندگی، صحت، زمین، مکان، باغات، کھیتیاں، کارخانے وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ تمہیں اس دنیا سے بالآخر جانا ہے اور پھر تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا، اِس دنیا کی ہر چیز فانی ہے وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ باقی رہنے والا ہے۔ ہر چیز کا والی اور وارث اللہ ہی ہے۔ انسان کا ایمان، نیکی، اخلاص، خضوع، طہارت، اعمال صالحہ سب اللہ کے پاس محفوظ رہتے ہیں، اِن میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ لہٰذا دنیا کی ناپائیدار چیزوں کی خاطر ہیرا پھیری کرنے کی بجائے نیکی کو اپنا شعار بنالو کہ یہی چیز باقی رہنے والی ہے

بچو نہیں کام دیگی۔

صبر بھی ملت ابراہیمی کا اہم اصول اور نیکی کی بات ہے۔ اللہ نے فرمایا وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ ہم صبر کرنے والوں کو ضرور اُن کا اجر عطا کریں گے۔ جنہوں نے ایفائے عہد کے لیے تکالیف برداشت کی ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی اس نیکی کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ انہیں اجر دے گا بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ان بہتر کاموں کے بدلے میں جو وہ انجام دیتے رہے اس کا یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم صبر کرنے والوں کو اُن کی کارکردگی کا بہتر سے بہتر بدلہ دیں گے۔ گویا ان کا بدلہ اُن کے اعمال سے بہر صورت بہتر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا" (الانعام) ہر نیکی کا کم از کم بدلہ دس گنا ہے تو معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا بدلہ اُس نیکی سے بہتر ہو گا اور نیکی میں جس قدر اخلاص بڑھتا جائیگا اسی قدر اجر میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

حیات طیبہ

فرمایا مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ جس شخص نے نیک اعمال کیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ نیک اعمال کے صلے میں مرد و زن میں کوئی تفاوت نہیں۔ ہر صنف کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے میں بعض عورتوں کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ ہر میدان میں مرد ہی پیش پیش ہیں اور ہر مقام پر اللہ نے انہی کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ ہم بھی نصف انسانیت ہیں۔ اُن کے اس تردد کے جواب میں اللہ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کی اولین مثال تو یہی آیت ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ دونوں صنفوں میں سے کوئی بھی ہو۔ اس کے اچھے اعمال کا بہتر بدلہ دیا جائے گا۔ سورۃ نساء میں "لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ" یعنی مردوں کے

لیے بھی اُن کی کمائی میں سے حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی ان کی کمائی میں سے حصہ ہے، یعنی اِن میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ آیت زیرِ درس کی طرح کی آیت سورۃ نساء میں بھی موجود ہے "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى" یعنی عمل صالح ہونا چاہیئے خواہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، اللہ تعالیٰ سب کو جنت میں داخل کرے گا۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ نے مردوں اور عورتوں کا ان کی تعریف کے ساتھ اکٹھا ذکر کیا ہے "اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا" ان صفات کے حاملین تمام مردوں اور عورتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔

فرمایا جس نے بھی نیک کام کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، شرط یہ ہے "وَهُوَ مُؤْمِنٌ" کہ اُسے ایمان کی دولت حاصل ہو۔ اگر ایمان کی بنیاد موجود ہو گی تو اعمال صالحہ پھل لائیں گے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے وعدہ فرمایا "فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً" کہ ہم انہیں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے یعنی اس دُنیا میں وہ اچھی زندگی بسر کریں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حیاتِ طیبہ سے مراد محض خوشحالی کی زندگی نہیں جس میں مال و دولت اور ظاہری آرام و راحت میسر ہو، کیونکہ یہ چیزیں تو بعض اوقات پکے سچے ایمانداروں کو بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ پاکیزہ زندگی سے مراد یہ ہے کہ انسان کو رزقِ حلال اور قناعت نصیب ہو، مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام

نے ارشاد فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ تحقیق وہ شخص کامیاب ہو گیا جس کو حقیقت اسلام حاصل ہو گئی، جسے بقدر کفاف روزی میسر آگئی اور جسے اللہ نے عطا کردہ روزی پر قناعت نصیب فرما دی۔ یہی حیاتِ طیبہ ہے کہ زبان پر اللہ کا ذکر ہو، دل میں اللہ کی محبت اور سکون حاصل ہو۔ فرائض کو ادا کرتا ہو اور مستقبل کے متعلق اچھا عقیدہ رکھتا ہو۔ جب کسی شخص کو رزقِ حلال میسر آجائے گا تو اسے اطاعت میں حلاوت، سکون اور مزا آئے گا۔ جو شخص قناعت کرتا ہے، اور اللہ کے ہر فیصلے پر راضی ہوتا ہے اُسے نیک کام کرنے کی توفیق ملتی ہے اور صحیح معنوں میں اللہ بھی اس پر راضی ہوتا ہے۔ یہی حیاتِ طیبہ ہے۔

سعدی صاحبؒ نے ایک نیک آدمی کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ چیتے کا زخم خوردہ دریا کے کنارے بیٹھا شکر خدا بجا لا رہا تھا کسی نے کہا کہ اتنی تکلیف کے باوجود اللہ کا شکر کس بات پر ادا کرتے ہو تو کہنے لگا "الحمد للہ بہ مصیبت گرفتار آمدم نہ بہ معصیت۔"

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مصیبت میں تو گرفتار کیا ہے۔ مگر معصیت سے محفوظ رکھا ہے۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ مالٹا جیل میں انگریزوں کے اسیر تھے، ہر روز دس پارے تلاوت بھی کرتے تھے، کثرت سے درود شریف بھی پڑھتے اور ساتھ اللہ کا شکر بھی ادا کرتے کہ اس نے مصیبت میں مبتلا کیا، کہیں معصیت میں مبتلا نہیں کر دیا۔ آپ نے جان پر کھیل کر انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا جس کی پاداش میں آپ کو سخت ترین تکالیف برداشت کرنا پڑیں مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ بہر حال ایمان سے خالی لوگوں کو اگر دنیا میں آرام و راحت بھی میسر آجائے۔ تو یہ حیاتِ طیبہ نہیں بلکہ حیاتِ خبیثہ ہوگی کہ جلدی ہی وہ جہنم کے کندۂ ناتراش بننے والے ہیں۔

فرمایا ہم اعمال صالحہ انجام دینے والے مومنوں کو حیاتِ طیبہ سے نوازیں گے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ
اور ہم ان کو ضرور بدلہ دیں گے ان کے بہتر کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے۔
اس سے مراد جنت کی زندگی ہے کہ وہ بھی بہترین حیاتِ طیبہ ہوگی۔ یہ ایسی زندگی ہوگی جس کو موت نہیں، ایسا غنا ہوگا جس کے بعد فقر نہیں، ایسی صحت ہوگی جس کے بعد بیماری نہیں اور ایسی سعادت ہوگی جس کے بعد شقاوت نہیں ہوگی۔ بغرضیکہ دنیا میں اگر مصائب و آلام بھی ہوں تو پھر بھی مومن کی زندگی، پاکیزہ زندگی ہوگی۔ اللہ نے اُسے اطاعت کی توفیق دی، وہ فرائض ادا کر رہا ہے، یہی حیاتِ طیبہ ہے۔ اس کے برخلاف ایمان سے محروم غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، ان کی زندگیاں بُرے کاموں میں صرف ہو رہی ہیں، ہمیشہ جاہ و اقتدار کے بھوکے رہتے ہیں، نہ اللہ کے ساتھ کوئی تعلق قائم ہے اور نہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے، نہ فرائض کی ادائیگی ہوتی ہے اور نہ آخرت پر ایمان ہے۔ ایسے لوگ ناپاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں حیاتِ طیبہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

تلاوت سے پہلے تعوذ

گذشتہ درس میں اللہ کا یہ احسان ذکر ہو چکا ہے "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہم نے یہ قرآنِ پاک نازل فرمایا جس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔ اب اگلی آیت میں اس عظیم کتاب کے آداب کے سلسلے میں فرمایا ہے فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کریں فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ تو سب سے پہلے اللہ کے ساتھ شیطان مردود سے پناہ طلب کریں۔ قرآن کریم کی تعلیم و تعلم اور اس کی تلاوت چونکہ اعلیٰ وارفع کام ہے اس لیے شیطان اس میں خلل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان تلاوتِ قرآن کی سعادت حاصل کرے۔ اس لیے فرمایا کہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے اللہ کے ساتھ پناہ مانگ لیا کرو۔ نماز کی روح رواں بھی تلاوتِ قرآنِ پاک ہی ہے۔ حدیث شریف میں تعوذ کے مختلف کلمات

آئے ہیں جیسے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ یا اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ نماز میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت سے پہلے تعوذ ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ ہر حصہ نماز کی پہلی رکعت میں تعوذ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم دونوں سنت ہیں جب کہ باقی رکعتوں میں صرف بسم اللہ مستحب ہے۔ تاہم امام شافعیؒ ہر رکعت کی ابتداء میں تعوذ اور بسم اللہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے تعوذ تو اس آیت میں آگیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض مقامات پر تعوذ کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً بیت الخلاء[1] میں جاتے وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ کے الفاظ سکھلائے گئے ہیں مباشرت سے پہلے بھی شیطان سے تعوذ کر لینا چاہیئے[2] اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ اے اللہ! ہم سے شیطان کو دور رکھ۔ اسی طرح ہر نیک کام کی ابتداء میں تسمیہ کا حکم دیا گیا ہے۔ کپڑا پہنتے وقت، کھانا کھاتے وقت سواری پر سوار ہوتے وقت، یا ہر قدم رکھتے وقت بسم اللہ پڑھ لینی چاہیئے کہ یہ باعثِ برکت اور مسنون ہے۔

شیطانی غلبہ

فرمایا تلاوت کرتے وقت شیطان مردود سے پناہ پکڑیں مگر یاد رکھیں اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بے شک اس کا غلبہ ایمان والوں پر نہیں ہوگا۔ اور ان پر بھی نہیں ہوگا۔ وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ گویا کہ کامل الایمان لوگوں پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔ دوسری جگہ آتا ہے کہ جب شیطان ان سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو انہیں فوراً سمجھ آجاتی ہے اور وہ خدا تعالےٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ فرمایا اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ شیطان کا غلبہ تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کے ساتھ دوستی کرتے ہیں۔ جو اس کی رفاقت کرتے ہیں۔ وہ اُسی کے وسوسے

[1] بخاری ص۹۳۶ ج ۲ [2] بخاری ص۷۷۶ ج ۲ و مسلم ص۴۶۳ ج ۱

میں پھنسے رہتے ہیں اور پھر برائیوں کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ گویا تمام معاصی شیطان کی دوستی اور رفاقت کی وجہ سے سرزد ہوتی ہیں۔

فرمایا شیطان کا تسلط اُن لوگوں پر بھی قائم ہو جاتا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔ شرکیہ رسوم ادا کرتے ہیں اور شیطان کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں پھر وہ جدھر چاہے انہیں لیے پھرتا ہے بِهٖ کا ترجمہ دو طریقے سے کیا جاتا ہے ایک یہ کہ بِهٖ سے مراد اللہ کی ذات ہے یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ وہ شیطان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ نیز بِهٖ کی "بؔ" سببیہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے یعنی جو لوگ شیطان کے سبب کی وجہ سے شرک کرتے ہیں اُن پر بھی شیطان کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے حقیقت بھی یہی ہے کہ لوگ شیطان کی وسوسہ اندازی اور اغوا کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور جو ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں، اُن پر شیطان کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ
رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٠٢﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ
اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ
الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ
عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٥﴾

ترجمہ :- اور جس وقت ہم تبدیل کر دیں ایک آیت
کو دوسری آیت کی جگہ ، اور اللہ بہتر جانتا ہے جو کچھ بھی
وہ اتارتا ہے ۔ تو کہتے ہیں (یہ نافرمان لوگ) کہ بیشک تو
افتراء کرنے والا ہے ۔ نہیں ، بلکہ اکثر ان میں سے بے سمجھ
ہیں (۱۰۱) آپ کہہ دیجئے کہ اُتارا ہے اس کو روح القدس

نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ ، تاکہ ثابت کرے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ۔ اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے فرمانبرداروں کے لیے (۱۰۲) اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بیشک یہ لوگ کہتے ہیں کہ سکھلاتا ہے اِس کو ایک انسان ۔ اُس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے ۔ اور یہ قرآن عربی اور صاف زبان میں ہے (۱۰۳) بیشک وہ لوگ جو نہیں ایمان لاتے اللہ کی آیتوں پر ، اللہ اُن کو راہ نہیں دکھاتا ۔ اور اُن کے لیے عذابِ الیم ہے (۱۰۴) بیشک افتراء باندھتے ہیں جھوٹ وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے ، اور یہی لوگ ہیں جھوٹے (۱۰۵)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں آدابِ تلاوتِ قرآن سکھلائے گئے تھے ۔ اللہ نے فرمایا کہ تلاوت شروع کرتے وقت شیطان مردود سے اللہ کے ساتھ پناہ پکڑ لیں تاکہ آپ اس کے وسوسے سے بچ جائیں ۔ فرمایا شیطان کا تسلط اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے دوستانہ رکھتے ہیں اور پھر اسی کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ البتہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے والے کامل الایمان لوگوں پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا ۔

اب آج کی آیات میں قرآنِ پاک ہی سے متعلق مشرکین کے بعض شکوک و شبہات کا دلائل کے ساتھ ازالہ کیا گیا ہے ۔ اس طرح گویا اِن آیات کا گذشتہ مضمون کے ساتھ ربط ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو پڑھے بغیر ایمانیات اور دین کے صحیح اصول معلوم نہیں ہو سکتے ، حالانکہ ایک مومن ان کا محتاج ہے اسی طرح فروعی مسائل کا علم بھی قرآن کریم کو پڑھے بغیر معلوم نہیں

سکتا، چنانچہ یہی بات آگے اسی رکوع میں آرہی ہے کہ کسی چیز پر حلت و حرمت کا حکم لگانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے تم اپنی زبان سے کسی شئے کو حلال و حرام قرار نہیں دے سکتے۔ غرضیکہ اللہ کا یہ پاک کلام زندگی کے ہر موڑ پر ہماری راہنمائی کرتا ہے اور یہ راہنمائی اس کی تلاوت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

نسخِ آیات

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ کے اس اعلیٰ و ارفع کلام کا ہر قسم کی تحریف اور شک و شبہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر اسی میں شک پیدا ہو گیا تو پھر اس کے احکام پر عمل درآمد کیسے ہو گا اور اس کی تلاوت سے صحیح نتیجہ کیسے مرتب ہو گا۔ چونکہ مشرکین مکہ قرآنِ پاک کے متن میں بعض اعتراضات کرتے تھے، اس لیے اللہ نے اُن کا مدلل جواب دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ اور جب ہم تبدیل کرتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ یعنی کسی حکم کی تبدیلی پر قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ " کافر اور مشرک لوگ کہتے ہیں کہ تو تو افترا کرتا ہے۔ یعنی جھوٹ باندھتا ہے کہ فلاں حکم فلاں کے ساتھ بدل گیا ہے۔ بھلا اللہ تعالیٰ کو اپنا حکم بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اللہ کو پہلے معلوم نہیں تھا کہ کون سا حکم اُس کی مخلوق کے لیے موزوں ہے العیاذ باللہ اس سے تو اللہ تعالیٰ پر جہالت صادق آتی ہے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے درمیان آیت فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جس چیز کو وہ نازل کرتا ہے۔ اسے اپنے پہلے حکم کا بھی اچھی طرح علم ہے اور وہ اس کی حکمت اور مصلحت کو بھی جانتا ہے نیز وہ اپنے نئے حکم یا آیت کی حکمت و مصلحت سے بھی خوب واقف ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جس طرح زمانہ اور واقعات بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی بدلتے رہتے ہیں۔

نسخِ آیات کی حکمت

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مریض کو کسی وقت میں کسی دوا کی ضرورت

ہوتی ہے جب کہ کچھ وقت کے بعد اس کی حالت کے مطابق دوا تبدیل کرنا پڑتی ہے۔ کبھی سرد دوا مناسب حال ہوتی ہے اور کبھی گرم۔ گویا مریض کے مرض میں تبدیلی کے ساتھ طبیب دوا بھی تبدیل کرتا رہتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی انسانی معاشرے کے حالات و ضروریات سے واقف ہے اس لیے وہ ان کے مناسب حال ہی احکام نازل فرماتا ہے۔ پھر جب معاشرے میں قدرے تبدیلی آجاتی ہے اور اسے دوسرے احکام کی ضرورت ہوتی ہے تو پہلے احکام منسوخ کر کے

دوسرے جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اب اللہ کی آخری شریعت پیغمبر آخر الزمان پر مکمل ہو چکی ہے۔ اب یہ دوامی احکام ہیں جن میں تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے۔ یہ احکام بھی بدستور نافذ العمل رہیں گے۔

نزول قرآن کے زمانہ میں بعض احکام میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ مکی زندگی میں جو حکم تھا وہ مدنی زندگی میں جاکر تبدیل ہو گیا۔ مثلاً کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ کے متعلق مکی زندگی میں قانون یہ تھا" كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" (النساء) یعنی لڑائی سے ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اس وقت جماعت المسلمین کمزور تھی، اس لیے عدم جنگ میں ہی مسلمانوں کی مصلحت تھی۔ پھر جب مدنی دور میں مسلمانوں نے طاقت جمع کر لی اور وہ علی الاعلان جنگ کرنے کے قابل ہو گئے۔ تو اللہ کا حکم آگیا" قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ" (التوبة) جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرو گویا یہود و نصاریٰ، کفار اور مشرکین سب کے ساتھ لڑائی لڑنے کا حکم دے دیا گیا کہ اس وقت مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔

سورۃ بقرہ میں آتا ہے "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا" جب ہم کوئی حکم منسوخ کرتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں تو اس کے بدلے میں اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسا حکم لے آتے ہیں۔ بہتر سے مراد یہ ہے کہ نیا حکم اپنی نوعیت اور اجر و ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوتا ہے ایسے حکم پر عمل پیرا ہونے میں بھی تسہیل کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، لہذا ہم اسے تبدیل کر دیتے ہیں بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر اکثر لوگ بے سمجھ ہوتے ہیں جو اس کی حکمت اور مصلحت کو نہیں جانتے۔

نزولِ قرآن کی غرض

ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ اس کو روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے۔ بزعم خویش یہ افترا اور جھوٹ نہیں ہے۔ اور اس کی غرض و غایت یہ ہے لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تاکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو پختہ کر دے چنانچہ تلاوتِ قرآن سن کر ایمان والوں کے دل مضبوط ہو جاتے ہیں، ان کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے، وہ اس پر یقین رکھتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ فرمایا قرآن وَهُدًى واضح ہدایت ہے جو انسان کی زندگی کے ہر موڑ پر راہنمائی کرتا ہے، انسانوں کی سمت درست کرتا ہے اور انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ یہ مسلمانوں کے لیے خوشخبری کا ذریعہ ہے۔ اس پر ایمان لانے اور عمل کرنے والوں کے لیے دائمی اور بہتر زندگی کی بشارت بھی ہے۔ سورۃ یونس میں ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کیلئے انکے رب کے پاس سچائی کا پایہ ہے ایمان لانے والے سچائی کے پائے میں قدم رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرنیوالوں کو خوشخبری دی جاتی ہے۔ یہ تسلی کا مضمون بھی ہو گیا۔

روح القدس

اس آیت کریمہ میں روح القدس کا لفظ توجہ طلب ہے اس سے

مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں جن کے واسطہ سے قرآن کریم حضورؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا سورۃ الشعراء میں موجود ہے "اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ" اس قرآن کریم کو روح الامین نے رب العالمین کی طرف سے آپ کے قلب مبارک پر نازل فرمایا تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔ شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابتؓ کے واقعہ میں بھی آتا ہے کہ مشرک لوگ شاعر اسلام اور پیغمبر اسلام کی ہجو کرتے تھے اس پر آپ علیہ السلام نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے فرمایا کہ ان کے اشعار کا جواب دو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری تائید روح القدس کے ساتھ کرے گا۔ چنانچہ حضرت حسانؓ مشرکوں کو شعروں میں جواب دیا کرتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ روح القدس کی تائید کا مطلب یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کے تمام گروہ کسی خاص امر کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسی کا نام روح القدس کی تائید ہے۔

نزول قرآن پر اعتراض

فرمایا وَلَقَدْ نَعْلَمُ ہم خوب جانتے ہیں اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ کہ کافر و مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ قرآن پاک حضور علیہ السلام کو کوئی انسان سکھاتا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جبر، یسار یعیش یا بلعام نامی ایک رومی غلام تھا۔ اس کا پہلا مذہب عیسائیت تھا انجیل پڑھا کرتا تھا۔ پھر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ شخص رات کے وقت کبھی کبھی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ سے دین سیکھتا بعض اوقات حضور علیہ السلام خود بھی اس کے پاس تشریف لے جاتے۔ اس پر مشرکین نے یہ پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ عجمی شخص آپ کو باتیں سکھاتا ہے جسے آپ قرآن کے نام پر پیش کر دیتے ہیں۔

اس کا جواب

اس بہتان کے جواب میں اللہ نے فرمایا لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ

اِلَیۡهِ اَعۡجَمِیٌّ یہ لوگ جس شخص کی طرف قرآن کو منسوب کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے۔ یعنی وہ شخص تو عربی زبان پر ہی قادر نہیں۔ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ اور اللہ کا یہ کلام فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے۔ بھلا وہ شخص جو خود اپنا ما فی الضمیر بھی ٹھیک طریقے سے عربی زبان میں بیان نہیں کر سکتا وہ قرآن پاک جیسا معجز کلام کیسے گھڑ سکتا ہے یہ ان لوگوں کا صریح جھوٹ اور بہتان ہے۔ اس کلام کو سن کر تو عرب کے بڑے بڑے ادیب اور شعراء انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں، بھلا اس رومی عجمی کی کیا حیثیت ہے کہ ایسے اعلیٰ وارفع کلام کی تعلیم دے سکے۔ قرآن کریم نے تو واضح چیلنج دے رکھا ہے کہ اگر تمہیں اس کلام میں کوئی شک ہے " فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ " (البقرہ) تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ۔ اس چیلنج کو قبول کرنے سے تو عرب کے بڑے بڑے شاعر بھی عاجز آ گئے چہ جائیکہ اس کا مصنف کوئی عجمی آدمی ہو۔

منکرین قرآن کے لیے سزا

فرمایا اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے لَا یَهۡدِیۡهِمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ بلکہ ان کیلئے دردناک عذاب تیار ہے فرمایا اِنَّمَا یَفۡتَرِی الۡكَذِبَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ بیشک وہی لوگ جھوٹ باندھتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس نے قرآن خود گھڑ لیا ہے یا اُسے کسی عجمی نے سکھا دیا ہے۔ یہ مفتری لوگ ہیں وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ اور حقیقت میں یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس اعتراض کا رد فرمایا ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے اور یہ کہ اُسے کسی غیر عربی نے سکھایا ہے۔ فرمایا یہ ایمان سے خالی لوگوں کا کام ہے اور یہی چیز فساد کی جڑ ہے جو انہیں غلط پراپیگنڈے پر آمادہ کرتی ہے

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ
اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ
مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ
مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى
الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾
اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ
هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا
وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ
۱۴ ع ۱۰ ۲۰ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

ترجمہ :- جس شخص نے کفر کیا اللہ کے ساتھ
بعد ایمان لانے کے ، مگر وہ شخص کہ جس کو مجبور کیا
گیا اور اس کا دل مطمئن تھا ایمان کے ساتھ
لیکن (گناہ اس پر ہے) جس نے دل کھول کر کفر کیا

ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے ۔ (١٠٦)
یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ لوگ ایسے ہیں جنہوں
نے دنیا کی زندگی کو پسند کیا آخرت کے مقابلے میں
اور بیشک اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا اُس قوم کو جو کفر
کرنے والی ہو (١٠٧) یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے مُہر کر
دی ہے اُن کے دلوں پر ، اُن کے کانوں پر اور اُن
کی آنکھوں پر ، اور یہی لوگ غافل ہیں (١٠٨) ضرور بر ضرور
بیشک یہ لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں (١٠٩)
پھر بیشک تیرا پروردگار ، اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے
ہجرت کی بعد اس کے کہ اُن کو فتنے میں ڈالا گیا ، پھر
انہوں نے جہاد کیا اور صبر کیا ، البتہ اس کے بعد
بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (١١٠)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں رسالت کے علاوہ قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا ذکر تھا ۔ یہ اللہ کا کلام ہے جسے جبرائیل امین نے اللہ کی جانب سے پیغمبر علیہ السلام پر نازل فرمایا ۔ مشرکین بہتان لگاتے تھے کہ قرآن پاک منجانب اللہ نہیں بلکہ ایک عجمی شخص سے سیکھ کر آپ اسے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ قرآن حکیم تو فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے ، بھلا ایک عجمی آدمی یہ کیونکر پیش کر سکتا ہے حالانکہ وہ تو اپنا مافی الضمیر بھی عربی زبان میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتا ۔ اللہ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ ایسا افتراء وہی لوگ باندھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اکراہ و اضطرار کی حالت کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے ۔ اگرچہ کلمہ کفر کسی حالت میں بھی پسندیدہ نہیں ہے ۔ تاہم اگر کوئی

شخص مجبوری کی حالت میں اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی زبان پر کلمہ کفر لاتا ہے، تو وہ شخص کافر یا مرتد نہیں ہوجاتا بشرطیکہ اُس کا دِل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ ایسے شخص کو کفر کا کلمہ کہنے کی وقتی طور پر رخصت ہوگی۔

وقتی طور پر رخصت

تاریخ اسلام ان واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں مشاہیر اسلام نے بے شمار ذاتی قربانیاں دے کر کلمہ حق کو بلند رکھا۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ کفار نے آپ کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا، حتیٰ کہ جان سے مار دینے کی دھمکی دی آپ نے مجبوری کی حالت میں کفار کی بات مان لی۔ جان چھوٹی تو حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا کَیْفَ تَجِدُ قَلْبَكَ تمہارے دِل کی کیفیت کیسی ہے۔ زبان سے کلمہ کفر ادا کرنے کے باوجود دل دین پر مطمئن ہے یا نہیں؟ انہوں نے عرض کیا، حضور! دل تو بالکل مطمئن ہے۔ فرمایا کوئی بات نہیں اِنْ عَادُوْا فَعُدْ اگر دوبارہ کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے اور کافر تمہیں مجبور کر دیں تو تم اسی طریقے سے اپنی جان بچا سکتے ہو۔ امام ابوبکر جصاصؒ اپنی تفسیر "احکام القرآن" میں رقمطراز ہیں کہ خواہ جان کا خطرہ ہو یا جسم کے کسی عضو کے کٹ جانے کا ڈر ہو، متعلقہ شخص کو کفار کی بات ماننے کی صرف رخصت ہے، البتہ بلند درجہ یہ ہے کہ انسان حق کی بات پر ڈٹ جائے خواہ اس کے لیے شہادت ہی کیوں نہ قبول کرنی پڑے۔

دین کی خاطر قربانیاں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صاحب عزیمت صحابہ میں سے حضرت بلالؓ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کو کفار نے مجبور کیا اِرْجِعْ یعنی اسلام کو چھوڑ کر پرانے دین میں واپس آجاؤ۔ آپ نے جواب دیا کہ اَرْجِعُ یعنی میں واپس نہیں پلٹوں گا۔ کفار کفر کا کلمہ کہلوانا چاہتے تھے مگر آپ احد احد ہی پکارتے رہے۔ آپ کو گرم ریت پر لٹا کر اُوپر پتھر رکھا گیا، آپ کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغا گیا مگر آپ اللہ اللہ کا وِرد ہی کرتے رہے اور

کلمہ کفر زبان پہ نہ لائے۔ آپ نے فرمایا کہ کفار اللہ کے نام سے چڑتے ہیں۔ اگر مجھے کوئی کلمہ بھی معلوم ہو جس سے یہ چڑتے ہیں تو میں وہ بھی زبان پہ لانے سے نہیں رکوں گا۔ حضرت بلالؓ نے کمال عزیمت کا مظاہرہ کیا۔ سخت ترین جسمانی سزائیں برداشت کیں مگر کفر کا کلمہ نہ کہا۔ اگرچہ آپ شہید نہیں ہوئے مگر آپ نے دین کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ حضرت عمارؓ کے والد حضرت یاسرؓ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ سخت ترین سزائیں برداشت کرتے ہوئے شہید ہو گئے مگر کفر کا کلمہ اپنی زبان پہ نہ لائے۔ آپ کی والدہ حضرت سمیہؓ کی دونوں ٹانگیں دو مختلف اونٹوں کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ پھر ابوجہل نے ان کے مقام مخصوصہ میں نیزہ مار کر آپ کو ہلاک کر دیا اور اللہ نے انہیں بلند ترین مرتبہ عطا فرمایا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت خبیب ابن زید انصاریؓ کسی طرح مسیلمہ کذاب کے ہاتھ آ گئے۔ مسیلمہ کہنے لگا۔ کیا تم محمد کی رسالت کو مانتے ہو۔؟ آپ نے فرمایا، وہ اللہ کے رسول ہیں اور میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔ پھر مسیلمہ نے پوچھا کہ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا مجھے اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہو؟ حضرت خبیبؓ نے فرمایا کہ یہ بات تو میں سننے کے لیے بھی تیار نہیں چہ جائیکہ تمہاری رسالت کا اقرار کروں۔ کہنے لگا میں تمہارا ایک ایک عضو کاٹ کر ہلاک کر دوں گا۔ فرمایا تو جو چاہے کر۔ غرضیکہ آپ کا جوڑ جوڑ کاٹ کر آپ کو شہید کر دیا گیا۔ مگر آپ کلمہ کفر زبان پہ نہ لائے

حضرت خبیبؓ کا واقعہ بھی بڑا مشہور ہے۔ کافروں نے کفر کا کلمہ کہلوانا چاہا، سولی پہ چڑھانے کی دھمکی دی مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور فرمایا اللہ کے راستے میں اسی کی عطا کردہ جان قربان کر دینا کوئی

بڑی بات نہیں۔ مَیں اس کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ آپ کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت خبیبؓ اور حضرت زید ابن دسنہؓ کو کافروں نے ایک ہی دِن شہید کیا۔ شہادت سے پہلے انہوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں سلام بھیجا کہ اے اللہ! ہمارا سلام ہمارے پیارے نبی تک پہنچا دے۔ جب یہ پیغام حضور علیہ السلام کو ملا تو آپ نے دونوں کے لیے وعلیکم السلام کہا۔

عبداللہ ابن حذافہؓ کا ایمان

امام ابن کثیرؒ نے حافظ ابن عساکرؒ کے حوالہ سے اپنی تفسیر میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حذیفہ سہمیؓ اور آپ کے بعض ساتھی رومیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اُن کے قیدی بن گئے۔ انہیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اُس نے آپ کو دین سے پھیرنے کے لیے لالچ دینے کی کوشش کی۔ کہنے لگا اگر دین اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لو تو میں تمہیں نہ صرف اپنی حکومت میں شریک کر لوں گا۔ بلکہ اُزَوِّجُ بِنْتِی اپنی بیٹی کا نکاح بھی تجھ سے کر دوں گا۔ آپ نے فرمایا اگر تم اپنا سارا ملک اور پورا عرب بھی مجھے دے دو تو میں آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی محمد کے دین سے پلٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں، بادشاہ نے حکم دیا کہ آپ کو سولی پر چڑھا کر ہلاک کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ کے راستے میں ہلاک ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ پھر بادشاہ نے تانبے کی ایک بہت بڑی دیگ منگوائی بعض روایات میں تانبے کا بنا ہوا گائے کا بہت بڑا مجسمہ بھی آتا ہے۔ بہر حال اس دیگ یا گائے میں تیل یا کوئی اور چیز ڈال کر اُسے خوب گرم کیا گیا۔ پھر آپ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو اس تیل میں پھینک دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا جسم جل کر کوئلہ بن گیا اور اُس کی ہڈیاں زائل ہونے لگیں۔ اس کے بعد پھر حضرت عبداللہؓ سے کہا کہ مان جاؤ، ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایک لحظہ بھر کے لیے بھی دین حق کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ بادشاہ نے پھر حکم دیا کہ اُسے سولی پر چڑھا کر اس کے دائیں بائیں تیر چلاؤ۔ مگر آپ

پھر بھی اپنے ایمان پر قائم رہے۔ بادشاہ نے سولی سے اتروالیا اور کہا کہ انہیں تپتی ہوئی دیگ میں پھینک دو۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا کہ شاید تم اپنا دین چھوڑ کر نصرانی بننے پر تیار ہو گئے ہو۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا، میں اپنی جان کے اتلاف کے تصور سے نہیں رو تا، بلکہ اس لیے رو رہا ہوں کہ اللہ نے مجھے ایک ہی جان دی ہے جو میں اس کے راستے میں قربان کر رہا ہوں۔ اگر میری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو ایک ایک کر کے اللہ کے نام پر قربان کر دیتا۔ اس پر بادشاہ نے اپنے قریب بلا کر کہا کہ اگر تم میری پیشانی کو بوسہ دے دو تو تمہیں رہا کر دوں گا۔ فرمایا اس کام کے عوض میں اپنے سارے ساتھیوں کی رہائی چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے یہ شرط قبول کر لی۔ حضرت عبداللہؓ نے بادشاہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنے لشکر کے ہمراہ رہائی پا کر واپس آ گئے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، لوگو! سب سے پہلے میں عبداللہؓ کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہوں، تم بھی ایسا کرو۔ پھر سب لوگوں نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

اضطراری حالت کے مسائل

اب مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ عزیمت تو اسی میں ہے کہ انسان کفر کا کلمہ کہنے کی بجائے شہادت قبول کرے مگر مفسرِ قرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی "تفسیر مظہری" میں لکھتے ہیں کہ تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب جان جانے کا خطرہ ہو تو انسان کلمہ کفر زبان سے ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ یہ اجازت ہے اگرچہ عزیمت اس کے خلاف ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کو مجبور کیا جائے کہ دوسرے مسلمان کا مال تلف کر دو ورنہ جان سے مار دیے جاؤ گے یا تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں گے۔ تو ایسے شخص کے لیے گنجائش ہے کہ وہ دوسرے بھائی کا مال تلف کر کے اپنی جان بچالے۔ ایسی صورت میں اگر انصاف والی حکومت ہو گی تو

مجبور کرنے والے شخص سے ضمانت لی جائیگی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو مال تلف کرنے والا مسلمان بھی مال کا ازالہ کر سکتا ہے مگر اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ ہاں اگر کوئی دوسرے مسلمان کی جان تلف کرنے پر مجبور کرے تو پھر مسئلہ یہ ہے کہ مجبور آدمی اپنی جان کو دوسرے کی جان پر ترجیح نہ دے بلکہ خود ہلاک ہو جائے اور دوسرے مسلمان کی جان کے درپے نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی کو مجبور کیا جائے کہ فلاں عورت سے زنا کرو ورنہ تمہاری جان ماردی جائے گی تو اس کی بھی اجازت نہیں۔ اللہ کے نزدیک مسلمان عورت کی عزت و آبرو بڑی اہم ہے، لہذا ایسا شخص اپنی جان پر کھیل کر مسلمان عورت کی عزت کو بچائے

عزیمت اور رخصت

ارشاد باری تعالیٰ ہے مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ جس نے کفر کیا اللہ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَـئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ مگر وہ جس کو مجبور کیا گیا حالانکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن تھا وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا لیکن گناہ اُس پر ہے جس نے سینہ کھول کر کفر کیا۔ فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے۔ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے مطلب یہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں جان بچانے کے لیے تو کلمہ کفر کہا جا سکتا ہے بشرطیکہ دل مطمئن ہو۔ مگر جو کوئی دل کی گہرائی سے کلمہ کفر ادا کرے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔

فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسۡتَحَبُّوا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کیا اور کفر کا کلمہ زبان سے ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ کہ اللہ تعالیٰ کافر قوم کو راہ نہیں دکھاتا۔ صراط مستقیم اسی کے حصے میں آتا ہے جس میں طلب اور خواہش ہو۔ اور جو

کوئی کفر پر مصر ہو اُسے ہدایت نصیب نہیں ہوتی ۔ ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد
ہوتا ہے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
اُن کے دلوں پر اللہ نے مہر کردی ہے ۔ اُن کے دل سیاہ ہو چکے ہیں ۔ وَ
سَمْعِهِمْ اور ان کے کان بند ہو چکے ہیں کہ حق بات کو سنتے ہی نہیں ،
سنتے ہیں تو گوارا نہیں کرتے ۔ وَأَبْصَارِهِمْ اور اُن کی آنکھوں پر پردے
پڑ چکے ہیں ۔ سورۃ البقرہ میں ہے وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ غرضیکہ
وہ حق بات کو دیکھنے سے قاصر ہیں ۔ یہ ان کے کلمہ کفر کہنے کی وجہ سے ہے
فرمایا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ اور یہی لوگ غافل ہیں دنیا کی زندگی
کو پسند کر کے خواہشات نفسانیہ پر چلنے والے لوگ اللہ تعالیٰ اور آخرت سے
غفلت میں پڑے ہوئے ہیں لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ
هُمُ الْخَاسِرُونَ ضرور بالضرور یعنی یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ یہ لوگ
آخرت کی زندگی میں نقصان اٹھانے والے ہیں ۔

فرمایا ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا
فُتِنُوا پھر بیشک تمہارا پروردگار فتنے میں ڈالے گئے مہاجرین ثُمَّ
جَاهَدُوا وَصَبَرُوا پھر جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور مصائب و
آلام پر صبر کیا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ۝
بیشک تمہارا پروردگار ان لوگوں کے لیے البتہ بہت بخشش کرنے والا اور
از حد مہربان ہے ۔ اگر ان سے کوئی معمولی لغزش ہو بھی گئی ۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے
فضل اور وسیع رحمت سے اُن کو معاف فرما دیگا ۔ ایسے لوگوں پر کوئی
الزام نہیں ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کمزور لوگوں کو تسلی بھی دیدی ہے ۔

يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا
وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ
اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ
كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا
اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا
يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ
فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا
وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ
تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ :- جس دن آئے گا ہر ایک نفس جھگڑا
کرے گا اپنے نفس کی طرف سے وہ پورا پورا دیا جائے
گا ہر نفس کو جو اُس نے عمل کیا ، اور اُن پر ظلم نہیں
کیا جائے گا ﴿۱۱۱﴾ اور اللہ نے بیان کی ہے ایک مثال
ایک ایسی بستی کی جو امن والی اور اطمینان والی تھی۔ آتی
تھی اس کی روزی کشادہ ہر طرف سے ۔ پس اس بستی

والوں نے کفر کیا اللہ کی نعمتوں کے ساتھ۔ پس چکھایا اللہ
نے اس کو بھوک اور خوف کا لباس، اس وجہ سے کہ جو
کچھ وہ کرتے تھے (۱۱۲) اور البتہ تحقیق آیا اُن کے پاس
رسُول اُن میں سے۔ پس جھٹلایا انہوں نے اُس کو، پس
پکڑا اُن کو عذاب نے، اور وہ ظلم کرنے والے تھے (۱۱۳)
پس (اے لوگو!) کھاؤ اُس میں سے جو اللہ نے روزی
دی ہے تم کو حلال اور پاک، اور شکر کرو اللہ کی نعمت
کا اگر تم خاص اُسی کی عبادت کرنے والے ہو (۱۱۴)

پہلے قرآنِ حکیم کی صداقت و حقانیت کا بیان ہوا۔ فرمایا قرآنِ پاک کو خود ساختہ یا کسی عجمی شخص کا سکھلایا ہوا کہنے والے جھوٹے ہیں۔ نیز یہ کہ جس نے اپنے اختیار اور ارادے سے اپنی زبان سے کفر کی بات نکالی وہ خدا کے غضب اور لعنت کا نشانہ بنے گا۔ ہاں! اضطراری حالت میں جب کہ جان جانے یا کسی عضو کے کٹ جانے کا خطرہ ہو، تو جان بچانے کے لیے کلمہ کفر زبان سے ادا کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ دل مطمئن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا کہ وہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں، اس لیے وہ کفر کی بات زبان پر لاتے ہیں ایسے لوگوں کو محاسبہ اعمال کی کچھ فکر نہیں۔ یہ عادی لوگ ہیں جن کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں، کان بند ہیں، اور آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں جس کی وجہ سے یہ لوگ نہ حق بات کو محسوس کرتے ہیں، نہ سُنتے ہیں اور نہ اسے دیکھتے ہیں۔ فرمایا حقیقت میں یہی لوگ غافل ہیں۔

اس حقیر دنیا کی خاطر کفر اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے آخرت اور محاسبہ عمل کی منزل یاد دلائی ہے۔ فرمایا یَوۡمَ تَاۡتِیۡ کُلُّ نَفۡسٍ اُس دن کو یاد کرو جب ہر نفس آئے گا تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا اپنے نفس کی

طرف سے خود سوال وجواب کرے گا۔ اس کی طرف سے کوئی وکیل، بیرسٹر، والدین، بھائی بہن یا اولاد کو جواب دینے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ اُسے اپنے اعمال کا خود ہی جواب دینا پڑے گا۔ حشر کے میدان میں ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی۔ اور وہ ایک دوسرے کی طرف توجہ نہیں کر سکیں گے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے یُؤْتٰی بِجَهَنَّمَ جہنم کی ستر ہزار زنجیریں ہوں گی اور ہر زنجیر کو کھینچنے والے ستر ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ جو اُسے کھینچ کر قریب لائیں گے۔ اُس وقت اس قدر دہشت کا سماں ہوگا کہ اللہ کے مقرب نبی بھی "نفسی نفسی" پکارتے ہوں گے۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب محاسبے کی منزل آئے گی لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ تَرْجُمَانٌ تو اس وقت اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر شخص کو براہ راست جواب دینا ہوگا۔ سورۃ عبس میں فرمایا "لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ" اس دن حالت یہ ہوگی کہ ہر شخص کو دوسرے سے مستغنی کر دے گی۔ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی کہ کسی طرح میں بچ جاؤں۔ بہرحال فرمایا کہ اس دن کو یاد کرو جس دن ہر نفس اپنی طرف سے خود جوابدہی کرے گا۔

پورا پورا بدلہ

وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ اور ہر ایک کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے عمل کیا۔ ہر نیکی اور ہر برائی کی پوری پوری جزا یا سزا ملے گی۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی جائیگی۔ نہ تو کسی کی نیکی میں کمی کی جائے گی اور نہ کسی کی کوئی برائی دوسرے کے سر پہ ڈالی جائے گی۔ ہر ایک کے سامنے اس کا اپنا کیا ہوا آئے گا۔ ہر شخص کا اپنا عقیدہ، اخلاق اور عمل ہی کام آئے گا۔ سورۃ مدثر میں ہے "كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ" ہر شخص اپنی ہی کمائی میں پھنسا ہوا ہوگا جس سے نکل نہیں سکے گا۔ اور کسی پر زیادتی نہیں ہوگی بلکہ ٹھیک ٹھیک معاملہ کیا جائے گا۔

خوشحال بستی کی مثال

اگلی آیت میں اللہ نے ایک خوشحال بستی کی مثال بیان فرمائی ہے جس کے

باشندوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اللہ نے ان پر عذاب مسلط کر دیا۔
ارشاد ہوتا ہے وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان فرمائی ہے كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً جو بالکل امن و اطمینان میں تھی۔ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس بستی سے مراد مکے کی بستی ہے کیونکہ یہ سورۃ مکی ہے اور اس بستی کا ذکر ہے۔ البتہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ مثال کسی ایک بستی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وہ بستی مراد لی جا سکتی ہے جہاں اس قسم کے حالات پائے جائیں۔
بہر حال مکے کی یہ بستی ایک خوشحال بستی تھی۔ تمام ضروریاتِ زندگی آسانی کے ساتھ دستیاب تھیں۔ امن و سکون تھا، کوئی شخص متفکر نہیں تھا اور نہ کوئی پریشان حال تھا۔ اشیائے خورد و نوش کی حالت یہ تھی يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ اس کی کشادہ روزی ہر طرف سے آتی تھی۔ غلہ، پھل اور کھانے پینے کی دیگر چیزیں بافراط موجود ہوتی تھیں۔ جہاں تک اس بستی کے مامون ہونے کا تعلق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" (البقرہ) مولائے کریم اس بستی کو امن والا بنا دے۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" (آل عمران) جو اس میں داخل ہوگا امن میں ہو جائے گا۔ یہاں پر کوئی کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ فتنہ فساد کا کوئی ڈر نہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ جگہ بے آب و گیاہ ہے، نہ زمین، نہ باغات، نہ چشمے اور نہ ہریالی مگر وہاں پر سارا سال رزق کی فراوانی رہتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی "وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ" (البقرہ) اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی عطا فرما، چنانچہ دنیا کے کسی بھی خطے میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے پھل اس بستی میں پہنچتے رہے ہیں، اب بھی پہنچتے ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ پہنچتے رہیں گے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ اس بستی کی کشادہ

روزی ہر طرف سے آتی تھی۔

نافدری کی سزا

مگر اس بستی والوں کی حالت یہ تھی فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ کفر کا معنیٰ ایمان اور توحید کا انکار بھی ہے اور اس سے ناشکری اور ناقدری بھی مراد ہوتی ہے۔ عام طور پر بھی انسان کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ" (ابراہیم) بیشک انسان بڑا ظالم اور ناشکر گزار ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں مگر وہ زبان سے الحمد للہ تک نہیں کہتا۔ تو اس بستی کے لوگ بھی خدا تعالیٰ کے انعامات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان پر اللہ کے تین خاص انعامات تھے۔ یعنی امن، اطمینان اور کشادہ روزی مگر ان کی ناقدری کی وجہ سے فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھوک اور خوف کا لباس چکھایا۔ ان کا وسیع رزق بھوک میں تبدیل ہو گیا اور امن و اطمینان کی بجائے ان پر خوف طاری ہو گیا۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ اس وجہ سے کہ جو کچھ وہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بری کارگزاری کی یہ سزا دی۔

انکار رسالت پر عذاب

پہلے اللہ نے اپنے تین احسانات کا ذکر کیا اب چوتھے بڑے احسان کے متعلق فرمایا وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ البتہ تحقیق اللہ کا عظیم الشان رسول ان کے پاس آیا، جس کو وہ پہچانتے تھے کہ ان کے خاندان کا آدمی ہے، صادق اور امین ہے، راستباز اور نیک ہے، اس کے اخلاق اتنے حمیدہ ہیں کہ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ پھر جب اللہ کے اس رسول نے لوگوں کو پیغام سنایا فَكَذَّبُوْهُ تو انہوں نے اس عظیم الشان رسول کی تکذیب کی اور اسے اللہ کا رسول تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ پس اللہ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ درآنحالیکہ وہ ظلم کرنے والے تھے۔ حضور علیہ السلام نے مکہ والوں کے لیے بددعا فرمائی اللھم اجعل علیھم سنین کسنی یوسف

دے اے اللہ! ان پر یوسف علیہ السلام کے زمانے والے سال یعنی قحط ڈال دے اللہ نے مکے والوں پر بھی قحط مسلط کر دیا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ہر طرف خشکی تھی، اوپر دھواں سا نظر آتا تھا، کھانے کے لیے کچھ نہیں ملتا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ چمڑا اور مردار تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔ اللہ نے ان کی کشادہ روزی کو ایسی تنگی میں بدل دیا۔

ادھر امن و امان کی حالت بھی بگڑتی چلی گئی۔ جب انہوں نے اللہ کے نبی کو جھٹلا دیا، اُسے طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں تو وہ ہجرت پر مجبور ہو گئے اور بالآخر مکہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ کو دارالاسلام بنا لیا۔ اللہ نے وہاں پر مسلمانوں کی مدد فرمائی، انہوں نے طاقت جمع کی اور مکے والوں پر مسلسل خوف کی حالت طاری ہو گئی اور جب تک مکہ فتح نہ ہو گیا۔ ان کے دن کا سکون اور رات کا چین ختم ہو کر رہ گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ حالات صرف مکہ کی بستی تک ہی محدود نہیں بلکہ جس جگہ بھی اللہ کی نعمتوں کی ناقدری اور اللہ کے رسولوں کا انکار ہو گا۔ وہاں ایسے ہی حالات پیدا ہوں گے۔ آگے سورۃ سبا میں اللہ تعالیٰ نے اہل سبا کا حال بھی بیان فرمایا ہے۔ اُن لوگوں کو بھی اللہ نے عیش و آرام کے بڑے سامان مہیا فرمائے مگر انہوں نے ناشکری کا اظہار کیا تو اللہ نے بہت بڑا سیلاب بھیجا جس کی وجہ سے ان کی زمینیں، باغات اور کھیتیاں تباہ ہو گئیں اللہ نے زمین سے روئیدگی کی طاقت ہی سلب کر لی۔ وہاں پر غلے اور پھلدار درختوں کی بجائے جنگلی بیر پیدا ہونے لگے۔ ہر طرف کانٹے دار جھاڑیاں نظر آنے لگیں حالانکہ وہاں پر ڈیم کا پانی میسر تھا جس کی بنا پر میلوں لمبے باغات اور غلّے کے کھیت ہوا کرتے تھے۔ اللہ نے ہر چیز تباہ کر دی اور فرمایا۔ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (سبا) ہم ناشکر گزاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

امن وامان کی ضرورت

انسانی زندگی کے لیے امن وامان بڑی ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر کاروبار زندگی ٹھپ ہوجاتا ہے، کارخانے، زراعت، صنعت وحرفت غرضیکہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ دوسرے ملک کے ساتھ جنگ کی حالت ہو تو ہر وقت دشمن کا خوف رہتا ہے۔ بمباری ہوتی ہے۔ املاک تباہ ہوجاتی ہیں اور لوگ مرنے لگتے ہیں۔ اندرونی طور پر بھی بدامنی ہو تو ہر وقت چوری، ڈاکے کا خطرہ رہتا ہے، لوگوں کی جان، مال اور عزت غیر محفوظ ہوجاتی ہے، آج دنیا میں ہر طرف بدامنی کی فضا پھیلی ہوئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت نے حرص اور لالچ کو جنم دیا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص جائز اور ناجائز طریقے سے سرمائے کی فکر میں رہتا ہے، خواہ اسمیں دوسروں کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اشتراکی نظام اس سے بھی بدتر ہے جس میں کسی انسان کی عزت نفس محفوظ نہیں ہوتی، انسانوں سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا ہے وسائل آمدن چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس طرح بدامنی اور بے چینی مسلسل سایہ فگن رہتی ہے اس کے برخلاف آسمانی شرائع ایسا نظام حیات قائم کرنا چاہتی ہیں جس میں کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو کو کوئی خطرہ نہ ہو، ہر شخص کو اس کے حسب حال روزی میسر ہو اور پورا معاشرہ امن و امان دوستی اور اخوت کا گہوارہ ہو۔

حدیث شریف میں حضرت حذیفہؓ کا بیان آتا ہے کہ ابتدائی دور میں مجھے بالکل اطمینان حاصل تھا میں کسی بھی آدمی سے بلاخوف و خطر معاملہ کر سکتا تھا، لیکن بعد میں حالات تبدیل ہوگئے۔ اب میں خاص خاص آدمیوں سے معاملات کرتا ہوں۔ امن کے زمانہ میں میں سمجھتا تھا کہ اگر میں کسی مسلمان سے معاملہ کروں گا اور مجھے کوئی نقصان پہنچے گا لَیَرُدَّنَّ اِلَیَّ دِیْنُہٗ تو اس مسلمان کا دین میرے اس نقصان کو برداشت نہیں کرے گا یعنی وہ مسلمان مجھے دھوکہ دینے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا کسی غیر مسلم یعنی یہودی، عیسائی یا مشرک سے معاملہ کرتے وقت مجھے یقین ہوتا تھا کہ اگر مجھے نقصان ہوا لَیَرُدَّنَّ اِلَیَّ

سلطنۃ تو حاکم اس نقصان کی تلافی کر دے گا یعنی میں اگر حاکم وقت کے پاس شکایت کروں گا تو وہ میرے نقصان کو برداشت نہیں کریگا بلکہ میرا حق دلاویگا۔ مجھے بالکل اطمینان تھا اور اچھے نظام کا یہی خاصہ ہے۔ اس کے برخلاف ہم برے نظاموں کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں، نہ دن کو سکون اور نہ رات کو آرام ہر وقت دشمن، چور، ڈاکو، پڑوسی کا خطرہ رہتا ہے۔ کسی سے معاملہ کرتے وقت تسلی نہیں ہوتی۔ یہ نظام معیشت کی خرابی ہے کہ نہ امن و چین حاصل ہے اور نہ کشادہ روزی نصیب ہے، مکان، خوراک، لباس، عزت نفس، صحت، تعلیم انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ جو ہر آدمی کو حاصل ہونی چاہئیں مگر یہاں حالت یہ ہے کہ ایک طرف سربفلک عمارات اور پرتکلف زندگی ہے تو دوسری طرف دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں سر چھپانے کو سایہ نہیں اور علاج کے بغیر لوگ موت کی آغوش میں جا رہے ہیں۔ ان حالات میں امن و امان کا تصور کہاں کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر بڑے احسانات کیے ہیں مگر یہ اُن کی قدر نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر کسی نہ کسی عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

حلال اور طیب روزی

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا پس کھاؤ اس میں سے جو اللہ نے تمہیں روزی دی ہے حلال اور پاکیزہ چیزیں۔ حرام اور ناپاک کے قریب بھی نہ جاؤ۔ حرام دین اور اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے اللہ نے اپنے سارے نبیوں کو یہی تعلیم دی "كُلُوا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا" (البقرہ) زمین کی پاک اور حلال چیزیں استعمال کرو۔ نجس اشیاء کا استعمال نہ کرو۔ ظاہری نجاست یہ ہے کہ کوئی چیز گل سڑ جائے اور اس میں بدبو پیدا ہو جائے، ایسی چیز مضر صحت ہوگی اور مکروہ تحریمی کے حکم میں آئے گی اور باطنی نجاست یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کا نام لے کر بکری ذبح کرے مگر ہو وہ چوری کی تو یہ طیب ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ ظاہری طور پر بے عیب ہونے

کے باوجود نجس ہی رہیگی۔ آگے اللہ نے محرمات کی مختلف اقسام بھی بیان فرمائی ہیں۔ چوری، ڈاکہ، رشوت، سمگلنگ کا مال کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ لہو و لعب کی کمائی، فوٹو سازی اور فلمی صنعت سے کمایا ہوا مال کیسے طیب ہو سکتا ہے، کھیل تماشا ہو یا گانا بجانا سب حرام ذرائع آمدنی ہیں، ان ذرائع سے حاصل کردہ مال حلال نہیں ہوگا اور پھر یہ ہے کہ حرام اور نجس مال کھانے والے کی نہ عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ دعا۔ ایسی چیزیں انسان کے لیے جہنم کا زادِ راہ بنیں گی۔

شکر گزاری

ایک تو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کی تلقین کی اور دوسرا فرمایا۔ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرو، اگر تم خالص اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ اللہ کی نعمتوں کی قدر کا یہی مطلب ہے کہ ہر نعمت جائز اور حلال ذرائع سے حاصل کی جائے اور اس کا استعمال بھی جائز ہو۔ فضول اور حرام کاموں پہ مال ضائع نہ کیا جائے۔ حلال و حرام میں امتیاز رکھا جائے اور اللہ کے قانون کی پابندی کی جائے۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ
الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٥﴾ وَلَا
تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ
هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ
الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ
الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿١١٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١١٧﴾ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا
مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ
وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٨﴾ ثُمَّ
إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا
إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٩﴾

ترجمہ:- بیشک حرام قرار دیا ہے تم پر (اللہ نے)
مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے
سوا غیر کا نام پکارا گیا ہو پس جو شخص مجبور ہوا (اس حال

ہیں کہ) وہ سرکشی کرنے والا نہیں ہے اور نہ حد سے تجاوز
کرنے والا ہے۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور
مہربان ہے (۱۱۵) اور نہ کہو اس چیز کو کہ بیان کرتی ہیں
تمہاری زبانیں جھوٹ، یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ افتراء
باندھو تم اللہ پر جھوٹ۔ بیشک وہ لوگ جو افتراء باندھتے
ہیں اللہ پر جھوٹ، وہ نہیں فلاح پائیں گے (۱۱۶) فائدہ
ہے تھوڑا سا، اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے (۱۱۷)
اور اُن لوگوں پر جو یہودی ہوئے، ہم نے حرام قرار
دی وہ چیز جو ہم نے بیان کی ہے آپ پر اس سے
پہلے۔ اور ہم نے اُن پر زیادتی نہیں کی، بلکہ وہ خود اپنی
جانوں پر زیادتی کرتے تھے (۱۱۸) پھر بیشک تیرا پروردگار
اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے برائی کی نادانی کے ساتھ
پھر توبہ کی ہے اس کے بعد اور اصلاح کی ہے انہوں
نے، تو بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد البتہ بہت
بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (۱۱۹)

چار حرام چیزیں

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بیان ہو چکا ہے کہ حلال اور طیب چیزیں کھاؤ، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے حلت و حرمت کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے چار قطعی حرام چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ حلت و حرمت کا یہ قانون اس سے پہلے سورۃ بقرہ، سورۃ مائدہ اور سورۃ انعام میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے جس کی پابندی اہل ایمان کے لیے نہایت ضروری ہے اِن محرمات میں اُن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ماکولات میں شمار ہیں اور لوگوں کا اکثر و بیشتر اِن اشیاء سے

واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ مسئلہ بیان کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر مشرک مذکورہ محرمات کو بُرا نہیں سمجھتے تھے اور اِن کو بلا دریغ استعمال کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قطعی حرمت کا حکم لگایا ہے۔

(۱) مردار
ارشاد ہوتا ہے اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ بیشک اللہ نے تم پر مردار حرام قرار دیا ہے۔ اگر کسی حلال جانور کو شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق ذبح نہ کیا جائے، تو اگرچہ وہ ذبح کیا گیا ہے مگر وہ مردار کے حکم میں ہی آئے گا۔ اگر کوئی جانور جیسے بکری وغیرہ خود بخود مر گئی تو ظاہر ہے کہ وہ تو مردار ہی ہوگی اور اللہ کے اس حکم کے مطابق اس کا کھانا قطعی حرام ہوگا۔ سورۃ مائدہ میں مردار کی بعض دوسری صورتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے یعنی وہ جانور بھی حرام ہے جو گلا گھٹ کر مر جائے، یا چوٹ لگنے سے مر جائے یا کسی اونچی جگہ سے گر کر ہلاک ہو جائے، یا جسے درندے پھاڑ کھائیں یا جو کسی استھان پر ذبح کیا گیا ہو۔ اگر کوئی جانور عمداً اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کر دیا جائے تو وہ بھی مردار کی تعریف میں آئے گا۔ سکھ جھٹکا کرتے ہیں یا انگریز جانور کی پیشانی میں گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے حرام ہیں، کوئی مسلمان ایسے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی زندہ جانور کے جسم سے کوئی حصہ کاٹ لیا جائے تو وہ بھی حرام ہوگا۔ زمانہ جاہلیت میں جب کسی پر مجبوری کی حالت ہوتی تھی، کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا تو اونٹ کی کوہان کاٹ کر کھا لیتے تھے۔ زخم بعد میں ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کسی دنبے کی چکی کاٹ لی جائے تو وہ حرام کے حکم میں آئے گی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے مَا اُبِيْنَ مِنَ الْحَيِّ فَهُوَ مَيْتَةٌ جو عضو زندہ جانور سے کاٹ کر الگ کر لیا جائے وہ مردار تصور ہوگا۔ مفسرین کرام مردار کی حرمت کی یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ جسم میں سستی پیدا ہوتی ہے اور مردار کھانے میں لطف و نشاط کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔ انسان میں اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا اس کو حرام

قرار دیا گیا ہے۔

(۲) خون
فرمایا ایک تو مردار حرام ہے اور دوسرا وَالدَّمَ یعنی بہنے والا خون بھی حرام ہے۔ جانور کو ذبح کرتے وقت جو خون بہہ جاتا ہے۔ یہ ناپاک اور حرام ہے ۔ چونکہ خوراک انسانی اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے اس لیے خون کے استعمال سے انسان میں درندگی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ خونخوار درندے، شیر، چیتا وغیرہ کی طرح انسان بھی درندگی پر اتر آتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کیلیے خون حرام قرار دیا ہے۔ البتہ اضطراری حالت کا ذکر آیت کے اگلے حصہ میں آرہا ہے۔ اگر کسی شخص کے جسم میں خون کی مقدار اس قدر کم ہو جائے کہ اُس کی زندگی کا بچاؤ مشکل ہو جائے تو ایسی حالت میں فقہائے کرام نے ایک انسان کا خون دوسرے انسان میں منتقل کرنے کی اجازت دی ہے۔ عام حالات یا معمولی تکلیف میں انتقال خون درست نہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ طہارت، سماحت، اخبات اور عدالت جیسے پاکیزہ اخلاق کی نشو و نما میں خوراک کو بڑا دخل حاصل ہے۔ انسان جس قسم کی خوراک استعمال کرے گا۔ اُس کے اخلاق پر اُسی قسم کے اثرات مرتب ہوں گے۔

(۳) خنزیر کا گوشت
تیسری حرام چیز فرمایا وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ خنزیر کا گوشت ہے درحقیقت خنزیر کی ہر چیز بال، کھال، ہڈیاں، خون وغیرہ حرام ہیں تاہم چونکہ بعض اقوام میں عام طور پر اس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے گوشت کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء کی شرائع میں خنزیر حرام ہی رہا ہے مگر یہ سب عیسائیوں کی بدبختی ہے کہ وہ اسے بھیڑ بکری کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جب مسیح علیہ السلام دنیا میں دوبارہ نزول فرمائیں گے تو وہ اپنی قوم سے سخت ناراض ہوں گے کہ جس جانور کو سارے نبیوں کی شریعت میں حرام قرار دیا گیا اُسے آپ کی قوم نے خوب

کھایا، چنانچہ اس کی تذلیل کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خنزیر کو قتل کریں گے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس جانور میں دو ایسی قبیح خصلتیں پائی جاتی ہیں، جو انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جانور گندگی کھاتا ہے۔ لہذا اس کا گوشت کھانے والے شخص کے دل و دماغ میں بھی گندگی کے اثرات پیدا ہوں گے۔ دوسری بری خصلت یہ ہے کہ یہ ایسا بے غیرت جانور ہے کہ کئی کئی نر ایک مادہ سے بیک وقت جفتی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خنزیر خور قوموں میں انتہائی درجے کی بے غیرتی پائی جاتی ہے۔ جس کا مشاہدہ دنیا میں کیا جا رہا ہے۔ بغرضیکہ اللہ نے خنزیر کا گوشت بھی حرام قرار دیا ہے۔

(۴) نذر لغیر اللہ

چوتھی حرام چیز نذر لغیر اللہ ہے۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ج جو جانور اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کے تقرب اور خوشنودی کے لیے مشہور کیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ اگر کوئی جانور یا دیگر کوئی چیز لات، منات یا عزیٰ وغیرہ کی نذر کی گئی تو وہ حرام ہو گئی۔ اسی طرح شیخ سدھو کی گائے یا دادا کا بکرا اسی تعریف میں آتا ہے۔ اہلال کا معنیٰ ہی آواز بلند کرنا یا تشہیر کرنا ہوتا ہے مقصد یہ کہ اگر کوئی چیز غیر اللہ کے نام پر منسوب کی گئی تو حرام ہو جائے گی۔ البتہ ایصالِ ثواب مختلف چیز ہے۔ کوئی شخص اس نیت سے اللہ کے نام پر جانور ذبح کرے کہ اس کا ثواب فلاں بزرگ یا فلاں شخص کو ایصال کرنا مقصود ہے، تو اس میں کوئی جھگڑا نہیں۔ پیران پیر کی گیارھویں کا بھی صحیح تصور یہی ہے۔ اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ پیرانِ پیر یا کسی دوسرے بزرگ کے لیے قربانی نہیں کریں گے تو وہ ناراض ہو جائے گا اور جان و مال میں نقصان کا خطرہ ہو گا تو یہی چیز نذر لغیر اللہ ہے۔ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا جائے یا چاول پکائے جائیں یا مٹھائی تقسیم کی جائے تو اگرچہ بظاہر تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر محققین فرماتے ہیں کہ ایسی چیز میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے۔ ایسا مال کھانے والوں کی روح ناپاک ہو جاتی

ہے اور اُن کا باطن مسخ ہو جاتا ہے۔ اُن میں اچھے جذبات کی بجائے غلیظ جذبات جنم لیتے ہیں۔ اس نجاست اور بُرے اخلاق کو صاحبِ روحانیت لوگ بخوبی محسوس کرتے ہیں۔

یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی توجہ طلب ہے۔ جس شخص کا عقیدہ گندا ہے اگر وہ اللہ کا نام لے کر بھی ذبح کرے گا، تب بھی اس کا ذبیحہ مردار کی طرح حرام ہی ہو گا۔ ذبیحہ اُن کا پاک ہوتا ہے۔ جن کا عقیدہ صحیح ہو۔ البتہ اہل کتاب کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں تو وہ جائز ہو گا کیونکہ وہ اپنی نسبت آسمانی کتاب کی طرف کرتے ہیں۔ البتہ کسی بت پرست مجوسی یا مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہو گا۔ خواہ وہ ہزار دفعہ اللہ کا نام لیکر ذبح کرے بہر حال اللہ نے ان چار چیزوں کا ذکر کیا ہے کہ یہ حرام ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

بحالت اضطراری

اس قطعی حکم کے بعد استثنائی صورت بھی بیان کر دی ہے فَمَنِ اضْطُرَّ جو کوئی اضطراری حالت میں ہو۔ اس کے پاس حرام اشیاء کے علاوہ کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ ہو اور اُس کی زندگی کو خطرہ پیدا ہو جائے تو اُسے ایسی اشیاء استعمال کرنے کی وقتی طور پر اجازت ہے بشرطیکہ غَيْرَ بَاغٍ مضطرب شخص سرکشی کرنے والا نہ ہو۔ بَاغٍ سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص جان بچانے کے لیے نہیں بلکہ لطف اندوز ہونے کے لیے حرام چیز استعمال کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی حرام چیز مباح نہیں ہو گی۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نافرمانی کے کام کے دوران کسی شخص پر اضطراری حالت وارد ہو جائے تو اس کے لیے بھی حرام چیز مباح نہیں ہو گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چوری یا ڈاکے کی نیت سے سفر کر رہا ہے تو اُسے سفر میں روزہ افطار کرنے اور نماز میں قصر کی اجازت نہیں ہو گی کیونکہ وہ بُرے مقصد کے لیے جا رہا ہے۔ البتہ امام ابُو حنیفہؒ کے نزدیک ایسا شخص گنہگار تو

ضرور ہے مگر افطار اور قصر کا حق اُسے بہر حال حاصل ہے۔

فرمایا حرام کی اباحت کے لیے دوسری شرط یہ ہے وَلَا عَادٍ کہ مضطرب شخص حد سے بڑھنے والا نہ ہو۔ مثلاً اگر بادُ مجبر حرام چیز کھا کر جان بچا سکتا ہے تو آدھ سیر کھانے کی کوشش نہ کرے۔ زیادہ کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ اضطراری حالت میں اگر اس اباحت سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی جان چلی جاتی ہے تو وہ آدمی گنہگار ہوگا کہ اُس نے اللہ کی دی ہوئی رعایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور اگر ایسی حالت میں حرام کھا لیا ہے تو اللہ نے اس کی اجازت دی فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ وہ نہایت بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔

حلت و حرمت کا قانون

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ کسی چیز کو اپنی زبانوں سے حلال اور حرام قرار نہ دو۔ حلت وحرمت تمہارے اختیار میں نہیں بلکہ اَلْحَلَالُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ حلال وہ ہے جسے اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اگر میں اللہ کی توحید اور آپ کی رسالت پر ایمان رکھوں اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھوں تو کیا مجھے نجات حاصل ہو جائے گی ؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا، ہاں، بیشک تم جنتی ہو۔

کسی چیز پہ حلت وحرمت کا حکم لگانا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی صفت مخصوصہ ہے اور اس میں کوئی شریک نہیں۔ حلت وحرمت کا اختیار نہ کسی بادشاہ کو ہے، نہ صدر کو اور نہ کسی پارلیمنٹ کو۔ شاہ ولی اللہ رح فرماتے ہیں تحلیل و تحریم ایک تکوینِ نافذ کا نام ہے یعنی خدا تعالیٰ کے ہر چیز کے مالک ہونے کی وجہ سے یہ ایک قطعی حکم ہے کہ یہ کام

کرو گے تو مؤاخذہ ہوگا اور فلاں چیز ترک کرو گے تو ماخوذ ہوگے بعض اوقات اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حلت وحرمت کا کام تو نبی کی طرف بھی منسوب ہے "وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ" (الاعراف) کہ وہ پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نبی اپنی طرف سے کسی چیز پر حلت وحرمت کا حکم نہیں لگاتا۔ بلکہ نبی کا بیان کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہوتا ہے کہ اللہ نے اس چیز کو حلال یا حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح مجتہد حضرات بھی بعض چیزوں پر حلت وحرمت کا حکم لگاتے ہیں۔ یہ بھی ان کی اپنی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ قرآن وسنت میں غور کر کے بیان کرتے ہیں کہ بات اس طرح سمجھ میں آرہی ہے کہ یہ چیز حلال ہے یا حرام اور اس کی یہ دلیل ہے سو اللہ نے فرمایا کہ اپنی زبانوں سے یوں مت کہو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے جب اللہ نے کسی چیز کو حرام نہیں کیا تو تم کیسے یہ حکم لگاتے ہو۔ مشرکوں نے بحیرہ، سائبہ وغیرہ کئی قسم کے محرمات بنا رکھے تھے۔ آج بھی مختلف علاقوں میں لوگ نذر ونیاز کی بعض چیزوں کو بعض مردوں یا بعض عورتوں کے لیے حرام ٹھہراتے ہیں حالانکہ اللہ نے تو ان کو حلال قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کہے گا وہ مشرک ٹھہرے گا۔

فرمایا اپنی زبانوں سے حلال یا حرام قرار نہ دو لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ کہ یہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والی بات ہے۔ فرمایا إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو خود حلال یا حرام ٹھہرانے کی بجائے شریعت کا حکم تلاش کرو کہ اللہ نے کیا فرمایا ہے اور اللہ کے نبی نے کس طرح بیان فرمایا ہے۔ پھر مجتہدین اور علمائے کرام کی تحقیق کیا ہے۔ خود ساختہ حکم لگانے والوں نے

متعلق فرمایا مَتَاعٌ قَلِيلٌ یہ چند روزہ زندگی میں فائدہ اٹھانے والی بات ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ آگے ان کے لیے دردناک عذاب بھی موجود ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حلت وحرمت کے سلسلہ میں اللہ کی حدوں کو نہ توڑو ورنہ عذاب الیم کا شکار ہو جاؤ گے۔

مزید فرمایا وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ یہودیوں پر اللہ نے وہ چیزیں حرام قرار دیں جن کا ذکر ہم نے آپ کے ساتھ پہلے کیا ہے یہودیوں کے وقتی محرمات کا تذکرہ سورۃ مائدہ اور سورۃ انعام میں بھی موجود ہے کہ ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ نے ان کے لیے ناخن والے جانور اور چربی حرام قرار دے دی تھی۔ سورۃ انعام میں "حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ" کے الفاظ ہیں کہ ہم نے ناخن والے جانور، جن کا پنجہ پھٹا ہوا ہوتا ہے، حرام قرار دے دیئے "وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا" اور ان کی چربی بھی ان پر حرام کر دی تھی اور یہ سب کچھ انکی سرکشی کی سزا کے طور پر کیا تھا۔ البتہ ہڈیوں یا آنتوں کے ساتھ لگی ہوئی چربی حلال تھی۔ گوشت میں سے چربی کا ذرہ ذرہ علیحدہ کرنا پڑتا تھا۔ فرمایا یہ سخت حکم دے کر وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر زیادتی کرنے والے تھے۔ انہوں نے اللہ کی حدود کو توڑا تو اللہ نے ان کے لیے بعض چیزیں حرام قرار دے دیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا تُشَدِّدُوا أَنْفُسَكُمْ اپنے نفسوں پر تشدد نہ کیا کرو۔ لوگ خود ہی بعض رسومات جاری کر لیتے ہیں اور پھر ان کی پابندی بھی خود ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس طرح وہ کسی کام کے لیے اپنے آپ کو پابند کر لیتے ہیں۔ پھر جب اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے تو مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ فرمایا اگر ایسا کرو گے تو خدا تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے گا۔ رسومات کی پابندی کر کے اپنے لیے مشکلات پیدا کرو گے

وقتی محرمات

رحمتِ الٰہی

فرمایا ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ پھر بیشک تیرا پروردگار اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے نادانی کے ساتھ برائی کا ارتکاب کیا۔ عقل و شعور پہ پردہ پڑ گیا اور کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھے ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ پھر اس کے بعد توبہ کر لی۔ غلطی کا احساس ہو گیا وَاَصْلَحُوْٓا اور اپنی اصلاح بھی کر لی۔ یعنی اگر کسی کا حق تلف کیا تھا تو وہ ادا کر دیا اور آئندہ کے لیے محتاط ہو گئے۔ تو فرمایا اِنَّ رَبَّکَ مِنْ بَعْدِھَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد بہت بخشش کرنے والا اور نہایت مہربان ہے اگر کوئی شخص سچے دل سے تائب ہو جاتا ہے اور اپنی اصلاح کر لیتا ہے تو اللہ تعالےٰ بھی اپنی بخشش اور رحمت کے دروازے اس پہ کھول دیتا ہے، اس کی تمام سابقہ خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا ط
وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ط
اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۲۱﴾
وَآتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ط وَإِنَّهُ فِي
الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ
أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ط وَمَا كَانَ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمہ :- بیشک ابراہیم علیہ السلام تھے پیشوا اور اطاعت کرنے والے اللہ تعالیٰ کے لیے، ایک طرف لگنے والے۔ اور نہیں تھے وہ شرک کرنے والوں میں سے ﴿۱۲۰﴾ وہ اُس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے والے تھے اللہ نے اُن کو برگزیدہ بنایا، اور ہدایت دی سیدھے راستے کی طرف ﴿۱۲۱﴾ اور دی ہم نے اُن کو دُنیا میں بھلائی، اور بیشک وہ آخرت میں البتہ نیک لوگوں میں سے ہیں ﴿۱۲۲﴾ پھر ہم نے وحی کی آپ کی طرف کہ آپ پیروی کریں ابراہیم کی مِلّت کی جو ایک طرف لگنے والے تھے، اور نہیں تھے شرک کرنے والوں میں سے ﴿۱۲۳﴾

ربط آیات

اس سورۃ میں شرک کی مختلف قسمیں بیان ہو چکی ہیں۔ منکرین کی طرف سے توحید و رسالت اور قیامت کے انکار کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ مشرکین کی طرف سے حلال و حرام میں دخل اندازی کا تذکرہ بھی ہو گیا ہے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ اِن آیات کا ربط گذشتہ سے پیوستہ درس کے ساتھ ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک خوشحال اور امن والی بستی کا ذکر فرمایا تھا جس کے باشندوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان پر بھوک اور خوف کو مسلط کر دیا۔ اس بستی سے مراد مکہ مکرمہ کی بستی ہے جس کی ابتدا ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل کر کے کر دی تھی اور یہی چیز اِن دونوں دروس میں قدرِ مشترک ہے۔ آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل بیان فرماتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ آپ اللہ کے ایماندار بندے اور بیحد شکر گزار تھے، نیز آپ شرک سے سخت متنفر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے دعوے کی سختی سے تردید فرمائی ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ فرمایا ملتِ ابراہیمی کے حقیقی وارث حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکار ہیں، لہذا آپ کو بھی ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا ہی حکم دیا گیا ہے۔

امامتِ ابراہیمی

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً بیشک ابراہیم علیہ السلام پیشوا اور امام تھے۔ قرآنِ پاک میں لفظِ امت کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے امت کا عام فہم معنی جماعت ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً" اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت یا گروہ بنا دیتا۔ یا جیسے فرمایا "كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (آل عمران) تم ایک بہترین جماعت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ امت کا ایک اور معنی مدت بھی ہوتا ہے جیسے سورۃ یوسف میں جیل سے رہائی پانے والے بادشاہ کے

مصاحب کے متعلق آتا ہے "وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ" کہ اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا کہ یوسف علیہ السلام نے اس سے کوئی بات کی تھی۔ امت، کا معنیٰ اطاعت اور ملت بھی آتا ہے۔ تاہم اس آیت کریمہ میں امت کا لفظ امام اور پیشوا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام لوگوں کے امام تھے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گزر چکا ہے "اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" اے ابراہیم علیہ السلام! میں تجھے لوگوں کا امام بناؤں گا کہ جس کا اتباع ضروری ہوگا۔ ویسے امت کا لفظ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس لحاظ سے بھی صادق آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں وہ تمام کمالات جمع فرما دیے تھے جو ایک پوری جماعت میں بحیثیت مجموعی ہو سکتے ہیں۔ وہ مالک ہے، چاہے تو ایک شخص میں جہان بھر کی خوبیاں جمع کر دے جیسا کہ مقولہ ہے لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ۔ تاہم اس مقام پر مقتدا، پیشوا اور معلم مراد ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے۔ اِنَّ مَعَاذًا کَانَتْ اُمَّۃً قَانِتًا لِلّٰہِ یعنی حضرت معاذؓ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ایک مکمل امت تھے۔ کسی شخص نے آپ کے حق میں لفظ امت کے استعمال پر اعتراض کیا تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ امت کا ایک معنیٰ معلم الخیر بھی ہوتا ہے۔ حضرت معاذ بڑے پائے کے نیکی کی بات بتلانے والے معلم تھے، اس لیے ان کے حق میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آپ کی ذات وہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے قرآن سیکھنا ہو وہ ان چار آدمیوں سے سیکھے یعنی عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی ابن کعبؓ اور سالمؓ۔ تو گویا آپ معلم الخیر تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے بڑھ کر نیکی کی بات بتلانے والا کون ہوگا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا

ابراہیم علیہ السلام ایک امت یعنی امام، پیشوا، مقتدا اور معلم الخیر تھے۔

اطاعت اور حنیفیت

فرمایا ابراہیم علیہ السلام پیشوا تھے قَانِتًا لِّلّٰهِ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے بھی تھے۔ قنوت کا معنی اطاعت اور خشوع و خضوع بھی ہوتا ہے جیسے سورۃ الزمر میں ہے "اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا" بھلا جو شخص رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کے ذریعے اطاعت کا حق ادا کرتا ہے کیا وہ ناشکر گزاروں اور نافرمانوں کی طرح ہو سکتا ہے؟ مطلب یہ کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مکمل اطاعت گزار تھے اور ساتھ ساتھ حَنِيْفًا حنیف بھی تھے، یعنی ہر طرف سے کٹ کر، ہر باطل دین سے ہٹ کر صرف اور صرف خدا کے سچے دین کی طرف لگنے والے تھے۔ لغوی طور پر حنف کا معنی چلتے وقت پاؤں کا اندر کی طرف مائل ہونا ہے اور حنیف اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پاؤں جھکا کر چلتا ہو یعنی ایک طرف کو مائل ہو۔ تو ابراہیم علیہ السلام اس لحاظ سے حنیف ہیں کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف ایک طرف لگنے والے تھے۔

امام شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں مزید وضاحت فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والا ہو، نماز پڑھتے وقت اپنا رُخ خانہ کعبہ کی طرف کرتا ہو، بیت اللہ شریف کا حج کرتا ہو، ختنہ کرتا ہو اور غسلِ جنابت کرتا ہو، وہ حنیف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ آپ پکے موحد تھے، خود خانہ کعبہ تعمیر کیا، خود اس کا حج کیا، اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، ختنہ کیا اور غسلِ جنابت تو آپ کے بعد عربوں میں زمانۂ جاہلیت میں بھی رائج تھا جو کہ ملتِ ابراہیمی کا ایک جزو ہے تو اس لحاظ سے ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام مومنوں کو بھی حنیفیت کا درس دیا ہے جیسا کہ سورۃ الحج میں ہے "حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ" تم سب کے سب حنیف

یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے بن جاؤ اور مشرک نہ ہو۔ حضرت ابراہیم کے مشرک نہ ہونے کے متعلق اللہ نے قرآن میں بار بار ذکر کیا ہے "وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (الانعام، النحل) آپ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

براہیم علیہ السلام بطرف نسبت

ابراہیم علیہ السلام تو اس قدر خدا پرست تھے، لہٰذا مشرکوں کو شرم آنی چاہیے جو تمام تر شرک کے باوجود اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں کہ ہم اُن کے دین پر ہیں۔ اِن کا حال تو یہ ہے کہ حلال و حرام خود اپنی طرف سے ٹھہرا لیتے ہیں، خدا تعالیٰ کی صفات، عبادت اور نذر و نیاز میں اس کا شریک ٹھہراتے ہیں، غیر اللہ کو مافوق الاسباب پکارتے ہیں، شرکیہ رسوم ادا کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ابراہیمی کہلانا چاہتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حنیف تھے، ہر طرف سے کٹ کر صرف خدا تعالیٰ کی طرف لگے ہوئے تھے وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور مشرکوں میں سے قطعاً نہیں تھے بلکہ کفر اور شرک سے سخت بیزار تھے آپ نے کفر اور شرک کی تردید میں بڑے دلائل پیش کیے ہیں اور توحید پرستی کے عقلی دلائل بہم پہنچائے ہیں۔ قیام عراق کے دوران بادشاہ اور تمام لوگ آپ کے مخالف تھے حتیٰ کہ سگا باپ اور پورا قبیلہ بھی آپ کے خلاف تھا۔ بابل جیسے وسیع و عریض شہر میں آپ کا ایک بھی حامی نہیں تھا۔ آپ تن تنہا کفر اور شرک کا مقابلہ کرتے رہے اور لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے مگر مشرک لوگ اپنی نسبت اُن کی طرف کر کے حقائق کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

شکرِ نعمت

فرمایا ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ آپ اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے والے تھے۔ ادھر مشرکین کا حال گیارہویں رکوع میں گذر چکا ہے "يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا" کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے تھے مگر اُن کا انکار اور ناقدری کرتے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ رکوع میں بیان ہو چکا ہے ان کے لیے اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ تھا " وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ " کہ ان کے پاس انہی میں سے اللہ کا عظیم الشان رسول آیا " فَكَذَّبُوْهُ " مگر ان بدبختوں نے اُسے بھی جھٹلا دیا، ایمان نہ لائے اور اس طرح اللہ کی ایک عظیم نعمت کی ناقدر دانی کی۔ کفرانِ نعمت کے متعلق سورۃ ابراہیم میں گزر چکا ہے " اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا " کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جنہوں نے اللہ کی نعمت کی سخت ناقدری کی۔ یہ نعمت اللہ کا رسول ہی تھا جسے جھٹلا دیا گیا۔ ان کے برخلاف ابراہیم علیہ السلام تو انعاماتِ الٰہیہ کے حد درجہ قدر دان تھے اور اس کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ کی طرف سے عطا کردہ روزی کے اس قدر قدر دان اور شکر گزار تھے کہ مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے کہ کہیں اللہ کی نعمت کی ناقدری نہ ہو جائے۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ مسافر کے انتظار میں رہتے حتیٰ کہ جب فرشتے قومِ لوط پر عذاب لے کر آئے اور آپ کے پاس انسانی شکل میں حاضر ہوئے " فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ " (ھود) تو آپ فوراً بچھڑا تل کر لے آئے تاکہ مہمانوں کی خدمت کر سکیں۔ قرآن پاک نے آپ کی یہ صفت بھی بیان کی ہے " وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى " (النجم) ابراہیم علیہ السلام نے اپنا عہد پورا فرمایا۔ جب ابتلاء کا وقت آیا، آپ کو آگ میں پھینک دینے کی تیاری ہو گئی تو آپ کو ذرا بھی تردد یا وہم نہیں ہوا بلکہ حکم خداوندی پر راضی رہے۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے " اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ " آپ اپنے پروردگار کے پاس قلبِ سلیم لے کر حاضر ہوئے۔ آپ ابو الانبیاء اور امام الانبیاء ہیں۔ آپ حنیفیت کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے امام ہیں۔ فرمایا اِجْتَبٰهُ اللہ تعالیٰ نے آپ کو برگزیدہ بنایا وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور آپ کو سیدھے

راستے کی طرف ہدایت دی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں جو اس نے ابراہیم علیہ السلام پر کیے۔ اور پھر آپ نے بھی ان احسانات کا پورا پورا شکریہ ادا کیا، اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ کیا اور ایک لحظہ بھر کے لیے بھی اُس کی یاد سے غافل نہیں ہوئے۔

دنیا کی بھلائی

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے فرمایا وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں بھلائی عطا فرمائی۔ روزی میں فراخی عطا کی۔ صاحبِ وجاہت اور کمال درجے کی اولاد دی۔ تمام حق پرست آپ کی عزت کرتے تھے۔ اللہ نے آپ کو نیکی اور شہرت عطا فرمائی۔ آپ کی اولاد میں سلسلہ نبوت قائم کیا۔ چنانچہ قیامت تک کے لیے آپ کے حق میں دعائیں ہونے لگیں۔ ہم آخری امت کے لوگ بھی جب نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر درود پڑھتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ تو ساتھ یہ بھی کہتے ہیں۔ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِیْمَ اے مولا کریم تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کی آل پر اپنی رحمتوں کا نزول فرما جس طرح کہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی آل کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازا۔ یہود و نصاریٰ غلط کار ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا احترام کرتے ہیں۔ یہی دنیا کی بھلائی ہے۔ پھر واضح کیا کہ دنیا میں بھلائی حاصل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ آخرت سے محروم رہ جائیں گے، بلکہ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ آپ آخرت میں بھی نیکوکار لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اللہ نے دنیا میں آپ کو مقتدا اور پیشوا بنایا۔ دینِ قیم اور صراطِ مستقیم پر چلایا اور سب لوگوں کو اسی راستے پر چلنے کا حکم دیا، تو آخرت میں بھی آپ اگلی صفوں میں نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل کا بیان بھی ہو گیا۔

ملتِ ابرٰہیمی کا اتباع

پھر فرمایا ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ پھر ہم نے آپ کی طرف وحی نازل فرمائی یعنی حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا کہ آپ ملّتِ ابراہیمی کی پیروی اختیار کریں۔ آپکی ملت وہی دینِ حق اور دینِ اسلام ہے جو ابتداء سے چلا آرہا ہے۔ دین تمام نبیوں کا ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، ملت بھی تقریباً سب کی ایک ہی ہے۔ دین اور ملت سے مراد موٹے موٹے اصول ہیں جو ہمیشہ یکساں رہے ہیں البتہ مختلف انبیاء کی شرائع میں مکان و زمان کی مناسبت سے بعض تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے مسائل اور جزئیات ہوتی ہیں جو مصلحت کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ ملت اور دین تبدیل نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ آپ بھی ملت ابراہیمی کا اتباع کریں۔ وہ ابراہیم علیہ السلام جو حنیف یعنی ہر طرف سے کٹ کر اور ہر دین سے بیزار ہو کر صرف ایک اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور آپ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ اللہ نے شرک کی دوبارہ تاکیداً تردید کر دی کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق سرمو بھی احتمال نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے کبھی کسی قسم کے شرک کی حمایت کی ہو۔ وہ تو پکے مُوحد تھے، لہٰذا مشرکوں کو آپ کا نام لیتے ہوئے اور آپ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہوئے کچھ تو شرم آنی چاہیئے۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا
فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۴﴾ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ
رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن
ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ :۔ بیشک مقرر کی گئی ہفتے کے دن کی تعظیم اُن لوگوں پر جنہوں نے اس میں اختلاف کیا ۔ اور بیشک تیرا پروردگار البتہ فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾ آپ دعوت دیں اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ ۔ اور جھگڑا کریں اُن سے اس بات کے ساتھ جو بہتر ہے ۔ بیشک تیرا پروردگار بہتر جانتا ہے اُس کو جو اُس کے راستے سے بہک گیا اور وہ بہتر جانتا ہے ہدایت والوں کو ﴿۱۲۵﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل و کمالات بیان فرمائے، اُن کی ملّت کا ذکر کیا اور اُن کی پیروی کا حکم دیا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ملتِ ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیتے تھے ۔ مشرکین

عرب اگرچہ نسلی طور پر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے مگر وہ آپ کا طریقہ چھوڑ چکے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام تو حنیف اور موحد تھے اور شرک سے قطعی طور پر بیزار تھے، مگر عرب کے لوگ شرک میں ملوث ہو چکے تھے۔ اُن کی اکثریت کفریہ اور شرکیہ رسوم ہی میں پھنس کر رہ گئی تھی اور اصل دین بھول چکی تھی عرب میں کوئی جگہ بت پرستی سے خالی نہ تھی حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ خانہ کعبہ بھی بت پرستی کا گڑھ بن چکا تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان شرکیہ اور کفریہ افعال کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا کتنی زیادتی اور مشرکوں کے لیے باعث شرم ہے۔

ہفتے کے دن کی تعظیم

بعض اہل کتاب اعتراض کرتے تھے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر ہیں تو پھر ہفتے کے دن کی تعظیم اور اس دن خاص عبادت کیوں نہیں کرتے۔ اللہ نے اس اعتراض کے جواب میں فرمایا اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ بیشک ہفتے کے دن کی خصوصیت (تعظیم اور خاص عبادت) ان لوگوں کے لیے مقرر کی گئی تھی جنہوں نے اس دن کے بارے میں اختلاف کیا تھا۔ ہفتے کے دن کی خصوصیت کا ذکر سورۃ بقرہ اور سورۃ مائدہ میں بھی موجود ہے، مگر اس دن کو یہ حیثیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں حاصل نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور بعد والے انبیاء کے زمانہ میں نافذ ہوا تھا۔ کیونکہ اسی دور میں لوگوں نے اس خاص دن کے متعلق اختلاف کیا تھا۔ اس اختلاف کی حقیقت کا تذکرہ حضور علیہ السلام کی حدیث مبارکہ میں ملتا ہے۔ تفسیری روایات میں بھی آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لیے جمعہ کا خصوصی دن مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس دن کاروبار ترک کر کے محض اللہ کی عبادت کیا کرو۔ مگر یہودیوں نے اس دن کی فضیلت کو تسلیم کرنے میں اختلاف کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تو

اُس دن کو خاص دن تسلیم کریں گے۔ تعطیل منائیں گے اور کاروبار چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کریں گے جس دن اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد فارغ ہوا تھا، اور وہ ہفتے کا دن بنتا ہے۔ اس کی تفصیل تورات میں موجود ہے اور قرآن میں بھی اشارۃً ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو چھ دن میں مکمل کیا اور پھر آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن آخری وقت میں ہوئی۔ کائنات کی تخلیق کا سلسلہ تو چھ دن میں مکمل ہو گیا۔ اور ہفتہ کا دن خالی تو انہوں نے اِس دن کو اختیار کر لیا۔ گویا انہوں نے جمعہ کے دن میں اختلاف کیا۔ اسی طرح نصاریٰ پر بھی جمعہ کا دن پیش کیا گیا کہ اس دن اللہ کی خاص عبادت کیا کریں مگر انہوں نے بھی اس طرف توجہ نہ کی اور کہنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہود کی عید ہمارے بعد ہو، لہٰذا انہوں نے یہودیوں کے ہفتہ سے بعد والا دن اتوار اختیار کر لیا کہ ہم اس دن چھٹی کر کے اللہ تعالیٰ کی خصوصی عبادت کیا کریں گے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی سعادت ہمارے حصے میں رکھی تھی جب کہ یہود و نصاریٰ اس سے محروم رہے، آپ کا ارشاد مبارک ہے نَحْنُ الْآخِرُوْنَ وَالْاَوَّلُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ بَعْدَ اَنْ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِنَا ہم سب سے آخر میں آنے والے ہیں مگر قیامت والے دن سب سے اول ہوں گے۔ یہود ہم سے ایک دن بعد اور نصاریٰ اُن کے ایک دن بعد یعنی علی الترتیب ہفتہ اور اتوار کو پیش ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن کو تمام ایام پر فضیلت بخشی ہے اور اسے سید الایام کا خطاب دیا ہے کہ یہ ان تمام دنوں کا سردار ہے۔

صاحب تفسیر حسینی لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا جو ہفتے کے دن سامان اٹھائے کاروبار کے لیے جا رہا تھا۔ آپ نے اسے روک لیا اور حکم دیا کہ اس کی گردن اتار دو کیونکہ اس نے ہفتہ کے دن کی تعظیم نہ کر کے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔ چنانچہ اُس شخص کو

قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش کھلے عام پھینک دی گئی جسے چالیس دن تک درندے اور پرندے نوچ نوچ کر کھاتے رہے۔ اس دن کی تعظیم کا اتنا سخت حکم تھا۔ پھر داؤد علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں نے اس دن کی تحقیر کی۔ اُن کو ہفتے کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا مگر وہ اس دن براہ راست تو مچھلی کا شکار نہیں کرتے تھے، البتہ انہیں حوض میں بند کر دیتے اور اتوار کو علی الصبح پکڑ لیتے تھے، اس طرح وہ حیلہ سازی سے اللہ کے حکم کی نافرمانی اور ہفتہ کے دن کی ناقدری کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا قہر نازل ہوا۔ اور ان لوگوں کی شکلیں بندروں اور خنزیروں میں تبدیل ہو گئیں اور پھر صفحۂ ہستی سے بالکل ہی ناپید کر دیے گئے۔ اللہ نے اتنی سخت سزا دی۔

جمعہ کے دن آسانی

اللہ تعالیٰ نے امتِ آخر الزمان کے لیے جمعہ کا دن مقرر فرمایا ہے مگر زیادہ سختی نہیں کی بلکہ اہلِ ایمان کے لیے آسانی پیدا فرمائی ہے۔ اس دن کے متعلق سورۃ جمعہ میں موجود ہے۔ اے ایمان والو! "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ" جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو فوری طور پر نماز کے لیے حاضر ہو جاؤ اور کاروبار ترک کر دو۔ اس حکم میں دو چیزیں ہیں ایک ذکرِ الٰہی یعنی خطبہ سننا اور دوسرا نماز پڑھنا۔ فرمایا "فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ" پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ۔ تو زمین میں پھیل کر روزی تلاش کرو۔ سارا دن تعطیل منانے کی ضرورت نہیں بلکہ نماز کے بعد اپنے کاروبار، کھیتی باڑی، تجارت، ملازمت، مزدوری، جہاں بھی تم کام کرتے ہو جا سکتے ہو۔ صرف نمازِ جمعہ کا حکم مؤکد ہے۔ اگر کوئی شخص بلا عذر تین جمعے مسلسل ترک کر دے تو وہ منافقوں میں شمار ہو گا، دل پر مہر لگ جائے گی۔ بہر حال اللہ نے ہمارے لیے بڑی آسانی فرما دی ہے کہ سید الایام بھی عطا فرمایا اور زیادہ سختی بھی نہیں فرمائی

ہفتے کے دن کی سختی ان لوگوں پر تھی جنہوں نے جمعہ کا دن تو قبول نہ کیا اور اس
کی بجائے ہفتہ کو پسند کیا اور پھر اس پر پورے نہ اُترے۔ فرمایا وَاِنَّ
رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ بیشک تیرا پروردگار قیامت والے دن اِن
کے درمیان اُن باتوں میں فیصلہ کریگا جن میں یہ اختلاف کرتے تھے ان کا
حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ کی آخری عدالت میں ہی ہو گا۔

یقہ تبلیغ
(۱)
ت

ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نصیحت کی بات
کی ہے۔ اور تبلیغ کا طریقہ کار بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اُدْعُ اِلٰى
سَبِيْلِ رَبِّكَ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیں جس
کے لیے اللہ نے تین طریقے تجویز کیے ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ تاہم
ہر نبی دعوت الی اللہ کا داعی ہوتا ہے کہ یہ امر اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ خود
حضور خاتم النبیین کے متعلق قرآن پاک نے فرمایا کہ آپ "دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" (الاحزاب) ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم
سے اُس کی طرف دعوت دینے والے اور روشن چراغ ہیں۔ اللہ نے عام اہل
ایمان کے متعلق بھی فرمایا "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ"
(حٰم سجدہ) اُس شخص سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کے راستے
کی دعوت دیتا ہے۔ خود بھی ایمان رکھتا ہے اور عامل بالاحکام بھی ہے۔
مومن، عامل اور داعی ہونا انبیاء کا طریق کار ہے۔ بہر حال اللہ نے دعوت کے
تین طریقے بیان فرمائے ہیں جن میں سے پہلا طریقہ فرمایا بِالْحِكْمَةِ حکمت
اور دانائی کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیں امام مالکؒ نے سنت کو حکمت
سے تعبیر کیا ہے۔ گویا حضور علیہ السلام کی تمام صحیح، یقینی اور قطعی باتیں حکمت
میں داخل ہیں۔ اِن کے ذریعے شکوک و شبہات دور ہوتے ہیں اور دل میں
یقین پیدا ہوتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ

فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا جس کو حکمت دے دی گئی، سمجھ عطا کر دی گئی، اُسے گویا کہ بہت بڑی بھلائی مل گئی جب حکیم اور دانا لوگوں کے سامنے حقائق بیان کیے جائیں تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں اسی لیے حضور علیہ السلام نے دعا میں سکھایا اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَائِقَ کَمَا ھِیَ اے اللہ! ہمیں چیزوں کی حقیقت سمجھا دے۔ جیسا کہ وہ واقع میں ہیں۔ یہ پہلے درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس قسم کے لوگوں کے سامنے کوئی چیز پیش کی جائے تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ پھر دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو پہلے درجے کی عقل و فہم نہیں رکھتے۔ بات سمجھانے کے لیے ان کے سامنے کوئی مثال، اچھا کلام یا کوئی اچھا شعر پیش کیا جائے جس سے ان کی طبیعت متاثر ہو تو پھر وہ بات کو سمجھتے ہیں۔

(۲) موعظتِ حسنہ

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اور اچھی نصیحت کے ساتھ۔ ایسے لوگوں کے لیے موعظتِ حسنہ کا طریقہ کارآمد ہوتا ہے۔ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا۔ اچھا بیان جادو اثر ہوتا ہے۔ اچھے اشعار بھی بعض اوقات بڑے مؤثر ثابت ہوتے ہیں ہمارے دور کے لوگوں میں مولانا ابوالکلام کو اپنی تحریر و تقریر پر کمال حاصل تھا۔ آپ کوئی چیز پیش کرنے کے بعد اسکے مناسب حال شعر نقل کرتے ہیں تو ساری بات ذہن میں اُتر جاتی ہے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو بھی اللہ نے کمال ملکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے مواعظ و تقاریر میں ایسے برمحل اشعار پیش کرتے تھے کہ ایک ان پڑھ آدمی بھی لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہتا تھا گویا عمدہ الفاظ اور اعلیٰ بیان کے ذریعے کسی چیز کو پیش کرنا موعظتِ حسنہ یا اچھی نصیحت کہلاتا ہے۔ ایسا وعظ و نصیحت جس میں طعن و تشنیع اور گالی گلوچ نہ ہو، ضرور اثر کرتا ہے "الفتح الربانی" حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہفتہ وار مواعظ ہیں جن میں اللہ نے کمال درجے کا اثر رکھا ہے۔ عربی زبان میں یہ نصائح دل میں اترتے چلے

جانتے ہیں، لوگ ذوق وشوق کے ساتھ سنتے ہیں۔

خود قرآن پاک کا ایک نام مَوْعِظَۃ بھی ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں، اس سے عقیدے اور اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے عمدہ طریقے سے نصیحت کی مثال خود قرآن نے بھی بیان کی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جا کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا تو ساتھ فرمایا" فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا " (طٰہٰ) اس سے نرم لہجہ میں بات کرنا تاکہ وہ نصیحت پکڑے یا ڈر جائے۔ غرضیکہ نصیحت کرتے وقت ہمیشہ نرم بات کرنی چاہیے تاکہ مخاطب کے لیے مؤثر ثابت ہو۔

حضور علیہ السلام ایک موقع پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور دورانِ خطبہ ہی کہنے لگا کہ حضرت! آپ مجھے وہ بات سکھائیں جس سے میں ناواقف ہوں اور اللہ نے آپ کو اس سے واقف کیا ہے۔ آپ نے لوہے کی کرسی منگوائی، اس پر تشریف فرما ہوئے، اس شخص کو بات سمجھائی اور اس کے بعد اپنا پہلا خطبہ جاری رکھا۔ اسی طرح ایک دیہاتی حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔ اِنِّیْ سَآئِلُكَ فَصَدِّقْ عَلَیْنَا۔ حضرت! میں ایک سائل ہوں۔ دیہاتی آدمی ہوں، ادب وآداب کی پاسداری نہیں، لہٰذا سختی سے سوال کروں گا، آپ ناراض نہ ہونا بلکہ میرے سوالوں کا جواب دینا۔ آپ نے فرمایا، پوچھ کیا پوچھتا ہے، اس نے سوالات کیے اور آپ نے نہایت نرمی سے جواب دیے۔ ایک اور موقع پر آپ علیہ السلام اونٹنی پر سوار جا رہے ہیں کہ ایک شخص آگے بڑھ کر اونٹنی کی مہار پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ آگے بعد میں جائیں پہلے میری راہنمائی کر دیں۔ اس شخص نے سوال کیا۔ حضور علیہ السلام نے تمام صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ شخص سوال پیش کر رہا ہے، تم بھی سنو، پھر اس شخص نے اپنا سوال دہرایا اور آپ نے اس کا جواب دیا۔ سائل کی تسلی ہو گئی اور صحابہ کو بھی اطمینان حاصل ہوا۔ آپ نے اس شخص

سے فرمایا خَلِّ یعنی اب مہار چھوڑ دے اور ہمیں جانے دے۔ چنانچہ آپ آگے تشریف لے گئے۔

ایک دفعہ حضور علیہ السلام صحابہ کے ہمراہ نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور نماز کے دوران ہی گفتگو شروع کر دی۔ لوگوں نے خاموش رہنے کا اشارہ بھی کیا مگر وہ شخص غصے میں بولتا رہا۔ پھر جب نماز ختم ہوگئی تو حضور علیہ السلام نے اسے قریب بٹھا کر سمجھایا کہ نماز اللہ کے ذکر اور اس کی تسبیح و تہلیل کے لیے ادا کی جاتی ہے۔ اس میں قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے، اس لیے نماز کے دوران کلام نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ نے اچھے طریقے سے اسکی اصلاح فرما دی تو وہ شخص کہنے لگا، خدا کی قسم میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے آج تک ایسا شفیق معلم نہیں دیکھا۔ آپ نے نہ تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی، نہ مارا پیٹا اور نہ ہی کسی قسم کی زجر و ملامت کی بلکہ نہایت اچھے طریقے سے بات سمجھا دی۔ غرضیکہ تبلیغ کا دوسرا طریقہ اچھی نصیحت ہے جو عمدہ پیرائے میں کی گئی ہو اور جو مخاطب کے دل و دماغ پر اثر کرے۔ فرمایا دوسرے درجے کے لوگوں کو اچھے طریقے سے نصیحت کریں۔

(۳) مباحثہ بطریق احسن

فرمایا تبلیغ دین کا تیسرا طریقہ یہ ہے وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِيۡ هِيَ اَحۡسَنُ اور اگر مخاطب سے بحث مباحثہ کی ضرورت پیش آجائے، سوال و جواب کا موقع ہو، اعتراض کا جواب دینا مطلوب ہو تو سختی اور تند خوئی کی بجائے نرمی اور حکمت عملی سے ہر سوال کا جواب دیں گالی گلوچ کی نوبت نہیں آنی چاہیئے کسی کے ساتھ جھگڑنے کی ضرورت نہیں، اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے ہر اعتراض کو خندہ پیشانی سے سنیں اور اس کا اچھے طریقے سے جواب دیں۔ اگر اچھے طریقے سے معاملہ کو سلجھائیں گے تو اس کا مثبت اثر ہوگا۔ بر خلاف اس کے ہمارے ہاں ہر فرقہ کے پیروکار دوسرے فرقہ والوں کو مغلوب کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں اور پھر اس سلسلہ میں اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہوئے گالی گلوچ اور طعن و تشنیع

تک نوبت پہنچ جاتی ہے جو کہ کسی طرح بھی احسن طریقہ نہیں۔ اس سے نہ تو مقرر کو کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ لوگوں کے پلے کچھ پڑتا ہے۔ یہ طریقہ تبلیغ ہرگز اسلامی طریقہ نہیں ہے اور اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اہل کتاب بڑے جھگڑالو قسم کے لوگ ہیں مگر ان کے متعلق بھی اللہ نے فرمایا "وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" (العنکبوت) ان کے ساتھ بھی بحث ومناظرہ کی ضرورت پیش آئے تو اچھے طریقہ سے مجادلہ کریں تقریر وتحریر میں دوسرے کے خلاف گندی زبان وقلم کا استعمال قطعاً پسندیدہ امر نہیں۔ اللہ کے نزدیک دوسرے کی تذلیل کرنا بہت بری بات ہے لہذا مباحث میں شریعت کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو فائدے کی بجائے نقصان ہی ہوگا۔

تین قسم کے لوگوں کے لیے اللہ نے تین طریقے بتلا دیے ہیں کہ ان اصولوں کی روشنی میں فریضہ تبلیغ ادا کرو۔ تمام انبیاء نے یہی طریقہ اختیار کیے۔ مخالفین نے انبیاء کے حق میں سخت ترین الفاظ استعمال کیے، جسمانی اور ذہنی اذیت پہنچائی مگر انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے نرم گفتاری کو اپنا شعار بنایا۔ نوح علیہ السلام کی قوم آپ کے خلاف سخت ترین الفاظ استعمال کرتی تھی۔ کہتے تھے تیری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ قوم نے کہا ہم تمہیں کھلی گمراہی میں مبتلا پاتے ہیں مگر اللہ کے سچے نبی نے جواب میں صرف اتنا فرمایا "یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ" اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا رسول ہوں، اور تمہیں ان کا حکم سنا رہا ہوں۔ سورۃ سبا میں حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں "اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا" کہ تم خدا کے لیے دو دو ہو کر یا فرداً فرداً کھڑے ہو کر غور کرو تو اسی نتیجے پر پہنچو

گے "مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ" کہ تمہارے صاحب یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں دیوانگی والی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تو علم و حکمت کے دریا بہا رہا ہے۔ اُس کے ایک ایک کلمے میں ہزاروں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ غرضیکہ تمام انبیاء علیہم السلام نے تبلیغ دین کے لیے ہمیشہ نرم خوئی کو اختیار کیا اور یہی طریقہ اللہ نے عام لوگوں کو بھی سکھلایا ہے۔

ہمارے دور کے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اِس طریقہ تبلیغ کے مجسم نمونہ تھے۔ اُن کے مواعظ حسنہ سے کمال حکمت اور ایمان کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ جب کوئی آپ کو کسی دوسرے فرقے کے ساتھ مناظرے کی دعوت دیتا تو آپ انکار کر دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر مخالف نے کوئی صحیح بات کہہ دی تو میں فوراً مان جاؤں گا اور تم کہو گے کہ میں نے تمہاری تحقیر کرا دی ہے، لہٰذا میں مناظرہ بازی کے چکر میں نہیں پڑونگا۔ ہمارے مدارس میں علم مناظرہ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حق بات کو دلائل کے ساتھ واضح کر دیا جائے۔ اگر کوئی مخالف فریق حق بات کہتا ہے تو اس کو تسلیم کرنے میں تامل نہ کرو اور جو غلط بات کہتا ہے اس کا احسن طریقے سے جواب دو۔ مگر اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ کوئی کسی کی حق بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مخالفت برائے مخالفت کا بھوت سر پر سوار ہے اور یہی چیز اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔ آج ہم اسلام کا نام لے کر اُنہی کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک بھی نہیں ہے۔

فرمایا کسی کے ساتھ مناظرہ، مباحثہ یا جھگڑا کرو تو بہتر طریقے سے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ
بیشک تیرا پروردگار اُس شخص کو جانتا ہے جو راستے سے بھٹکا ہوا ہے
وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ اور وہ ہدایت والوں کو بھی خوب

جانتا ہے۔ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے سب
لوگوں کے درمیان فیصلہ بھی اسی نے کرنا ہے، لہذا تم کبھی غلط راستہ
اختیار نہ کرو۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ
وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾
وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ
اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ ع ۱۶ ۹ ۲۲

ترجمہ :- اور اگر تم بدلہ لو ، پس بدلہ لو اس کی مثل جتنی تم کو تکلیف پہنچائی گئی ہے ۔ اور اگر تم صبر کرو تو البتہ وہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے (۱۲۶) اور (اے پیغمبر!) آپ صبر کریں ۔ اور نہیں ہے آپ کا صبر کرنا مگر اللہ (کی توفیق) سے ۔ اور نہ غمگین ہوں آپ اُن (مخالفوں) پر ، اور نہ ہوں تنگی میں اُس چیز سے جو یہ تدبیر کرتے ہیں (۱۲۷) بیشک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو ڈرتے ہیں اور وہ لوگ جو نیکی کرنے والے ہیں (۱۲۸)

زمانہ نزول

سورۃ النحل کی اِن آخری تین آیات کے زمانہ نزول کے متعلق مفسرین کی دو رائیں ہیں ۔ امام ابُوحنیفہ رح کے استاد، مکہ کے اسناد الحدیث حضرت عطاءؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ ہذا کی اِن تین آیات کے سوا باقی ساری سورۃ مکی دور میں نازل ہوئی جب کہ یہ آیات مدنی زندگی میں نازل ہوئیں اور ان کا زمانہ نزول فتح مکہ کے قریب ہے ۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری سورۃ مکی

ہے اور ان آیات میں بیان کردہ انتقامی کارروائی کا قانون غزوہ احد کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر مکان و زمان کے لیے نافذ العمل ہے۔ اس لحاظ سے غزوہ احد کے دوقع پر پیش آمدہ حالات پر بھی اس قانون کا اطلاق ہوتا ہے

شانِ نزول

پہلے نظریہ کے مطابق ان تین آیات کا شانِ نزول غزوۂ احد سے وابستہ ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ستر مسلمان شہید ہوئے جن کے ساتھ کفار نے بڑی زیادتی کی۔ ان شہداء کے اعضاء کاٹ کر ان کا مُثلہ بنایا گیا حتیٰ کہ سید الشہداء امیر حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا گیا۔ اس کارروائی کا مسلمانوں کو بڑا صدمہ ہوا حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے اپنے شہداء کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا بخدا! اگر اللہ نے ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرمایا تو ہم ان کے ساتھ اس سے دگنی انتقامی کارروائی کریں گے۔ ہم بھی اُن کے مُردوں کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان وغیرہ کاٹ کر ان کو بدشکل بنائیں گے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ اپنی تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے اس عزم کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ جن میں اللہ نے زیادتی کرنے سے منع فرما دیا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے اپنے ارادے سے رجوع کر لیا اور دوسرے لوگوں کو بھی کسی کا مُثلہ بنانے سے منع فرما دیا۔ امام سیوطیؒ نے مسند بزار کے حوالے سے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے قسم کا کفارہ بھی ادا کیا اور آئندہ ایسی منتقمانہ کارروائی کا ارادہ ترک کر دیا۔

انتقامی کارروائی کی حدود

ارشاد ہوتا ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ اگر تم بدلہ لینا چاہو فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ تو اتنی قدر بدلہ لو جس قدر تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ بدلہ لیتے وقت زیادتی نہ کرو۔ بلکہ پہنچائی گئی تکلیف کی حدود میں رہتے ہوئے دشمن کو اتنی ہی اذیت پہنچاؤ۔ اور یہ بھی محض اجازت ہے، ضروری نہیں۔ اس کے برخلاف وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ اگر تم اس تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے صبر سے کام لو، یعنی بدلہ لینے کا ارادہ ہی ترک کر دو، دشمن کو ویسے ہی معاف کر دو لَهُوَ خَيْرٌ

لِلصّٰبِرِیْنَ تو یہ بات صبر کرنے والوں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ گویا معاف کر دینا بدلہ لینے سے بہتر ہے۔ یہ معافی تمہارے لیے گناہوں کا کفارہ بنے گی۔ اور تمہارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے آخرت میں بہت فائدہ ہوگا۔

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ ان آخری آیات کا تعلق سورۃ ہذا کی آیت نمبر ۹۰ کے ساتھ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کا عالمی پروگرام پیش کیا ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ"... الخ اللہ نے جن تین مثبت چیزوں کا حکم دیا ہے ان میں پہلی چیز عدل ہے اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دشمن جس قدر اذیت پہنچائے اسے اسی قدر تکلیف دی جائے اور زیادتی نہ کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی چیز بیان کی ہے کہ عدل و انصاف کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو خواہ تمہارے سامنے تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ مکی سورتوں میں بالعموم توحید و رسالت، قرآن پاک کی صداقت اور معاد کا ذکر ہے تاہم عدل ایک ایسی ضروری چیز ہے جس کا ذکر اللہ نے مکی زندگی ہی میں کر دیا اور مسلمانوں کو یہ بات سمجھا دی کہ غالب آنے کی صورت میں اگر انتقام لینا چاہو تو کسی پر زیادتی نہ کرنا ورنہ تم خود ظالم بن جاؤ گے اور اگر صبر کرو اور بالکل معاف ہی کر دو تو یہ عزیمت کا مقام ہے، اس کا نتیجہ مزید بہتر صورت میں نکلے گا۔ اس قانون کی ضرورت مکی زندگی میں اس لیے بھی تھی کہ اس وقت مسلمان فریضہ تبلیغ ادا کر رہے تھے، لوگوں پر اسلام پیش کر رہے تھے اور اس کے جواب میں مشرکین کی طرف سے بڑی تکلیف دہ باتیں سننا پڑتی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں میں انتقامی آگ بھڑک اٹھتی تو اللہ نے پیشگی قانون بتلا دیا کہ بہتر تو یہ ہے کہ معاف ہی کر دو اور اگر بدلہ ہی لینا ہو تو حد سے تجاوز نہ کرو۔

انتقامی کارروائی کے ضمن میں امام ابوبکر حصاصؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

اگر دشمن نے تمہارے آدمی کی جان تلف کی ہے تو تم بھی اس کی جان لے سکتے ہو۔ اور اگر دشمن نے کسی کا کوئی عضو کاٹا ہے تو تم بھی اُس کا وہی عضو تلف کر سکتے ہو۔ اس قانون کی تفصیل اللہ نے سورۃ مائدہ میں بیان فرمادی ہے " اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ " یعنی قصاص کی صورت یہ ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا بھی قصاص ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص معاف کر دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائیگا۔

قتل کے معاملہ میں قانون یہی ہے کہ اگر ممکن ہو تو قاتل کو ویسے ہی قتل کیا جائے جس طرح اُس نے خود قتل کیا تھا۔ مثلاً اگر کسی نے کسی شخص کا پہلے کوئی عضو قطع کیا اور پھر اُس کو مکمل طور پر جان سے مار دیا، تو اس کے قصاص میں بھی ایسا ہی کیا جاسکتا ہے۔ تاہم عام قانون یہ ہے کہ قتل کے قصاص کے لئے تلوار سے یکبارگی گردن اڑادی جائے۔ امام ابُوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے آدمی کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا ہے تو اس میں بعینہٖ قصاص ممکن نہیں، لہٰذا اس کے بدلے میں اُسے تلوار کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا۔ البتہ جہاں مماثلت ممکن ہو، وہاں ایسا ہی عمل کیا جائے گا۔ مثلاً اگر کسی نے کسی شخص کی ٹانگ گھٹنے سے کاٹ دی ہے تو اس کے بدلے گھٹنے سے ہی ٹانگ کاٹی جائے گی، اگر کسی کا ہاتھ کہنی سے کاٹا گیا ہے تو قصاص میں بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔ البتہ اگر کسی نے کسی کی ٹانگ پر ضرب لگائی ہے اور وہ درمیان سے ٹوٹ گئی ہے تو اب عین اتنی ہی ضرب لگانا اور بالکل اسی مقام سے ٹانگ کو توڑنا، یا بالکل وہی آلہ استعمال کرنا اور پھر اس کے نتیجہ میں بالکل اتنی ہی ہڈی کا ٹوٹنا اور اتنی ہی درد پہنچانا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی صورت

ہیں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ قصاص کی بجائے اتنی سزا کی ضمانت دینا ہوگی۔ یعنی مضروب شخص کو معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔

امام ابوبکر حصاصؒ فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اعضاء کا معاوضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مالی نقصان کا بھی معاوضہ ادا ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی نے دوسرے شخص کی لکڑی چوری کر کے اُسے چھت میں استعمال کر لیا ہے یا اس کا صندوق یا فرنیچر بنا لیا ہے۔ اسی طرح کسی کی گندم چوری کر کے اُسے پسوا کر روٹی کھالی ہے، تو ایسی صورت میں چوری شدہ چیز کا بعینہٖ واپس ہونا ممکن نہیں رہتا ہے۔ لہذا امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اُس مغصوبہ چیز کی قیمت ادا کرنا پڑے گی، یہ انتقامی کاروائی کا قانون اللہ نے بیان فرمادیا ہے۔

صبر کی ترغیب

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے عزیمت کے مقام پر صبر کی خاص طور پر تلقین فرمائی ہے۔ اگرچہ یہ خطاب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے مگر اس خطاب میں آپ کے پیروکار بھی شامل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَاصْبِرْ آپ صبر کریں وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ لیکن آپ کا صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں۔ ایمان والوں کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کی توفیق کے بغیر انسان نیکی کا کوئی بھی کام نہیں کر سکتا، لہذا ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے توفیق کا طلبگار رہنا چاہیئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی یہی کہا تھا "وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ (هود) جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق حاصل نہ ہو، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ ہی کی توفیق سے انسان کام کاج کرتا ہے، صبر اور برداشت کرتا ہے۔ بہرحال اللہ نے صبر پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تسلی دی ہے کہ آپ کافروں، مشرکوں، مخالفوں اور نافرمانوں کی کارگزاریوں کے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ وَلَا تَحْزَنْ

عَلَیْھِمْ آپ اُن پر غمگین نہ ہوں وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ اور اُن کی تدبیروں سے تنگ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی چالوں کا خود توڑ پیدا کرے گا، لہٰذا آپ کے دل میں تنگی نہیں پیدا ہونی چاہیے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی آپ کے شامل حال رہے گی۔ لہٰذا آپ غمزدہ نہ ہوں " وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ " اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے، وہ خود ان سے نپٹ لے گا۔

پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بیشک اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اُس سے ڈرتے ہیں اور دوسری بات یہ وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ اور وہ لوگ جو نیکی کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ کی معیت اس سے ڈرنے والوں اور نیکی کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم رہنا ضروری ہے اور اس کے لیے تقویٰ اور نیکی کی ضرورت ہے۔ جس شخص میں خوفِ خدا ہوگا وہ شریعت کی حدود کی پاسداری بھی کریگا، کفر، شرک، نفاق اور بدعقیدگی سے بچتا رہے گا۔ اللہ کے ساتھ معاملہ ہمیشہ سچائی کے ساتھ درست رہ سکتا ہے۔ اگر دل میں کسی قسم کا کھوٹ ہوگا تو تعلق باللہ درست نہیں رہ سکتا۔ البتہ مخلوق کے ساتھ تعلقات کی درستگی احسان پر موقوف ہے۔ انسان اپنے بھائی بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے گا، اُن کے ساتھ نیکی اور احسان کرے گا تو اس کا تعلق مخلوقِ خدا کے ساتھ درست ہو جائیگا۔ غرضیکہ اس حصہ آیت میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا ذکر آگیا ہے اور یہی دو چیزیں پورے دین کی جڑ اور بنیاد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی معاملہ صحیح ہو اور مخلوق کے ساتھ بھی نیکی کا سلوک ہو۔

تعظیم اور شفقت

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ دین کا نچوڑ دو باتیں ہیں۔ ایک بات اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے احکام کی تعظیم اور ان پر عمل درآمد ہے اور دوسری

اَلشَّفْقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ یعنی اللہ کی مخلوق پر شفقت و مہربانی کرنا ہے۔ ان دو باتوں کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ تقویٰ اور احسان ہی نکلے گا جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ اور اللہ کی مدد انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں یہ دو چیزیں پائی جائیں۔ سلف صالحین میں یہ چیزیں موجود تھیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی ہمیشہ ان کے شامل حال رہتی تھی۔ جب ان دو چیزوں میں کمزوری واقع ہوگئی تو امت تنزل میں چلی گئی۔ اب کئی صدیوں سے امت مسلمہ کا حال دنیا کے سامنے ہے۔ وجہ یہی ہے کہ نہ ان میں تقویٰ باقی رہا ہے اور نہ احسان۔ عدل و انصاف مفقود ہے۔ حقوق کی ادائیگی نہیں ہوتی۔ تمام طبقات میں سرکشی پائی جاتی ہے۔ اللہ کے احکام سے علی الاعلان بغاوت ہو رہی ہے۔ تو ایسی صورت میں اللہ کی رحمت اور مدد کیسے حاصل ہوگی۔ ہمارے اندر وہ شرائط ہی نہیں پائی جاتیں جو معیت الٰہی کا سبب بنتی ہیں تو ہمیں کامیابی کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔

معیت الٰہی

اللہ تعالیٰ کی معیت بہت بڑی چیز ہے اور اس کے لیے انبیاء علیہم السلام بھی دعائیں کرتے تھے۔ غارِ ثور والا واقعہ دیکھ لیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اس غار میں پناہ لے رکھی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں دشمن کا خوف پیدا ہوتا ہے تو حضور علیہ السلام فرماتے ہیں "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" (توبہ) خوف نہ کھائیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے، ہمیں کس بات کا غم ہے۔ اسی طرح جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل کھڑے ہوئے تو آگے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ لوگوں میں کس قدر خوف پیدا ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اسی طرح قوم کو تسلی دی تھی کہ فکر نہ کرو، "اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ" (الشعراء) میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔ وہی راہ نکالے گا۔ ہم اسی کے حکم سے باہر نکلے ہیں لہٰذا اس کی مدد ہمارے شامل حال ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔

خطبات شیخ الاسلام

از: شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

مرتّب ومقدمہ: حضرۃ مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے یہ خطبات بڑی اہمیّت رکھتے ہیں۔ اپنے موضوعِ احوال وسیاست کے اعتبار سے اور علمائے حق کی فیصلہ کن جدّوجہد کے اعتبار سے بھی ان خطبات کی بڑی اہمیّت ہے افسوس کہ ابتک یہ یکجا نہیں تھے جمعیۃ علماء ہند کی کارگزاریوں کے مدنظر بعض محترم ہستیوں نے ان میں سے بعض خطبات کو اکٹھا کیا ہے لیکن تمام خطبات اس طرح اکٹھے نہیں ہوئے جس طرح ہونے چاہئیں تھے۔ احقر کی بڑی خواہش تھی کہ جس طرح دوسرے اکابر کے خطبات یکجا مل جاتے ہیں حضرت مدنیؒ کے یہ اہم ترین خطبات بھی اگر ایک جگہ جمع ہوتے تو اچھا تھا۔ ان سے بھی عام لوگ استفادہ کرتے ایک دفعہ احقر نے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا اسعد مدنی مدظلہ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اگر آپ یہ کام کرادیں تو اچھا ہوگا لیکن شاید کہ صاحبزادہ صاحب مدظلہ کی توجہ اسطرف مبذول نہ ہوسکی۔ بالآخر بعض احباب کے اصرار پر احقر کو ہی یہ کام کرنا پڑا۔ بعض احباب نے حضرت مدنیؒ کے جتنے خطبات دستیاب ہوسکے لاکر دیئے اور کچھ خطبات احقر کے پاس بھی تھے وہ کتابت کے لیے دے دیئے۔ سردست یہ گیارہ خطبات میسّر ہوسکے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے: (۱) خطبہ سیوہارہ، (۲) خطبہ رنگپور بنگال، (۳) خطبہ دہلی، (۴) کوکناڈا، (۵) علی گڑھ، (۶) جونپور، (۷) لاہور (۸) سہارنپور، (۹) بمبئی (۱۰) حیدر آباد دکن، (۱۱) سورت۔ (ماخوذ مقدمہ خطبات)

سائز ۲۳×۱۸/۸، ضخامت ۵۰۰ صفحات، کاغذ اعلیٰ، جلد مضبوط، قیمت ۸۰/ روپے

ناشر: ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ کی

مایہ ناز اور مقبول عام تفسیر

معالم العرفان فی دروس القرآن

مکمل طبع ہو گئی ہے

اللہ رب العزت کے کلام پاک کو عوام کے اذہان کے قریب کرنے کے لیے مفسرین کرام نے بے شمار کوششیں کی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ یہ تفسیر بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم اور مبارک کوشش ہے۔ رواں دواں اور آسان اردو زبان میں قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ اور سہل انداز میں مستند تفسیر، ضروری مسائل کی توضیح، ضروریات وقت، زمانہ و ماحول کی خرابیوں کی نشاندہی اور ان کا علاج، قرآن کریم کی آیات سے اور پھر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بیان کردہ تفسیر اور صحابہ کرامؓ ائمہ کرامؒ اور جمہور مفسرین کی اختیار کردہ توضیحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرک و بدعت اور مذاہب باطلہ اور نظامات فاسدہ کا مختصر طریق پر بہتر رد اس تفسیر کا خاص امتیاز ہے۔ اعلیٰ کتابت و طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اس تفسیر کی قیمت ۳۱۵۵ روپے ہے۔

علماء، طلباء، خطباء، اور عوام الناس کے لیے بے حد مفید اور معلومات افزا ہے۔

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔ اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب صاحب

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ (مکتبہ)

محمد منیر صاحب Ph:221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ